معارف

کی

۱۳۳ویں جلد

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

معارف اعظم گڑھ

فہرست مضامین معارف

جلد ۱۳۳

جنوری ۱۹۸۴ء تا جون ۱۹۸۴ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

معارف

دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت بیس روپے سالانہ

مطبع دارالمصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۳۳ ماہ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۸۴ء عدد ۱

مضامین

مقالات

ادبیات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

۲۲ نومبر ۱۹۸۳ء کو کراچی میں لیاقت کالج کی طرف سے استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کی برسی ایک جیمین ہوٹل میں بہت ہی باوقار طریقے پر منائی گئی، جس میں شہر کے اکابر اور معززین بڑی تعداد میں شریک تھے، اس برسی کے موقع پر حضرت سید صاحبؒ پر مختلف اخباروں میں مضامین شائع ہوئے، انگریزی اخبار ڈان میں مصباح الہدیٰ اسلام آباد کا جو مضمون ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے عنوان سے چھپا وہ شوق سے پڑھا گیا، اور اس کا چرچا کئی جگہ رہا، اس موقع پر حضرت سید صاحبؒ کا مضمون رسول وحدت بھی کئی اخباروں میں چھپا، لیاقت کالج کی طرف سے جو جلسہ ہوا، اس میں کراچی یونیورسٹی کے ڈاکٹر محمد حنیف فوق اور حضرت سید صاحبؒ کے مرید ارشد جناب غلام محمد نے بڑے اچھے مضامین پڑھے، پاکستان کے مشہور عالم مولانا حسن مثنیٰ ندوی، جناب فخرالحسن صاحب پرنسپل لیاقت کالج اور ان کے اسٹاف کے کچھ اراکین نے بھی اچھی تقریریں کیں، بہار کے مشہور شاعر جناب کلیم عاجز بھی اتفاق سے اس وقت وہاں موجود تھے، انھوں نے بھی اپنے تاثرات پیش کئے، مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس خاکسار کو بھی بولنا پڑا، اشکبار آنکھوں کے ساتھ جذباتی انداز میں اس کی وضاحت کی کہ استاذی المحترم مرحوم اسلام کے سفیر اور دبستانِ شبلی کے ضمیر بن کر کس طرح اپنے فرائض انجام دیئے، جلسہ کے صدر ریر ایڈمیرل ایم آئی ارشد نے کہا کہ سید صاحبؒ کی کتاب "عربوں کی جہازرانی" بڑی اہم ہے، بحریہ کے ہر نوجوان کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے، کالج کے پرنسپل صاحب نے اعلان کیا کہ ۱۹۸۴ء میں حضرت سید صاحبؒ کی صد سالہ سالگرہ بڑے پیمانے پر منائی جائے گی۔

۲۶ نومبر کو کراچی کے اسلامیہ کالج میں بھی یہ برسی منائی گئی، میں یہاں بھی مدعو تھا، اسی کے احاطہ میں حضرت سید صاحبؒ کا مزارِ اقدس ہے، پہلے یہ اچھے حال میں نہ تھا جس کو دیکھ کر دکھ ہوتا تھا، اب پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق کے حکم سے احاطہ کی چار قبروں کے لئے ایک عمدہ عمارت بنا دی گئی ہے جس میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا مزار بھی ہے، اسی کے بغل میں سید صاحبؒ کی ابدی خوابگاہ ہے، جس کو ان کے چھوٹے داماد سید محی الدین مرحوم نے بہت پہلے سنگ مرمر کا بنوا

دو قبروں کے ساتھ پاکستان کے ریزرو بینک کے سابق گورنر جناب زاہد علی صاحب اور پاکستان کے ایک سابق سیرگی جو بریں ہیں، اب حضرت سید صاحبؒ کا مزار ان کے رتبہ اور وقار کے مطابق ہو گیا ہے، اس کے سامنے کی دیوار پر ان کی مختصر سوانح عمری کے ساتھ ان کی تمام تصانیف کے نام بھی درج ہیں،

مزار پر حاضری دی تو بے اختیار جی چاہا کہ اس کی تعویذ سے لپٹ جاؤں، زبان حال سے کہہ رہا تھا کہ وہ دارالمصنفین کو علم و فن کا ایک تاج محل بنا گئے، ان کی ذات مبارک کی موجودگی میں اس پر چودھویں رات کی جو چاندنی چھٹکی نظر آتی تھی وہ اب وہاں نہیں دکھائی دیتی، آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے کہ انھوں نے اپنی نگرانی میں جن شاگردوں کو تیار کیا تھا وہ ایک ایک کر کے اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، اس بزم دوشیں کا ایک ٹمٹماتا چراغ میری حقیر ذات باقی رہ گئی ہے، انھوں نے بے سروسامانی کے عالم میں دارالمصنفین کے احاطہ میں علم و فضل کی جو جوت جگائی تھی اس کے احاطہ میں وہ بے سروسامانی تو نظر نہیں آتی بلکہ اس کی ظاہری زینت و آرایش پہلے سے زیادہ ہے مگر وہ جوت نہیں جو ان کے زمانہ میں تھی، چشم بینا رکھنے والوں کو وہاں ان کی روح منڈلاتی ضرور نظر آتی ہے، مگر ان کے علم و فضل کی پاکیزگی اور سیرت کی طہارت سے ان کے حاشیہ نشینوں کے ذہن میں جو بالیدگی اور ان کی تحریروں میں جو تازگی پیدا ہوتی رہی، اب وہ ہاں نہیں ہو رہی ہے،

مزار کے پاس کھڑے ہو کر اللہ تبارک و تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی کہ اس کے اندر ابدی نیند سونے والے نے دارالمصنفین کو اپنے خون سے سینچا تھا، اپنے کو مٹا کر اس کے وقار کو بلند کیا تھا، اس کی شہرت بڑھانے میں انھوں نے جو محنت و ریاضت کی تھی اس سے محلول ہو کر رہ گئے تھے، اس کے ہر ذرہ میں ان ہی کے دل و جگر کے ریزے ہیں، اب وہ نہیں ہیں تو خدایا ان کی اور ان کے استاذ محترم کی نیت بابرکت کی خاطر اس ادارہ کو اپنی رحمتوں اور برکتوں کی بارش سے سیراب رکھ، تاکہ اس کے ذریعہ سے فیوض کی جو جوئبار بہی تھی وہ جاری رہے آمین، آنکھیں نم تھیں، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مزار کے مکین دارالمصنفین کے احاطہ میں آ رہے ہیں، جا رہے ہیں، قدم قدم پر علم و فن کے نئے نئے گل کھلا رہے ہیں،

اسلامیہ کالج میں جلسہ شروع ہوا تو اس کی صدارت سندھ کے محکمۂ اطلاعات کے سکریٹری جناب عبدالعزیز اشرفی نے کی۔ مقررین میں مولانا غلام محمد، جناب انیس الرحمن ایڈووکیٹ، مولانا حبیب اللہ، بہاری اور جناب سلیم یزدانی تھے، مہمان خصوصی کی حیثیت سے اس خاکسار نے عرض کیا کہ وہ بیان تو بڑا اچھا تھا کیونکہ مزار دیکھ کر اس کے روئیں روئیں سے آنسو ٹپک رہے ہیں جس کے بعد کچھ بولنا آسان نہیں، مگر ان کا اصلی خراج عقیدت تو یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں جو تعلیمات دی ہیں ان پر عمل کرکے زندگی کو سنوارنے کی کوشش کی جائے۔

۳۱ نومبر کو قائداعظم اکیڈمی کے ڈائرکٹر جناب شریف المجاہد نے علامہ محمد اقبال پر ایک مقالہ پڑھنے کے لئے مدعو کیا، اس جلسہ کی صدارت جناب ہاشم رضا نے کی جو اس اکیڈمی کے صدر ہیں، سامعین کی خدمت میں یہ عرض کیا کہ علامہ محمد اقبالؒ یورپ کے فلسفیوں کی گاڑیوں کے حامل نہ تھے، بلکہ وہ تو اس کے قائل تھے کہ خود یورپ کے فلسفی مسلمان حکماء کی گاڑیوں کے قلی ثابت کئے جا سکتے ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے فرنگی بتوں کو دل ضرور دیا مگر ان کے دیرنشینوں کے درمیان اپنے کو پگھلا ہوا پایا، اس طرح کہ اپنے سے ایسا بیگانہ ہو گیا کہ اپنے کو دیکھ کر پہچان نہ سکا، یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب کے میخانہ سے مے ضرور چکھی، مگر اس کو چکھ کر درد سر مول لیا، ان فرنگیوں کے ساتھ بیٹھا بھی، مگر احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دن بے سود گذرے۔

کراچی کے قیام میں کچھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ یہ خاکسار اپنے استاذی المحترم کو نظرانداز کرکے اقبال پرست ہو گیا ہے، اس کو دور کرنے کے لئے لیاقت کالج کے پرنسپل صاحب نے اپنے کالج میں ایک تقریر کرائی جس میں اس خاکسار نے حضرت سید صاحبؒ کی تحریروں کو پیش کرکے یہ دکھایا کہ وہ جو کچھ لکھتا یا بولتا ہے اسی اجمال کی تفصیل ہے، الحمدللہ کہ حاضرین مطمئن نظر آئے، جناب پرنسپل صاحب نے اپنے گھر پر بھی ایک نشست کرائی، اس موضوع پر مزید گفتگو ہوئی، وہاں اس پر بھی اصرار تھا کہ حضرت سید صاحبؒ کی تمام تحریریں شائع کی جائیں کوئی چھوڑی نہ جائے، اس موقع پر جناب عبدالغنی شمس نے حضرت سید صاحبؒ پر ایک نظم بھی سنائی۔

۰۰۰۰۰ ۰۰۰۰۰

مقالات —

مستشرقین کے اعتراضات کی نشرواشاعت کس طرح ہوئی ہے

اور

اُن کی نوعیت، اغراض اور خاص محور

مترجمہ۔ ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

بزدلی اور لڑائیوں میں گھبراہٹ اور بےصبری الزام

قدیم و جدید کسی مورخ نے بھی آپ پر یہ الزام عائد نہیں کیا ہے مگر مستشرق پادری لامانس نے مورخین و ارباب سیر کے اجماع عام کے برخلاف آپ کو اس الزام سے متہم کرکے تمام عربوں کو بھی اسی لپیٹ میں لے لیا ہے، وہ کہتا ہے

"لوگ عربوں کو شجاعت سے متصف مانتے ہیں۔ اور اسی کو دورِ اول کی اسلامی فتوحات میں ان کی کامیابی کی وجہ قرار دیتے ہیں، لیکن مجھے اس انتہائی مبالغہ آمیز رائے کو ماننے میں سخت تردد ہے۔" ڈاکٹر عبد الحلیم رسول اللہؐ کی شجاعت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "آپؐ لڑائیوں میں خود فوج کی قیادت کرتے اور کسی جنگ میں بھی آپؐ پراگندہ خاطر نہ ہوئے، یہاں تک کہ احد کی لڑائی میں جب مسلمان عظیم ابتلا سے دوچار ہوئے اور غزوۂ خندق میں جب دشمنوں میں

کا لشکر جرار امنڈ پڑا تھا۔ اور حنین کے روز جب مینہ کی طرح نیزوں اور تیروں کی بارش ہو رہی تھی تب بھی آپؐ خائف اور مرعوب نہیں ہوئے۔

ان شواہد کے بعد بھی لامانس نے یہ افسانہ تراشا ہے کہ آپؐ میں شجاعت، دلیری اور دری نہ تھی، امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت انسؓ سے یہ مسند روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلعم سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے بڑھ کر سخی تھے۔

اہل مدینہ گھبرا اٹھتے مگر آپؐ پر خوف طاری نہ ہوتا اور سب سے پہلے گھوڑے پر سوار ہو جاتے، وہ جبیر بن مطعم سے روایت کرتے ہیں کہ حنین سے واپسی کے وقت آپ نے ارشاد فرمایا تم لوگ مجھے جھوٹا بخیل اور بزدل نہ پاؤ گے، آپؐ بزدلی سے پناہ مانگتے، امام بخاریؒ عمرو بن میمون ازدی اور حضرت انسؓ سے یہ مسند روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ فرماتے تھے کہ "اے اللہ میں عجز و درماندگی، کاہلی و سستی، دہشت و بزدلی اور بڑھاپے سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔ داعیان حق کا یہی حال ہوتا ہے، وہ جو پیغام پہنچاتے ہیں، اور جسے نافذ و جاری کرتے ہیں، اسکی شدید مخالفت کی جاتی ہے، اس بنا پر ان کا شجاع اور نڈر ہونا ضروری ہے، رسول اللہؐ تو سب سے زیادہ بہادر تھے، اس لئے یہ الزام کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا۔

(ج) خواب و منام کی کثرت کا الزام | یہ بہتان قرآن و حدیث کی صراحت اور تاریخی حقائق کے خلاف ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام اوصاف و عادات سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوتی، اس بنا پر لامانس کا یہ کہنا کہ "آپؐ بہت زیادہ سوتے تھے" یا تو اس کی واقعی جہالت کا نتیجہ ہے۔ یا اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا ہے۔ کیونکہ عربوں میں نقد و انتقاد کی قوت و صلاحیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، اگر وہ آپؐ کی زندگی میں کسی ایسی بات کا مشاہدہ کرتے جو قرآن کی اس خبر کے مطابق نہ ہوتی کہ آنحضرتؐ رات کا ایک بڑا حصہ عبادت میں گزارتے تھے، تو وہ آپ کی پیروی اور تصدیق نہ کرتے کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ

(مزمل۔ ۲۰)

بیشک تیرا خدا خوب جانتا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھ کے لوگ کبھی دو تہائی رات کے قریب اور کبھی آدھی رات اور کبھی تہائی رات قیام کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہؐ رات میں اس قدر طویل قیام کرتے کہ پائے مبارک میں ورم آجاتا تھا، حضرت مغیرہؓ فرماتے ہیں کہ آپؐ رات میں نماز کے لیے قیام فرماتے۔ اس کی وجہ سے آپ کے پائے مبارک اور پنڈلیوں میں ورم آجاتا تھا۔ اس بارہ میں جب آپؐ سے کچھ کہا جاتا تو فرماتے کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔

حافظ ابن حجر قرطبی کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ استفسار کرنے والوں کا خیال تھا کہ عبادت الٰہی کے لیے مشقت جھیلنے کی وجہ گناہوں کا خوف اور رحمت و مغفرت کی طلب ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مغفرت ثابت شدہ امر ہے۔ اس لیے آپؐ کو عبادت کی کوئی احتیاج نہیں تھی آپ نے ان لوگوں کو بتایا کہ عبادت کا ایک سبب انعام و مغفرت کی شکر گذاری اور اس نعمت میں غیر مستحقین کو شریک کرنا بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی تو آپؐ نے اتنا لمبا قیام کیا جس کی وجہ سے میرے دل میں ایک برا خیال پیدا ہوا۔ لوگوں نے دریافت کیا، کونسا برا خیال پیدا ہوا، فرمایا میں نے ارادہ کیا کہ بیٹھ جاؤں اور آپ کو چھوڑ دوں، امام مسلم حضرت حذیفہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہؐ کے ساتھ نماز پڑھی تو آپؐ نے بقرہ، آل عمران اور نساء کی سورتیں ایک ہی رکعت میں پڑھیں۔ اس درمیان میں جب آپ کوئی ایسی آیت تلاوت کرتے جس میں

تسبیح کا ذکر ہوتا تو آپؐ تسبیح پڑھنے لگتے۔ سوال کا تذکرہ ہوتا تو سوال کرتے، تعوذ کا موقع ہوتا تو تعوذ فرماتے، پھر قیام سے کچھ کم دیر تک رکوع میں رہے۔ اور اس سے کم دیر تک قومہ میں رہے اور قیام ہی کے بقدر لمبا سجدہ کیا، حافظ ابن قیم جوزی فرماتے ہیں کہ آپؐ کبھی بستر پہ سوتے، کبھی چمڑے کے فرش پر، کبھی چٹائی پر، کبھی زمین پر، کبھی تخت پر، کبھی ریت پر اور کبھی سیاہ کمبل یا بوریا پر آپ کا بستر گندمی رنگ کے چمڑے کا تھا۔ اس میں کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی، آپؐ کے پاس ایک ٹاٹ تھا، آپ اس پر دو تہہ کر کے سویا کرتے تھے۔ ایک روز چار تہہ کر کے بچھایا گیا تو آپ نے ناگواری ظاہر کی اور فرمایا اسے پہلے کی طرح کر دو تاکہ اس کی وجہ سے رات کی نماز میں رکاوٹ نہ پیش آئے۔

ذرا غور کیجئے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طرز عمل یہ تھا تو مستشرقین کی افتراپردازی کس قدر لغو ہے۔

نبی کی حیثیت سے آپؐ پر الزامات | نبیؐ کی ذات پر بحیثیت آدمی مستشرقین کے اعتراضات کا مختصر جائزہ لینے کے بعد اب اسی طرح کے چند بے سروپا اور الزام ملاحظہ ہوں، ان کا تعلق آپؐ کی نبوت و رسالت سے ہے۔

(الف) رسول کے نام پر اعتراض | ڈرمنگم کا بیان ہے کہ نبیؐ کا اصلی نام قثم تھا۔ ولادت کے تھوڑے عرصہ بعد یا بعثت کے بعد اسے بدل کر آپؐ نے اپنا نام محمد رکھ لیا۔ حالانکہ اس کی نوعیت نام سے زیادہ لقب کی ہے۔ اسی طرح آپؐ کی کنیت عرصہ تک ابوالقاسم رہی، لامانس وغیرہ نے بھی رسول کے نام کو ایک معما اور لاینحل مسئلہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ہوار اپنی کتاب تاریخ العرب میں یہ تعلیل و توجیہ پیش کرتا ہے کہ محمد کا لفظ اصلاً وصف ہے۔ اس کے ایک خاص معنی ہیں۔ اسی لیے لوگوں نے اسے ان کا لقب قرار دیا ہے۔ ڈرمنگم کی کتاب کا ترجم

اس افترا پردازی کے متعلق لکھتا ہے "یہ عجیب و غریب الزام ہے، سب سے پہلے اسپرنگر نے اس کا ذکر کیا۔ اس کا ماخذ سیرت حلبیہ کی ایک روایت ہے جو امتاع سے اس طرح نقل کی گئی ہے کہ عبد المطلب کے بیٹے قثم نو برس کی عمر میں آنحضرتؐ کی پیدائش سے تین سال قبل فوت ہو گئے، عبد المطلب کو اس کا بڑا قلق ہوا۔ اس لئے جب آنحضورؐ کی ولادت ہوئی تو انھوں نے آپ کا نام قثم رکھا۔ مگر حضرت آمنہ نے کہلایا کہ انھیں خواب میں بچے کا نام محمد رکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اس بنا پر عبد المطلب نے پھر ان کا نام محمد رکھ دیا"۔

اس روایت کا وضعی اور جعلی ہونا بالکل واضح ہے، اور اگر اس کی علتوں کو نظر انداز کر کے اسے مان بھی لیا جائے تو ادنی غور و فکر کرنے والے کو بھی اس سے صرف یہی معلوم ہوگا کہ عبد المطلب نے آنحضرتؐ کی ولادت کے چند ہی لمحے بعد حضرت آمنہ کے اشارہ پر آپ کا نام قثم سے تبدیل کر کے محمد رکھ دیا۔ مگر ہر شفلڈ اسپرنگر کی اس رائے نے مستشرقین کے لیے قیاس آرائی اور افترا پردازی کا ایک نیا دروازہ کھول دیا، اور انھوں نے اس سے عجیب و غریب، اور نہایت بعید از قیاس نتائج اخذ کر لئے اور اس طرح کی بے سر پیر کی بات اڑا دی کہ آپ کا نام محمد بعثت کے بعد رکھا گیا، اور بعض لوگوں نے تو یہاں تک ستم ڈھایا کہ قرآن میں جہاں محمد و احمد کا ذکر ہے وہ بعد کا اضافہ ہے۔ مثلاً

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ	اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا کہ اے
اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ	بنی اسرائیل میں تمھارے پاس خدا کا بھیجا ہوا
مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ	تصدیق کرتا ہوا آیا ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی
التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ	ہوئی توراۃ کی اور ایک پیغمبر کی بشارت سناتا
يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ	ہوا آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام
(صف ۶)	احمد ہوگا۔

لیکن یہ ساری باتیں اسلام کے خلاف ان کے بغض و حسد کا نتیجہ ہیں، ورنہ یوحنا کی انجیل کے باب اصحاح (۱۴) میں فارقلیط کا لفظ آیا ہے، جو محمد ہی کے ہم معنی ہے۔ ان مستشرقین نے اس بات کو بھی نظر انداز کر دیا کہ ان کے اس بے بنیاد الزام کے ماخذ سیرت حلبیہ کے اندر اس کا بھی ذکر ہے کہ آنحضرت ؐ سے پہلے تقریباً سولہ[1] اشخاص کا نام محمد تھا۔ علاوہ ازیں عربی زبان میں قثم اس شخص کو کہتے ہیں جس کا بدن گٹھا ہوا ہو یا جو جسمانی اعتبار سے کامل و جامع ہو، ایک حدیث میں ہے کہ آپ ؐ نے فرمایا کہ میرے پاس ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا تم قثم ہو اور تمہاری خلقت درست ہے، پتہ نہیں مستشرقین اس کے بارہ میں کیا کہیں گے؟ اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ بعثت کے بعد فرشتے نے آپ کو قثم کا خطاب عطا کیا تھا۔

ب) رسول کی امیت | بار کہتے ہیں"...... دوسری آیت یہ ہے :-

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ	اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ
بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ	اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو
مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ	مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں
اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ	کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار
ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ	بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو
عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ	لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے
... سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ	سر پر سوار نہ ہو جاؤ، یہ اس وجہ سے کہ
الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۔	وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملہ میں
(آل عمران - ۷۵)	ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے، اور
	یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں

اس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ بت پرستوں کے لیے امی یا امیین کا لفظ اہل کتاب یا یہودیوں
نے وضع کیا تھا۔ اس رائے کی مزید تائید ہارنشر کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ عبرانی میں اس کا
مقابل لفظ اموت یا عولام ہے، پھر وہ کہتے ہیں کہ محمد کی لفظ امی سے کیا مراد تھی؟ اس کے بارے میں
کوئی قطعی بات کہنی مشکل ہے، بوہل کا خیال ہے کہ امی سے وہ شخص مراد ہے جو لکھ پڑھ نہ سکتا ہو
اس کے معنی وثنی (بت پرست) نہیں ہے. مگر اس کے بعد وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض اسباب کی بنا پر
امی کے معنی کی یہ تعیین دشوار ہے. کیونکہ عربی میں "امۃ"، عبرانی میں "اما" اور آرامی میں "اُمتیا"
کا لفظ کسی امت یا قوم کی جہالت کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال نہیں ہوتا، ..... بعض لوگ
کہتے ہیں کہ امی کا لفظ حضرت محمدؐ کے لئے اس وجہ سے استعمال ہوا ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے
مگر حقیقت یہ ہے کہ لفظ امی کا ان سب معنوں سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ قرآن مجید میں ہے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ	اور ان میں امی (ان پڑھ) ہیں جو کتاب
الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ	الٰہی کو صرف اپنی آرزوؤں کا مجموعہ خیال
إِلَّا يَظُنُّونَ۔ (بقرہ ۲ - ۷۸)	کرتے ہیں حالانکہ وہ صرف اٹکل کے تیر

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیین سے مراد نوشت وخواند سے ناواقف لوگ نہیں ہیں بلکہ
لوگ ہیں جن کو منزل من اللہ آسمانی کتابوں سے ناواقفیت تھی۔

مستشرقین کے اقوال کے تعارض وتضاد کو نظر انداز کر کے ان کے اس شبہ کی تردید میں
چند باتیں عرض کی جاتی ہیں۔

۱۔ نبی اکرمؐ کی شان میں امی کا لفظ سورہ اعراف کی دو آیتوں میں آیا ہے، یہ مکی سورۃ
چونکہ اس وقت تک آپؐ کا یہود سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس بنا پر یہ خیال صحیح نہیں ہو سکتا
اسے یہود نے بت پرستوں کے لئے استعمال کیا تھا۔ عبرانی و آرامی میں اس کے مقابل کا ہونا

ہیں کے یہود کی وضع و اصطلاح ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۲۔ امی کا لفظ قرآن مجید میں چھ جگہ آیا ہے۔ اعراف کی دو آیتوں (۱۵۷ - ۱۵۸) میں اور آل عمران کی دو آیتوں (۲۰ و ۷۵) میں اور ایک ایک جگہ جمعہ (۲) اور بقرہ (۷۸) میں، ان آیتوں کے سیاق سے پتہ چلتا ہے کہ اس سے مراد نوشت و خواند سے بے بہرہ لوگ ہیں۔ اور یہی عربی زبان میں اس لفظ کے معروف معنی ہیں، لغت کے ائمہ اور عربیت کے ماہرین نے بھی اس کی یہی تشریح کی ہے، طبری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: "عربوں کے نزدیک امی وہ شخص کہلاتا تھا۔ جو لکھنا نہ جانتا ہو" ابوحیان اندلسی اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں "نوشت و خواند سے ناواقف امی کہلاتا ہے۔ ام کی جانب اس کی نسبت بھی اسی معنی کی نشاندہی کرتی ہے۔ کہ قرأت و کتابت عورتوں کا عمل و شغل نہیں، قرآن نے آپ کی امیت کی صراحت اس طرح کی ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ إِذًا لَارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ۔ (عنکبوت - ۴۸)	اور تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اسے اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے، ایسا ہوتا تو اہل باطل ضرور شک کرتے۔

رسول کی امیت تواتر سے ثابت ہے۔ اور مستشرقین اس کی ذات سے جس نبوت کو سلب کرنا چاہتے ہیں اس کے دلائل میں امیت بھی ہے۔

۳۔ اوپر نقل کی گئی آیت (ومنھم امیون الخ) سے مقالہ نگار نے دعویٰ کیا ہے کہ اس سے مقصود خدا کی نازل کی ہوئی کتابوں سے عربوں کی عدم معرفت ہو، یہی رائے بعض مفسرین کی بھی ہے۔[ا]

طبری نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباسؓ کا ایک اثر بھی نقل کیا ہے۔"

[ا] گو کثرت سے علما نے اسی معنی کو مراد لیا ہے جس کی طرف مصنف نے اشارہ کیا ہے، مگر محققین کے نزدیک صحیح قول دوسرا ہے کہ رسول اللہؐ کا نوشت و خواند سے عاری ہونا ثابت ہے، مگر تمام عربوں کا یہ حال نہ تھا۔

ر ہوتا ہے کہ امیین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے خدا کے بھیجے ہوئے رسولوں اور
ی کی ہوئی کتابوں کی تصدیق نہیں کی تھی۔ اور خدا نے اس نام سے انھیں اس لیے موسوم
ی کتابوں اور رسولوں کے منکر تھے لیکن اس اثر کی سند پر ضعیف ہیں، اور یہ اثر درست
ت نہیں ہے۔ کیونکہ ضحاک اگرچہ ثقہ ہیں لیکن ان کی نہ حضرت ابن عباسؓ سے
ت ہے اور نہ کسی اور صحابی سے اگر یہ اثر صحیح بھی ہو تو مجازاً ہی یہ مفہوم مراد ہو سکتا
ی نے اس کی تردید کی ہے، اور یہ تاویل کلام عرب کے معروف استعمال کے خلاف

خدا کی طرف سے وحی نہیں ہے پہلے الزام سے زیادہ خطرناک دوسرا
ہے کہ قرآن رسول اللہؐ کا کلام ہے جو آپؐ کے عمل اور کاریگری کے نتیجہ میں وجود
یہ بات کتنی عجیب ہے کہ ان غرض پسند مستشرقین کی نظر اللہ کے کلام اور رسول کے
ہ فرق پر نہیں جاتی جو اسلوب اور اعجاز وغیرہ کے لحاظ سے دونوں میں ہے گو کہ رسول
لسانی بلاغت و بیان کا سب سے عمدہ و ارفع نمونہ ہے، قرآن نے جب تمام انسانوں
عربوں کو خصوصاً یہ چیلنج کیا کہ قرآن جیسا کوئی کلام یا اس کی کسی سورہ جیسی کوئی
لریں تو سب سے پہلے اس چیلنج کا خود محمدؐ ہی کو سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ آپؐ نے تو اپنی
ہ دیث کی کتابت سے بھی منع کر دیا تھا تاکہ قرآن و حدیث ایک دوسرے سے گڈمڈ
یہ بات بھی لائق توجہ ہے کہ کیا کوئی مصنف بر سر عام ایسے شاندار کارنامہ کو اپنی تخلیق
نے کی تردید کرے گا اور اس پر خود اپنی اس قدر شدید ملامت کرے گا۔ نیز کیا یوں
ے کلام اور خدا کے کلام میں فرق و امتیاز کرنے سے عاجز رہنا ممکن ہو سکتا ہے جبکہ
فصاحت اور طلاقت لسانی مشہور ہے، بیان و بلاغت کا کوئی نکتہ شناس اور

[illegible]

عربیت کا رمز آشنا قرآن مجید کے خدا کی وحی ہونے کا منکر نہیں ہو سکتا، انور جندی تحریر کرتے ہیں۔ مستشرقین کی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ وہ آنحضرتؐ کی ذہانت، عبقریت، فہم و فراست کی بنا پر یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن اس ماحول کے اثر سے آپ کے ذہن و دماغ میں ڈھلا ہے جس میں آپؐ کی نشو و نما ہوئی تھی۔ اور جس میں آپؐ نے زندگی بسر کی تھی، یا پھر وہ باطنی عقل کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ اس پروپگنڈہ کا مقصد مسلمان کا قرآن سے رشتہ کاٹنا ہے کیونکہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ محمد کا کلام ہے۔ تو لامحالہ یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ وہ انسانی فکر و عمل کا نتیجہ ہے۔ اس کے بعد اس کی ساری عظمت اور معنوی بلندی خاک میں مل جائے گی۔ اور مسلمان متفرق اور پراگندہ ہو جائیں گے حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں نظم و نسق اور گوناگوں پہلوؤں سے نہایت واضح اور بین فرق ہے۔ علاوہ ازیں محمدؐ امی تھے۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ تنہا یہی ایک ایسی دلیل ہے جس سے ان لوگوں کی مکمل تردید ہو جاتی ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ آپ کو گذشتہ کتابوں سے واقفیت تھی، جب آپ کو اپنی قوم کے سوا کسی اور قوم کے واقعات و حالات کا علم ہی نہ تھا تو آخر کس ذات نے آپ کو اگلے لوگوں کے واقعات اور قصوں سے مطلع کیا تھا؟

(د) رسول اللہؐ کی اعصابی کیفیتیں: اسپرنگر کہتا ہے کہ آپ کو اعصابی عوارض لاحق ہو گئے تھے، اور یہ انھیں اپنی ماں حضرت آمنہ سے وراثۃً ملے تھے، کیونکہ زمانہ حمل میں وہ ایسے خواب دیکھتی تھیں جو از قسم خرافات تھے۔ گرنبل اس کی تردید کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اسپرنگر کی طرح ہمیں خوابوں کا سہارا نہیں لینا چاہئے، شیخ محمد عزہ لکھتے ہیں ہم کو خوشی ہے کہ خود مستشرقین ہی نے اسپرنگر کے اس خیال کی تردید کر دی ہے کہ آنحضرتؐ کو اعصابی کیفیتیں اور حالتیں پیش آتی تھیں جو انھیں اپنی ماں سے وراثۃً ملی تھیں لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں کہ حضرت آمنہ کے خواب از قسم خرافات تھے، کیونکہ ان کا خواب دیکھنا محال اور ناممکن نہیں اسی طرح خواب دیکھنے والے

کے لیے اعصابی بیماریوں میں مبتلا ہونا ضروری نہیں ہے۔

مستشرقین اور مسلمانوں میں سے متعدد محققین نے نفسیات اور علم تاریخ کی روشنی میں اس
الزام کی تردید کی ہے۔ انھوں نے انسانی نفسیات کے مطالعہ اور آدمی کی صحت و مرض کا تجزیہ کر کے بتایا ہے کہ
اعصابی بیماریوں میں مبتلا اشخاص سے عظمت و برتری کے کمالات، قابل رشک و فخر کارنامے اور
غیر معمولی ذہنی نتائج کا ظہور ناممکن ہے، نیز وحی کے حالات و کیفیات اعصابی امراض
(مرگی اور بیہوشی وغیرہ) کی حالتوں اور کیفیتوں سے بالکل مختلف ہیں، ڈاکٹر ہیکل لکھتے ہیں۔
مستشرقین کی تحقیقات نے ان کی رہنمائی اس امر کی جانب کی ہے کہ آنحضرت ؐ کو مرگی کی بیماری تھی،
اس لئے آپؐ پر جنونی کیفیتیں طاری ہو جاتی تھیں، اس حالت میں آپ پوشیدہ ہو جاتے، بدن سے
پسینہ بہنے لگتا، جسم میں تشنج آجاتا، اعضاء و جوارح سکڑ جاتے اور منہ سے جھاگ گرنے لگتا،
جب افاقہ ہوتا تو آپ مسلمانوں کے سامنے تلاوت کرتے اور کہتے کہ یہ اللہ کی جانب سے مجھ پر
وحی ہوئی ہے، حالانکہ یہ سب باتیں مرگی کے دورے کا نتیجہ ہوتی تھیں۔ مگر محمدؐ پر وحی کے وقت
جو کیفیت طاری ہوتی اور آپ پر جو کچھ فیضان ہوتا اس کی یہ تعبیر و توجیہ علمی حیثیت سے نہایت
غلط ہے، کیونکہ جس پر مرگی کا دورہ ہوتا ہے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اسے اس اثنا میں پیش
آنے والی باتیں یاد رہ جائیں بلکہ افاقہ کے بعد وہ ان سب باتوں کو بھول چکا ہوتا ہے، اور
اسے بالکل ہی یاد نہیں ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آیا تھا، کیونکہ فکر و شعور کی حرکت اس
حالت میں یکسر معطل ہو جاتی ہے، لیکن وحی کے وقت پیغمبر کا یہ حال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے
ہوش و حواس بجا رہتے ہیں، ادراک کی قوت بیدار رہتی ہے اور جو کچھ اسے ملتا ہے۔ وہ
اسے پوری توجہ سے سنتا اور محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اسے اپنے ساتھیوں کے سامنے بیان کرتا ہے۔
نزولِ وحی کے وقت روحانی ادراک گو مکمل طور پر بیدار رہتا ہے، تاہم جسم کی

اصل کیفیت کا اس وقت زائل ہو جانا بھی ضروری نہیں ہے، بلکہ اکثر نزولِ وحی کے وقت آپ عادی طریقہ پر بالکل بیداری کی حالت میں ہوتے تھے۔ سورہ فتح کے نازل ہونے کے وقت آپ کی یہی کیفیت تھی، یہ سورہ واقعہ حدیبیہ کے بعد مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ واپسی کے موقع پر نازل ہوئی تھی۔

اس سے ظاہر ہوا کہ اعصابی بیماریاں انسان کے ہوش و حواس کو معطل کر کے ایسی حالت میں کر دیتی ہیں جس میں شعور، احساس اور ادراک مفقود ہو جاتا ہے لیکن وحی میں یہ صورت پیش نہیں آتی بلکہ دراصل یہ روحانی ارتقا کا نام ہے جو انبیاء ہی کو اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ اعلیٰ اور یقینی حقائق کو نبیوں پر القا فرماتا ہے تاکہ وہ انھیں لوگوں تک بھی پہنچا دیں۔

اعتدال پسند مستشرقین کی تصنیفات میں بھی اس شبہ کا ازالہ کیا گیا ہے، مثلاً محمد رسولؐ (آینا دینہ) حیات محمد (ڈرمنگھم)، حیات محمد (آرونگ)، تہذیب و تمدن کی کہانی (ول ڈیورانٹ) مشرقی تحقیقات (ڈاگوبہ) وغیرہ

سنوک ہرگرنگ کہتا ہے کہ محمدؐ کا وزن تسلیم کرنا چاہئے۔ وہ تاریخ عالم کے ممتاز ترین فرد تھے۔ دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی اس پر طویل بحثیں موجود ہیں اور انھوں نے وحی کی کیفیت بیان کرنے میں صحیح حدیثوں اور معتبر کتب سیرت کو ماخذ بنایا ہے۔

معجزاتِ نبویؐ کا انکار وحی کا خارقِ عادت ہونا بالکل واضح ہے، اور جب اس کی مختلف شکلیں احادیث سے ثابت ہیں تو دوسرے خوارق و معجزات بھی اگر صحیح حدیثوں سے ثابت ہوں تو انھیں تسلیم کرنے میں کون سا امر مانع ہو سکتا ہے، مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد یہ تصور اپنے دل سے نکال دینا چاہئے کہ آپ کی زندگی کا صرف ایک ہی معجزہ قرآن ہے، اور اگر کسی کا آپ پر ایمان ہی نہ ہو تو بھلا وہ آپ کے کسی معجزہ کو کیا تسلیم کرے گا۔

خواہ یہ معجزہ قرآنی ہی کیوں نہ ہو

معجزات کی من مانی تاویل اور ان کی اپنی خواہشات کے مطابق توجیہ بڑی ناروا جسارت ہے نہ یہ بحث و تحقیق کا صحیح انداز ہے، اور نہ کسی معقولیت پسند شخص سے اس کی توقع کی جا سکتی ہے۔ معجزات کو مقتضائے عادت کے خلاف ہونے ہی کی بنا پر خوارق کہا جاتا ہے۔ اور جو چیزیں عادی اور مانوس طریقے کے مطابق ہوں۔ انہی کے امکان و عدم امکان کی بحث علم قیاس کے دائرہ میں آتی ہے، لیکن علم و دانش کا کبھی بھی یہ فیصلہ نہیں رہا ہے کہ مالوف اور عادی چیزیں ہی صرف ممکن الوقوع ہوتی ہیں، اور نامانوس اور غیر عادی چیزوں کا وقوع غیر ممکن اور محال ہے۔ اگر تم معجزات و خوارق کے متعلق علم، قانون اور ضابطہ کا فیصلہ معلوم کرنا چاہو گے تو ان کی زبان حال سے جس کو ہر صاحب علم و نظر سمجھتا ہے، یہی جواب ملے گا کہ معجزات و خوارق کا تعلق نبی و عقلی موضوعات سے نہیں ہے، اس لئے وہ ان کے بارہ میں کوئی متعین حکم نہیں لگا سکتے بلکہ خارق عادات چیزوں کے ظہور کے بعد ہی وہ بحث و تجزیہ کا موضوع بن سکتے ہیں۔

براق، اسراء اور معراج | کارا دافو (Carra de Vaux) کہتے ہیں براق کا لفظ جو برق کے لفظ سے متصل اور رجزم ہوا ہے، افسانوں اور قصوں میں ایک عجیب شکل و صورت کے اس انوکھے اور بے بنیاد جانور کے لئے آیا ہے، جس پر رسول اللہؐ معراج کی شب میں سوار ہوئے تھے۔

احمد محمود شاکر اس شبہ کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اسراء و معراج کی حدیث میں اس کی صراحت ہے کہ آنحضرت صلعم کو رات میں لیجانے کے لئے ایک چوپایہ لایا گیا تھا، جو خچر سے چھوٹا اور گدھے سے بڑا تھا اور اس کا رنگ سفید اور رفتار بہت تیز تھی، محدثین اور علمائے فن کے نزدیک ان حدیثوں کی صحت میں کوئی کلام نہیں بلکہ یہ متواتر اور

...ان کو مفسرین کے اقوال قرار دینا غلط ہے، مقالہ نگار کو تعبیر و بیان کا یہ طریقہ اپنے نامناسب الفاظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا، مسلمانوں کے علماء کے نزدیک جو چیزیں تواتر سے ثابت ہوں ان کا صحیح اور یقینی ہونا شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے، ان کی حیثیت اساطیر اور افسانوں جیسی نہیں ہوتی، درحقیقت براق کا تعلق ان غیبی امور سے ہے، جن کی آنحضرتؐ نے خبر دی ہے، اور جو ماورائے مادہ ہونے کی وجہ سے آدمی کے احساس اور گرفت میں نہیں آسکتے ہیں، اس زمانہ میں فلکیات سے متعلق جو علمی انکشافات ہوئے ہیں ان کی حقیقت اس سے پہلے غیر معلوم تھی،

مقالہ نگار نے اسراء و معراج کو آنحضرتؐ کا خواب کہا ہے، لیکن صحیح و صریح متواتر حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالمِ خواب کا واقعہ نہ تھا، بلکہ روح و جسم کی بیداری کی حالت میں پیش آیا تھا، اس کی اسی خصوصیت و اعجاز کے قریش منکر تھے، انھوں نے اس مسئلہ میں بعض مسلمان اہل قلم کا حوالہ بھی دیا ہے، جن کا یہ خیال ہے کہ معراج روحانی تھی،[۱] ان لوگوں کو حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے وہم ہوا ہے کہ "معراج کی شب آپؐ کا جسم مبارک اپنی جگہ پر موجود تھا" مگر یہ بے اصل جھوٹی اور گڑھی ہوئی روایت ہے، اس کی سندیں درست نہیں ہیں، حضرت عائشہؓ کی رخصتی مدینہ میں ہوئی جب کہ اسرا کا واقعہ ہجرت سے پہلے مکہ میں پیش آیا تھا۔

---

[۱] اس میں شبہ نہیں کہ جمہور کا وہی نقطۂ نظر ہے جس کی فاضل مصنف نے ترجمانی کی ہے مگر محققین اہل علم کی ایک جماعت کی رائے وہی ہے جو حضرت عائشہؓ کے علاوہ بعض دیگر صحابہؓ سے بھی منقول ہے، سیرۃ النبی جلد سوم میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے، آخر میں مصنف سیرت بھی جمہور کے مسلک ہی کو صحیح سمجھنے لگے تھے مگر دوسرے قول کو بے اصل قرار دینا بھی درست نہیں ہے، علاوہ ازیں معراج جسمانی ہوئی ہو یا روحانی دونوں صورتوں میں اس کا معجزہ اور خارق عادات ہونا ظاہر ہے۔ (مترجم)

مستشرقین کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار و عدم تصدیق کی یہ ایک مثال تھی، یہ عجیب بات ہے کہ وہ حضرت موسیٰ اور دوسرے نبیوں کے خوارق و معجزات کو تو تسلیم کرتے ہیں مگر آنحضرتؐ کے اسی قسم کے معجزات کو مستبعد قرار دیتے ہیں اور انھیں افسانہ اور خرافات شمار کرتے ہیں۔ اعتدال پسند مستشرقین ڈرینہ، بوڈلی اور کارلائل وغیرہ کا حال یہ ہے کہ وہ آپؐ کے دوسرے معجزات کو نظر انداز کر کے صرف معجزۂ قرآنی سے آپؐ کی نبوت پر استدلال کرتے ہیں، کیونکہ یہی آپ کا دائمی فکری معجزہ ہے، اسے تعریف و توصیف کے پیرایہ میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ محمدؐ نے اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کی ملائکہ سے بات چیت ہوئی یا عجائب و غرائب کا ان سے صدور ہوا، اور طبعی قوانین کے خلاف خرق عادت چیزیں ظاہر ہوئیں بلکہ یہ فرمایا کہ میں تم ہی لوگوں جیسا ایک آدمی ہوں" ان لوگوں کا مقصد جو بھی ہو مگر اس سے غرض پسند مستشرقین کے لیے انکار نبوت کا مواد فراہم ہوتا ہے، اور معتدل مستشرقین کو بھی آپؐ کی اہمیت کو کم کرنے اور آپؐ کی ذات کو نکتہ چینی کا نشانہ بنانے کا موقع ملتا ہے۔

چونکہ رسول اللہؐ کے معجزات انشقاقِ قمر (چاند کا ٹکڑے ہونا) حنین جذع (درخت کے تنہ سے آواز نکلنا) تکثیر الطعام (تھوڑے کھانے کا زیادہ ہوجانا) نبع الماء (انگشت مبارک سے پانی کے چشمہ کا جاری ہونا) وغیرہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہیں بلکہ ان میں سے بعض معجزات کے طرقِ اسناد حد تواتر کو پہنچے ہوئے ہیں، اس لیے مستشرقین کے انھیں نظر انداز کرنے اور ذکر نہ کرنے سے نہ تو کسی مسلمان کا ایمان ہی ڈگمگا سکتا ہے اور نہ انسانی عقل ان کے وقوع کو محال خیال کرسکتی ہے، موجودہ تاریخی حقائق نے بھی آپؐ کے بعض معجزات کے ثبوت مہیا کردیئے ہیں، چنانچہ سائنس کے جدید انکشافات کے بعد چاند کے ٹکڑے ہوجانے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ ایما ڈرینہ لکھتے ہیں کہ تمام مذاہب کے علمبرداروں میں صرف پیغمبر اسلامؐ ہی وہ

وہ شخص ہیں جن کی رسالت کا ثبوت معجزات کا محتاج نہیں ہے، آپ کی نبوت کی سب
بڑی دلیل خود قرآن مجید کی بلاغت ہے، قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات میں اس کی جانب
یوں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَمَا مَنَعَنَا أَنْ نُرْسِلَ بِالْآيَاتِ	اور ہم نے نشانیاں بھیجنی اس لئے
إِلَّا أَنْ كَذَّبَ بِهَا الْأَوَّلُونَ	موقوف کر دیں کہ اگلے لوگوں نے
(اسراء - ۵۹)	ان کی تکذیب کی تھی۔

ڈینہ کا مقصد رینان کی تردید ہے، جو حضرت عیسیٰؑ کی مدح و منقبت کے ثبوت میں
ان کے معجزات کو پیش کر کے کہتا ہے، کہ اس طرح کے معجزات دوسرے انبیاؑ سے ظہور میں
نہیں آئے، وہ معجزات کو اس لئے محال قرار دیتا ہے کہ وہ تاریخ وعلم النفس کے اصول
وقواعد کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کی اس رائے سے عقلی مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے
بعض مسلمان محققین بھی متاثر نظر آتے ہیں، عقاد کا بیان ہے کہ مخالفین کو دعوت دینے
میں نبی کے لئے خوارق مفید نہیں ہوتے کیونکہ وہ لوگ تو معجزہ کو سحر و شعبدہ یا مدہوشی
اور دیوانگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اور اس کے ذریعہ سے انبیاء
کے لئے چاہے آسمان کا دروازہ ہی کیوں نہ کھل جائے۔ رسالت و نبوت کی اس سے بڑھکر
اور کیا کرامت ہوگی کہ قرآن میں اس کی تاکید پر تاکید کی گئی ہے کہ آسمانی رسالت
لوگوں کی عقل وضمیر کی رہنمائی کے لئے ہر قسم کے نقص وعیب سے پاک بنائی گئی ہے،
مگر نبوت پر ہر قسم کے اعتراضات واوہام کے باوجود اس کی صحت کو خوارق یا اخبار
غیب سے مشروط نہیں کیا گیا ہے، فرمایا:

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ	اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار

عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ (یونس: ۲۰)

کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی؟ کہہ دو کہ غیب کا علم اللہ ہی کو ہے، سو تم انتظار کرو! میں بھی تمہارے

وہ اس مفہوم کی مزید آیتیں نقل کرکے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ علم غیب سے صرف اللہ ہی کو واقفیت ہوتی ہے۔ مگر اس مسئلہ کا معجزات سے کوئی تعلق نہیں، قدیم علمائے اسلام اور دورِ جدید کے فضلاء نے معجزہ کی حقیقت اور تمام انبیاء کے لیے اس کے ثبوت و امکان کے مسئلہ کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے، پس اسلام کی رو سے معجزہ کا ثبوت درست ہے، معجزہ ایسے خارق عادت امر کا نام ہے، جو انبیائے مرسلین سے ان کی نبوت کی صحت و صداقت ظاہر کرنے کے لیے صادر ہوتا ہے پس معجزات کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو مادی علوم کے منافی ہو مگر انسان عقل و ادراک کے ناقص و محدود ہونے کی بنا پر ان اسباب و مقاصد سے واقف نہیں ہوتا جن کے لیے یہ رونما ہوتے ہیں، مسلمانوں کا ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ہی اسباب و علل اور اصول و قوانین کا صانع ہے۔ اس لیے وہ ان کو تبدیل کر دینے اور انبیاءؑ کے ذریعہ مقتضائے عادت کے خلاف چیزیں ظاہر کر دینے پر بھی قادر ہے، ....

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اہم اور عظیم الشان معجزہ قرآن مجید ہے، یہ ابد تک قائم و باقی رہے گا اور اس اعتبار سے وہ دوسرے انبیاءؑ کے معجزات سے ممتاز ہے، اور اس کے ماضی و حال اور مستقبل کے حقائق سے دائمی مطابق ہونے کی مثال دی جاتی رہے گی۔

شارع کی حیثیت سے نبیؐ پر اعتراضات: مستشرقین نے ان شرعی احکام و قوانین پر بھی اعتراضات کئے ہیں۔ جن کی نبی اکرمؐ نے دعوت دی ہے، جیسے اسلامی عبادات، معاملات، جہاد اور شریعت کے حکم و اسرار وغیرہ اختصار کی وجہ سے چند ہی مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ ج۔ ڈ نگھم اپنی کتاب حیات محمدؐ میں لکھتا ہے۔ قریش عہدِ جاہلیت میں حج کے جو مراسم

ومناسک اختیار کیے ہوئے تھے، آنحضرتؐ نے اہل مدینہ کی امید و توقع کے برخلاف ان چیزوں کو
وہاں باقی رکھا کیونکہ آپؐ کا مقصد یہ تھا کہ اس کی وجہ سے قریش اسلام کی جانب راغب ہو جائیں گے
اور بہ تدریج ان چیزوں کو قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے جو روحانی بلندی کی موجب اور
کتاب مقدس کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہیں۔

اس شبہ کی تہ میں متعدد اور شبہات بھی پنہاں ہیں، چونکہ فاضل مستشرق نے حج کے
اعمال ومناسک کو آپؐ کی جانب منسوب کیا ہے۔ اس لیے ہمیں اس پر رد و کد کی ضرورت
پیش آئی، اس کا تحلیل و تجزیہ کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں،

(الف) ڈرمنگھم یہ لکھکر قارئین کو باور کرانا چاہتا ہے کہ حج کے اعمال ومناسک خود نبیؐ
کے وضع کیے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ میں آپؐ نے قریش کو اسلام سے قریب کرنے کے لیے انکی
خاطرداری و دلجوئی کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ مگر فاضل مستشرقین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے احکام
ومسائل سرے سے کسی نبی یا رسول کی خواہش پر مبنی نہیں ہوتے، ان کی اصل نوعیت تو یہ ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (نجم - ۴)   یہ تو وحی (حکم خداوندی) ہے جو ان کی
طرف بھیجی جاتی ہے۔

جس نبی کی صداقت، امانت اور پیغام حق کو بے کم و کاست پہنچانے کی مسلمہ شہادتیں
موجود ہیں تو بھلا اس قدر پست سطح پر کیسے اتر سکتا ہے کہ سیاسی قیادت کی ہوس کرے اور حق کے اصول
ومبادی سے دستبردار ہو جانے اور ان کے بارہ میں بھاؤ تاؤ کرنے کا خیال بھی اپنے دل میں لائے
چاہے یہ ڈرمنگھم ہوں یا کوئی اور مستشرق جب یہ لوگ یہ اور اسی طرح کے دوسرے دعوے
کرتے ہیں تو ان کی دلیلیں کیوں نہیں پیش کرتے، اس کے بغیر کون ان کی باتوں سے مطمئن
ہو سکتا ہے۔

(ب) ان کا مقصد یہ ثابت کرنا بھی ہے کہ حج کے اعمال و مناسک ملتِ ابراہیمی کی یادگار نہیں ہیں، بلکہ ان میں قریش کے حج کی نقل و متابعت کی گئی ہے، لیکن یہ دعویٰ بھی بے دلیل ہے، اور شریعت محمدی سے اس کے برعکس ثبوت ملتا ہے، صحیح مسلم، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دارمی وغیرہ میں ایک حدیث منقول ہے، جس کے متن کا خلاصہ امام مسلم کی روایت کے مطابق یہ ہے۔

عن جعفر بن محمد عن ابيه	جعفر بن محمد (امام جعفر صادق) اپنے والد
قال دخلنا على جابر بن	محمد بن علی (امام باقر) سے روایت کرتے
عبد الله فسأل عن القوم	ہیں کہ ہم چند لوگ جابر بن عبد اللہ کے پاس گئے،
حتى انتهى الي فقلت انا	انھوں نے دریافت کیا کہ آپ لوگ
محمد بن علي بن حسين فاهوى	کون ہیں (سب نے اپنا تعارف کرایا)
بيده الى راسي	یہاں تک کہ جب میری باری آئی تو
فقلت اخبرني عن حجة	میں نے کہا کہ میں محمد بن علی بن حسین ہوں،
رسول الله صلى الله عليه وسلم	چنانچہ انھوں نے اپنا دستِ شفقت
فقال بيده فعقد تسعا	میرے سر پر رکھا.... میں نے عرض کیا کہ
.... فلما كان يوم التروية	مجھے رسول اللہؐ کے حجۃ الوداع کے بارہ میں
توجهوا الى منى فاهلوا بالحج	بتائیے! انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں سے
وركب رسول الله صلى الله	نو کی گنتی کا اشارہ کرتے ہوئے ارشاد
عليه وسلم فصلى بها الظهر	فرمایا..... جب یوم الترویہ (۸
والعصر والمغرب والعشاء	ذی الحجہ) ہوا تو سب لوگ منیٰ کے لیے

بالفجر ثم مکث قلیلا حتی
طلعت الشمس وامر بقبۃ
من شعر تضرب لہ بنمرۃ
فسار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ولا تشک قریش الا انہ
واقف عند المشعر الحرام
کما کانت قریش تصنع فی
الجاھلیۃ فاجاز رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم حتی اتی
عرفۃ فوجد القبۃ قد
ضربت لہ بنمرۃ فنزل بھا
حتی اذا زاغت الشمس
امر بالقصواء فرحلت لہ
فاتی بطن الوادی فخطب
الناس ۔۔۔۔
(صحیح مسلم بشرح النووی
ج ۸ ۔ ص ۱۸۱)

پڑاؤ ہونے تک آپ مزدلفہ میں رکے رہے اور فجر پڑھ کر کچھ دیر ٹھہرے، اور رسول اللہ اونٹنی پر سوار ہو کر منیٰ
چلے اور وہاں آپ نے ظہر، عصر، مغرب
عشاء اور فجر کی نماز ادا کی۔ پھر بعد تھوڑی
دیر آپ اور ٹھہرے یہاں تک کہ جب
سورج نکل آیا تو آپ عرفات کو روانہ
ہوئے، آپ نے حکم دیا تھا کہ صوف کا بنا ہوا
خیمہ آپ کیلئے نمرہ میں نصب کیا جائے،
قریش کو اس میں شک نہ تھا کہ آپ
مشعر حرام کے پاس قیام کریں گے کیونکہ
وہ زمانہ جاہلیت میں ایسا ہی کرتے تھے
مگر آپ (ان کے علی الرغم) مشعر حرام سے
آگے بڑھ کر عرفہ پہنچ گئے اور نمرہ میں جو
خیمہ آپ کی ہدایت کے مطابق نصب
کیا گیا تھا آپ اسی میں اتر گئے۔ یہاں تک کہ
جب آفتاب ڈھل گیا تو آپ نے اپنی
اونٹنی قصوا پر کجاوا کسنے کا حکم دیا، جب کجاوا کسنے کے بعد وہ لائی گئی تو آپ اس پر سوار ہو کر وادی کے درمیان آئے اور لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی حج کا نظام رہا، جو باتیں داخل کر لی گئی تھیں
جن کا ملت ابراہیمی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس حدیث میں ان کو باطل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ

قریش عہد جاہلیت میں بیت اللہ کے مجاور و متولی ہونے کی بنا پر حدود حرم سے باہر نہیں نکلتے تھے بلکہ اس کے حدود کے اندر مزدلفہ کے علاقہ میں مشعر حرام کی پہاڑی قزح کے پاس ہی وقوف کرتے تھے اور یہ اپنا خاص امتیاز سمجھتے تھے۔ ان کو یقین کامل تھا کہ رسول اللہ بھی ان کے اسی خاندانی دستور کے مطابق مشعر حرام ہی کے پاس وقوف کریں گے اور وہاں سے آگے نہیں بڑھیں گے۔ لیکن چونکہ ان کا یہ طریقہ غلط اور ملت ابراہیمی کے خلاف تھا۔ اس لئے آپ نے آگے بڑھ کر عرفہ اور وادی نمرہ میں حدود حرم سے باہر قیام کیا جس کی ہدایت آپ کو اس آیت میں دی گئی تھی۔

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ (بقرہ- ۱۹۹) — پھر تم لوگ (قریش) بھی وہیں سے چلو جہاں سے لوگ چلیں۔

یعنی جس طرح تمام لوگ حدود حرم سے باہر عرفہ تک جاتے ہیں وہیں آپؐ اور آپ کے اہل خاندان بھی قیام کریں اس میں قریش کو کوئی امتیاز اور خصوصیت حاصل نہیں ہے۔

۲۔ حج کے سلسلہ میں مستشرقین کا دوسرا اہم اعتراض یہ ہے کہ اس میں بت پرستی کا شائبہ اور سامی قبائل کی رسموں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

(الف) مستشرقین اپنے پہلے دعویٰ کے ثبوت میں رمی جمرات (کنکریاں مارنے) کو پیش کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ یہ رسم بت پرستی سے ماخوذ اور اسی کی یادگار ہے، اسی لئے قرآن مجید میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے، صرف سیرت کی کتابوں اور حدیثوں ہی میں اس کا ذکر ملتا ہے، اسلام سے قبل جمرات کے پاس خون سے رنگے ہوئے چند پتھر رکھے رہتے تھے، اور یہیں قربانی کی جاتی تھی۔

احمد محمد شاکر مرحوم اس کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں۔ رمی جمرات بت پرستی کی علامت اور یادگار نہیں ہے، بلکہ حج کے شعائر اور دین ابراہیمی کی قدیم یادگاروں میں ہے۔

تو جب ملت ابراہیمی کی بعض چیزیں بھی وراثۃً چلی آرہی تھیں مگر اکثر چیزوں میں انھوں نے تحریف وتغیر کر ڈالا تھا، اسلام نے حج کے تمام شعائر کو خدائے واحد کی خالص عبادت کے لیے مخصوص کر دیا۔ وہ توحید اور خدا پرستی کا دین ہے، رسول اللہؐ کی تمام توجہ اس بات پر مرکوز رہتی تھی کہ مسلمانوں کے اعمال، اقوال، عقائد اور عبادات میں شرک کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے پائے۔

(ب) احرام | دوسرے دعوی کے سلسلہ میں مستشرقین کا خیال ہے کہ احرام کے لیے غسل کرنا اور خضاب اور خوشبو لگانا بھی ایسی رسم و یادگار ہے جس کا سلسلہ ان عبادتوں اور دعاؤں سے جا ملتا ہے جو قدیم زمانہ میں شیاطین کو بھگانے اور دور کرنے کے لئے کی جاتی تھیں، اسی طرح احرام کا کپڑا قدیم سامی لوگوں کے یہاں بھی بہت مقدس سمجھا جاتا تھا، کاہنوں اور زاہدوں کی چادریں بھی اسی وجہ سے سفید ہوتی تھیں، نیز بعض دینی رسمیں انجام دینے کے وقت جسم کی جانب توجہ نہ کرنا سامی قبائل کی معروف عادت تھی۔

اس سلسلہ میں بھی وہی جواب مناسب ہے، جو اوپر گذر چکا ہے، مزید وضاحت کے لئے یہ بتانا کافی ہوگا کہ اسلام خدا کی شریعت اور قانون کا نام ہے یہ اپنے تشخص، امتیاز اور جداگانہ خصوصیات کی بنا پر دوسرے تمام شرائع و قوانین سے بالکل مختلف و ممتاز ہے، اس پر کسی اور مذہب و شریعت کی کوئی چھاپ نہیں ہے، اگر کوئی اسلامی عبادت کسی قدیم عمل کے مشابہ ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کا تعلق بھی آسمانی و الہامی شریعت سے ہوگا، اسلام کسی الٰہی قانون اور اسلامی عبادت کو برقرار رکھنے میں مزاحمت نہیں کرتا کیونکہ اس طرح کی عبادت فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہوتی ہے۔ غسل، خضاب اور سفید کپڑا پہننا وغیرہ بھی عین فطرت کے مطابق ہیں، اسلام کسی چیز کو اس وقت تک ناگوار اور معیوب نہیں قرار دیتا جب تک کہ وہ

توحید خالص کے تصور کے منافی نہ ہو، غرض حج کے اعمال و مناسک کو بت پرستی کی علامت قرار دینا یا سامی قبائل کی یادگار بنانا مستشرقین کا ایسا فرضی دعویٰ ہے، جس کی تائید کسی قابل اعتماد تاریخی دلیل سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس حج کے تمام اعمال کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی عبادتوں سے جڑا ہوا ہے، سامی قبائل کی جسم کی جانب سے اہمال و غفلت کی مشہور رسم کو اسلام نے نہ حج کے اندر باقی رکھا ہے، اور نہ حج کے باہر، رہے وضو غسل اور طہارت تو یہ مسلمانوں کی تمام عبادتوں کا خاص جز ہیں۔

ج، جہاد: مستشرقین کے نزدیک جہاد قتل و خون ریزی اور دوسری قوموں کو زبردستی مغلوب کرنے کا نام ہے وہ اس کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں اس کی سونتی ہوئی تلوار ہی کا حصہ ہے۔ اسلام نے عام مذاہب کے برخلاف دنیا کو اس قدر حیرت انگیز سرعت سے جو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا تو اس کا راز بھی اس کے تشدد و طاقت ہی میں پنہاں ہے اس طرح اسلام اور دوسروں کو موت کے گھاٹ اتار دینے میں وہی تعلق ہے جو ایک جڑ سے نکلنے والے دو درختوں میں ہوتا ہے کہ وہ کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے اسی لئے تخریب، ہلاکت، وحشت، بربریت، خون ریزی اور سفاکی ہی اسلام کے برگ و بار ہیں اور جبر، استبداد اور لوگوں کو زبردستی حلقۂ اسلام میں داخل کرنا اس کا شیوہ ہے۔

جہاد کے خلاف مستشرقین کی ان چند ہی ہرزہ سرائیوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ دعوت الی اللہ، بہترین حکمت و موعظت کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت، اسلامی حقائق پر لوگوں کا انشراح، متعدد قبائل کا رضا اور رغبت سے اسلام قبول کرنا اسلام کا عقیدہ و فکر کی آزادی کا اعلان، کلمہ پیش کر کے اسلام کی تلقین وغیرہ کے واقعات نہ کبھی پیش آئے اور نہ اسلام نے اپنی دعوت و تبلیغ کا کبھی یہ انداز ہی اختیار کیا۔

میکڈونالڈ لکھتا ہے: "تلوار کے ذریعہ اسلام کی نشر و اشاعت سارے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے

جہاد کے مفہوم کی اس تحریف کے بعد انہوں نے جو نتیجے اخذ کئے ہیں وہ سب بھی نہایت بے بنیاد اور موجب غلط ہیں، مثلاً پڑوسی قوموں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے جو خطوط لکھے یا ان کے پاس جو وفود اور سفرا بھیجے، اس کا مقصد فاضل مستشرق کے نزدیک کشور کشائی اور ان قوموں کو سرنگوں اور مغلوب کرنا تھا، حالانکہ اگر کوئی انصاف پسند قرآن و اسلام کے مقصد و روح کو واقعی سمجھے اور رسول اللہ ﷺ کی سنت و سیرت مبارکہ کا مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اسلامی جہاد ایک ایسا دقیق قانون ہے جو نہ تو جلدی اور روا روی میں تیار ہوا ہے، اور نہ عدم غور و فکر کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے، بلکہ یہ خدا کی طرف سے وحی کردہ ہے۔ اور اس کا منشا یہ ہے کہ اسلام ساری انسانیت کا دین بن جائے۔ اور اسے تمام مذہبوں پر برتری و بالادستی حاصل ہو جائے۔ یہ خدا کا وعدہ ہے، جو پورا ہوگا۔

وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَأَهُ بَعْدَ حِينٍ (ص ۸۸) اور تم کو اس کا حال ایک وقت کے بعد معلوم ہو جائے گا۔

مستشرقین اور عیسائی مبلغین نے اسلامی جہاد کی جو تعبیر کی ہے اس سے اسلامی فتوحات اور جہاد کے اصل اسلامی اغراض و مقاصد کا حلیہ ہی بگڑ گیا ہے، کرین کا بیان ہے کہ فریضۂ جہاد کی بنا پر کسی شخص کو بھی اسلام قبول کرنے کے لیے مجبور کیا جا سکتا ہے، حالانکہ یہ نہ اسلام کا اصول ہے اور نہ علمائے اسلام نے اس کی کہیں صراحت کی ہے۔ مسلمانوں کے یہاں محض جنگ و قتال ہی جہاد کی صورت نہیں ہے، بلکہ کلمہ کی تلقین و دعوت اور علم کی طلب و اشاعت کا نام بھی جہاد ہے۔ اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ بھی جہاد ہے، نیز نفس اور اس کی خواہشات سے بھی جہاد کیا جاتا ہے، یہ سب صورتیں بھی جہاد کے مفہوم میں داخل ہیں اور بہت مشہور ہیں۔

۳ - اسلام صرف دعوت و تبلیغ کی دعوت نہیں: ان کا تو یہ اعتراض تھا کہ اسلام قتل و خون ریزی کا مذہب ہے۔

ان میں سے بالکل برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ جہاد کا حکم تو صرف نبیؐ کی زندگی ہی تک کے لئے تھا، اور اب
کا کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا، ان لوگوں کی نظر میں اسلام صرف پند، موعظت، رہبانیت اور درویشی
ام ہے، اور بعض مستشرقین کے نزدیک جہاد کی حیثیت دفاعی ہے، اسلام قتال کی اسی وقت
زت دیتا ہے جب خود اس کو مٹا دینے کے لئے اس پر حملہ کیا جائے، مستشرقین کے اس پروپگنڈا
ثر ہوا کہ خود مسلمانوں نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کر لیا ہے اور بقول مولانا مودودی یہی اصطلاح
ائی دینا شروع کیا ہے کہ

"حضور! بھلا ہم جنگ و قتال کیا جانیں؛ ہم تو بھکشوؤں اور پادریوں کی طرح پر امن مبلغ لوگ
، چند مذہبی عقائد کی تردید کرنا اور ان کی جگہ کچھ دوسرے عقائد لوگوں سے تسلیم کرا لینا بس یہ ہمارا کام
ہمیں تلوار سے کیا واسطہ؟ البتہ اتنا قصور ضرور ہم سے ضرور ہوا ہے کہ جب کوئی ہمیں مارنے آیا
ہم نے بھی جواب میں ہاتھ اٹھا دیا سو اب ہم تو اس سے بھی توبہ کر چکے ہیں حضور کی طمانیت کے لیے
اردو والے جہاد کو سرکاری طور پر منسوخ کر دیا گیا ہے، اب تو جہاد فقط زبان و قلم کی کوشش کا نام"

اس پروپگنڈہ سے برطانوی استعمار کو ہندوستان پر اپنا تسلط جمائے رکھنے میں بڑی مدد
ی، اس سلسلہ میں ان کو قادیانیوں سے بھی خوب سہارا ملا جو جہاد بالسیف کو موجودہ زمانہ میں
ل قرار دیکر انگریزوں کے معاون اور پشت پناہ بن گئے تھے۔

مقالات شبلی
جلد ششم

سلسلۂ مقالات شبلی کی اس جلد میں مستشرقین یورپ کے رد میں جامع اور بہت سے محققانہ
ضامین ہیں، ایک مصر کے کتب خانۂ اسکندریہ پر بھی ہے، اس میں مولانا نے ثابت کیا ہے کہ یہ کتب خانہ مسلمانوں
بعد فتح کرنے سے بہت پہلے خود عیسائیوں کے ہاتھوں جلکر برباد ہو گیا تھا۔

قیمت۔ عـــہ

اطبائے قدیم اور نظریۂ جراثیم

اثبات و ابطال

از

جناب حکیم صیانت اللہ صاحب امروہہ

دورِ جدید کے کتنے ہی نظریات کو جدید تحقیق کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ وہ ماقبل ہی سے محقق چلے آرہے ہیں، ان نظریات میں سے ایک نظریۂ جراثیم بھی ہے، جو موجودہ طریقۂ علاج کا جزو لاینفک بن چکا ہے، مسئلہ کی اہمیت کے پیشِ نظر دورِ جدید کے یونانی اطباء اور مفکرین و محققین کے لئے بھی یہ لائق توجہ بنا، ان جدید مفکرین نے جب اپنے خزینۃ العلم کا در کھولا تو جا بجا منتشر حالت میں انہیں یہ سرمایۂ تحقیق ملا، اس لئے ان حضرات نے بھی تطبیقاً اس نظریہ پر اپنی مہرِ تحقیق و تصدیق ثبت کر دی لیکن متقدمین کی رہنمایانہ نشاندہی کے باوجود مسئلہ کے ان گوشوں کو درخورِ اعتناء نہ بنایا جو بہر صورت محتاجِ توجہ تھے اسی لئے یہ مسئلہ بعض اعتبار سے آج بھی مسلم الثبوت ہوتے ہوئے دعوتِ تحقیق و نظر دے رہا ہے،

غور طلب امر یہ ہے کہ جب یہ مسئلہ اطبائے قدیم کے لئے بھی حقیقتِ ثابتہ تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے اسے نظری حیثیت سے تو موضوعِ بحث بنایا لیکن عملی حیثیت سے وہ درجہ نہ دیا جو عملیات میں جاری و ساری ہے، اگر ان کی تحقیق بھی عملی حیثیت سے آج کی تحقیق کے مطابق تھی تو اصول و طریقۂ علاج میں یکسانیت کیوں نہیں؟ اس لئے مزید تحقیق کے بجائے موجودہ تطبیق سے کام لینا

کی دقیق تناظروں کو پیش نہیں کرتا۔ یہ حق جب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب کہ ابتدا و ماخذ کے ساتھ انتہا پر بھی غور کیا جائے۔

متقدمین جراثیم سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی کنہ و حقیقت پر بھی نظر رکھتے تھے، انھوں نے بطور کلیہ و جنس تمام جاندار مخلوقات کو حیوانات کہکر چار نسلوں میں تقسیم کیا ہے۔ ذیل کے کلیہ میں جراثیم و وائرس بھی محصور ہیں، مثلاً

ان تولد الحیوانات علی اربعة	حیوانات کی تولید کی چار قسمیں ہیں، رحمی
اصناف ارحامی مثل الناس	جیسے انسان وغیرہ، انڈے کے ذریعہ
وغیرهم بیضی مثل الطیور	سے جیسے پرند و مچھلی، نباتی و زمینی
السمک، نبتی وارضی مثل	جیسے فدا ازج اور زمین کے دیگر کیڑے
الدود ارتج ودیدان الارض	اور ساخی جو جسم کے میل کچیل سے پیدا
او ساخی، یتولد من الوساخ	ہوتے ہیں جیسے جوئیں اور لیکھیں۔
البدن مثل القمل والصیبان	

(فردوس الحکمت ص۵۶)

چونکہ طب کا موضوع جسم انسانی ہے، اس لئے اس موضوع کے تحت ان موادات کے لئے عفونت اخلاط فضلات و مواد وغیرہ میں طبخ و امتزاج سے بھی بحث کی گئی۔ اس طبخ و امتزاج و استحالہ کے نتائج میں ان مولدات کو قوت مصورہ نے طبیعت و مادہ کی مناسبت سے جو صورت عطا کی، بعد نظر اس کی نشاندہی بھی کی، اور یہ بھی رہبری کی کہ جس طرح جسم کے اندر ان فضلات و مواد میں ایک خصوص امتزاج کے بعد جو مولدات نمودار ہوتے ہیں، اسی طرح زمین میں بھی مختلف طبائع و اشکال و صور کے حشرات پیدا ہوتے ہیں، اس مسئلہ کی وضاحت کے لئے پہلے ایک اصول متعین کیا گیا کہ

[illegible]

بل ان له کیفیة وامتزاج — ہوتی ہے اس کے لئے ایک [illegible]

[illegible] کیفیت ہوا کرتی ہے

اس کے بعد تعفین ہوتا ہے تاکہ اس سے تکوین و تولید کا مسئلہ واضح ہو جائے۔

ومتی کان فی ذالک الخلط — جب اس خلط میں امتزاج و نضج ہوتا ہے

امتزاج ونضج یمکن ان یکوّن — تو اس سے حیوان کی تکوین ممکن ہے اور

عنه وکوّنت من الحیوان — یہ حیوانی پیدائش حسب امکان ہوا کرتی ہے

علی حسب ما یمکن لان القوة — کیونکہ قوت مصورہ کسی جوہر کو اس طرح

المصوّرة لا یصنع جوهرا — نہیں چھانٹتی کہ وہ کوئی بھی شکل حیوانی

یمکن ان یتصور منه حیوانا — صورت اختیار کرے، بلکہ اس کو طبیعت

بل یصوره بحسب طبیعته — و مادہ و امتزاج کے مطابق صورت عطا

ثم بحسب المادة وامتزاجه — کرتی ہے اس کی مثال اس طرح ہے کہ

ومثال ذالک ما یتولد فی — جس طرح بدن کے اندر پیدا ہوتے ہیں

البدن مثل ما یتولد فی — اسی طرح زمین میں بھی مختلف صورتوں

الارض من الحشرات المختلفة — اور طبیعتوں کے حشرات پیدا ہو جاتے

فی الصور والطبائع، وانما اختلفت — ہیں اور یہ اختلاف مواد و طبائع کے

بحسب المواد والطبائع۔ — مطابق ہی ہوا کرتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

فیه شبیه بحب المعروفة	وہ ہے جس میں گیہوں کے مشابہ جیسی
بالدودی وهو الذی یکون	پیدا ہو جاتے ہیں، اس کا سبب پیدائش
فیه حیوان شبیهة	فساد وعفونت زدہ خلط ہوتی ہے
بالصبیان - والسبب فی	جس میں کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں جیسا کہ
تولد ذالک الخلط ذی العفونة	کوئی شئے گرم ہو کر سڑ جائے،
وقد تتولد فیه الدود	
کما یتولد فی الشئ اذا سخن	
وعفن،	

(معالجات بقراطیہ مخطوطہ ص ۹)

مذکورہ بالا مسئلہ گرچہ چوں اور حب جوں سے متعلق ایک وضاحت ہے، مگر اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جوں ہو یا کوئی جرثومہ اس کا سبب تولید تو قابلِ عفونت خلط ہوا کرتی ہے، خواہ وہ جسم کے اندر ہو یا اس کے باہر۔

بعض معاصرین کا خیال ہے کہ شیخ کے قول کے مطابق عفونت کے لئے محض حرارت و رطوبت کافی نہیں، نیز جسم کے اندر کوئی بھی خلط متعفن نہیں ہو سکتی جب تک کہ بیرونی اجسام خبیثہ کی اس میں رسائی نہ ہو، حالانکہ شیخ نے اخلاط کے طبعی اور غیر طبعی ہونے کے بیان میں اس کو غیر مبہم و واضح الفاظ میں صاف کر دیا ہے اور خون کے طبعی و غیر طبعی کی وضاحت میں کہا ہے کہ

هو صنفان طبعی وغیر طبعی	دموی خلط کی دو قسمیں ہیں طبعی
والطبعی احمر اللون لا نتن	و غیر طبعی، طبعی سرخ رنگ جس میں
له حلو جدا و غیر طبعی قسمان	بدبو نہ ہو اور بہت شیریں ہو، غیر طبعی

قسمة التغير عن المزاج	کی دو قسمیں ہیں ایک تو یہ کہ اس کا مزاج
لا بشئ خالطه لکن بان ساء	صالح متغیر ہو جائے، نہ یہ کہ اس میں
مزاجه فی نفسه فیه وخلا و سخن	کچھ مل جائے لیکن اس کا مزاج فی
ومنه ما انما قد تغیر بان حصل	نفسہ برا ہو جائے، مثلاً اس میں ٹھنڈک
خلط ردی فیه وذالک قسمان	پیدا ہو جائے یا مثلاً وہ گرم ہو جائے
فانه اما ان یکون ذالک الخلط ورد علیه من	دوسری یہ کہ اس میں اس طرح تغیر ہو
خارج فنفذ فیه وافسده و	کہ اس میں کوئی خلط ردی شامل ہو کر
اما ان یکون الخلط فیه نفسه	نفوذ کر جائے، اور اس میں فساد پیدا
مثلاً بان یکون قد عفن بعضه	کردے، یا یہ کہ فی نفسہ خلط ہی میں کچھ
(کتاب القانون جلد اول ص ۲۵)	تغیر لاحق ہو جائے، مثلاً یہ کہ اس کا بعض
	حصہ عفونت اختیار کرلے،

شیخ کے مذکورہ بالا بیان سے صاف طور سے ظاہر ہے کہ خارجی شے بھی خلط غیر طبعی ردی میں شامل ہو سکتی ہے، جو کیڑا یا زہر مس اور وائرس بھی ہو سکتے ہیں، اور خود فی نفسہ اس خلط میں تغیر لاحق ہو سکتا ہے، لیکن اس داخلی یا خارجی فساد و عفونت کے لئے جسم کا مستعد ہونا بھی ضروری ہے، اگر بدن اس استعداد سے عاری و خالی ہو تو نہ عفونت پیدا ہوگی، اور نہ خارجی تغیرات سے اجسام منفعل ہوں گے جیسا کہ شیخ نے خود حمی وبائیہ میں اس کی وضاحت کی ہے، ابن صاحب کامل الصناعۃ نے اسس کو تفصیلاً بیان کیا ہے، مثلاً،

ان الامراض الوبائیة لیست	امراض وبائیہ تمام لوگوں میں پیدا
تحدث لجمیع الناس لکن لما کان	نہیں ہوا کرتے، مگر جب ہوا کے ذریعہ

متى تغيرت الاشياء عن مزاجها	کہ کسی تغیر و تبدل کی بنا پر اس طرح
فمن شأنها ان تغير	ہو جائے تو اس وقت یہ ضروری ہے
مزاجه مشاكل المزاج	کہ جو شخص اس سے متاثر ہو اس کا
فتشابه الوقت وما كان منها	ہو ا کے مزاج سے بدن میں مشابہت
حادثا عن تغير جوهر الهواء	رکھے، وہ جب یہ تغیر جو ہر ہوا میں
فمن شأنه ان يحدث اكثر	واقع ہو جائے تو یہ ضروری ہے کہ
ذلك بمن كان في بدنه اخلاط	یہ زیادہ تر ان ہی لوگوں میں پیدا ہو
بها دية مشاكلة الجوهر الهوا	جن کے بدن کے اخلاط ردیہ جوہر
الردى لانها في ذلك الوقت	جو ہوا سے ردی کے مشاکل و مشابہ ہوں
مستعد لتقبيل ما يورثه	کیونکہ اس حالت میں اجسام ان
فيها تلك العلل والامراض	امراض و عوارض کے قبول کرنے کی
(کامل الصناعة جلد دوم ص)	استعداد و صلاحیت رکھتے ہیں۔
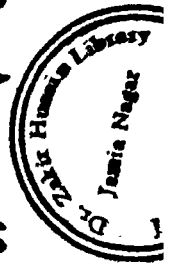
مذکورہ بالا موضوع بحث کے مطابق مذکورہ عبارت سے ایک نکتہ بھی سامنے آیا کہ اس میں محض تغیر مزاج الہوا، اور تغیر مزاج البدن نہیں کہا گیا۔ مشاکل کی تعبیر بھی کی گئی جس سے تو صحیح مطلب یہ نکلا کہ اگر اس ہوائے ردی میں جو جرثیم وغیرہ بھی شامل ہوں اور فساد و عفونت کی موجودگی کی وجہ سے اس کے نوعی اسکانات موجود بھی ہیں تو یہ جسم میں اسی وقت موثر اور مرض کا باعث ہوں گے، جب جسم کے اخلاط ردیہ ان خارجی موثرات کے بالکل ہم شکل ہوں۔ شکل و صورت کی اس یکسانیت نے جسم میں جراثیم یا اجسام خبیثہ کی پیدائش اور اثر اندازی کے بہت و بیشتر پردے سامنے سے ہٹا دیئے۔

لیکن داخلی یا خارجی فساد وعفونت سے استدلال کیا ہے، اس کی وضاحت یوں کی گئی،

وكانت العفونة عبارة	مرطوب جسم میں مقصود غایت
عن احالة الحرارة للجسم	کے خلاف حرارت کا جسم میں تصرف
ذی الرطوبة الی مخالفة الغاية	کرجانا عفونت ہے،
المقصود منه۔	

(شرح قرشی، مخطوطہ ص ۲۰)

عفونت و فساد سے حیوانات کی تولید کس طرح ہوتی ہے، اس کی ایک مثال عرق مدنی کے بیان میں بھی ملتی ہے،

فی عرق المدنی هذا فی الحقيقة	عرق مدنی درحقیقت رگ نہیں بلکہ وہ تو بدن میں پیدا
ليس بعرق وانما هو حيوان	ہونے والا ایک کیڑا ہے، جیسے کیڑوں
يتولد فی البدن كما يتولد باقی	کی دوسری قسمیں ہوتی ہیں، اس کی پیدائش
اصناف الدود وتولده عن	ایک مائی مادہ سے ہوتی ہے جس میں
مادة مائية شديد العفونة	شدید عفونت و فساد موجود ہو، اس
والفساد اصلح احوالها بحسب	مادے کے مزاج کے اعتبار سے اسی حیوان
مزاجها ان تتولد منها ذلك	کا پیدا ہونا مناسب تھا،
الحيوان،	

(شرح قرشی مخطوطہ ص ۲۶۲)

عرق مدنی کو ابن جزلہ بغدادی نے بھی ایک خاص ہیئت کے ساتھ کیڑے کی

طرح تعبیر کیا ہے۔

وعلامته شبه العرق	اس کی علامت رگ کے مشابہ جلد
تحت الجلد یتحرک کالدّودۃ	کے نیچے ایک کیڑے کی طرح حرکت کرنا ہے۔
الخ	

(تقویم الابدان فی تدبیر الانسان (مخطوطہ) ص ۱۹)

ایک مخصوص رطوبت میں عفونت کی وجہ سے دانتوں میں بھی کیڑا لگ جاتا ہے جیسے

کرم دنداں سبب آں رطوبتے	دانتوں میں کیڑے کا سبب ایک
بود کہ در دنداں جمع آید و متعفن گردد	رطوبت ہوتی ہے، جو دانتوں میں
و قابلِ حیات کرمی شود،	جمع و متعفن ہو کر ایک زندہ کیڑے
(خلاصۃ التجارب ص ۳۰۰)	کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

کان میں بھی کیڑا پیدا ہو جاتا ہے، اس کا سبب بھی ایک مخصوص مادہ میں عفونت پیدا ہو جانا ہے۔

و چوں حدوثِ کرم در گوش از مادہ	عفونتی مادہ کان میں گر کر
عفن کہ بگوش ریختہ خواہد باشد	کیڑے کی پیدائش کا سبب ہوتا
(خلاصۃ التجارب ص ۲۷۶)	ہے

حسب مقام و مادہ کس قسم کے کیڑے اور جراثیم پیدا ہو سکتے ہیں، یہ بھی مندرجہ ذیل عبارت عبارت سے واضح ہے،

فيما القمل فله شيء يشبه	پلکوں میں جوں کے مانند ایک شے
بالقمل في اصل الاشفار يعرض	پیدا ہو جاتی ہے، یہ ان لوگوں میں
لمن يكثر الطعمة ويقل التعب	ہوتی ہے جو زیادہ کھانے اور حمام و
والحمام. (كتاب الحاوي ج ۲ ص ۹۰)	مشقت کم کرتے ہیں۔

مذکورۂ بالا عبارت سے یہ بھی واضح ہوا کہ سر و جسم میں جس قسم کی جوں پیدا ہوتی ہے وہ پلکوں میں پیدا ہونے والی جوں سے مختلف ہوتی ہے، اور ایسا اختلاف مواد و فضلات سے ہی ممکن ہے، اور یہ فضلات و مواد موقع و محل کے اعتبار سے تمام اجسام میں جداگانہ حیثیت و اشکال رکھتی ہیں۔ مثلاً ایک اور جوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ گدھ کی جوں کے مانند کبھی انسانی جسم میں پیدا ہو کر شدید اذیت کا باعث بن جاتی ہے۔ مثلاً

العلة الاخرى المعروفة لقمل	ایک دوسری بیماری قمل النسر کے نام
النسر وهذه ايضا يعم جميع	سے مشہور ہے، یوں تو یہ بیماری تمام جسم
البدن غير انه اذا احدث في	میں ہوتی ہے مگر جب سر میں پیدا ہو جائے
الراس كان صعبا وسببه منه	تو بہت سخت بات ہے، اس کا سبب
ما ذكرنا من اجناس العفونة	بھی ہمارے ماقبل ذکر کے مطابق عفونت
وفسادها غير ان الفساد اذا	و فساد ہی کی جنس سے ہے ہونے اگر
عم واشتد كان في الخلط وسومة	کہ یہ فساد عام ہو کر شدت اختیار کر لے،
فان قمل الذي يتولد كبارا	یہ دسومت والی خلط میں ہوا کرتی ہے
وربما اخرجت القملة نصفها	اور بڑی شکل میں پیدا ہو جاتی ہے کہ
الى خارج الجلد ونصفها تحت الجلد	بعض اوقات اس جوں کا نصف حصہ

ثم علاوة على تلك القملة	جلد کے باہر ہوتا ہے اور نرم جوں کے
ويتعبه الانسان۔	پھر اندر سے خارش میں مبتلا ہوتی ہیں
	انسان کو سخت عذاب میں مبتلا کر دیتی ہیں'

یہ جوئیں انسان کے بدن میں پیدا ہو کر کس قسم کے اذیت ناک و ہلاکت خیز حالات پیدا کر دیتی رہیں، یہ بھی حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔

هٰذه هامة كالقملة او كاصغر	یہ جوئیں چھوٹی سر جھوٹی چیچڑیوں کے
القردان بعضها وقد لايتوقى	مثابہ بہت خطرناک ہوتی ہیں ان سے
منها وتسمى بالفارسية "زده"	بچا نہیں جا سکتا، اس جوں کو فارسی
وهي تفجر الدم من سائر البدن	میں "زدہ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں؛
من المسام ومن المقعدة و	اس میں تمام بدن کے مسامات، معدہ
الصدر والبول وافواه المقعدة	سینہ، پیشاب، مقعد، ناک اور دانتوں
وبالرعاف ومن اصول الاسنان	سے خون پھوٹ پڑتا ہے اور بسا اوقات
وربما عظم الامر فيها فلا تقبل	یہ معاملہ اتنا سنگین ہو جاتا ہے کہ کسی دوا
الدواء۔ (المختارات ص۱۸۱)	کو قبول نہیں کرتا۔

عفونت سے کیڑوں اور حیوانات کی پیدائش کی واضح مثال شیخ کے بیان میں بھی موجود ہے، جس کا ذکر وبا کی علامت کے طور پر کیا گیا ہے۔

وترى الحيوانات المتولدة	وہ حیوانات جن کی پیدائش عفونت سے
من العفونة قد كثرت۔	ہوتی ہو کثرت سے نظر آئیں گے۔
(كتاب القانون جلد رابع ص۹۶)	(کتاب القانون جلد رابع ص۹۶)

وبائی دور کی جیسی ترجمانی بعض متاخرین نے بھی اس طرح کی ہے کہ

ہر گاہ کہ بینند کہ حشرات وجانوران	جس وقت کہ کیڑے کوڑے اور زمینی جانور
زمینے کہ از عفونت تولد کنند.	دیکھے جائیں جن کی پیدائش
(ذخیرہ نظام شاہی کتاب پنجم ص۱۲۵)	عفونت سے ہوتی ہے.

اس طرح حیوانات عجیبہ وعفنہ کی اصطلاح کے ساتھ دبیلات کے ذکر میں بکٹریا جراثیم کے وجود کی ایک مشاہداتی مثال رازی نے بھی بیان کی ہے.

اذا بطت دبیلات رأیت	میں نے دُبیلات میں شگاف دیا تو میں نے
فی داخلها انواعاً مختلفة	ان کے اندر مختلف اجسام تر وسخت
اجساماً رطبةً وصلبةً وحیواناً	اور عجیب قسم کے حیوانات عفونیہ کے
عجیبة کالحیوانات عفنیة	مشابہ دیکھے.
(کتاب الحاوی جز ثانی ص۱۰۱)	

مشتے نمونہ از خروارے مذکورۂ بالا چند مثالوں سے ثابت ہے کہ یہ حیوانات یا جراثیم اصل میں کچھ مخصوص گندے فضلات و مواد کی پیداوار ہیں، جن کو طبیعت دفع نہ کرسکے، یا جن کی اصلاح نہ کرسکے، ان میں عفونت پیدا ہو کر جراثیم یا رازی کی اصطلاح کے مطابق عجیب متعفن حیوانات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، ثبوت روزمرہ کے مشاہدات سے بھی ملتا ہے کہ انسانی جسم میں جوئیں پیدا ہوتی ہیں، لیکن وہ دوسرے حیوانات سے مختلف ہوتی ہیں، اسی طرح پھلوں، ترکاریوں اور غلہ وغیرہ میں کیڑے پیدا ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مختلف شکل وصورت رکھتے ہیں، اسی طرح حشرات الارض میں بھی مشابہت ویکسانیت نہیں ہوتی، نیز مرضی کیڑے بھی مختلف الاشکال ہوتے ہیں، جیسے دود القرح دود الاذن، دود الانف، دود الامعاء، صداع دودیہ، جرب دودیہ، حیوانات عجیبہ وعفونیہ وقمل النسر

وغیرہ۔ یہ اختلاف اشکال اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ تمام تر موسمات اور کیڑے یا جرمس مواد
و فضلات کے اعتبار سے پیدا ہوتے ہیں، اور طبیعت و مواد کے لحاظ سے قوت مصورہ ان کو
شکل و صورت عطا کرتی ہے، چنانچہ ان مواد و فضلات کے مولدات کا نگاہ کی حد تک جس قدر
مشاہدہ کیا جا سکا، اسی اعتبار سے ان کے نام رکھے گئے، مگر جب باریک بینی بصارت کا زیادہ ساتھ
نہ دے سکی تو کھلے ذہن سے یہ اعتراف بھی کیا گیا، کہ کچھ اشیاء اور اسباب کی جزئیات کا ہمیں
بھی علم نہیں، یہ علمی اعتراف بعینہ ایسا ہے جیسا کہ جرمس اور وائرس کو خوردبینی گرفت میں لیکر
بعض آزاد وائرس کو ابھی تک اس گرفت میں نہ لیا جا سکا، لیکن جزئیات کا علم نہ ہونا ان کو
عدم کی دلیل نہیں، جیسے بعض وائرس کی عدم گرفت ان کے وجود کی نفی نہیں ہے، اگر اس وقت
خوردبین معرض وجود میں ہوتی تو بزبان شیخ صرف (وس دعلیہ من خارج یا ما یعنا لطہ
من اجسام ارضیۃ وخبیثۃ) نہ کہا جاتا بلکہ باہر سے وارد ہونے والی شے اور اجسام ارضیہ
خبیثہ کو یقیناً جراثیم اور وائرس جیسے ناموں سے تعبیر و موسوم کیا جاتا، یا صاحب کامل الصناعۃ کے قول
کے مطابق زمانۂ وبا میں "کان بدنہ اخلاط ردیۃ مشاکلۃ بجواہر الھواء الردی"
پر اکتفا نہ کیا جاتا، بلکہ اخلاط ردیہ اور ہوائے ردیہ میں باہمی شکل و صورت کو ایک پتھا لوجسٹ
کی طرح جراثیم اور وائرس کی شکل بھی مصور کر دی جاتی اور خوردبین نہ ہونے کے باوجود یہ تحقیق بھی
کچھ کم اہمیت کی حامل نہیں ہے کہ جرب اور کھجلی کی قسم کی نشاندہی کی گئی جس میں سوئی کی نوک
کے برابر باریک کیڑے موجود ہوتے ہیں، اسی طرح قمل النسر کے نام سے ایک کیڑے کی
تحقیق بھی بے حد محتاج توجہ ہے، کیونکہ گدھ مرغی کبوتر کی طرح اہلی اور پالتو جانور نہیں ہے
کہ اس کے جسم میں موجود جوؤں اور کیڑوں کا بآسانی مشاہدہ کیا جا سکے، چہ جائیکہ جسم انسانی میں
بے حد کم پیدا ہونے والے مرض کو مختص کر کے اس کے شدید ترین عوارض کو بھی بیان کر دیا جائے،

یعنی اطبائے قدیم کے نظریات کے تحت جراثیم کا اثبات جن کو انھوں نے اخلاط و مواد ردیۂ و عفونیہ کے ضمن میں موجبات عفونیہ کہہ کر مولدات و حیوانات عفونیہ و اجسام خبیثہ کا نام دیا، لیکن ان ہی کے نظریات کے تحت اس اثبات میں یہ ابطال بھی مضمر و مستور ہے کہ جراثیم یا حیوانات عفونیہ و اجسام خبیثہ بلا واسطہ سببِ مرض نہیں ہیں بلکہ سبب تو وہ عفونت ہے جو اخلاط غیر طبعیہ و مواد ردیۂ میں پیدا ہوتی ہے، اور اس عفونت کے نتیجہ میں یہ مولدات ہویدا ہوتے، جو جسم کے اندر بھی ہو سکتے ہیں، اور اس کے باہر بھی، جیسا کہ حسبِ ذیل حوالے سے ظاہر ہے جس کی وضاحت جرب دودیہ میں کی گئی ہے۔

وھو الذی یکون حیوان	وہ کھجلی ایک حیوان سے ہوتی ہے جو
شبیھۃ بالصیبان والسبب	لیکھوں کے مشابہ ہوتا ہے، اس کی
فی تولد ذالک الخلط قد عفن	پیدائش کا سبب ایک خلط ہوتی ہے
وفسد یتولد فیھا الدود کما	جس میں فساد و عفونت پیدا ہو کر کیڑا
یتولد فی الشیٔ اذا سخن	پیدا ہو گیا، جیسا کہ کسی بھی شئی میں پیدا
وعفن	ہو جاتا ہے، جو گرم ہو کر سڑ جائے،

(معالجات بقراطیہ (مخطوطہ) ص۳۰۱)

اس عبارت سے واضح ہے کہ خلط و مادہ میں عفونت پیدا ہو کر کیڑے پیدا ہوا کرتے ہیں نہ کہ کیڑے عفونت پیدا کرتے ہیں، اس کی تائید مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ہوتی ہے جس میں عرق مدنی (نارو) کو ایک کیڑے سے تعبیر کیا گیا ہے،

وتولدہ من مادۃ مائیۃ شدیدۃ	اسکی پیدائش ایک شدید العفونت
العفونۃ والفساد	وفاسد مائی مادے سے ہوتی ہے

(شرح قرشی (مخطوطہ) ص۲)

وبائی زمانہ میں خارجی تغیرات سے ہوا کس حد تک متاثر ہو جاتی ہے، اس کا سبب بھی عفونت ہی ہے۔ مثلاً

ھذا الوباء ھو تعفن یعرض	ہوا میں تعفن پیدا ہو جانے کا
فی الھواء۔	نام وبا ہے۔

(کتاب القانون اول ۱۱۰)

یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ یونانی نظریہ کے مطابق ہوا تو بسیط ہے، اس میں تعفن کیونکر ممکن ہے، جیسا کہ حسب ذیل عبارت سے ظاہر ہے کہ

ان البسائط لا تعفن لانھا	بسائط میں عفونت پیدا نہیں ہوا کرتی،
خلقت بالطبع غیر قابلۃ	کیونکہ طبعاً ان کی پیدائش ایسی ہے
للتعفن لو کان ذالک لجاز	کہ وہ عفونت کو قبول ہی نہیں کرتیں،
ان یعفن جمیعا.	اگر ایسا ہوا کرتا تو تمام اشیاء
(شرح قرشی مخطوطہ ۱۲۳)	متعفن ہو جایا کرتیں،

متقدمین کی علمی بصیرت نے اس ممکن اعتراض کا رد بھی اسی وقت کر دیا تھا جو آج کی سائنس کا اہم ترین موضوع ہے کہ ہوا بسیط نہیں ہے۔

فانا لسنا نعنی بالھواء البسیط	ہم ہرگز اس ہوا کو ہوائے بسیط و
المجرد فان ذالک لیس ھو	مجرد نہیں کہتے کیونکہ ہمارے اردگرد
الھواء الذی یحیط بنا۔ الخ	جو ہوا ہے وہ ہوا نہیں ہے۔

حفظان صحت کے بطور جن دو امور کو اہمیت دی گئی ہے ان میں ایک عفونت بھی ہے جیسے کہ :-

بل انما تضمن امرین منہا العفونۃ	بلکہ حقا صحت دو امور پر مشتمل ہے
اصلاً ۔ الخ	ایک یہ کہ عفونت کو بالکل روکا جائے

مندرجہ ذیل عبارت اس بات کا ثبوت بھی ہے کہ عفونت کوئی مرض نہیں ہے، بلکہ بلا واسطہ سببِ مرض ہے، اس لئے بالواسطہ جراثیم سببِ مرض نہیں ہو سکتے، جیسا کہ حمیٰ عفونیہ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے۔

کحمی العفونۃ فان العفونۃ	حمی عفونیت کی طرح، کیونکہ عفونت
سبب بلا واسطۃ ولیس العفونۃ	بلا واسطہ سبب ہے، اور وہ فی
فی نفسہ مرضا بل انما ھی	نفسہ مرض نہیں ہے، بلکہ مرض کا
سبب مرض۔	سبب ہے۔

(کتاب القانون جلد رابع)

مذکورہ بالا واضح مثالوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ طب یونانی میں امراض واسباب میں عفونت و فساد کو بہت بڑا دخل ہے، اور یہ بھی محقق ہے کہ عفونت سے کیڑے پیدا ہوا کرتے ہیں جن کو جراثیم و وائرس کا نام دیا گیا ہے، نیز عفونت و فساد کے لئے سبب و محل یعنی غیر طبعی اخلاط فضلات و مواد ردیہ درکار ہیں، جس کو استعداد سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے اگر اطبائے قدیم نے اصول و علاج میں جراثیمی نظریہ سے صرف نظر کر کے اخلاط غیر طبعیہ اور فضلات و مواد ردیہ اور ان کی قابل تعفن حیثیت کو اولین درجہ دیا، تو میرے نزدیک یہ نظری و عملی دونوں حیثیتوں سے اصولِ طب کے عین مطابق ہے۔

ہمیں آنکھ بند کر کے محض جدید تحقیق پر اعتماد کرنے کے بجائے اپنے شاندار ماضی کو مدنظر رکھنا چاہیئے، ہمارے اسلاف نے بعض صنعتی آلات کے عدم وجود وایجاد کی وجہ سے جہاں

اپنے قسم مرکب ہیں، ان کو نشان منزل بنا کر آگے بڑھنا چاہیے، اور یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمارے ماکولات و مشروبات سے .. ..

بڑا سے بدل ما یتحلل جسم میں مخصوص استحالہ کے بعد جو کیلوس و کیموس تیار ہوئے اور اخلاط وجود میں آئے، نیز بعض نقائص کی بنا پر ان سے جو غیر طبعی تقاضا جبر ہو کر طور میں کچھ مخصوص تغیرات کی وجہ سے جو مولدات یا جراثیم معرض وجود میں آئے، ان کو تلاش کرنا چاہیے، نہ کہ ان فروعی مولدات کے لئے اینٹی سیپٹک یا اینٹی بائیٹک قاتل جراثیم زہروں کو جسم میں مسلسل پہنچاتے رہیں، جن کا جسم میں فساد انگیز ردعمل اور ری ایکشن ہوتا ہے اور جن سے ہزار ترقیات کے باوجود طب جدید پریشان و متفکر ہے، ہم اپنے تحقیقی نظریات کے مطابق جسم میں ان کا امتلا روکیں تاکہ جسم میں جراثیم کی تولید کی استعداد و صلاحیت کا سد باب ہو، اور عدم صلاحیت و استعداد کی بنا پر بیرونی و خارجی جراثیم نہ بدن کو متاثر کر سکیں اور نہ انھیں سامانِ حیات مل سکے۔

سلسلہ حکمائے اسلام

یہ گرانقدر سلسلہ دو حصوں پر مشتمل ہے جن میں تیسری صدی ہجری سے خاندان خیرآباد و فرنگی محل تک کے تمام مشہور مسلمان فلاسفہ و حکماء کے حالات مستند مآخذ کے حوالہ سے لکھے گئے ہیں، پہلے حصہ میں پانچویں صدی ہجری تک کے فلاسفہ اور حکماء کے حالات ہیں، اس کے شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، دوسرے میں متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام کے سوانح و حالات کے ساتھ ان کی علمی خدمات اور ان کے فلسفیانہ نظریات و افکار کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم)

علمائے فرنگی محل
کے
شجرۂ نسب پر ایک نظر

از

جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، چیرمین اتر پردیش اردو اکاڈیمی لکھنؤ

علمائے فرنگی محل کے نسب نامے کے بارے میں اس حد تک تمام مورخین اور تذکرہ نگار متفق ہیں کہ وہ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ انصاری ہروی (م ۴۸۱ھ/۱۰۸۸ء) کے واسطے سے میزبانِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت ابو ایوب انصاری خزرجی، مدنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہونچتا ہے،

ملا قطب الدین شہید سہالوی (م ۱۱۰۳ھ/۱۶۹۲ء) نے جو اس خاندان کے قریبی جد اعلیٰ ہیں صرف اپنی چند پیڑھیوں کا کسی سلسلے میں ذکر کیا ہے، مولانا محمد ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء) الفصان اربعہ کے مقدمے میں لکھتے ہیں:-

"حضرت مولانا شہید قدس سرہ نے اپنی مخطوطہ کتاب تلویحات کے آخر میں اپنے قلم سے اپنا نسب نامہ یوں تحریر کیا ہے، قطب الدین بن عبد الحلیم بن عبد الکریم ابن احمد بن حافظ بن فضل اللہ بن بدھ بن نظام الدین بن علاء الدین انصاری"

ملا قطب شہید نے "علاء الدین" کو خواجہ عبد اللہ انصاری کی اولاد لکھا ہے، خواجہ عبد اللہ انصاری کا مزار "ہرات" میں ہے، وہ "شیخ الطائفہ" اور "پیر انصار" بھی کہلاتے تھے، اور ان کا نسب نامہ حضرت ابو ایوب انصاری (میزبان رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تک پہونچتا ہے۔ یہاں تک نسب نامے

علمائے فرنگی محل کے نسب نامے کے موضوع پر جو خصوصی رسالہ "قرۃ الابصار فی تحقیق نسب قطب الانصار"
کے نام سے مولانا محمد عبدالباقی فرنگی محلی مہاجر مدنی (م [illegible]) نے تحریر کیا ہے اس میں وہ مذکورۂ بالا
اقتباس نقل کر کے لکھتے ہیں :۔

"راقم الحروف نے بھی ملا قطب الدین شہید کی مخطوطہ کتاب شرح جغمنی کے آخر میں
اُن کے قلم سے یہی نسب نامہ خود دیکھا ہے، اغصانِ اربعہ کے مصنف نے اس سلسلہ میں جو یہ
تحریر کیا ہے کہ "چونکہ پورا نسب نامہ تمام تفصیلات کے ساتھ تحقیق نہیں ہو پایا اس لئے یہاں
اس کا اندراج مناسب نہیں سمجھا"۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ پورا نسب نامہ درج کرنا
ممکن تو تھا مگر چونکہ خود مصنف اغصانِ اربعہ کو اس کی تحقیق کا پورا موقعہ نہیں مل پایا اس لئے
انھوں نے بلا تحقیق نسب نامہ اپنی کتاب میں درج نہیں کیا، ان کی کتاب اغصانِ اربعہ کا سنہ
تصنیف ۱۲۵۲ھ [۱۸۳۶ء] ہے" (۲)

مصنف "اغصانِ اربعہ" اس کتاب کی تصنیف کے بعد ۱۰ برس بقیدِ حیات رہے، مگر اپنی اس
تصنیف میں انھوں نے کوئی اضافہ نہیں کیا، ان کے بڑے بیٹے مولانا محمد انعام اللہ (ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر، وفات
۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء) نے ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء تک خاندانی حالات کا اضافہ کر کے ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء میں "اغصانِ اربعہ" کو طبع
کرا دیا۔ مطبوعہ کتاب کے آخر میں انھوں نے پورا نسب نامہ بھی درج کیا ہے، جس کے بارے میں ان کا
کہنا ہے کہ "بڑی تحقیق"، "بے حد دقتِ نظر" اور "اکابر خاندان سے خوب پوچھ گچھ" کے بعد یہ نسب نامہ
انھوں نے مرتب کیا ہے پورا شجرۂ نسب یوں ہے :۔

مُلا قطب الدین شہید سہالوی بن مُلا عبدالحلیم بن مُلا عبدالکریم
بن شیخ الاسلام ملا احمد بن مُلا محمد حافظ بن شیخ فضل اللہ
ابن شیخ محی الدین بن شیخ شرف الدین بن شیخ نظام الدین

ابن قطب العالم شیخ خواجہ علاءالدین بن خواجہ اسماعیل بن خواجہ اسحاق
ابن خواجہ داؤد بن خواجہ عزیزالدین بن خواجہ جلال الدین
ابن خواجہ دوست محمد بن خواجہ پیر فیاض الدین بن پیر معزالدین
ابن پیر حبیب اللہ بن خواجہ شمس الدین بن خواجہ جلال الدین
ابن خواجہ ظہیرالدین بن خواجہ سلطان محمد بن خواجہ نظام الدین
ابن خواجہ شہاب الدین بن محمود بن ایوب ،
ابن جابر بن مقرب باری بن خواجہ ابو اسماعیل عبداللہ الہروی
ابن ابو منصور محمد بن ابو معاذ بن محمد
ابن احمد بن علی بن جعفر
ابن منصور ثابت الانصاری بن حضرت ابو ایوب انصاری (۳)

یہی "نسب نامہ" مفتی محمد یوسف فرنگی محلی نے "سلم العلوم کی شرح" قاضی مبارک" پر اپنے حواشی کے آخر میں درج کیا ہے، اس کے علاوہ مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحئی فرنگی محلی نے اپنی تصنیف "حسرۃ العالم بوفات مرجع العالم" میں بھی تقریباً یہی شجرہ دیا ہے۔

مولانا عبدالغفار فرنگی محلی نے اپنی تصنیف "الاسرار العالیہ فی مناقب الوالیہ" میں (جو مخطوطہ ہے) نیز مولوی رضی الدین محمود فتح پوری (اصلاً سہالوی) نے بھی اغصان الانساب میں (جو مخطوطہ ہے) تقریباً یہی شجرۂ نسب دیا ہے، اس سلسلے میں مولانا عبدالباقی کا بیان ہے،

"حضرت مفتی صاحب علیہ الرحمۃ نے جو نسب نامہ لکھا ہے بالکل وہی نسب نامہ ان کے عم محترم حضرت مولانا عبدالوالی قدس سرہٗ نے اشعۃ اللمعات کے مخطوطے کے آخر میں تحریر کیا ہے جسے میں نے خود دیکھا ہے، مولوی عبدالصمد کے قلم کے ایک ورق میں لکھا ہوا بالکل یہی نسب نامہ بھی میں نے دیکھا ہے، جو مولانا

محمد حامد کی کتابوں میں موجود ہے، میرے نانا مولوی محمد غضنفر نے اپنی اولاد کی کتاب میں یہی نسب لکھا ہے، یہ کتاب میرے کتبخانہ میں اب بھی موجود ہے، جو نسب ملا رضی الدین فتحپوری نے اغصان الانساب میں درج کیا ہے وہ بھی یہی ہے، فرق اتنا ہے کہ انھوں نے "شیخ فضل اللہ بن شیخ شرف الدین عرف شیخ بدھ بن شیخ نظام الدین، الخ تحریر کیا" (۴)

مولانا عبد الباقی مزید لکھتے ہیں :-

"یہ سب حضرات ایک ہی عہد میں تھے مولانا محمد عبد الوالی (۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء) میں پیدا ہوئے اور (۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء) میں وفات پائی، مولوی عبد الصمد نے (۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) میں مفتی محمد یوسف نے جو (۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء) میں پیدا ہوئے، (۱۲۸۶ھ/۱۸۷۰ء) میں وفات پائی اور مولوی محمد غضنفر نے (۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) میں وفات پائی اور ان سب حضرات کے نسب نامہ تحریر کرنے کا زمانہ (۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء) معلوم ہوتا ہے "اغصان الانساب" کی تصنیف غالباً (۱۲۵۸ھ/۱۸۴۲ء) میں ہوئی [صحیح یہ ہے کہ "اغصان الانساب کی تصنیف بھی (۱۲۶۰ھ/۱۸۴۴ء) میں ہوئی جیسا کہ اغصان الانساب کے دیباچے میں مصنف نے صراحت کی ہے،]

استاد محترم [مولانا عبد الحیٔ فرنگی محلی] نے مفتی محمد یوسف کی تحریر پر اعتماد کیا، مولوی الخادم مشہر نے اغصان الانساب پر مولوی عبد الغفار نے مولانا محمد عبد الوالی کے تحریر کردہ نسب نامے کو بعینہ لے لیا (۵)

ان سب مذکورہ حضرات کے پاس یہ شجرۂ نسب پہنچا کہاں سے ؟ یہی استفسار مصنف قرۃ الابصار نے اپنے استاد مولانا محمد نعیم فرنگی محلی (م ۱۳۱۸ھ/۱۹۰۰ء) سے کیا جن کا جواب یہ تھا۔

"چونکہ مفتی محمد یوسف نے "قاضی مبارک" پر اپنے حواشی کے آخر میں نسب نامہ درج کیا تھا اس لیے میں نے اُن سے دریافت کیا کہ یہ انھوں نے کہاں سے نقل کیا ہے،

مفتی صاحب نے کہا کہ "مولانا محمد عبد الوالی سے" میں مولانا کے پاس گیا تو انھوں نے بتایا کہ "مولوی عماد الدین نے یہ شجرۂ نسب مجھے دیا تھا" میں نے مولوی عماد الدین سے دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ میرے کتب خانے میں جو قدیم کتب ہیں ان میں سے ایک کتاب کے اندر ایک "ورقہ" برآمد ہوا جس میں ملّا قطب الدین شہید کا نسب نامہ لکھا تھا۔" (۶)

مصنّف قرۃ الابصار دستیاب "ورقہ نسب" کی استنادی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"یہ ملّا عماد الدین وہ ہیں جنھوں نے ستّو برس کی عمر میں (۱۲۰۳ھ / ۱۸۶۰ء) میں وفات پائی، اس سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ تیرہویں صدی ہجری کے پہلے نصف میں نسب نامہ کا یہ پرچہ دستیاب ہو چکا تھا۔ اور مذکورہ کتب میں جو نسب نامے درج ہوئے ہیں اسی دستیاب "ورقہ نسب" پر مبنی ہیں" انساب کے بارے میں گزرے ہوئے حضرات کی تحریروں پر بھروسہ کرنا اور اُسے بنیاد تحقیق بنانا بالکل بجا اور درست ہے، فقہا اس مخطوطے پر جو محفوظ حالت میں پایا جائے اعتماد کرتے چلے آئے ہیں، دار القضا میں محفوظ دستاویزوں پر قاضی بھروسہ کرتا ہے، اسی لئے مکتب دیوان" اور "کتاب حقوق" "وثائق شرعیہ میں شمار ہوتے ہیں" (۷)

اس کے آگے مصنّف "قرۃ الابصار" نے "ورقہ نسب" کی صحت پر یوں روشنی ڈالی ہے:۔

"حاصل کلام یہ کہ وہ ورق جو کتب خانے کی کسی کتاب کے اندر رکھا ہوا محفوظ حالت میں ملا ہے اس پر اعتماد نہ کرنے کی کوئی بھی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، گویا یہ شجرۂ نسب جو کتابوں کے اوراق کے درمیان گم تھا، خاندان والے نہ جان پائے کہ کہاں ہے، ایک

اُسے پایا، اس شجرۂ نسب کے دستیاب نہ ہو پانے کے اسباب بھی قوی تھے

حضرت ملا قطب الدین شہید کر دیئے گئے اور ان کا کتب خانہ قاتلوں نے نذر آتش کر دیا۔ جو بچا کھچا رہ گیا اُسے ان کی اولاد اپنے ہمراہ فرنگی محل لے آئی۔

منجھلے بیٹے ملا سعید اور بڑے ملا اسعد جو اس وقت جوان تھے سلطان عالمگیر کے پاس دکن چلے گئے اور خدا جانے ان دونوں کی وفات کہاں ہوئی، مُلّا نظام الدین [فرزند سوم] اس وقت ۱۴ برس کے اور اُن سے چھوٹے مُلّا محمد رضا بارہ برس کے تھے، اب کون بتائے کہ شجرۂ نسب کا یہ ورق کتب خانہ کے ساتھ جل گیا یا باقی بچا، اور اگر بچا تو افراد خاندان یا کتابوں کے اِدھر اُدھر ہونے سے کدھر چلا گیا؟

اصل "حویلی فرنگی" میں مُلّا سعید کی اولاد مقیم ہوئی، ملا نظام الدین نے حویلی کے ایک حصے کو الگ کر کے اس میں سکونت اختیار کر لی، مُلّا اسعد کی اولاد نے حویلی کے اصطبل میں گھر بنا کر رہنا شروع کر دیا، ملا محمد رضا نے اصل حویلی کی دوسری سمت گھر بنا کر رہائش اختیار کی، ان میں سے ہر ایک کا ذخیرۂ کتب اس کے ساتھ اس کی رہائش گاہ میں منتقل ہوا، کتابوں کا اس طرح اِدھر اُدھر ہونا ایک نئے تغیر کا سبب بنا، اب کون جانے کہ یہ ورق کس گھر پہونچ گیا ہے اور کہاں رکھا ہے؟ مزید برآں ملا محمد رضا عرب کی سمت سفر کر گئے، اُن کے بیٹے مُلّا احمد حسین جو علامۂ وقت تھے (۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۲ء) میں وفات پا گئے، ان کے بیٹے ملا اسعد الدین جو عالم تھے معاش کے حصول میں وطن سے باہر رہے، ان کے بیٹے عماد الدین اگر اتفاقاً اپنی کتابوں کے اندر شجرۂ نسب کا ورق پا جاتے ہیں تو ذرا بھی حیرت کی بات نہیں ہے! نیز اس زمانہ میں اہل خاندان کو اپنے خاندان کی تاریخ لکھنے کی طرف توجہ ہی نہ تھی کہ وہ نسب نامے کی تلاش و جستجو کرتے، نکاح، بیاہ کے سلسلے میں نسب نامہ دکھانا بھی اس خاندان کے لئے

اس لئے لازم نہ تھا کہ ان کا نسب مشہور اور قبیلۂ انصاریہ سے ان کا تعلق معروف تھا۔ جب خاندان کی تاریخ قلمبند کرنے کے لئے تفتیش احوال کی ضرورت محسوس ہوئی اور اپنوں بیگانوں نے افراد خاندان کی پیدائش اور وفات وغیرہ کے سلسلے میں استفسار شروع کیا، اس وقت اہل خاندان کو تنبہ ہوا اور خوش قسمتی سے اسی زمانے میں کتابوں کے اندر سے شجرۂ نسب کا ورق ہاتھ آگیا، اس کی نقلیں لے لی گئیں اور اس امر کے پیش نظر کہیں یہ ضائع نہ ہوجائے تصانیف میں اس کا اندراج کر دیا گیا۔

مولوی عبدالاعلیٰ نے جن کا انتقال (۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء) میں ہوا تیرہویں ہجری صدی کے اوائل میں "رسالہ قطبیہ" تالیف کیا، اور "مناقب رزاقیہ" کی شرح "محاسن رزاقیہ" کے نام سے لکھی اس وقت تک شجرۂ نسب دستیاب نہیں ہوا تھا، یہ معلوم ہے کہ ان کے گھرانے میں یہ نسب نامہ نہیں تھا، اسی لئے "محاسن رزاقیہ" میں اس عدم دستیابی کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے برسبیل احتمال کسی تاریخ سے ایک نسب نامہ نکال کر درج کر دیا۔ یہ احتمالی نسب نامہ درجۂ اعتبار سے ساقط ہے"۔ (۸)

"شجرۂ نسب کے ورق" سے متعلق مولانا عبدالباقی کی اس مدلل گفتگو کا خلاصہ پیش کرنے کی ضرورت اس لئے پڑی کہ اُن کے شاگرد رشید، ممتاز عالم و مصنف مولانا محمد عبدالباری فرنگی محلیؒ نے قدرے مختلف شجرۂ نسب بیان کیا ہے، جو اُن کی مطبوعہ عربی تصنیف "حسرة المسترشد بوصال المرشد" میں درج ہے، یہ تصنیف انھوں نے اپنے والد ماجد اور مرشد مولانا محمد عبدالوہاب فرنگی محلی کی وفات (۱۳۲۱ھ / ۱۹۰۴ء) کے فوراً بعد اُن کے حالات میں کی تھی۔ (۹)

اُن کے "شجرۂ نسب" میں شیخ فضل اللہ (شجرۂ نسب کے ورق میں نمبر۹) کے بعد ساتویں پیڑھی میں شیخ محی الدینؒ کے نام کی جگہ "شرف الدین" ہے جو مذکورہ "ورق" میں آٹھویں نمبر پر ہیں، ملا قطب الدین

شیعہ کے قلم سے لکھی چند پیڑھیوں میں بھی "ورق" کا ساتواں نمبر "شیخ بدھ" آیا ہے جو "محی الدین" بھی ہوسکتا ہے اور "شرف الدین" بھی، یہ بہت جزوی فرق ہے، اور ایسا فرق قدیم شجروں میں عموماً پایا جاتا ہے جو بڑا فرق استاد اور شاگرد کے پیش کردہ شجروں میں ہے، وہ شیخ علاء الدین (ورق میں دسویں نمبر پر) سے ہے۔

مولانا عبدالباری نے "شیخ علاء الدین" کے والد کا نام نصیر الدین بن بدر الدین بن شرف الدین لکھا اور دس پیڑھیاں اس کے اوپر "شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی کا نام لکھا ہے، نیز شیخ الاسلام کے جس بیٹے کی اولاد علمائے فرنگی محل کو بتایا ہے ان کا نام "اسماعیل" لکھا ہے۔

"ورقۂ نسب" میں شیخ علاء الدین کے اوپر انیس[19] پیڑھیوں کے بعد "شیخ الاسلام" کا نام آتا ہے اور اُن کے جن بیٹے کی اولاد میں علمائے فرنگی محل ہیں ان کا نام "مقرب باری" ہے۔

مولانا عبدالباری نے اگرچہ اپنے بیان کردہ نسب نامے کا کوئی تاریخی حوالہ نہیں دیا ہے مگر یہ تسلیم کیا ہے کہ "شیخ علاء الدین" (ورق شجرہ میں نمبر ۱) کی اوپر کی پیڑھیوں میں ماہرین انساب نے اختلاف کیا ہے "لیکن تحقیق وہی ہے جو انھوں نے درج کی" (۱۰)

انھوں نے یہ تحقیق ۱۳۲۱ھ/۱۹۰۳ء میں کی تھی، اسی کی تقلید ان کے شاگرد اور مرید شیخ الطاف الرحمن قدوائی (م ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) نے "احوال علمائے فرنگی محل" میں کی، بلکہ صراحت کر دی کہ "مورخوں نے آپ کے [شیخ علاء الدین کے] نسب میں بہت کچھ اختلاف کیا ہے، مگر ہم نے باتباع اپنے اساتذہ کے نسب مذکور اختیار کیا ہے"۔ (۱۱)

کتاب "احوال علمائے فرنگی محل" کا زمانۂ تصنیف ۱۳۴۳ھ/۱۹۲۴ء ہے۔ (۱۲)

مولانا عبدالباقی نے "شجرۂ نسب" کی تحقیق اور غلط روایتوں کی تردید میں اپنا مذکورۂ بالا رسالہ ۹ رصفر ۱۳۳۱ھ (مطابق نومبر ۱۹۱۲ء) کو قلمبند کیا تھا، اس وقت مصنف ہجرت کرکے مدینہ منورہ میں مقیم ہو چکے تھے، وہیں اس کے اکتیس[31] برس بعد ۲۶ ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۹۴۴ء

کو وفات پائی۔ (۱۳)

قطعیت کے ساتھ اب یہ بتانا مشکل ہے کہ مولانا عبدالباری کو جن کی وفات اپنے استاد مولانا عبدالباقی سے بیس برس قبل ہوگئی تھی، اپنے فاضل استاد کی تحقیق سے استفادہ کا موقع ملا یا نہیں مگر اتنا یقینی ہے کہ استاد کے رسالے کی تصنیف کے زمانے (۱۳۳۷ھ/۱۹۱۹ء) سے لے کر اپنی وفات (جنوری ۱۹۲۶ء/۱۳۴۴ھ) تک مولانا عبدالباری کی سیاسی سرگرمیاں ان کی علمی سرگرمیوں پر اس قدر حاوی رہی تھیں کہ ان کو کسی مزید تحقیق کا وقت ہی نہ مل سکا۔ نیز مولانا عبدالباری نے اپنی عمر کے آخری دس برسوں میں خاندان کے حالات اور اس کے شجرۂ نسب سے متعلق نہ کوئی تصنیف لکھی، نہ کوئی اظہار خیال کیا۔ اس موضوع پر ان کی عربی تصنیف "آثار الاول من علمائے فرنگی محل" ۱۳۳۶ھ/۱۹۰۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں نسب نامے کے سلسلے میں وہ تفصیل میں نہیں گئے ہیں۔

مولانا محمد عنایت اللہ فرنگی محلی (شاگرد مولانا عبدالباری فرنگی محلی) نے جب ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں "تذکرۂ علمائے فرنگی محل" قلم بند کرنا شروع کیا تو ان کے پیش نظر شجرۂ نسب کا یہ اختلاف ضرور تھا، مگر انھوں نے یہ "تذکرہ" خود ان کے الفاظ میں :۔

"یکم محرم ۱۳۴۷ھ سے لکھنا شروع کیا اور محرم کے اختتام پر اس کا اتمام کیا" (۱۴)

شجرۂ نسب کے اس اختلاف کا حوالہ دے کر انھوں نے لکھا ہے :۔

"مجھکو خود اس بارے میں تحقیق کا موقع نہیں ملا ہے" (۱۵)

تاہم اپنے استاد کے درج کردہ شجرۂ نسب پر استاذ الاساتذہ مولانا محمد عبدالباقی کے تحقیق کردہ شجرۂ نسب کو انھوں نے بھی ترجیح دی ہے، لکھتے ہیں :۔

"یہ نسب نامہ [جو اغصان اربعہ کے آخر میں درج ہے اور جسے مولانا محمد عبدالباقی نے تسلیم کیا ہے] حضرت مولانا عبدالحیٔ رحمۃ اللہ علیہ کے مکتوبہ نسب نامے سے تھوڑا مختلف

ہے کہ حضرت استاذ [مولانا عبد الباری] رحمۃ اللہ علیہ اور مولوی الطاف الرحمٰن صاحب کے مکتوبہ نسب ناموں سے بہت کچھ مختلف ہے، "قرین قیاس انصاف" کا نسب نامہ ہے (۱۶)

مولانا عنایت اللہ بھی اپنے استاذ الاساتذہ مولانا عبد الباقی مہاجر مدنی سے چار سال قبل انتقال کر گئے تھے! ایک مہینے کے اندر "تذکرۂ علمائے فرنگی محل" قلم بند ہو جانے کا فطری نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سی باتیں تشنۂ تحقیق رہ گئیں، بہت سے وہ امور جو تفصیل چاہتے تھے مجمل رہ گئے، رجال اور واقعات سے متعلق سنین کا حوالہ بھی کہیں کہیں سادہ رہ گیا۔

جدی واستاذی، مصنف "تذکرۂ علمائے فرنگی محل" سے شجرۂ نسب کے سلسلے میں ایک تسامح بھی ہو گیا، جس کو "عجلت تصنیف" ہی کا نتیجہ سمجھنا چاہئے یعنی جس نسب نامے کو انھوں نے "قرین قیاس" قرار دے کر درج "تذکرہ" کیا، آگے جا کر اس سے بالکل ذہول ہو گیا، اور "احوال علمائے فرنگی محل" میں درج شجرۂ نسب کے بعض اکابر کے احوال اس صراحت کے ساتھ نقل کر گئے:۔

"احوال علمائے فرنگی محل" میں دادا حافظ تک جو احوال مذکور ہیں بقدر ضرورت بعض تغیرات و اضافے کے ساتھ لکھتا ہوں" (۱۷)

جس کتاب سے انھوں نے "احوال" نقل کئے ہیں اس میں "علاء الدین" (ورقۂ نسب میں دسویں نمبر) کو شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کے بیٹے اسماعیل کی اولاد بتایا گیا ہے، اور ورقۂ نسب میں جسے مصنف "تذکرہ" نے "قرین قیاس" قرار دیا "علاء الدین" شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کے بیٹے جابر مقرب باری یا جابر ابن مقرب باری کی اولاد ہیں،

ان علاء الدین کے بارے میں "احوال علمائے فرنگی محل" میں ایک طرف یہ ہے کہ ان کا انتقال ۱۲ر شوال ۷۶۸ھ میں ہوا اور موضع شیخ پورہ میں اپنے والد بزرگوار مولانا نصیر الدین کے مقبرے میں دفن ہوئے، دوسری طرف یہ کہ علاء الدین خلجی شاہ دہلی ان کا مرید تھا، (۱۸)

حالانکہ ان "علاء الدین" کی وفات سے ایک سو ساٹھ سال قبل سلطان علاء الدین خلجی (م ۷۱۶ھ/۱۳۱۶ء) دنیا کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ اُس کی وفات تک یہ علاء الدین ہی نہیں ان کے والد مولانا نصیر الدین بھی پیدا نہیں ہوئے تھے، جن کے بارے میں "احوال علمائے فرنگی محل" میں لکھا ہے کہ :-

"نوّے برس کی عمر میں یا ۹۹ یا ۱۰۱ برس کی عمر میں ۱۱ رذی الحجہ ۸۷۹ھ/۱۴۷۵ء یوم یکشنبہ کو وفات فرمائی۔" (۱۹)

۱۰۱ برس ہی کی عمر مان لی جائے تو ان علاء الدین کے والد ماجد مولانا نصیر الدین کی پیدائش ۷۴۸ھ قرار پائے گی، یعنی سلطان علاء الدین خلجی کی وفات کے بتیس سال کے بعد!

صد سالہ مولانا نصیر الدین کے والد ماجد مولانا بدر الدین کے بارے میں "احوال علمائے فرنگی محل" میں ہے کہ وہ اپنے شیخ طریقت حضرت نصیر الدین چراغ دہلی [م ۷۵۷ھ/۱۳۵۶ء] کے حکم پر برناوا [متھرا اور دہلی کے درمیان واقع، اب ضلع میرٹھ میں] قیام پذیر ہوئے اس سے قبل وہ مدت تک درس و تدریس میں مشغول رہے، دہلی میں "منارہ شمسیہ" (قطب صاحب کی لاٹ) کے پاس ان کا مدرسہ تھا (۲۰)

(باقی)

حوالہ جات

(۱) اغصان اربعہ (فارسی) مطبوعہ مطبع کارنامہ فرنگی محل لکھنؤ ۱۲۹۸ھ/۱۸۸۱ء ص ۳

(۲) قرۃ الابصار فی تحقیق نسب قطب الانصار (فارسی مخطوطہ نزد راقم)

(۳) اغصان اربعہ مذکورۂ بالا۔

(۴) قرۃ الابصار مذکورۂ بالا۔

(۵) حوالۂ بالا۔

(۶) حوالۂ بالا۔

(۷) حوالۂ بالا۔

(۸) حوالۂ بالا (خلاصے کی شکل میں)

(۹) حسرۃ المسترشد بوصال المرشد از مولانا عبدالباری (مطبوعہ عربی)

(۱۰) حوالۂ بالا۔ حاشیہ ص۳

(۱۱) احوال علمائے فرنگی محل از شیخ الطاف الرحمٰن قدوائی (مطبوعہ اردو)

(۱۲) حوالۂ بالا۔

(۱۳) تذکرۂ علمائے فرنگی محل (مطبوعہ) میں قلمی اضافے۔

(۱۴) حوالۂ بالا۔ (مطبوعہ) ص۲۔

(۱۵) حوالۂ بالا۔

(۱۶) حوالۂ بالا ص۲

(۱۷) حوالۂ بالا۔

(۱۸) احوال علمائے فرنگی محل (مطبوعہ) ۱۹۳۰ء۔

(۱۹) حوالۂ بالا۔

(۲۰) حوالۂ بالا۔

معین بن محمود کشمیری

اور

صحیح البخاری کے چند اور نایاب نسخے

از

جناب حکیم محمد عمران خاں، عربی فارسی ریسرچ انسٹیٹوٹ ٹونک

راقم کا ایک مضمون "معین بن محمود کشمیری اور ان کی تصانیف" کے عنوان سے رسالہ "معارف" عدد ۳ جلد ۹۹ بابت ماہ مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا، حال میں فہرست کی تیاری کے سلسلہ میں، عربی فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، راجستھان، ٹونک کے (جس میں سعیدیہ لائبریری ٹونک کے تمام مخطوطات بھی مدغم کر دیئے گئے ہیں) حدیث کے مخطوطات کو تفصیلی طور پر پھر دیکھنے کا اتفاق ہوا، تو خوش قسمتی سے صحیح البخاری کے چند اور نایاب نسخوں کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا، جو مولانا معین بن محمود کشمیری (المتوفی ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء) کی ملکیت یا ان کے مطالعہ میں رہے ہیں اور ان نسخوں میں سے ایک نسخہ پر وہ اصل سند بھی مرقوم ہے، جو انھیں ان کے استاذ مولانا حیدر ابن فیروز کشمیری (المتوفی ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء) نے خود اپنے قلم سے دی تھی، جسے مولانا معین بن محمود نے اپنے کتابت کردہ صحیح البخاری کے اس نسخہ پر اپنے قلم سے نقل کیا ہے، جس کی تفصیل محولہ بالا مضمون میں دی گئی ہے،

مولانا حیدر، حضرت شاہ عبد الحق صاحب محدث دہلوی (المتوفی ۱۰۵۲ھ) کے شاگرد اور ہندوستان کے مشہور اساتذۂ حدیث میں گذرے ہیں، جن سے اس علاقہ کے متعدد علماء کو شرف تلمذ

حاصل رہا ہے، ان کے تلامذہ میں مولانا ہاشم بن اسماعیل بن موسیٰ کشمیری بھی تھے، وہ مولانا معین ابن محمود کے ساتھیوں میں تھے، انہی کے قلم سے لکھا ہوا صحیح البخاری کا ایک نسخہ بھی اس ادارہ میں محفوظ ہے، یہ دو جلدوں پر مشتمل ہے، اور اُس اصل نسخہ سے منقول ہے، جو خود مولانا حیدر کشمیری محدث کے دستِ مبارک سے لکھا ہوا تھا، اور جس طرح مولانا معین کشمیری نے اپنا نسخہ نقل کرکے اور باقی حصہ دوسرے کاتب سے نقل کراکے اسکی تصحیح و تحشیہ کا کام انجام دیا تھا، اسی طرح مولانا ہاشم کشمیری نے بھی اس نسخہ کی کتابت کرکے اس کی تصحیح و تحشیہ کا کام خود کیا ہے، جیساکہ مندرجۂ ذیل تفصیلات سے قارئین کو اندازہ ہوگا،

معارف میں شائع شدہ مضمون ترتیب دیتے وقت مولانا معین کشمیری کی تیار کردہ صحیح البخاری کی صرف جلد اول میرے پیش نظر تھی، اس وقت الحمدللہ وہ دوسری جلد بھی پیش نظر ہے، جو مولانا معین نے کسی دوسرے کاتب سے نقل کراکے، ابتداءً اُس کی تصحیح و تحشی کی ہے اور پھر اپنے استاذ گرامی مولانا حیدر کشمیری سے، اس کے آخر میں اپنی سند و اجازت تحریر کرائی ہے، جلد اول پر مولانا معین نے یہ سند اپنے قلم سے نقل کی تھی، اور اس جلد دوم پر یہ اصل سند خود مولانا حیدر مرحوم کے قلم سے لکھی ہوئی محفوظ ہے،

صحیح البخاری کی یہ جلد ثانی باب فضائل اصحاب النبی سے شروع ہوکر آخر کتاب تک ہے، سفید دبیز، غیر مجدول کاغذ پر، خط نسخ میں لکھا ہوا خوشخط نسخہ ہے، جو اول سے آخر تک محشی ہے، تصحیح اور کچھ حواشی خود مولانا معین کے قلم سے ہیں، اس جلد کے کاتب کوئی عبدالرحیم ہیں، اور کتابت مکہ مکرمہ میں ہوئی ہے، خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نسخہ کی جلد اول جس پر سابق مضمون شائع ہوا اُس کے کاتب بھی شاید یہی عبدالرحیم ہوں، زیر نظر جلد پر کاتب نے اگرچہ اپنا نام اور تاریخ کتابت علحدہ نہیں لکھی ہے، لیکن کتاب کے ختم پر ترقیمہ عربی نظم میں دیا ہوا ہے، جس میں تاریخ و سنہ کتابت

کا بھی ذکر ہے، لیکن سنہ واضح نہیں، ذیل میں منظوم ترقیمہ بعینہٖ نقل کیا جا رہا ہے :-

"الحمد للہ المھیمن اولا والشکر اولہٗ واخرہٗ الا
الاؤہ لا حوت العدی سیما ابنا آدم بالاحادیث العلا
ثم الصلوٰۃ مع السلام علی الذی زان الوری بحدیثہ متجملا
لاسیما عبد الرحیم من انجلت اتلامہ بحدیثہ فقد انجلا
کتب البخاری فی سنتین مجاورا ام القری دار القوی بیت العلا
واتمہ فیھا وصححہ بما صح الصحاح بہ صحیح من علا
فرغت یداہ عن الکتابۃ فانقضت اخری جمادی سدس تلک فقد خلا
قدکان سادسھا الخمیس بہ انتہت سنتا الکتابۃ فالکتاب تکملا
یا حاسبی حمل الحساب فحا سبوا تاریخہ محتلا
اللہ یرحم کاتبا ومحدثا ای عابدیہ تفضلا
وعلی النبی صلوٰتہٗ وسلامہ وعلی الھداۃ ومن الیھم اقبلا

تمت کتابۃ الجامع الصحیح البخاری بعون اللہ المھیمن حسن توفیقہ"

مذکورہ بالا ترقیمہ کے ختم ہوتے ہی زیریں ایک گوشہ میں تصحیح کا نوٹ اس طرح درج ہے۔

"واللہ تعالیٰ اسأل ان یوفقنی فی ..... تصحیح ..... صحیح البخاری و تحشیہ والحمد للہ علیٰ ذالک مصلیاً ومسلماً علیٰ حبیبہ ونبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فی التاریخ اثنین مضت ..... من شھر جمادی الاولی سنۃ ۱۰۴۱ھ"

ترقیمہ والے آخری صفحہ کے حاشیہ پر وہ اصل سند درج ہے، جو مولانا حیدر کشمیری نے مولانا معین بن محمود کو دی ہے، یہ پوری عبارت مولانا حیدر کے قلم سے ہے، البتہ ابتدا میں مختصر عبارت

یہ عنوان کے مولانا معین بن محمود کے قلم سے اس طرح درج ہے :-

"یکتب بدستخط مولانا حیدر اجازۃ الفقیر الحقیر .... الحمد للہ علی اتمام ذیل الخطبۃ ۔ الخ"

اس کے بعد مولانا حیدر کی دی ہوئی اصل سند شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سند، شائع شدہ سابق مضمون میں بھی نقل کی گئی تھی، لیکن چونکہ اُس نسخہ کے بعض حصے کٹے ہوئے تھے، اور یہ اصل سند بھی کرم خوردہ ہے اس لئے دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے ذیل میں وہ سند دوبارہ نقل کی جا رہی ہے، تاکہ اُس وقت جو حروف یا الفاظ پڑھنے میں نہیں آسکے تھے، ممکن ہے اس میں واضح ہو جائیں :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احمد اللہ علی عظمۃ جلالہ واشکرہ بجزیل نوالہ واثنی علیہ ثناء لاینقطع بل یزید، رافعاً اکف الضراعۃ والابتہال فی ان یوفقنا لما یحب ویرضی، واشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ، الموصوف بصفۃ الکمال، المنعوت بنعوت الجلال والجمال واشہد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ ذو المقام الاعلی الارفع.... بل الخلائق اجمع صلی اللہ علیہ وعلی..... مصابیح الظلم وینابیع الحکم ۔ اما بعد فلما شمر عن ساق جدہ فی خدمۃ علم الحدیث الشریف وسعی فی ارتقاء الطو... المنیف..... الزمان واغتنم الفرصۃ بتوفیق الملک المنان الشیخ الفاضل الصالح الکامل الناسک الاعز الاکرم معین الملۃ والدین خاوند بن حضرۃ قدوۃ العارفین، زبدۃ آل طٰہٰ و یٰسین خواجہ خاوند محمود نور اللہ مضجعہ النقشبندی علوی الحسینی شکر اللہ سعیہ وحصل منہ ما یکفیہ بجد منہ ویفی فی.... فطلب الاجازۃ ...... وان لم اکن صالحاً لذالک ولکنی احببت اقتداء للسلف الصالحین

وبقاء لهذه السنة السنية واجزت له ان یروی عنی کتاب مشکوٰة المصا[بیح] وجمیع ..... روایة عنی مما اجازنی شیخی ومرشدی وحید عصره وفرید دهره الشیخ المحدث عبد الحق بن سیف الدین الدهلوی .... اجازة تامة .... کما ینبغی .... مطلقة عامة والمرجو من الشیخ المذکور ان لاینسانی واولادی من صالح دعواته فی خلواته وجلواته جزاه الله خیراً۔ کتب هذه الاسطر العبد الضعیف الفقیر الی الله القوی حیدر بن فیروز الکشمیری الچرخی عفی عنه .... فی لیلة السابعة من جمادی الاخریٰ سنة الف واربع وخمسین "

کرم خوردگی کی وجہ سے اس اصل سند کے اب بھی کئی الفاظ رہ گئے ہیں، جو پڑھے نہیں جاسکے، لیکن سابق اشاعت کے مقابلہ میں سند کے بہت سے الفاظ اب واضح ہوگئے ہیں،

ترقیمہ اور مذکورہ سند کے صفحہ ختم ہوجانے کے بعد اس کی پشت پر (غالباً) خود مولانا معین ابن محمود کشمیری کے قلم سے ایک دوسری سند درج ہے، جو محدثین کے طریقہ کے مطابق حدیث مسلسل کی سند ہے، مگر اس کی دو ایک ابتدائی سطریں پڑھنے میں نہیں آسکیں، باقی حصہ جو ایقرأ ہے وہ اس طرح ہے :۔

....

..... بسرعة لکن عادة مشائخ الحدیث ان یکتبوا بعد کتابة الاسناد الاجازة حدیثا مسلسلا، اردت ...... الاجازة حدیثا کذا، فاخترت حدیث الراحمون یرحمهم الرحمن رجاء ان یرحمنی الله تعالیٰ برکة فکتب الاستاذ .... ملاحیدر قال حدثنی شیخی وسیدی حافظ الوقت الشیخ الموفق

عبدالحق بن سیف الدین الدہلوی، نفعنا اللہ . . . . عن الاحادیث
المسلسلۃ، قال حدثنا الشیخ الصالح الموفق عبدالوہاب بن فتح اللہ الروی
احد الفقراء الشیخ عبدالوہاب . . . . . وہو اول حدیث سمعتہ منہ، قال
حدثنا شیخنا الامام العلامۃ الشیخ الکبیر محمد بن افلح الیمنی وہو اول حدیث
سمعتہ منہ، قال حدثنا العلامۃ وحید الدین عبدالرحمٰن بن ابراہیم العلوی
وہو اول حدیث سمعتہ، قال حدثنی شیخنا الامام شمس الدین السخاوی
. . . . وہو اول حدیث سمعتہ منہ، قال حدثنی جماعۃ کثیرون جداً، اجلہم
علماً وعملاً . . . . . شیخی الاستاذ الحجۃ الناقد، شیخ مشائخ الاسلام
حافظ العصر ابوالفضل احمد بن علی العسقلانی الشافعی، عرف بابن حجر سماعاً
من لفظہ وحفظہ وہو اول حدیث سمعتہ منہ، قال حدثنی بہ حافظ الوقت
ابوالفضل عبدالرحیم بن الحسن العراقی وہو اول حدیث سمعتہ منہ، قال ح د
اخبرنی بہ غالباً الشیخ شمس الدین بن احمد . . . . التدمری اجازۃ وہو
اول حدیث رویتہ عنہ، قال وہو العراقی قال حدثنا بہ المقتدر ابوالفتح
محمد بن محمد بن ابراہیم . . . . . . وہو اول حدیث قال العراقی
سمعتہ منہ، وقال التدمری حضرتہ عندہ، قال حدثنا بہ النجیب
ابوالفرج عبداللطیف بن عبدالمنعم . . . . . اول حدیث سمعتہ منہ حدثنا
بہ الحافظ ابوالنصر عبدالرحمٰن بن علی الجوزی وہو اول حدیث سمعتہ منہ
قال حدثنا بہ ابوسعید . . . . صالح احمد بن عبدالملک النیسابوری وہو
اول حدیث سمعتہ منہ، قال حدثنا بہ ابوطاہر محمد بن محمد بن محمد بن الہادی

وھواول . . . . منه، قال حدثنا به ابوحامد بن محمد بن یحییٰ البزاز

وھواول حدیث سمعته منه، قال حدثنا به سفیان بن عیینه وھواول . .

. . . . منه سفیان عن عمرو بن دینار عن ابی قابوس، مولیٰ عبداللہ

بن عمرو بن العاص عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھما اجمعین (عن

رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم) قال، الراحمون، یرحمھم الرحمٰن

تبارک وتعالیٰ، ارحموا من فی الارض، یرحمکم من فی السماء "

مذکورہ بالا اسنادات اور ترقیمے سے اس بات کا پوری طرح اندازہ بلکہ یقین ہوجاتا ہے کہ یہ دونوں جلدیں ایک ہی سلسلہ کی کڑی ہیں، اور مولانا معین بن محمود کشمیری کی ملکیت میں رہی ہیں، اور جس طرح جلد اول کا باقی حصہ (جس پر سابق مضمون شائع ہوچکا ہے) انھوں نے دوسرے کاتب سے نقل کرا کے تصحیح کی تھی، اسی طرح یہ جلد بھی دوسرے کاتب سے لکھوا کر تصحیح کی گئی بلکہ اسکے آخر اپنے استاذ مولانا حیدر سندی کی گئی ہے، اگر ایسی بات ہے تو پہلی جلد کے باقی حصہ کو کاتب بھی عبدالرحیم ہی جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا، خط بھی دونوں جلدوں کے ملتے جلتے ہیں، اسیطرح دونوں جلدیں مکمل ہوجاتی ہیں

اس موقع پر اس طویل تحریر کا یہاں بطور یادگار نقل کیا جانا ضروری معلوم ہوتا ہے جو مولانا معین نے جلد اول کے آخر میں لکھی ہے اور اس وقت مضمون کی طوالت کے پیش نظر نقل نہیں کی گئی تھی، جس کا حوالہ شائع شدہ مضمون میں ص۲۲۶ و ص۲۲۷ پر دیا گیا ہے،

شائع شدہ مضمون میں ص۲۲۶ پر یہ بھی واضح کردیا گیا ہے کہ اس تحریر کی ابتداء میں بالائی حصہ پر وہ قطعہ اور مہر درج ہے جس کی اشاعت ہوچکی، اس کے بعد مذکورہ طویل تحریر اس طرح پر ہے :-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وبه نستعین یا معین ـــ الحمد للہ الذی

وفقنا لتصحیح کتاب بخاری وتحشیه وتلاوة احادیث رسوله وحبیبه صدر
الموجودات ونبذ المخلوقات محمد المحمودیة اقواله وافعاله صلی الله علیه وسلم
وعلی آله واصحابه حملة علومه و . . . . آدابه، اما بعد فیقول افقر عباد الله
الغنی معین الدین خاوند بن قدوة مشائخ الدین والعلماء الربانیین
خواجه خاوند محمود العطاری النقشبندی العلوی الحسنی الحصاری البخاری
لما کان کتاب صحیح البخاری اصح کتب الحدیث، بل لا کتاب تحت ادیم السماء بعد
کتاب الله اصح منه واجمع لاحادیث النبویة وانفع لطالب منافع الاخرویة
تعلق الخاطر الفاتر بقرائته وتصحیح لفظه وروایته . . . . لکتابة حواشیه
رجاء ان یکون عاملا بما فیه من العلوم فی الدنیا وداخلا فی زمرة العلماء
. . . . فلما تمت کتابة بعضها الاول بید الفقیر . . . . جز
جدول الذهب، مع رسالة اخری . . . . . . عشرین جزواً واحد جزء فراه
. . . . عشرین، وباقیها بید الکاتب، ولکن کتبت مع جمع حواشیه من
اوله الی آخره مع تصحیح لغات . . . . . کاملة، واردت ان وفقنی الله
تعالی ان یطوف به بیت العتیق، زادها الله شرفاً . . . . . . النبی الامی
صلی الله علیه وسلم والازم علماء مدینة الرسول علیه افضل الصلوة
واکمل التحیات، فاقرأ عند عالم من علماء المدینة بعضا منه، حتی یجی
لی اجازة بعد اجازة، والتمس ان یکون هذا الکتاب وقفا عنده حتی یا
من شاء متی شاء من اهل العلم، وارجو ان لا ینسونی فی دعواتهم اما
مع احبائی واولادی فی خلواتهم وجلواتهم، رضی الله عنهم وعنا ء

احبابنا، اٰمین یارب العالمین، و بعلمی ان لا وسیلۃ لی الی سدتہ المنیعۃ
و بابہ العلی، غیر تصحیح ھٰذا الکتاب و تحشیہ، جعلتہ وقنا لمرضات
ربی و مرضات رسولہ صلی اللہ علیہ وسلم و نرجو بشفاعۃ حبیبہ
علیہ الصلوٰۃ والسلام وان لم یکن من حیث تصحی لائقا لجنابہ، رجاء
ان یتوجہ اللہ الکریم و یقبل بہ الیّ و سیسمی باسمی و یذکرنی بلسانہ
الشریف علیہ الصلوٰۃ والصلوات بعدد قطرات الامطار و بعدد اوراق
الاشجار، و بعدد دواب البراری والبحار و بعدد رمل البراری والبحار
و بعدد کل ذرۃ الف الف مرۃ۔ اللّٰھمّ اجعلنا من محبیہ و محبی محبیہ
واجعل حبہ احب الاشیاء عندنا و من انفسنا و من اھلنا واموالنا و
اولادنا واغفر ذنوبنا واستر عیوبنا، ببرکۃ تصحیح احادیث رسولک
الکریم و نبیک العظیم واجعلنا. . . . . فی الحیاۃ و بعد الممات
وادخلنا جنتک فی جوار اولیائک و اٰبائنا الکرام، اٰمین اٰمین یا
رب العالمین“

اس کے بعد مولانا حیدر کشمیری کی دی ہوئی مذکورۂ بالا سند نقل کی گئی ہے، جو سابق مضمون
میں بھی شائع ہو چکی ہے، لیکن اس سند کو نقل کرنے سے پہلے عنوان اس طرح دیا گیا ہے:-

”طریق اجازۃ الاحادیث من استاذی مولانا علامۃ الدھر ملا حیدر
نور اللہ مضجعہ بھٰذا الطریق“

اس کے بعد بسم اللہ کے ساتھ وہ سند شروع ہو جاتی ہے جس کی اصل مولانا حیدر کے قلم
سے جلد ثانی کے آخر میں ہے، اور جب جلد اول کے ختم پر مولانا معین نے مذکورہ نوٹ کے ساتھ

درج کی ہے، مذکورۂ بالا دعائیہ الفاظ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جلد اول کا مذکورہ بالا نوٹ مولانا حیدر کے انتقال کے بعد دیا گیا ہے۔ مولانا حیدر نے مذکورہ سند ۱۰۵۲ھ/۱۶۴۲ء میں دی ہے اور ۱۰۵۷ھ/۱۶۴۷ء میں اُن کا انتقال ہو گیا، مولانا معین بن محمود کا انتقال ۱۰۸۵ھ/۱۶۷۴ء میں ہوا ہے، اس لئے استاذ گرامی کا انتقال ہو جانے کے بعد ہی مولانا معین نے جلد اول کے آخر میں مذکورۂ بالا نوٹ دیدیا ہوگا تاکہ یادگار رہے،

اس سلسلہ کی دوسری جلد دستیاب ہو جانے کے بعد وہ تمام شبہات اور احتمالات تو ختم ہو گئے۔ جو مذکورہ مضمون میں معارف کے صـ۲۲۹ پر تحریر کئے گئے تھے، البتہ یہ بات ابتک معلوم نہیں ہوسکی کہ مولانا معین بن محمود ان جلدوں کو مدینہ طیبہ لے جاسکے یا نہیں، غالباً نہیں لے جاسکے، اگر لے گئے ہوتے تو علمائے مدینہ میں سے کسی کی سند ان جلدوں میں سے کسی جلد پر ضرور ہوتی، یا کسی طرح کا نوٹ ہی درج ہوتا، لیکن ان جلدوں میں سے کسی جلد پر بھی اس طرح کی باتوں کا نہ ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ جلدیں ہندوستان ہی میں رہیں، جو یا تو شاہی کتب خانوں میں داخل ہو گئیں یا علماء کے زیر مطالعہ رہیں،

ہر دو جلد کے دیکھنے اور مطالعہ کرنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دونوں جلدوں کے ہر ہر صفحے کے بالائی حصے کی ایک سطر تو محو کی گئی ہے، بغور دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً ہر ہر صفحہ کے بالائی حصہ پر "الوقف" لکھا گیا تھا، جسے ہر صفحے سے محو کیا گیا ہے، بعض اور قرائن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، والعلم عند اللہ،

مذہبی رواداری جلد دوم

یہ سلسلۂ مذہبی رواداری کی دوسری جلد ہے، مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔

قیمت — ۱۰

معارف کی بیرونی ڈاک

فرینک فرٹ ۔ جرمنی
یکم دسمبر ۱۹۸۳ء

مخدوم و محترم گرامی قدر جناب سید صباح الدین صاحب ۔ سلام و رحمت

بحمداللہ زندہ ہوں ، امید کہ آپ اچھے ہوں گے ، بین الاقوامی میڈیکل سمینار میں شرکت کے بعد واپسی میں پھر جرمنی کے فرینک فرٹ سے گذر رہا ہوں ، یہاں آپ کی لندن کی ڈائری یاد آئی جس میں فرینک فرٹ کا ذکر تھا ، میں جب بھی جرمنی آیا ، یا آتا ہوں ، تو دو عالمی جنگوں کی ہولناکیاں ، بمباریوں کی بازگشتیں اور ہولناکیاں دیکھتا ہوں ، بیواؤں کی آہوں یتیموں کی ہچکیوں اور نیم جانوں کی سسکیوں کے سوا کچھ اور سنائی نہیں دیتا ، دوسری جنگ تو یاد ہے ، جب اہل جرمنی زندگی کے لیے موت اور آبادی کے لیے ویرانی کے دیوبن کر اپنی سرزمین سے نکلے تھے ، اور اپنی مسیحی برادری کو للکارا تھا ، اور پھر سالہا سال دونوں خاک و خون میں لت پت کشتی لڑتے رہے ، آج بھی مسیحی عالم کے افق کی سرخی میں انسانی خون کی گھلاوٹ و ملاوٹ موجود ہے ، اس شفق میں کتنی ماؤں کے لال سو رہے ہیں ، کتنی بیواؤں کے شوہروں کی آرزوئیں تڑپ رہی ہیں ، اور کتنے یتیموں کی بربادیوں کی داستانیں گونج رہی ہیں ، غروب آفتاب کے وقت اس کی سرخیوں میں جھانک کر دیکھیے ، غروب انسانیت کی جھلکیاں نظر آئیں گی ، اب تو تیسری عالمگیر جنگ کے لیے روس و امریکہ تال ٹھونک رہے ہیں ، اور مظلوم انسانیت سہمی ہوئی ڈری ہوئی کانپ رہی ہے ، یہ ہے اس قوم کی داستان جو اسلام کے خلاف پروپگنڈا میں مصروف ہے ،

ہیں کے قلمی ٹھیکہ دار یعنی مستشرقین "اسلام تلوار کے زور سے پھیلا، اسلام ایسا ہے، اسلام ایسا ہے" کے نعرے بلند کرتے رہتے ہیں، مگر وہ اپنے گریبان میں منھ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ کس قدر آلودہ اور داغدار ہے خود ان کی اپنی کہانی،

مذیکل سیمینار میں ہم نے اپنے مقالے میں مستشرقین اور طب اسلامی، نیز عربی اور فارسی کے طبی ...طات کے بارہ میں ان کی منفیانہ پالیسی پر روشنی ڈالی، جو طب اسلامی کو جادو ٹونا سے زیادہ اہمیت ...دیتے، حالانکہ درحقیقت انھوں نے طب اسلامی سے ہی اپنی ابتدا کی ہے، اور ابن سینا ...نون ۱۶۵۰ء تک مغربی جامعات کے نصاب کا جزو لاینفک تھا، بہرحال احسان فراموشی کا گلہ ہی بیکار ہے، چونکہ ہمارا موضوع بالکل نیا تھا، اور اس پر صرف میرا ہی مقالہ تھا، اس لیے ...عین میں غیر معمولی دلچسپی پیدا ہوئی، اور وہ یہ سنکر متحیر رہے کہ مستشرقین کا رویہ اس قدر ...اندر رہا ہے، ہم نے بعض تجاویز بھی پیش کیں، مثلاً مستقل کانفرنسوں میں اسلامی طبی خدمات ...ملاء طب اسلامی کی خدمات کو منظر عام پر لایا جائے، تاکہ نئی مسلم پود کے اندر خود اعتمادی ہو، اور وہ ماضی میں اعتماد کے ساتھ حال اور مستقبل کی تشکیل و تکوین کے لیے تیز گام ہو سکے،

ریعا کن تاریخ را پایندہ شو   از نفسہاے رمیدہ زندہ شو

مشکن اے خواہی حیات لازوال   رشتۂ ماضی ز استقبال و حال تو

...ہاں ہمارا مقالہ اعظم گڈھ کی کانفرنس "اسلام اور مستشرقین" کی توسیعاتی اسکیم کا ایک حصہ تھا،

مذیکل سیمینار میں دنیا کے ۶۷ ملکوں کے ماہرین طب تشریف لائے، نیوکلیر مڈسن کے ...یا بھی پیش پیش نظر آئے، بے شمار مقالات پیش کیے گیے، نوع بہ نوع خیالات منظر عام پر ...ے، اس کانفرنس کا سب سے اہم حصہ وہ تھا، جس میں مغربی دنیا بلکہ مغربی تہذیب کے بیمار ...شرہ میں سسکتی ہوئی انسانیت کس طرح دم توڑ رہی ہے، کے موضوع پر بحث کی گئی، منشیات

کی آفت، جنسیات کی لعنت نے جسم انسانی کو کس طرح کھوکھلا کر دیا ہے، اور اس کی لعنتوں نے ذہن
انسانی کو کس قدر مفلوج کر دیا ہے، اور اس سے سارا عالم کس طرح متاثر ہوا ہے، اور ہو رہا ہے
وغیرہ، مضامین اسناد و دستاویزات کی روشنی میں سامنے لائے گئے، مقالات پیش کرنے والوں
میں مسلمان، عیسائی اور دیگر مذاہب کے لوگ بھی تھے، ایشیا اور یورپ وامریکہ کے معروف ڈاکٹر
پروفیسر، سرجن، معالج اور ریسرچ اسکالر اس میں شریک تھے، اس میڈیکل سیمینار کے پیچھے جو ذہن
کارفرما تھا، وہ یہ کہ انبیائے کرام روحانی ڈاکٹر کی حیثیت سے عالم میں تشریف لائے، اور انسانیت
کے امراض کا روحانی علاج پیش کیا، طبیب اور میڈیکل ڈاکٹر جسمانی معالج کی حیثیت سے معاشرہ
کی بیماریوں کو دور کرنے کے ذمہ دار ہیں، مگر روحانی ذمہ داریوں سے سبکدوش نہیں ہو سکتے، یا
محض پیشہ ورانہ ذہن کے ساتھ فن طب کو کسب معاش کے لیے استعمال نہیں کر سکتے، نہ ہی تمام طبی
سہولتیں محض امراء کے لیے مخصوص کی جا سکتی ہیں، اور غرباء ان سے محروم رکھے جا سکتے ہیں، جیسا
کہ آج ہو رہا ہے، یعنی گراں دواؤں اور علاج و معالجہ سے صرف امراء ہی استفادہ کرتے ہیں
یا کر سکتے ہیں، غریب کی رسائی وہاں تک ممکن نہیں ہے، غرباء اور کمزوروں کے ساتھ طبی انصاف
انسانیت کا تقاضا ہے، اور امراء کی مونوپلی کی پالیسی قابل مذمت ہے، سیمینار کا دوسرا موقف
جو کھل کر سامنے آیا، وہ یہ تھا کہ جنسی انتشار اور فواحش و منکرات کی کثرت نے معاشرہ میں
طاعون یا ہیضہ کی صورت اختیار کر لی ہے، اس کا حل اسی وقت ممکن ہے، جب انسان قانون
الٰہی کا پابند ہو، اور مرد و زن کے تعلقات حدود اسلامی کے اندر ہوں، آج کی نام نہاد تہذیب
جو اقدام اور روشن خیالی کا دعویٰ کرتی ہے، جرائم اور بدکاریوں کی روک تھام و کر سکی جنسی امراض
کی تفصیلات، سفلس اور گونوریا کی کثرت اور ان کے انسداد سے حکومت کی بے بسی اور قومی
دولت کے اسراف پر یورپ کے اطباء نے روشنی ڈالی، ان امراض کے انسداد کے لیے سالانہ

بحث اور قومی دولت کا بڑا حصہ صرف ہو رہا ہے، معصیت اور گناہ کرنے والوں کے پیدا کردہ مصائب میں قومی دولت کا زیاں ناقابل برداشت ہے ــــــــ یہی لعنت اب مشرق میں بھی پھیلتی جا رہی ہے۔ بحث کا خلاصہ یہی نکلا کہ قانون الٰہی سے سرتابی کا یہی نتیجہ ہے، یہی روحانی اور جسمانی صحت کے زوال کا اصل سبب بھی ہے، اس امر کا انکشاف بھی ہوا کہ سوزاک اور آتشک جو پہلے قدیم تہذیبوں کے امراض تصور کیے جاتے تھے، آج تہذیب نوی کے امام امریکہ کا اصل مرض بن گیا ہے، ان امراض کے شکار والدین کے بچے۔ معصوم اور بے گناہ۔ بے شمار امراض اپنے خون و جگر میں لے کر پیدا ہو رہے ہیں، اس کی روک تھام کے لیے قومی دولت کا بڑا حصہ صرف ہو رہا ہے، مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والی بات صادق ہے، اعداد و شمار کے مطابق امریکی ڈاکٹروں نے بتایا کہ دس ملین انسان سالانہ اس مرض کا شکار ہیں یہی حال غیر ازدواجی جنسی تعلقات کی آفات کا ہے، لواطت یا ہوموسکس بھی قدیم تہذیب کی لعنت تھی مگر آج یورپ و امریکہ کی نئی تہذیب کی مقبول تحریک ہے، برطانوی پارلیمنٹ نے برضا اس عمل کو جائز قرار دے دیا ہے، اور امریکہ میں اس کی مخالفت کو غیر قانونی قرار دیا جا رہا ہے، یا دینے کی سعی جاری ہے،

مغربی ممالک کی وزرائے صحت اور طب کی جو رپورٹیں اور اعداد و شمار کانفرنس میں سامنے آئے، وہ روح فرسا تھے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے امراض اب اختیار سے باہر ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور مغرب نے تہذیب کے نام پر ان امراض کو ایشیا اور افریقہ میں بھی برآمد کر دیا ہے۔ افریقہ کے ممالک میں ان امراض نے وہی صورت اختیار کر لی ہے، جو مغربی ممالک کی ہے، افریقہ میں ان امراض کی وجہ سے اسٹرلائزر کی تحریک ایسی چلی ہے کہ افریقی ایک دن اپنی نسل سے ہی محروم ہو جائیں گے، اور بقیہ پس ماندہ آبادی مسیحی دین قبول کر لے گی۔

مغربی تہذیب کی یہ بے بسی فکری و تہذیبی تضاد کا نتیجہ ہے، سبب اور مسبب میں چولی دامن کا ساتھ ہے، ایک طرف ذرایع ابلاغ عامہ اخبارات، مجلات ریڈیو .T.V وغیرہ نے فواحش و منکرات کی اشاعت میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے، جس کے نتائج حسب توقع ظاہر ہو رہے ہیں، دوسری طرف ان امراض کی روک تھام کے لیے سالانہ قومی بجٹ کی بڑی رقم ان امراض کی روک تھام پر صرف ہو رہی ہے، جس میں معصوم عوام کے ٹیکس کی رقم بھی شامل ہے، یہ آفت سبب و مسبب کے درمیان منطقی ربط کا نتیجہ ہے، جب تک امراض کے سبب یا اسباب کا انسداد نہ ہوگا، نتائج یا مسبب ظاہر ہوتے رہیں گے،

خدا کرے اس سمینار کے مثبت اثرات ظاہر ہوں، اس وقت ریڈیو سے سات بجے کی جو خبر سنی، ایسا معلوم ہوا کہ میں فرینک فرٹ میں نہیں، اسرائیل میں بیٹھا ہوا ہوں، یعنی ایک عالمی محاذ ہے جو اسلام، مسلمان اور عربوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔

والسلام

سید حبیب الحق ندوی

مکاتیب شبلی

مزارِ اقبال پر

از جناب جگن ناتھ آزاد صاحب جموں

منزلِ جاناں کو جب یہ دل رواں تھا دوستو
تم کو میں کیسے بتاؤں کیا سماں تھا دوستو

ہر گماں پہنے ہوئے تھا ایک ملبوسِ یقیں
ہر یقیں جاں علاوہ حسنِ گماں تھا دوستو

دل کی ہر دھڑکن مکان و لامکاں پر تھی محیط
ہر نفس رازِ دو عالم کا نشاں تھا دوستو

کیا خبر کس جستجو میں اس قدر آوارہ تھا
دل کہ جو گنجینۂ سرِّ نہاں تھا دوستو

ڈھونڈنے پر بھی نہ ملتا تھا مجھے اپنا وجود
میں تلاشِ دوست میں یوں سرگراں تھا دوستو

مرقدِ اقبال پر حاضر تھی جب دل کی تڑپ
زندگی کا ایک پردہ درمیاں تھا دوستو

قرب نے پیدا کیا تھا خود ہی دوری کا سماں
فاصلہ ورنہ کوئی حائل کہاں تھا دوستو

بے خودی میں جب مرے ہونٹوں نے چوما قبر کو
میرا سینہ سجدہ گاہِ قدسیاں تھا دوستو

روبروئے جلوۂ مرقد، وجودِ کم عیار
زور ناقص شرمسارِ امتحاں تھا دوستو

پردۂ دل میں نہاں تھی تہ بہ تہ جو خامشی
عشق کا وہ بھی اک اندازِ بیاں تھا دوستو

جلوہ گاہِ دوست کا عالم کہوں اب تم سے کیا
جلوہ ہی جلوہ وہاں تھا میں کہاں تھا دوستو

سجدہ گاہِ قدسیاں تھا یا نہ جانے کیا تھا وہ
جو مری نظروں کے آگے آستاں تھا دوستو

دل نے ہر لمحے کو دیکھا اک نرالے رنگ میں
لمحہ لمحہ داستاں در داستاں تھا دوستو

جس کے شعورِ زندگی پر وسعتِ عالم تھی تنگ
فلسفے کا وہ جو بحرِ بیکراں تھا دوستو

سو رہا تھا خاک کے نیچے جہانِ زندگی راز ہستی میری نظروں پر عیاں تھا دوستو

کاش تم بھی میری پلکوں کا نظارہ دیکھتے

یہ نظارہ کہکشاں در کہکشاں تھا دوستو

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

کارنامے ہیں ابھی راز میں دیوانوں کے یہ فسانے ابھی محتاج ہیں عنوانوں کے

پاؤں پڑتے ہیں جدھر بھی ترے دیوانوں کے ذرّے تعظیم کو اٹھتے ہیں بیابانوں کے

آرزو ہی سے ہے دنیائے محبت کا وجود زندگی رقص میں ہے بھیس میں ارمانوں کے

خشک لب، لب بستہ، بہ دل، برہنہ پا، خاک بسر خاص انداز یہی ہیں ترے دیوانوں کے

اُن سفینوں کے مقدر پہ ہنسی آتی ہے آ سکیں جو نہ مقابل کبھی طوفانوں کے

ملتی رہتی ہے ہر وقت گلستاں کی خبر ہم قفس میں بھی ہیں ممنون نگہبانوں کے

دل میں کچھ اور ہے، چہرے سے نمایاں کچھ اور کتنے بدلے ہوئے حالات ہیں انسانوں کے

شمع کی سمت بڑھے جاتے ہیں بے خوف و خطر کوئی دیکھے تو سہی حوصلے پروانوں کے

ہائے وہ قطرۂ بے مایہ کہ جس نے جوہر

پرورش پائی ہے آغوش میں طوفانوں کے

مطبوعات جدیدہ

دعوۃ القرآن تفسیر پارۂ عم　از جناب شمس پیرزادہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۴۰، ہدیہ سات روپیے، پتہ ادارہ دعوۃ القرآن ۹۵ محمد علی روڈ، بمبئی نمبر ۳-۴۰۰۰۰۔

معارف میں ادارۂ دعوۃ القرآن بمبئی کا ذکر پہلے آچکا ہے، جس نے دعوۃ القرآن کے نام سے اردو اور دوسری زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر شایع کرنے کا پروگرام بنایا ہے، دعوۃ القرآن کی پہلی دو جلدوں پر ان صفحات میں ریویو کیا جا چکا ہے، جو ابتدائی پانچ پاروں کے ترجمہ و تفسیر پر مشتمل تھیں، اب بعض وجوہ سے آخری پارہ کی تفسیر شایع کی گئی ہے، یہ مفید تفسیر دینی و تبلیغی جذبہ سے لکھی گئی ہے، اور اس میں غیر ضروری طوالت اور بے جا اختصار سے پرہیز کیا گیا ہے، لایق مصنف نے سلیس اور عام فہم زبان اور دلنشیں انداز اختیار کیا ہے، تاکہ آیتوں کا مفہوم و مدعا بھی واضح ہو جائے، اور قرآن کا دعوتی و استدلالی پہلو بھی پوری طرح سامنے آجائے جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور غیر مسلموں کو بھی تشفی ہو جائے، مصنف پہلے ہر سورہ کے متعلق ایک مختصر نوٹ قلمبند کرتے ہیں، اس میں اس کے زمانۂ نزول، مرکزی مضمون اور سورہ کے مختلف اجزاء میں بیان کیے گئے مضامین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، پھر متن مع ترجمہ نقل کرتے ہیں، اور آخر میں آیتوں کی بقدر ضرورت وضاحت و تشریح کرتے ہیں، مصنف نے ہر سورہ کے نوٹ میں نظم کلام کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، وہ در اصل سورہ کا تجزیہ ہے، جہاں تک سورتوں اور آیتوں کے باہمی

پارہ نظام کا تعلق ہے، اس پر کوئی خاص بحث نہیں کی گئی ہے، انھوں نے سورتوں کے مرکزی مضمون کی وضاحت میں بھی زیادہ غور وفکر سے کام نہیں لیا ہے، دیباچہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں "پارۂ عم کی سورتیں بجز سورۂ نصر کے سب مکی ہیں" (ص۳) حالانکہ انھوں نے سورۃ البینہ اور سورۃ الزلزال کو خود بھی مدنی لکھا ہے، اور عام مفسرین کے نزدیک فلق وناس بھی مدنی سورتیں ہیں، انگریزی عبارتیں بلا ترجمہ نقل کی ہیں، ترجمے میں بھی کور کسر رہ گئی ہے، قرآن کا ترجمہ ٹھیک اصل کے مطابق ہونا چاہیے، توضیحی فقروں اور جملوں کو قوسین میں لکھنا چاہیے، مگر مصنف نے اس کا خیال نہیں کیا ہے، جیسے کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ میں پہلے کلا کا ترجمہ "ان کی باتیں غلط ہیں" اور دوسرے کا "پھر سن لو ان کے خیالات باطل ہیں"۔ (ص۶) دونوں جگہ کلا کا ترجمہ ہی نہیں کیا گیا ہے، اور جو ترجمہ کیا ہے، اس کی حیثیت توضیحی ہے، جسے قوسین میں ہونا چاہیے تھا، مگر یہ غیر ضروری سا ہے، یہی بے احتیاطی مندرجۂ ذیل آیتوں کے خط کشیدہ ترجمے میں بھی کی گئی ہے، کَاَنَّھُمْ یَوْمَ یَرَوْنَھَا الخ (جس روز وہ اسے دیکھ لیں گے تو انھیں ایسا محسوس ہوگا) (ص۲۲) فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّۃُ (پھر جب وہ کانوں کو بہرا کر دینے والی آواز گرجے گی) (ص۲۸)، اس میں جَآءَتْ کا ترجمہ "گرجے گی" کے بجائے "آئے گی" ہونا چاہیے تھا، فَاَثَرْنَ بِہٖ نَقْعًا (اور اس تگ ودو سے غبار اڑاتے ہیں) (ص۱۵۶) مندرجۂ ذیل خط کشیدہ ترجمے محل نظر ہیں:۔ جَزَآءً مِّنْ رَّبِّکَ عَطَآءً حِسَابًا (یہ تمہارے رب کی طرف سے جزا ہوگی اور کافی انعام) (ص۱۰) ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰی (پھر پلٹا اور مخالفت میں سرگرم ہوگیا) (ص۱۸) بعض جگہ مفہوم چاہے صحیح ہو لیکن ترجمہ میں الفاظ کی رعایت نہیں کی گئی ہے، مثلاً وَاَخْرَجَ ضُحٰھَا (اور اس کا دن نکالا) (ص۱۸) وَالضُّحٰی (قسم ہے روز روشن کی) (ص۱۱۸) ضحیٰ کا صحیح ترجمہ دھوپ اور دھوپ چڑھنے کا وقت ہے وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ (اور جب لوگوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ دیا جائے گا) (ص۳۴)

وَالْفَشَاوِحَاتِ اَلشَّمِیْعِ (قسم ہے آسمان کی جو بارش برساتا ہے) (ص ۱۱) مصنف نے ایک لفظ کا جو ترجمہ کیا ہو اسی لفظ کا دوسری جگہ اس سے مختلف کر دیا ہے، مثلاً وَمَا یُدْرِیْکَ لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰی میں یزکّی کا ترجمہ کیا ہے، (وہ پاکیزگی حاصل کرتا) (ص ۲۶) اور وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی میں یزکی کا ترجمہ کیا ہے (حالانکہ اس کے اصلاح قبول نہ کرنے کی ...) عام مترجمین و مفسرین نے نازعات وغیرہ صفتوں کا موصوف فرشتوں کو مانا ہے، مصنف کے نزدیک ان کا موصوف ہوائیں ہیں، مگر انھوں نے وَالسَّابِحَاتِ سَبْحًا کا یہ ترجمہ کیا ہے (ان کی جو سبک رفتار ہیں) حالانکہ سبح کے معنی تیرنا ہیں، اس سے خیال ہوتا ہے کہ نازعات و ناشطات کا موصوف ہوائیں ماننا تو درست ہے مگر آخر الذکر صفتوں کا موصوف ہواؤں کے بجائے بادل ہوں گے، اس طرح کی غلطیاں اور بھی ہیں، قرآن کے ترجمہ و تفسیر کا کام بڑا نازک ہے، اس لیے اس میں مکمل احتیاط بہت ضروری ہے۔

ایران اور مصر میں کتب سوزی :۔ تالیف استاد مرتضیٰ مطہری شہید، مترجمہ جناب سید عارف نوشاہی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۴۴، قیمت دس روپیے، پتہ :۔ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان ۴۶۔ اے سٹیلائٹ ٹاؤن، راولپنڈی، پاکستان۔

کتب سوزی اور کتب خانوں کی بربادی کا الزام مدتوں سے مسلمانوں کے سر لگایا آتا ہے، یورپین مورخین نے اس بے اصل قصہ کو اس قدر شہرت دی کہ خود مسلمان بھی اسے صحیح باور کرنے لگے، تا آنکہ متکلم اسلام علامہ شبلیؒ نے ان کے کذب و افترا اور فریب و تدلیس کی ساری عمارت ہی منہدم کر دی، زیر نظر کتاب میں اسکندریہ کے علاوہ ایران میں بھی مسلمانوں کے ہاتھوں کتبخانوں کی بربادی کے الزام کا جواب دیا گیا ہے، لائق مصنف نے پہلے الزام عائد کرنے والوں کے دلائل

پیش کیے ہیں، پھر اسکندریہ اور ایران میں کتب سوزی کے واقعات کو جعلی اور مہمل ثابت کیا ہے، یہ کتاب ایک ایرانی فاضل استاذ مرتضیٰ مطہری کی تصنیف ہے، جو ایران کے موجودہ انقلاب کے پرجوش حامی اور امام خمینی کے شاگرد ہیں، پاکستان کے اہل قلم جناب عارف نوشاہی نے کتاب کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے، ان کے قلم سے شروع میں ایک مقدمہ اور آخر میں حواشی بھی ہیں، مقدمہ میں مصنف کے حالات اور ان کی علمی و سیاسی خدمات کا مختصر تذکرہ ہے، اس کتاب میں علامہ شبلیؒ کے مقالہ سے زیادہ مدد لی گئی ہے، جو فارسی میں چھپ چکا ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے اہم ہے کہ اس میں ایک شیعی عالم نے خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ فاروق کی جانب منسوب الزام کی غیر جانبداری سے تردید کی ہے۔

مآثر فاروقی: مرتبہ جناب محمد عبدالرشید صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۴، قیمت چار روپے، پتہ: ایم۔ اے۔ رشید ریٹائرڈ لکچرار، ۳/۶۳، پریم نگر، کانپور۔

اردو میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی مبسوط اور مختصر سوانح عمریاں شایع ہو چکی ہیں، خصوصاً علامہ شبلیؒ نے اسلام کی اس مایۂ ناز ہستی اور اس کے مدبر عظیم کی شخصیت اور کارناموں کی نہایت شاندار اور دلآویز مرقع آرائی کی ہے، اس نئی کتاب میں بھی خلیفۂ دوم کی مقدس زندگی، پاکیزہ سیرت، اہم اوصاف اور غیر معمولی کمالات کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے، شروع میں عرب کے محل وقوع، حدود اربعہ، حضرت ابراہیمؑ کی حجاز میں تشریف آوری، اور تعمیر کعبہ کے علاوہ قریش میں بت پرستی کے رواج، ان کی تولیت کعبہ اور ان کے قبیلوں کا تذکرہ بھی ہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ کی ولادت، خاندان، تعلیم و تربیت، قبول اسلام اور خلافت کے لئے ان کے انتخاب پر بحث کی ہے اور ان کا سراپا بیان کیا ہے، اور لباس و پوشاک اور ازواج و اولاد کا تذکرہ کیا ہے،

اور بتایا ہے کہ خلافت کے لیے جو اوصاف ضروری تھے، وہ سب ان میں بدرجۂ اتم موجود تھے، پھر حضرت عمرؓ کے اخلاق و عادات کی خوبیاں دکھائی ہیں، اور ان باتوں کو پیش کیا ہے جن سے ان کی عظمت و فضیلت ظاہر ہوتی ہے، مثلاً اصابت رائے، ان کی رائے کے مطابق وحی کا نزول، فہم و اجتہاد، معاملہ فہمی، قیافہ شناسی، مصلحت اندیشی، منصفانہ فیصلہ، حق گوئی، دینی حمیت و جرأت، ایمانی فراست، عبادات میں شغف، حبِ رسول، اتباعِ سنت، زہد، ترکِ لذائذ، مشتبہ چیزوں سے پرہیز، قبولِ حدیث میں شدت احتیاط اور چھان بین، عمال سے بازپرس اور ان کو ہدایات، تواضع و انکسار، شہادت، سخن فہمی اور ذوقِ شعری، ہجو گوئی کی ممانعت اور عرب سے یہود و نصاریٰ کا اخراج وغیرہ، اس کتاب کا مقصد حضرت عمرؓ کی سیرت و کردار کے جلوے دکھانا ہے، اس لیے اس میں ان کے عہد کی فتوحات اور حکومت کے نظم و نسق پر گفتگو نہیں کی گئی ہے، مصنف نے احادیث و آثار کی مدد سے سیرتِ فاروقی کے اہم اور نمایاں پہلو بیان کیے ہیں، گو یہ واقعات عام کتابوں میں بھی درج ہیں، مگر ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است، مصنف کے دلکش انداز نے تازگی اور جدت کا لطف پیدا کر دیا ہے، مگر جمع و تالیف حدیث کے متعلق ان کا یہ بیان صحیح نہیں ہے کہ "احادیث کی جمع و تالیف کا کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً سو سال بعد ... ہوا، امام مالک بن انسؒ پہلے محدث ہیں جنہوں نے حدیث کی سب سے پہلی مستند کتاب مؤطا تالیف کی،" (ص ۳۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں آپ کی احادیث کی جمع و تالیف تحریری صورت میں عمل میں نہیں آئی تھی، (ص ۳۸)

قربانی مرتبہ اظہر علی فاروقی، متوسط تقطیع، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۸، قیمت ۲ روپے، پتہ اظہر علی فاروقی، ۸۸۴ ہ - دریاباد، الہ آباد ۳

اس کتاب میں قربانی کے مسائل، ماہ ذی الحجہ کے فضائل اور عید الاضحیٰ اور ایام تشریق کے مسنون اعمال بیان کیے ہیں، اور دکھایا ہے کہ قربانی سے دنیا کا کوئی مذہب خالی نہیں، اسلام نے اور چیزوں کی طرح اسے بھی مشرکانہ اعمال سے پاک کیا، آخر میں بقر عید اور بعض دوسرے تہواروں کے اندر داخل موجودہ غلط رسم و رواج سے بچنے کی تلقین کی ہے" ص

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

مسلمان سلاطین کے عہد میں ہندوستان کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ان کی فتوحات سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی رہیں، خود ہندوستان کے مختلف فرماں روا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مسلمانوں نے باہر سے آکر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہو کر رہی، لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، مصنف نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کیمپ اور مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت ۲۲-۰۰ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

منیجر

جلد ۱۳۳ ماہ ربیع الثانی سنہ ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ فروری سنہ ۱۹۸۴ء عدد ۲

مضامین

مقالات

وفیات

۰۰۰۰۰

شذرات

۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ ماسٹرز آف ایجوکیشن اینڈ ٹریننگ کے زیر اہتمام پاکستان کے نامور دانشور جناب سید حسام الدین راشدی پر ایک میموریل لکچر دینے میں خوشی محسوس کی،

جناب سید حسام الدین راشدی کی وفات اپریل ۱۹۸۲ء میں ہوئی، ان کی یاد میں کراچی یونیورسٹی میں میموریل لکچر کا ایک بورڈ قائم ہوا ہے اس کا پہلا لکچر ہارورڈ یونیورسٹی کی این میری شمیل نے دیا تھا، دوسرے لکچر کے لئے راقم کو اس لئے دعوت دی گئی کہ مرحوم سے ۱۹۵۵ء سے بڑے گہرے تعلقات تھے، اس میموریل لکچر کے بورڈ کے صدر جناب حکیم محمد سعید (ہمدرد دواخانہ والے) ہیں اور اس کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ریاض الاسلام ہیں جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں قائد اعظم محمد علی جناح چیئر کے وزیٹنگ پروفیسر ہیں، یہ لکچر اردو لغت بورڈ کے نئے ہال میں ہوا، جو اس کی پہلی تقریب تھی مجمع بہت ہی منتخب تھا، یونیورسٹی کے اساتذہ کے علاوہ شہر کے اکابر اور ارباب علم کی بھی شرکت تھی، اس کی صدارت جناب حکیم محمد سعید نے کی جناب جمیل جالبی وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے، ڈاکٹر ریاض الاسلام اردو لغت بورڈ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے ساتھ اہتمام میں ہر طرف سرگرم نظر آرہے تھے،

سید حسام الدین راشدی مرحوم نے حسب ذیل کتابیں اردو، سندھی اور فارسی میں ایڈٹ کیں یا لکھیں (۱) مولانا محب اللہ سندھی، (۲) سندھی ادب (۳) مہران جون ماؤجون (۴) مثنوی چاہ نامہ از ادراکی بیگلار (۵) مقالات الشعراء از قانع ٹھٹھوی، (۶) مثنوی مظہر الآثار (۷) تکملہ مقالات الشعراء از مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی (۸) قصائد و مثنویات از قانع ٹھٹھوی (۹) تذکرۂ امیر خانی (۱۰) مثنویات ہشت بہشت از عطا ٹھٹھوی (۱۱) تاریخ مظہر شاہجہانی از یوسف میرک (۱۲) منشور الوصیت از جہانیان نور محمد (۱۳) تاریخ ترخان نامہ (۱۴) بیگلار نامہ (۱۵) تذکرہ حدیقۃ الاولیاء از عبد القادر ٹھٹھوی، (۱۹-۱۴)

تذکرۂ شعرائے کشمیر جلد اول، دوم، سوم، چہارم (۲۰) تذکرہ روضۃ السلاطین از فخری ہروی (۲۱) جواہر العجائب از فخری ہروی (۲۲) دیوان فخری ہروی (۲۳) مدد چراغ محفل (۲۴) میر محمد معصوم بھکری،

مقالہ میں ان کتابوں پر پورا تبصرہ کیا گیا تھا، یہ وہ کتابیں ہیں جن کی کیفیت اور کمیت سے متاثر ہو کر نظر ان کے مصنف کو پاکستان کے علم و فن کا شاہزادہ کہنے میں تامل نہ کریں گے، ان میں جو کتابیں ایڈٹ کی گئی ہیں ان میں جس جانکاہی اور جگر کاوی سے ان کے لئے مقدمے، حواشی اور تعلیقات قلمبند کئے گئے ہیں وہ ان اہل قلم کے لئے ایک درس ہے جو غیر معمولی محنت و ریاضت کرنے کے بجائے اپنے قلم کی گلکاری اور ظاہری صنعت گری دکھا کر مطمئن ہو جاتے ہیں، ان کتابوں میں سندھ اور خصوصاً ٹھٹھہ کے گذشتہ علمی، ادبی، تاریخی اور آثاری کارناموں کو روشن کرنے میں مصنف نے جو اپنا جذبہ دکھلایا ہے اس کو یاد کر کے لوگ برابر یہ کہہ اٹھیں گے،

ان کے گئے یہ دل کی خرابی نہ پوچھئے ... جیسے کسی کا کوئی نگر ہو لٹا ہوا،

مقالہ پونے دو گھنٹے میں ختم ہوا، حاضرین بڑی خاموشی اور دلچسپی سے اس کو سنتے رہے جو مقالہ نگار کی محنت کا اصلی صلہ تھا، آخر میں جناب حکیم محمد سعید، جناب جمیل جالبی، ڈاکٹر ریاض الاسلام اور ڈاکٹر ابو اللیث نے جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم کو اپنا اپنا خراج عقیدت پیش کیا، یہ مقالہ آئندہ ان میموریل لکچرز کے سلسلہ میں شائع کیا جائے گا،

ہمدرد فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ۱۴ سے ۱۸ دسمبر ۱۹۸۳ء تک انٹرکونٹی نینٹل ہوٹل میں مذاکرہ علمی تعلیمات نبوی، تصور سیاست اسلامی کے عنوان سے بڑی صاف ستھری اور گرما گرم محفلیں ہوتی رہیں، ان میں مشغولیت کی تفصیلی روداد آئندہ معارف کی اشاعت میں آئے گی،

---

۲۹ دسمبر ۱۹۸۳ء کو حیدر آباد کے سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے بھی جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم پر ایک دوسرا لکچر دینے کے لئے مدعو کیا گیا، حیدر آباد کا سفر کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے مشہور استاد ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ان کے بڑے بھائی اور رسالہ عمران کے اڈیٹر کی معیت میں ہوا،

وہاں سندھی ادبی بورڈ کے ڈائرکٹر جناب غلام ربانی اور جناب سید حسام الدین راشدی مرحوم کے بھتیجے جناب یٰسین راشدی نے ضیافتانہ اور مخلصانہ میزبانی کے فرائض انجام دیئے، جلسہ حیدرآباد کے شاہی سنٹر میں ہوا، جہاں شہر کے معززین اور ارباب ذوق کا بہت اچھا مجمع تھا، اس کی صدارت تہران یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ قریشی نے کی جو کچھ کراچی یونیورسٹی میں مقالہ کی صورت میں پیش کیا تھا، اس کو یہاں زبانی بیان کیا بعض باتیں تالیوں کی گونج میں سنی گئیں، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پسند کی گئیں، آخر میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر امجد بیگ، ڈاکٹر نجم الاسلام، محمد امجد حسین جیلانی، ڈاکٹر غلام ربانی، اور ڈاکٹر ایس۔ ایم قریشی نے جناب راشدی مرحوم کے علمی کمالات کی تعریف و تحسین کی،

حیدرآباد کے قیام میں سندھ کی مہمان نوازی کے گوناگوں جلوے نظر آئے، سب ہی لوگ ملنے میں بچھے جاتے تھے، سندھ کے مشہور سابق رہنما جناب عبدالمجید سندھی مرحوم کے داماد ڈاکٹر شیخ محمد اسماعیل تو اخلاص و محبت کے پیکر بنے ہوئے تھے، وہ معارف کے بڑے قدرداں ہیں، اس کو ہر طرح کی ریاضت گوارا کر کے برابر منگواتے رہتے ہیں، سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر نبی احمد ہاشمی تو عزیزانہ طور پر ملے، انھوں نے علامہ شبلی پر مقالہ لکھکر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے، پروفیسر غلام مصطفےٰ اور ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے درِ دولت پر بھی حاضری دی،

سندھی ادبی بورڈ کی علمی سرگرمیوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا جس آب و تاب سے اس کی طرف سے سندھی میں کتابیں شائع ہوئی ہیں، وہ لائق تقلید اور قابل تعریف ہیں، سندھ یونیورسٹی کی سندھولوجی کا جو میوزیم ہے وہ تو ہر سیاح کے لئے جاذب توجہ بنا ہوا ہے جس محنت اور خوش سلیقگی سے یہ آراستہ کیا گیا ہے وہ سندھ کی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہے، واپسی میں ٹھٹھہ رک کر جناب راشدی مرحوم کے مزار پر فاتحہ پڑھی، جنھوں نے خود سندھ کے سابق رہنما جناب عبدالمجید سندھی مرحوم کے پہلو میں دفن ہونا پسند کیا تھا، راستہ میں جناب غلام ربانی صاحب نے بہم کی میزبانی کی، اور سندھ کی دیرینہ روایت کے مطابق کراچی تک پہونچا کر واپس ہوئے،

افسوس ہے کہ ۲۰ جنوری ۱۹۸۲ کو ڈاکٹر سعید انصاری کا دہلی میں کینسر کے موذی مرض میں انتقال ہو گیا، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، وہ دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے قدیم رکن تھے، ان شاء اللہ آئندہ ان پر معارف میں مفصل لکھا جائیگا،

مقالات

سیرت نبوی ؐ کے متعلق مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح

مترجمہ ضیاء الدین اصلاحی

(۳)

"الاستاذ نذیر حمدان کی کتاب "الرسول صلی اللہ علیہ وسلم فی کتابات المستشرقین" (رسول اللہ مستشرقین کی کتابوں کے آئینہ میں) کے بعض حصوں کا ترجمہ اس سے پہلے زبرنظر میں کیا جا چکا ہے، اس حصہ میں مستشرقین کی بعض غلطیوں کی تصحیح کی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ؐ کی سیرت کے واقعات کو مسخ کرنے اور انھیں توڑ مروڑ کر کیا سے کیا بنا دینے میں مستشرقین نے کس قدر تلبیس و تدلیس سے کام لیا ہے، ان سے ان کی فتنہ پردازی، بدنیتی اور تعصب کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے، قرآن مجید نے مستشرقین کے پیش رو اہل کتاب کے متعلق جو یہ کہا تھا کہ

يَاأَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ۔ (آل عمران: ۷۱)	اے اہل کتاب تم حق کو باطل میں کیوں گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو کیوں چھپاتے ہو، درآنحالیکہ تم جانتے بھی ہو۔

وضو سحب ۱۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلْوُنَ	اور ان اہل کتاب میں بعض ایسے ہیں
اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ وَمَا هُوَ	کہ کتاب (تورات) کو زبان مروڑ
مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ	مروڑ کر پڑھتے ہیں تاکہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ
مِنْ عِنْدِ اللهِ وَمَا هُوَ مِنْ	پڑھتے ہیں کتاب میں سے ہے حالانکہ وہ کتاب
عِنْدِ اللهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللهِ	میں سے نہیں ہوتا اور کہتے ہیں کہ وہ
الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔	خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے
(آل عمران - ۷۸)	نہیں ہوتا اور خدا پر جان بوجھ کر جھوٹ ۳۳

تو وہ ان مستشرقین پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے۔" "مترجم"

شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی مستشرقین کی غلطیوں کے بارہ میں رقمطراز ہیں ۔

"اسلام اور مسلمانوں کے واقف کار اور ماہر فرنگیوں کی تصنیفات عجیب وغریب اغلاط کا مجموعہ ہوتی ہیں جنھیں دیکھنے اور پڑھنے کے بعد ان سے اور ان کی تحقیقات دونوں سے نفرت اور بدگمانی ہوتی ہے" (مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق ۲۱ - ۳۶۶ ۱۹۴۶ء)

محمد کرد علی نے مستشرقین کی غلطیوں کی متعدد قسمیں بتائی ہیں (۱) لفظی (۲) فکری یاحسی (۳) موضوع سے مصنف کی عدم واقفیت کے نتیجہ میں سرزد ہونے والی غلطیاں، اس قسم کی غلطیاں کرنے والوں کا دار و مدار غیر معتبر کتابوں پر ہوتا ہے، چنانچہ یہ لوگ سفرناموں، افسانوں، ناولوں اور مزاحیہ نگار صحافیوں کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں، حالانکہ ان کتابوں کے مصنفین اپنے قارئین کی دلچسپی کے لیے نادر اور انوکھی باتیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالتے ہیں اور جب اس میں انھیں ناکامی ہوتی ہے تو وہ خود اپنے ذہن وتخیل سے اس طرح کی باتوں کا اختراع کرتے ہیں اور انھیں

حقائق کو پیش کرتے ہیں۔ بعض غلطیاں جان بوجھکر قصد و ارادہ سے کی جاتی ہیں، ان میں دینی عصبیت یا سیاسی غرض کارفرما ہوتی ہے، اور بعض دفعہ بیک وقت ان دونوں ہی باتوں کو دخل ہوتا ہے۔ (مجلۃ المجمع العربی دمشق ۲۱-۳-۱۹۳۶ء)

الغرض تہہ بتہہ اور زبردست غلطیوں کے اسباب و عوامل یہ ہیں۔ علوم و معارف اسلامیہ کی وسعت، مستشرقین کا مبہم انداز بیان، جہالت نیز اسلام و پیغمبر اسلام کے خلاف ان کی سازش و ریشہ دوانی۔ یہ کہنا کہ ہر بحث و تحقیق کرنے والے کی نگاہ سے بعض پہلو مخفی رہ جاتے ہیں اور اس سے سہواً کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں اور کبھی کبھی تو تحقیق کے مقدمہ و بنیاد ہی کے اندر ایسی خرابی اور غلطی راہ پا جاتی ہے۔ جس کے نتیجہ میں صحیح کے ساتھ غلط اور رطب کے ساتھ یابس شامل ہو جاتا ہے۔ پس اگر غلطیوں کے بارہ میں اس سے دوبارہ گفتگو کی جائے اور ان کی نشاندہی کر دی جائے تو بحث و مباحثہ میں شدید اختلاف اور جھگڑے کی نوبت نہ آئے بلکہ وہ حق کی طرف رجوع کرے گا کیونکہ رجوع الی الحق ایک علمی فضیلت و برتری ہے جو علماء و ثقات کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے، مگر مستشرقین عموماً دیدہ و دانستہ ایسی بری غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن کی غرض و غایت اگر تعلیم یافتہ مسلمانوں پر واضح ہو جاتی ہے، اور وہ ان سے انھیں متنبہ کر دیتے ہیں تو وہ کبھی تو معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور کبھی ان غلطیوں پر اصرار کرتے ہیں لیکن اگر یہ لوگ خود مستشرقین کی غلطیوں سے واقف نہ ہو سکے تو ان کی غلطیاں تسلیم شدہ علمی حقائق و مسلمات بن جاتی ہیں جنھیں علمی و ادبی بحث و گفتگو میں بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

عرب محققین میں رافعی، عقاد، کرد علی، جندی اور قطب وغیرہ نے مستشرقین کی بعض غلطیوں کو نمایاں کیا ہے اور خود بعض مستشرقین نے بھی اپنے ساتھیوں کی تاریخی، ادبی، لغوی، دینی اور علمی و فنی غلطیوں کی حقیقت ظاہر کر دی ہے۔

بالقصد اردو کی جانے والی اکثر غلطیاں شکوک و شبہات اور طعن و تشنیع کی حیثیت رکھتی ہیں جن میں خرافات کے علاوہ فتنہ و فساد انگیزی کا بھی دخل ہوتا ہے۔

ذیل میں مستشرقین کی غلطیوں کی بعض مثالیں پیش کی جاتی ہیں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے کی زندگی کے چند واقعات پیش کئے جاتے ہیں، اور آخر میں بعثت کے بعد کے واقعات زندگی کے بارہ میں ان کی بعض غلط بیانیوں کا ذکر کرکے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

۱۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھیل کے بارہ میں غلط بیانی

ادغ لکھتا ہے: "اس اثنا میں کہ محمدؐ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ کھیتوں میں کھیل رہے تھے ...... (سیرت پر مصنف کی کتاب ص ۴۴) اس کے بعد اس نے شق صدر (سینہ مبارک چاک کئے جانے کا واقعہ نقل کیا ہے، حالانکہ وہاں نہ کھیت تھے، اور نہ جھاڑیاں، جیسا کہ سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے، سیرۃ ابن ہشام میں صرف اس قدر ہے کہ "حلیمہ کا بیان ہے کہ ہم انھیں (محمدؐ) کو لیکر جب اپنے گھر لوٹے تو چند ماہ بعد ایک روز وہ اپنے (رضاعی) بھائی کے ساتھ ہمارے گھروں کے پیچھے بھیڑ بکریوں کے گلے میں تھے کہ دفعتہً ان کا بھائی دوڑتا ہوا ہمارے پاس آیا اور مجھ سے اور اپنے باپ سے کہنے لگا کہ "ہمارے قریشی بھائی کو دو آدمیوں نے پکڑ کر ..... (سیرت ابن ہشام جلد ۱ صفحہ ۱۶۳)

اسی مفہوم کی روایت البدایہ والنہایہ میں بھی ہے۔

"حلیمہ فرماتی ہیں کہ ہمارے یہاں آنے کے دو تین ماہ بعد وہ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ بھیڑ کے ریوڑ میں ہمارے گھروں کے پیچھے تھے کہ ان کا بھائی دوڑتا ہوا آیا[1] ... (البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۲۷۵)

---

[1] یہ روایت ابن اسحاق کی ہے، اور محققین کے نزدیک صحیح نہیں ہے مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں "اب صرف وہ روایت جس میں حلیمہ سعدیہ کے ہاں قیام کے زمانہ میں شق صدر کا ذکر ہے، یہ روایت متعدد مختلف سلسلوں سے اور مختلف صحابیوں سے لوگوں نے نقل کی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان میں دو سلسلوں کے علاوہ بقیہ سلسلے صحت اور قوت کا حکم نہیں رکھتے اور ان میں بعض ایسی لغو باتیں شامل ہیں، جو اس کو درجۂ اعتبار سے گرا دیتی ہیں"۔ (سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۴۹۰)

نوجوانی میں بھی اللہ کی جانب سے آپؐ کی مراسمِ شرک وجاہلیت سے حفاظت

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ "محمدؐ کو دو بار خیال ہوا کہ شہر کے طرف میں پہنچ کر شہوت اور نوجوانی کے لطف و لذت سے متمتع ہوں، مگر اچانک ایسی صورت پیش آگئی کہ وہ اس سے باز رہے۔" (ڈرمنگھم کی کتاب ص ۶۹)

صحیح یہ ہے کہ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں امام بیہقی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے جو حضرت علیؓ کی سند سے ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ اہلِ جاہلیت عورتوں کے قصد و ارادہ سے جو کام کیا کرتے تھے، مجھے دو راتوں کے سوا کبھی اس قسم کا جاہلانہ خیال تک نہیں آیا، مگر ان دونوں موقعوں پر بھی اللہ نے میری حفاظت کی۔ ایک رات میں مکہ کے بعض نوجوانوں کے ساتھ تھا، ہم لوگ بکریاں چرا رہے تھے، میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا تم میری بکریاں دیکھتے رہنا تاکہ میں مکہ جاکر قصہ گویوں کی مجلس میں حصہ لوں، چنانچہ جب میں مکہ میں داخل ہوا، اور پہلے ہی گھر کے قریب پہنچا تو وہاں گانے بجانے کی آواز سنی، لوگوں سے دریافت کیا یہ کیا ہو رہا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ فلاں شخص کی فلاں عورت سے شادی ہوئی ہے، میں یہ منظر دیکھنے کے لیے بیٹھا مگر مجھے ایسی نیند آئی کہ سورج نکلنے کے بعد ہی آنکھ کھلی، دوسری شب میں بھی اسی طرح کا واقعہ پیش آیا۔"[1] (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۸۷)

---

[1] یہ روایت نہایت ضعیف ہے، علامہ ابن کثیرؒ نے اسے نقل تو کیا ہے مگر اس کے متعلق صراحت کر دی ہے کہ یہ نہایت غریب ہے اور اسکے بعض سلسلے حضرت علیؓ ہی پر جاکر ختم ہوگئے ہیں یعنی یہ روایت مسند کے بجائے موقوف ہے، صحیح واقعہ علامہ شبلیؒ کے بیان کے مطابق صرف اس قدر تھا کہ عرب میں افسانہ گوئی کا عام رواج تھا، راتوں کو لوگ تمام اشغال سے فارغ ہوکر کسی مقام میں جمع ہوتے تھے، ایک شخص جس کو اس فن میں کمال ہوتا تھا، داستان شروع کرتا تھا، لوگ بڑے ذوق وشوق سے رات رات بھر سنتے تھے، بچپن میں ایک دفعہ آنحضرت صلعم نے بھی اس جلسہ میں شریک ہونا چاہا تھا۔ لیکن اتفاق سے راہ میں شادی کا کوئی جلسہ تھا، دیکھنے کیلئے کھڑے ہوگئے، وہیں نیند آگئی۔ اٹھے تو صبح ہوچکی تھی، ایک دفعہ اور ایسا ہی اتفاق ہوا، اس دن بھی یہی اتفاق پیش آیا، چالیس برس کی مدت میں صرف دو دفعہ اس قسم کا ارادہ کیا لیکن دونوں دفعہ توفیقِ الٰہی نے بچا لیا کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے" (سیرۃ النبیؐ جلد ۱ ص ۱۲۹)۔ مگر یہ نسا، کا لفظ صرف اسی روایت میں ہے حالانکہ روایت میں بیان کئے گئے مفہوم سے اسکی کوئی تائید نہیں ہوتی مولانا شبلیؒ نے سیرت کے حاشیہ میں یہ بھی کی لائف آف محمد صلعم سے یہی لکھا ہے۔ (۱۲۹)

[illegible]

ل ابن اثیر کے الفاظ اس سے مختلف ہیں، ملاحظہ ہوں۔

"جاہلیت کے زمانہ میں لوگ جو کام کرتے تھے میں نے بجز دو بار کے کبھی ان کا قصد و ارادہ نہیں کیا، مگر دونوں بار اللہ تعالیٰ میرے اور اس کام کے درمیان حائل ہو گیا اور پھر میں نے اس طرح کے کام کا کبھی ارادہ نہیں کیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے نبی نبوت سے سرفراز فرمایا۔" (الکامل جلد ۲ ص ۳۱)

طبری کے الفاظ بھی قریب قریب اسی طرح کے ہیں (تاریخ طبری ص ۲۹۱)

۴۔ عبادت نبویؐ ڈاکٹر منگمری واٹ نے آپؐ کی عبادت کے متعلق بھی یہ غلط بیانی کی ہے کہ آپؐ نے عزیٰ کے نام پر ایک سفید بکری کی قربانی کی تھی،[۱] مگر سیرت ابن ہشام میں عبادت نبویؐ کے سلسلے میں اس طرح کی نجس و ناپاک حرکت کی مطلق نفی کی گئی ہے وہ لکھتے ہیں کہ آپؐ جوان ہوگئے مگر جاہلیت کی خباثت اور ناپاکی سے کبھی آلودہ نہیں ہوئے اللہ تعالیٰ کو آپ کی کرامت اور نبوت مقصود تھی اسلئے اس نے آپ کو جاہلیت کی آلائشوں سے ہمیشہ محفوظ رکھا (ابن ہشام جلد اول ص ۱۹۸)

ابن کثیرؒ امام بیہقی کے حوالہ سے حضرت زید بن حارثہؓ کی یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ اساف و نائلہ کے نام سے تانبے کا ایک بت تھا، جسے طواف کرتے وقت مشرکین چھوا کرتے تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ میں بھی طواف کر رہا تھا، چنانچہ جب اس بت کے پاس سے گذرا تو اسے چھو دیا، آپ نے منع کیا مگر میں نے اپنے جی میں کہا میں اسے ضرور چھوؤں گا، تاکہ دیکھوں کیا ہوتا ہے چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا تو آپ نے فرمایا کیا تم باز نہیں آئے؟" (البدایہ والنہایہ جلد ۲ ص ۲۸۸)

غور کرو جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جاہلیت کے میلے ٹھیلے میں بھی نہیں جاتے تھے، اور نہ بتوں کو چھوتے تھے بلکہ انھیں چھونے سے منع کرتے تھے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ بت کے لیے سفید بکری کی قربانی کرتے۔[۲]

---

[۱] واٹ مکہ ص ۳۵۔ [۲] علامہ شبلیؒ نے بھی اس روایت کو ذکر کر کے اس کی تردید کی ہے، مگر انھوں نے سفید رنگ لکھ کر خاکی رنگ کی بکری کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں: "مارگولیس صاحب نے یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ آنحضرت صلعم نے عزیٰ کے نام ایک خاکی رنگ کی بکری ذبح کی تھی، لیکن صاحب موصوف نے اس کی سند میں کوئی عربی ماخذ پیش نہیں کیا۔" (بقیہ ص ۹۱)

ں، تجارت
ی کی کثرت

ڈرمنگھم کا بیان ہے کہ: "ایک زمانہ میں مکہ کے اندر محمدؐ کی ایک دکان تھی۔"
یہ قطعاً غلط ہے، سیرت کے ماخذ سے اس کی کوئی تائید نہیں ہوتی۔ مزید براں
لکھتے ہیں کہ محمدؐ جزیرہ عرب کے طول و عرض میں حضرت خدیجہؓ کے تجارتی قافلوں کی سربراہی
" (ڈرمنگھم ص ۶۱)

...نخ کا بیان ہے: "حضرت خدیجہؓ سے شادی کے چند برس بعد سے آنحضرتؐ مستقل تجارت
تھے، اور قافلوں کے ساتھ دور دراز کا سفر بھی کرتے تھے۔"[۱] (ص ۵۳)

...صفحہ ۹۰) بلکہ ولیوسن کا حوالہ دیا ہے۔ (دیکھو مارگولس کی کتاب صفحہ ۷۰ تا ۷۲)، معجم البلدان (ایک جغرافیہ کی
...ب روایت اس مضمون کی موجود ہے، لیکن اولاً تو اس موضوع خاص میں یہ کتاب خود بے سند ہے، ثانیاً یہ روایت
...جو مشہور دروغگو ہے۔" (حاشیہ سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۰۱) [۱] آگے رسول اللہؐ کے سفر اور مقامات سفر کے
...صنف کے خیالات محتاج وضاحت ہیں اسلئے اس کے بارہ میں علامہ شبلی کی سیرۃ النبی جلد اول سے جستہ جستہ بعض
...ل کئے جاتے ہیں۔

...است کی غرض سے شام و بصرے اور یمن کے متعدد سفر آپ نے کیے تھے (ص ۱۲۳) آنحضرت صلعم نے بھی اس تقریب
...، شام اور بصریٰ کے سفر کا حال پہلے گذر چکا ہے، اس کے علاوہ اور مقامات تجارت میں بھی آپؐ کا تشریف
...۔۔۔ حضرت خدیجہؓ نے جہاں جہاں آپؐ کو تجارت کی غرض سے بھیجا تھا، ان میں جرش بھی ہے جو یمن میں ہے، حاکم
...ے لکھا ہے اور علامہ ذہبی نے بھی تصدیق کی ہے کہ جرش میں آپ دو دفعہ تشریف لے گئے۔۔۔۔ نبوت کے بعد جب سال
...ند میں عرب کے تمام دور دراز مقامات سے وفود آئے ان میں جب بحرین سے عبد القیس کا وفد آیا تو آپ نے بحرین کے
...مقام کا نام لیکر وہاں کا حال پوچھا لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک کا حال ہم سے زیادہ جانتے ہیں
...نے تمہارے ملک کی خوب سیر کی ہے۔" (مسند ابن حنبل ج ۴ ص ۲۰۶) مورخین یورپ جو علوم غیبی کے منکر ہیں اور
...تے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں، قیاسات کے ذریعہ سے اس دائرہ
...ی ہے، ایک مورخ نے لکھا ہے کہ آپ نے بحری سفر بھی کیا تھا جس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہازوں کی رفتار
...ت کی ایسی صحیح تصویر ہے جس سے (نعوذ باللہ) ذاتی تجربہ کی بو آتی ہے (مارگولس ص ۷۰)، مورخ مذکور کا یہ بھی
...صر بھی تشریف لے گئے تھے اور ڈیڈ سی (بحر میت)، کا بھی معائنہ کیا تھا لیکن تاریخی دفتر ان واقعات سے خالی ہے۔" (سیرت جلد اول ص ۱۲۱)
...سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں، "یورپین مورخین جنکی بنیاد صرف قیاس و اسپر ہوتی ہے اگر اس قسم کے دلفریب بیان
...ہیں تو لیکن آنحضرتؐ کا مصر جانا درحقیقت یورپ کے عہد ظلم کی مضحکہ انگیز روایت ہے، بحری سفر آپ نے یقیناً نہیں کیا لیکن اگر
[illegible]

بوڈلے کا کہنا ہے کہ "محمد صلعم ۲۵ برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ انھوں نے اتنے سفر کر ڈالے جتنے سفر مکہ کا کوئی باشندہ عمر بھر نہیں کرتا، مکہ سے یمن، شام فلسطین اور فارس کا سفر آپ کا معمول اور عادی امر بن گیا تھا، آپ کے زمانہ میں لوگ اس کثرت سے سفر صرف زیارت کعبہ کے لئے کرتے تھے۔"

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے بعثت سے قبل بکریاں بھی چرائی تھیں اور تجارت بھی کی تھی لیکن آپ کی تجارت کی وہ شکل جو ان لوگوں نے بیان کی ہے، غیر معروف ہے، آپ یمن اور فارس تشریف نہیں لے گئے تھے، البتہ دمشق کے مضافات میں گئے تھے مگر دمشق میں داخل نہیں ہوئے، رہے رسول اللہؐ کے سفر تو ان کی تعداد چند ہی ہے۔ غالباً رسول اللہؐ کے مکہ سے سفر کے لئے نکلنے کی کثرت و زیادتی سے مستشرقین کا دو مقصد ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ گذشتہ اور موجودہ مذاہب سے واقف تھے۔ اور ان مذہبوں کے ماننے والوں سے آپ کے تعلقات تھے[1]، دوسرا مقصد یہ ہے کہ وہ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ تجارت سے آپ کی فطری دلچسپی اور اس میں تجربہ، مہارت اور ہوشیاری کی بنا پر آپ اس لائق ہوئے کہ لوگوں کی سیاسی رہنمائی اور قیادت کر سکیں۔

۵۔ دوسروں سے تحصیل علم | بوڈلے بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بحیرا کی صحبت میں رہکر عرصہ تک اس سے استفادہ کرتے رہے، یہ راہب جب اس کم سن عربی سے گفتگو کرتا تو معلوم ہوتا کہ وہ اپنے کسی رفیق سے گفتگو کر رہا ہے، چنانچہ اسی نے انھیں حضرت عیسیٰؑ کے عقیدہ اور بتوں کی پرستش کے حماقت ہونے پر

---

[1] اس کے متعلق علامہ شبلیؒ کا یہ بیان گذشتہ حاشیہ میں گذر چکا ہے۔ "مورخین یورپ نے جو علوم غیبی کے منکر ہیں، اور جو ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ کے تمام معارف و معلومات سیر و سفر سے ماخوذ ہیں" (سیرت جلد اول ص۱۱۰) آگے بحیرا راہب کے مشہور واقعہ کے ضمن میں مزید تفصیل پیش کی جائے گی۔ (مترجم)

مسلط کیا تھا، اور محمدؐ اس کی باتوں کو نہایت غور و توجہ سے سنتے تھے۔[1]

دوسری جگہ وہ لکھتا ہے کہ "گو محمدؐ کی کتبی تعلیم کم ہوئی مگر انھوں نے حصولِ درس کے لیے جانے والے اور دن دن بھر حجرۂ درس میں بیٹھے رہنے والے طالب علموں سے بھی زیادہ حصول علم کیا تھا۔" (ص۳۰)

وہ اور دوسرے مصنفین یہ بھی کہتے ہیں کہ عکاظ کے میلہ اور قس بن ساعدہ کے خطبوں[2] کے ذریعہ سے محمدؐ نے نصاریٰ اور ان کے فرقہ نسطوری کے اثرات بھی قبول کیے تھے۔ (ص۳۰)

صحیح یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کا کتاب مقدس دیکھنا یا اسے پڑھنا سرے سے ثابت ہی نہیں ہے، گو یہ تسلیم ہے کہ اس کے اور بعض قرآنی قصوں میں مماثلت ہے، اور رسول اللہؐ نے جب

---

[1] بحیرا کے مشہور واقعہ کا دار و مدار جس روایت پر ہے، وہ سنداً ضعیف اور پایہ اعتبار سے ساقط ہے۔ مولانا شبلیؒ نے اس پر مفصل نقد و جرح کی ہے ملاحظہ ہو (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۷۰ تا ۱۹۹) وہ یہ بھی تحریر فرماتے ہیں "تعجب یہ ہے کہ اس روایت سے جس قدر عام مسلمانوں کو شغف ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے، سر ولیم میور، ڈریپر، مرگولیس وغیرہ سب اس واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہؐ نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتائے تھے انہی پر آنحضرتؐ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے تمام عمدہ اصول انہی نکتوں کی شرح اور حواشی ہیں۔ عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے، اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں، قیاس میں نہیں آسکتا کہ دس بارہ برس کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھائے جائیں، اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۷۶)

مولانا حاشیہ میں لکھتے ہیں "ڈریپر صاحب معرکۂ علم و مذہب میں لکھتے ہیں: بحیرا راہب نے بصریٰ کی خانقاہ میں محمد کو نسطوری عقائد کی تعلیم دی، آپ کے نا تربیت یافتہ لیکن مشتاق دماغ نے نہ صرف اپنا تا معتقد کے مذہبی بلکہ فلسفیانہ خیالات کا گہرا اثر قبول کیا ... بعد میں آپ کے طرز عمل سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ نسطوریوں، جو عیسائیوں کے ایک مذہبی فرقہ کا نام ہے، کے مذہبی عقائد نے آپ پر کہاں تک قابو پا لیا تھا۔ سر ولیم میور صاحب نے نہایت بے ڈھنگے پن سے ثابت کرنا چاہا ہے کہ آنحضرت صلعم کو بت پرستی سے جو نفرت پیدا ہوئی اور ایک مذہب جدید کا جو خاکہ آپ کے ذہن میں قائم ہوا وہ سب اسی سفر شام کے مختلف تجارب اور مشاہدات کے نتائج تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر شارع اسلام بالفرض کسی عیسائی اساتذہ کی تعلیم پائے ہوئے ہوتے تو ممکن تھا توحید خالص کا وہ ولولہ اور تثلیث سے نفرت کا وہ جوش اسکے سینہ میں پیدا ہو سکتا جو قرآن کے ہر حرف میں نظر آتا ہے (سیرۃ النبی جلد اول ص ۱۷۶)

[2] قس بن ساعدہ کا ایک خطبہ بہت مشہور ہے مگر وہ بھی سراپا [illegible] موضوع ہے، مولانا شبلیؒ نے اسکے رواۃ پر مفصل جرح کی ہے جس سے قطع نظر

بحیرا سے ملاقات کی تھی تو اس وقت آپ کی عمر نو برس تھی، اور یہ بالکل خلاف عقل و قیاس ہے کہ صرف ایک ملاقات نے آپ کے تمام انحرافات محو اور زائل کر دیئے ہوں، علاوہ ازیں اسلام کا عقیدۂ توحید جس کی آنحضرت صلعم نے دعوت دی اور انبیاءؑ کے جو خصوصیات اور جنت و دوزخ کے جو اوصاف

(بقیہ حاشیہ ص۹۳) "ادب و محاضرات کی کتابوں میں عموماً اور بعض تاریخوں میں بھی مذکور ہے کہ قس بن ساعدہ نے عکاظ میں جو مشہور خطبہ دیا تھا، آنحضرت صلعم خطبہ میں شریک تھے، اس خطبہ کا بڑا حصہ الکثرابل ادب نے نقل کیا ہے اور چونکہ اسکے فقرے بظاہر قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں کی طرح چھوٹے چھوٹے اور مقفیٰ ہیں اسلئے عیسائی مورخین نے دعویٰ کیا ہے کہ آنحضرت صلعم نے یہ طرز انہی سے لیا ہے .... ایک نکتہ یہاں خاص طور پر لحاظ رکھنے کے قابل یہ ہے کہ بنو عباسیہ کے زمانہ میں یہ مذاق پیدا ہو گیا تھا، کہ اپنے زمانہ کے شعرا اور فصحا سے اشعار اور خطبے تصنیف کراتے تھے اور جاہلیت یا ابتدائے اسلام کے شعرا اور خطبا کے نام سے مشہور کرتے تھے، محمد بن اسحاق اس رتبہ کے شخص ہیں کہ امام بخاریؒ نے جزء القراۃ میں ان سے روایت کی ہے تاہم ان کا یہ عام طریقہ تھا علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں خطیب بغدادی سے روایت کی ہے کہ محمد بن اسحاق شعرائے وقت کو مغازی کے واقعات دیدیتے تھے کہ انکے بارہ میں اشعار کہدو، ان اشعار کو وہ اپنی کتاب میں شامل کر دیتے تھے، ابن ہشام میں حضرت خدیجہؓ، ابو بکرؓ، امیہ بن ابی الصلت، ابو طالب کے سینکڑوں اشعار نقل کئے ہیں جن کی زبان اور انداز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی زبان نہیں ہے، ایک لطیف بات یہ ہے کہ ابن ہشام ان اشعار کو نقل کر کے اکثر موقعوں پر لکھ دیتے ہیں کہ فن شعر کے ماہران اشعار کی نسبت انکار کرتے ہیں .... یہ وضاعی مختلف اغراض سے کی جاتی تھی بنیاد اس وجہ سے کہ ان خطبوں یا شعروں میں آنحضرت صلعم کے مبعوث ہونے کی پیشینگوئی یا کوئی بات اسلام کی تصدیق کی شامل کر دیتے تھے مثلاً قس بن ساعدہ کا خطبہ.... اکثر لوگ یہ کرتے تھے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کے متعلق جو باتیں ہیں انکے مطابق اشعار تصنیف کراتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے اسلام کی تائید ہوگی، امیہ بن ابی الصلت کے نام سے جو اشعار منقول ہیں انکو دیکھکر صاف یقین ہو جاتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید کو سامنے رکھکر یہ اشعار کہے ہیں ... ایک عجیب بات یہ ہے کہ مسٹر مارگولیس نے بھی ایک موقع پر اس کی تصدیق کی ہے چنانچہ کہتے ہیں "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موزوں کیا گیا ہے"۔ ان لوگوں نے اپنی دانست میں اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے یہ کام کیا تھا آج یورپ والے اسی سے یہ کام لیتے ہیں کہ آنحضرتؐ پیغمبر نہ تھے بلکہ جاہلیت کے خطبا اور شعرا کے معتقدات اور خیالات بلکہ طرز ادا تک اخذ کرتے تھے، لیکن ادب کا نکتہ شناس یا فن روایت کا ماہر بے تکلف سمجھ سکتا ہے، کہ تمام اشعار اور خطبے مصنوعی ہیں، یورپ کو فن ادب اور روایت میں مہارت کے لیے ابھی ایک زمانہ درکار ہے۔ اور جب وہ زمانہ آئے گا۔ تو یورپ کو اپنی بد مذاقی پر خود شرم آئے گی

(سیرۃ النبی جلد اول ص۱۸۳)

بیان کئے اور شرائع و اخلاق کے سلسلہ میں جو باتیں ارشاد فرمائیں، وہ سب نجران کے نصاریٰ اور نسطوریوں کے عقائد کے سراسر خلاف ہیں۔

یہ بات بھی نہایت عجیب و غریب ہے جس سے کتب سیرت کا تمام ذخیرہ خالی ہے کہ اس زمانہ میں مکہ کے اندر ندرسے تھے، اور محمدؐ ان کے ایک فائق و برتر طالب علم تھے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کے واقعات کے سلسلہ میں مستشرقین کی غلطیوں کی نشاندہی کرکے ان کی تصحیح کی جائے گی۔

۶۔ وحی کی ابتدا ونسنک لکھتا ہے :۔ "حضرت جبرئیلؑ کے پہلی بار ظہور اور نبی پر غشی طاری ہونے کے بعد حضرت خدیجہؓ بہت خوف زدہ ہوئیں اور ایک گوشہ نشین راہب کے پاس آئیں، جس کا نام سرجیوس تھا، اس نے اطمینان دلایا اور بتایا کہ یہ جبرئیلؑ تھے، جو فرشتہ ہیں، اور تمام انبیاءؑ کے پاس بھیجے جاتے ہیں"۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر غشی اور بیہوشی طاری نہیں ہوئی تھی بلکہ کپکپی طاری ہوئی تھی جو عموماً خوفزدہ لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے، رہیں حضرت خدیجہؓ تو وہ اس واقعہ سے خوف زدہ نہیں ہوئی تھیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسکین دے رہی تھیں کہ "بخدا اللہ آپ کو کبھی ذلیل و رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، دوسروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرتے ہیں اور راہ حق کی صعوبتوں اور شدتوں میں مدد کرتے ہیں"۔

احمد محمد شاکر فرماتے ہیں کہ یہ سمجھنا کہ حضرت خدیجہؓ کا واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا بالکل غلط اور صحیح و ثابت حدیثوں کے خلاف ہے، پھر وہ صحیح بخاری سے نزول وحی کی ابتدا سے متعلق حدیث نقل کرکے لکھتے ہیں، کہ اس سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے، کہ حضرت خدیجہؓ اپنے ابن چچا زاد بھائی

[illegible] وقت، کے پاس آپ کو بلا لی گئی تھیں، وہ افضل تھے، کوئی بھی افضل شخص موجود نہ تھے۔ (دائرۃ المعارف - ۹ - ۲، ۵)

دعوت جہری کا آغاز ارنلڈ کہتا ہے: "محمدؐ نے اپنے ارادہ سے بنی ہاشم اور قریش کے لوگوں کو مطلع کیا . . . انھوں نے اپنی دعوت کا آغاز کھلم کھلا اور جہراً کیا تھا" (ص[illegible])

مگر ابن اثیر کامل میں لکھتے ہیں: "آپ نے پہلے راز سربستہ کا تذکرہ اپنے متعلقین میں ان لوگوں سے کیا جن کے بارہ میں مکمل اطمینان تھا، چنانچہ تمام لوگوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ بنت خویلد آپ پر ایمان لائیں اور آپؐ کی تصدیق کی"۔ (جلد دوم ص[illegible])

طبری کا بیان ہے: "اللہ نے نبوت سے سرفراز فرما کر آپ پر اور اپنے بندوں پر جو انعام کیا تھا، آپؐ اسے پوشیدہ طور پر اپنے انہی متعلقین سے ذکر کرتے جن کے بارہ میں اطمینان تھا، عمرو بن عنبسہؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ عکاظ میں تھے، عرض کیا، اے اللہ کے رسول! کن لوگوں نے آپؐ کی دعوت قبول کی ہے؟ فرمایا دو آدمیوں نے جن میں ایک آزاد دوسرا غلام ہے، یعنی ابوبکرؓ اور بلالؓ نے، اس کے بعد میں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ طبری یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے آپؐ پر ایمان لانے والے اور آپؐ کی اتباع کرنے والے شخص آپؐ کے غلام زیدؓ بن حارثہ تھے۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ اسلام لانے میں سبقت حضرت علیؓ نے کی تھی۔ (طبری جلد ۱ صفحات ۳۰۶، ۳۱۲ و ۳۱۶)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رسول اللہؐ نے اپنی دعوت کا آغاز پوشیدگی سے کیا تھا۔ اور ابتداً اپنے متعلقین اور ان دوستوں سے اس کا تذکرہ کیا تھا جو قابل اطمینان اور لائق اعتماد تھے۔ دعوت کا اعلان تو آپؐ نے تین برس بعد کیا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ

اللہ نے مجھ کو بعثت کے تین برس بعد حکم دیا کہ جو کچھ مجھے عطا کیا گیا ہے اسے کھلم کھلا اور علی الاعلان لوگوں کے سامنے پیش کر دیں۔"[1]

۸۔ حضرت خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات کا غم | ارتھ لکھتے ہیں :۔

"محمدؐ نے اپنی بیوی حضرت خدیجہؓ اور اپنے چچا ابو طالب کی وفات کے غم میں ماتمی لباس پہن لیا تھا، اور جس سال دونوں کی وفات ہوئی تھی اسے عام الحزن (غم کا سال) کہتے تھے۔" (ص ۹۶)

اس قدر صحیح ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم اس سال کو عام الحزن (غم کا سال) فرمایا کرتے تھے، سیر کی کتابوں میں اس کی صراحت موجود ہے، لیکن ماتمی لباس پہننے کی بات درست نہیں ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں۔

---

[1] تاریخ طبری جلد ۲ صفحہ ۳۱۸، سیرت ابن ہشام جلد ا صفحہ ۲۔ دراصل یہ تاریخ اسلام کا بڑا اہم مسئلہ ہے کہ اسلام کیونکر پھیلا، مخالفین نے اس کا ذریعہ تلوار بتایا ہے، اس غلط بیانی سے مستشرقین کا یہی مقصد ہے، مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں : آنحضرت صلعم نے جب فرض نبوت ادا کرنا چاہا تو سخت مشکلیں پیش نظر تھیں، اگر آپ کا فرض صرف اسی قدر ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح صرف تبلیغ دعوت پر اکتفا فرمائیں یا حضرت کلیمؑ کی طرح اپنی قوم کو لیکر مصر سے نکل جائیں تو مشکل نہ تھی، لیکن خاتم نبوّت کا کام خود سلامت رہ کر عرب اور نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کو فروغ اسلام سے منور کر دینا تھا، اس لئے نہایت تدبیر اور تدریج سے کام لینا پڑا، سب سے پہلا مرحلہ یہ تھا کہ یہ پُر خطر راز پہلے کس کے سامنے پیش کیا جائے، اس غرض کے لیے صرف وہ لوگ انتخاب کئے جا سکتے تھے جو فیض یاب صحبت رہ چکے تھے، جن کو آپ کے اخلاق و عادات کی ایک ایک حرکات و سکنات کا تجربہ ہو چکا تھا، جو پچھلے تجربوں کی بناء پر آپ کے صدق دعوے کا قطعی فیصلہ کر سکتے تھے ... لیکن جو کچھ ہوتا پوشیدہ طور پر ہوتا، نہایت احتیاط کی جاتی تھی کہ محرمان خاص کے سوا کسی کو خبر نہ ہونے پائے ... تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا کیا، لیکن اب آفتاب رسالت بلند ہو چکا تھا، صاف حکم آیا۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (حجر) اور تجھ کو جو حکم دیا گیا ہے واشگاف کہہ دے۔
(سیرۃ النبی جلد اول [illegible])

ابو طالب اور حضرت خدیجہؓ کی وفات ہجرت سے تین برس پہلے ہوئی ان کی وفات سے رسول اللہؐ کو بڑا صدمہ لاحق ہوا، آپ فرماتے تھے، کہ قریش کی جانب سے مجھے ناگوار اور تکلیف دہ حد تک مصیبتیں ابو طالب کی وفات کے بعد ہی پہنچیں[1]"

ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں ابن اسحاق کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔

"خدیجہؓ اور ابو طالب کی وفات ایک ہی سال ہوئی، امام بیہقیؒ فرماتے ہیں۔ ابو طالب کی وفات کے تین روز بعد حضرت خدیجہؓ کا بھی انتقال ہو گیا، ابن جوزیؒ نے سند ثعلبہ بن صغیر اور حکیم بن حزام سے روایت کی ہے کہ پانچ دنوں کے فرق سے ابو طالب اور خدیجہ کی وفات ہوئی، اس طرح رسول اللہؐ دو مصیبتوں سے بیک وقت دوچار ہوئے، غم اس قدر شدید تھا کہ گھر میں پڑے رہتے تھے، اور باہر کم نکلتے تھے، اسکے بعد قریش کی ایذا رسانیاں بہت بڑھ گئیں[2]"

۹۔ رسول اکرمؐ کا منبر | ڈرمنگھم نے منبر نبویؐ کے متعلق اس طرح خامہ فرسائی کی ہے۔

"آپؐ وعظ کے وقت اپنے اسی منبر کے جو بیک وقت آپؐ کی کرسی منبر اور تخت سب ہی تھا ایک زینہ پر کھڑے ہوتے اور آپؐ کے ہاتھ میں ایک چھوٹا نیزہ یا سونے اور ہاتھی کے دانت سے جڑا ہوا عصا ہوتا جس سے نشانات اور لکیریں بناتے، منبر کے نیچے حضرت بلالؓ ایک سونتی ہوئی تلوار لئے کھڑے رہتے، اس کا قبضہ چاندی کا تھا، محمدؐ نے یہ طریقہ آخر عمر میں عربوں کو متاثر کرنے کے لئے اختیار کیا تھا[3]"

حالانکہ کرسی اور تخت کبھی آپ کے استعمال میں نہیں رہے، آپ تو صحابہ کرام کے درمیان اس طرح مساویانہ بیٹھتے تھے، کہ نو وارد کو پتہ نہیں چلتا کہ آپ کون ہیں، اسی طرح سونا جڑا ہوا عصا

---

[1] الکامل ج ۲ ص ۹۰ و ۹۱ [2] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۱۲ [3] ایضاً ص ۱۳۴

سونے چاندی کے قبضہ کی تلوار بھی آپ نے کبھی استعمال نہیں فرمائی کیونکہ سونے اور چاندی کا استعمال اسلام میں حرام ہے، فاضل مستشرق نے منبر کی نسبت جو کچھ کہا ہے، اس کا کوئی ذکر کتب صحاح حدیث کی صحیح اور معتبر کتابوں میں نہیں ملتا۔

۱۰۔ رسول اللہ کا پائجامہ پہننا۔ | دائرۃ المعارف الاسلامیہ[1] میں لفظ سروال کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے:

"رسول اللہ پائجامہ پہنتے تھے، متعدد حدیثوں سے اس کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ آپ سے دریافت کیا گیا کہ آپ پائجامہ پہنتے ہیں؟ فرمایا ہاں سفر و حضر دونوں میں، مجھے ستر کا حکم دیا گیا ہے اور پائجامہ سے بڑھکر ستر پوش کوئی لباس نہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث بالکل ضعیف ہے، بلکہ سرتاپا بے اصل اور موضوع ہے، اس کے ایک راوی یوسف بن زیاد البصری منکر الحدیث ہیں جو خرافات و باطیل بیان کرنے میں شہرت رکھتے تھے، اس روایت کے علاوہ دائرۃ المعارف میں اور بھی جتنی حدیثیں نقل کی گئی ہیں وہ سب کی سب مصنوعی، موضوع اور سراسر بے اصل ہیں۔

۱۱۔ تکبیر و اقامت | جو نیبل کہتے ہیں۔

"اقامت اذان ہی سے بنی ہے، اور اذان نصاریٰ کے طریقۂ عبادت کی نقل ہے۔"

انھوں نے اپنی تائید کے لیے خطط مقریزی (جلد ۲ ص ۲۱) کا حوالہ بھی دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اذان اور اقامت دو چیزیں ہیں، دونوں کے الفاظ اور کلمات کی تعداد میں بھی فرق و اختلاف ہے اور اذان میں قطعاً کلیسا کے طرز عبادت کی کوئی نقل نہیں کی گئی ہے، کتب صحاح میں اذان کے بارہ میں جس حدیث کی تخریج کی گئی ہے، اس کے الفاظ محدود اور ترکیبیں معروف ہیں، محمد عوف نے اس مسئلہ پر طویل بحث کی ہے، آخر میں انھوں نے مقریزی کے حوالہ کی حقیقت یہ بتائی ہے:

---

[1] یہ مستشرقین کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا عربی ترجمہ ہے۔

(۱) لوگوں نے اس تناقض و تضاد کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے، غالباً ان کی مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو اس کی صفت عفو و غفور ہے، اور دوسری طرف منتقم اور شدید العقاب بھی ہے، مگر دراصل یہ کوئی تضاد نہیں ہے کیونکہ یہ صفتیں اپنے متعلق کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہو گئی ہیں، اللہ تعالے ان لوگوں کے لئے غفور و عفو ہے جن سے عفو و مغفرت کی اس کی حکمت مقتضی ہوتی ہے، اور منتقم اور شدید العقاب ان لوگوں کے لئے ہے جن کو سزا دینا اس کی حکمت و مصلحت کا اقتضا ہوتا ہے؛ اس کی مثال بعینہ درج ذیل آیت ہے، جس میں رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی بظاہر متضاد صفتیں بیان ہوئی ہیں، حالانکہ وہ متضاد نہیں ہیں ؎۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ	محمدؐ اللہ کے رسول اور جو ان کے ساتھ
أَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ	ہیں کفار پر سخت، آپس میں
(فتح - ۲۹) (دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۲ ص ۵۶۳)	رحم دل ہیں۔

۱۴ - اسلامی حدود | ڈرمنگھم کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی پر جو منافقین کا سردار تھا، اس لیے حد جاری نہیں کی کہ وہ اپنی قوم اور اہل مدینہ میں غیر معمولی اثر و نفوذ رکھتا تھا' (حیات محمد از ڈرمنگھم ص ۳۰۵)

صحیح یہ ہے کہ رسول اللہؐ کو منافقین کا نام بنام علم تھا، مگر اس کے باوجود آپ نے کسی منافق کو کبھی کسی قسم کی سزا نہ دی خواہ وہ لیڈر ہو یا کوئی اور، اسکی وجہ یہ امید اور توقع تھی کہ شاید وہ صحیح طریقہ پر اسلام قبول کرلیں اور مسلمانوں کی صف اور جماعت میں شامل ہو جائیں، علاوہ ازیں آپؐ کو ان سے قتال کرنے کا حکم بھی نہیں دیا گیا تھا، رہی یہ آیت ؎۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ	اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد
وَالْمُنٰفِقِيْنَ (تحریم - ۹)	کرو۔

۔ تو مغربی کا خیال ہے کہ منافقین سے بہتر کا مطلب یہ ہے کہ انہیں اسلام کی دعوت دی جائے

، اس سلسلہ میں جس قدر بھی ممکن ہو کوشش سے دریغ نہ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر رئیس المنافقین کے قتل کا ارادہ ظاہر کیا ہوتا تو غزوۂ

بنی المصطلق[1] کے بعد خود ان کے صاحبزادے ہی انہیں رضا و رغبت سے قتل کر ڈالے ہوتے۔

۱۔ ہجرت | ہجرت کے وقت آپ کے گھر سے نکلنے کے بارے میں اسپرنگر نے لکھا ہے۔

" واقعہ کے متعلق ایک محتمل روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

اپنے گھر کے پیچھے کی دیوار سے کود کر نکلے تھے، اور اترتے وقت ان کے خادم نے انہیں سہارا

دیا تھا۔ اور آپ نے اسکی پشت سے سیڑھی کا کام لیا تھا" (ص ۱۱۱)

وہ آگے یہ بھی لکھتا ہے۔

" ابھی آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے رفیق حضرت ابوبکرؓ زیادہ دور

نہیں گئے تھے کہ اچانک گھوڑوں پر سوار ایک جماعت ان کے پاس آگئی جس کی قیادت

۱۔ یہ غزوہ ۵ھ میں غزوۂ خندق سے کچھ پہلے ہوا تھا، یہاں جس واقعہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اس کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے، اس غزوہ میں غنیمت کے لالچ سے بہت سے منافقین بھی شریک تھے، جو ہر موقع پر فتنہ گری کی کوشش کرتے تھے ایک دن چشمہ سے پانی لینے پر ایک مہاجر اور انصاری میں جھگڑا ہو گیا نوبت یہاں تک پہنچی کہ قریش و انصار نے تلواریں کھینچ لیں قریب تھا کہ جنگ چھڑ جائے لیکن چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا عبداللہ بن ابی جو رئیس المنافقین تھا اس کو موقع ہاتھ آیا انصار سے مخاطب ہو کر کہا تم نے یہ بلا خود مول لی، مہاجرین کو تم نے بڑھا کر اتنا کر دیا کہ اب خود تم سے برابر کا مقابلہ کرتے ہیں اب بھی تم دستگیری سے ہاتھ اٹھا لو تو وہ خود یہاں سے نکل جائیں گے، جب آنحضرت صلعم کو اس واقعہ کی اطلاع دی گئی تو حضرت عمرؓ بھی موجود تھے بولے ارشاد ہو تو اس منافق کی گردن اڑا دی جائے، آپ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ لوگ کہیں محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیا کرتے ہیں

عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے کا نام بھی عبداللہ تھا، باپ جس قدر بڑا منافق اور دشمن اسلام تھا بیٹا اسی قدر اسلام کے جاں نثار تھے، آنحضرت صلعم کی ناراضی کی بنا پر یہ خبر پھیل گئی تھی کہ آپ عبداللہ بن ابی کے قتل کا حکم دینے والے ہیں یہ سن کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ دنیا جانتی ہے کہ میں باپ کا کس قدر خدمت گزار ہوں لیکن اگر حکم ہو تو میں خود اس کا سر کاٹ لاتا ہوں، آپ نے اطمینان دلایا کہ قتل کے بجائے میں اس پر مہربانی کروں گا۔

عمر تک بالکل کنوارے رہے تھے"۔ (ص۱۱۹)

حالانکہ سیرت کے عربی مآخذ میں اس روایت کا ذکر تک نہیں ہے، اس لئے یہ جھوٹی اور گڑھی ہوئی بات ہے، سراقہ کے واقعہ میں بھی غلط بیانی کی گئی ہے، صحیح روایت یہ ہے کہ وہ تعاقب میں تنہا اور پیادہ نکلے تھے[۱]۔

ام المومنین حضرت سودہ بنت زمعہ [illegible] کا بیان ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت سودہؓ سے دوسری بیویوں کی طرح محبت نہیں کرتے تھے، اور چند برس بعد ہی آپ نے ان سے اعتزال اختیار کر لیا تھا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت ایک قلبی معاملہ ہے جس کا ادراک دوسرے نہیں کر سکتے، دوسرے حضرت سودہؓ کی شادی کے واقعہ سے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رغبت و محبت دونوں کا اندازہ ہوتا ہے،

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آپ کی یہی اکیلی بیوی تھیں[۲]، ان کے نکاح کا واقعہ ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس طرح ہے کہ خولہ بنت حکیم آنحضرتؐ کے ایما سے حضرت سودہؓ کے والد کے پاس گئیں اور نکاح کا پیغام دیا، انھوں نے کہا محمد شریف کفو ہیں لیکن سودہ سے بھی دریافت کر لو، خولہ نے کہا انھیں یہ پسند ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "جب سودہ بوڑھی ہو گئیں تو انہوں نے اپنی باری مجھے دیدی" ابن عباسؓ فرماتے ہیں، "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کی ایک عورت حضرت سودہ سے نکاح کیا جن کے پہلے شوہر سے پانچ یا چھ بچے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے [illegible]

[۱] اس واقعہ کی تفصیل استیعاب ابن عبد البر وغیرہ میں موجود ہے، ملاحظہ ہو، آنحضرتؐ کے مکہ سے نکلنے کے بعد مشرکین نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد کو قتل کر دیگا یا انھیں زندہ گرفتار کر لائے گا اسکو گراں قدر انعام دیا جائیگا، سراقہ اپنے قبیلہ بنی مدلج کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے آکر ان سے کہا میں نے ساحل کی طرف سیاہی دیکھی ہے میرا خیال ہے کہ وہ محمد اور ان کے ساتھی ہیں، سراقہ کو یقین ہو گیا لیکن انعام کی طمع میں انھوں نے کہا نہیں وہ لوگ نہیں ہیں تم نے فلاں شخص کو دیکھا ہوگا جو ابھی ہمارے سامنے گیا ہے، تھوڑی دیر کے بعد سراقہ اٹھ کر گھر گئے اور لونڈی سے کہا کہ گھوڑا تیار کر کے ایک مقام پر لے جا، اور نیزہ سنبھال کر پیچھے کو گھر کی پشت سے نکلے، لونڈی سے گھوڑا لیا اور لوگوں کی نظر بچا کر نکل گئے اور گھوڑا دوڑاتے ہوئے آنحضرتؐ کے پاس پہنچ گئے۔

[۲] چونکہ حضرت سودہؓ و حضرت عائشہؓ کا نکاح قریب قریب ایک ہی زمانہ میں ہوا اس لئے مورخین میں اختلاف ہے کہ کس کو تقدیم حاصل

...نے کہا اے اللہ کے رسول! آپ مجھے تمام لوگوں سے زیادہ عزیز اور محبوب ہیں اور میں آپ کی بہت تعظیم و تکریم کرتی ہوں، یہی میرے لئے مانع ہے کہ آپ کے سر پر بچے صبح و شام سوار رہا کریں گے آپ نے فرمایا کوئی اور مانع تو نہیں ہے، عرض کی نہیں خدا کی قسم اور کوئی مانع نہیں ارشاد ہوا خدا تم پر رحمت ہو، قریش کی نیک بخت عورتیں اپنے چھوٹے بچوں پر کس قدر شفیق اور مہربان ہوتی ہیں اور وہ اپنے شوہروں کا کتنا لحاظ اور خیال رکھتی ہیں" (البدایہ والنہایہ جلد ۳ ص ۱۳۲، ۱۳۳)

یہ واضح دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے شادی کرنے کی رغبت بھی تھی اور شادی کے بعد آپ ان سے محبت بھی کرتے تھے، اور دوسری ازواج مطہرات کی طرح باریوں کی تقسیم میں ان سے مساوات بھی برتی تھی، مگر انھوں نے خود بطیب خاطر اپنی باری حضرت عائشہؓ کو دیدی تھی۔[1]

۱۹۔ رسول اللہؐ کی بعثت عامہ | مارگولیتھ مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نے اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لیے کوئی خط جزیرۂ عرب کے باہر کے بادشاہوں اور امرا کو نہیں لکھا (تاریخ اسلام جلد ۱ ص ۱۵۰) میور کہتے ہیں کہ "آپ نے بعثت سے لے کر وفات تک عربوں کے سوا کسی اور ملک کے لوگوں کو اسلام کی دعوت نہیں دی"، بروکلمن نے بھی اس کی توثیق کی ہے۔ کہتے ہیں "یہ ثابت کرنا آسان نہیں جب کہ نبی خود بار بار کرا رہے تھے کہ وہ عالمی پیغمبر ہیں اور انھیں ساری دنیا کو اسلام کا پیغام پہنچانے کی دعوت دی گئی ہے" (تاریخ الشعوب الاسلامیہ ج ۱، ص ۱۰)

قرآن مجید نے خود ہی بعثت نبویؐ کی صحیح نوعیت اس طرح واضح کر دی ہے۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً — ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر تمام لوگوں

---

[1] حقیقت صرف یہ ہے کہ حضرت سودہؓ جب بوڑھی ہو گئیں تو ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلعم طلاق دیدیں اور وہ شرف صحبت سے محروم ہو جائیں، اس بنا پر انھوں نے اپنی باری خوشی خوشی حضرت عائشہؓ کو دیدی تھی اتنی سی بات کو مستشرقین نے افسانہ بنا دیا کہ آنحضرتؐ کو اور بیویوں کی طرح ان سے محبت نہ تھی اور آپؐ نے ان سے عملاً اپنا تعلق ختم کر لیا تھا، نعوذ باللہ من ھفواتہم۔

لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (سبا ۔ ۲۸) — کے لئے بشارت دینے والا اور ڈرانے والا۔

نیز:۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (انبیاء ۔ ۱۰۷) — ہم نے تم کو نہیں بھیجا مگر ساری دنیا کے لیے رحمت بنا کر۔

امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں حضرت جابرؓ کے واسطے سے آپ کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

اعطیت خمسا لم یعطھن احد قبلی کان کل نبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی کل احمر واسود۔ (صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ) — مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں، ہر نبی خاص اپنی ہی قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا، اور میں ہر کالے گورے (ساری دنیا) کے لئے مبعوث ہوا۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

فضلت علی الانبیاء بست، اعطیت جوامع الکلم ونصرت بالرعب واحلت لی الغنائم وجعلت لی الارض طھورا ومسجدا وارسلت الی الخلق کافۃ وختم بی النبیون۔ (صحیح مسلم کتاب المساجد و مواضع الصلوٰۃ) — مجھے دوسرے نبیوں پر چھ چیزوں کی وجہ سے فضیلت دی گئی، مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے اور رعب اور دھاک کے ذریعہ فتح و نصرت دی گئی اور مال غنیمت میرے لیے حلال کیا گیا اور تمام روئے زمین میرے لیے پاک اور مسجد بنائی گئی اور میری بعثت تمام دنیا کی طرف ہوئی اور میری ذات سے

۱۷۔ <u>اسلامی فتوحات</u> | ڈاکٹر منگمری سنت نبوی سے ناقص واقفیت کی بنا پر بہت سی حدیثوں کے منکر ہیں۔ اور انھیں خلفاء اور جنگی قائدوں کا اضافہ بتاتے ہیں، ان کی متابعت اور ہمنوائی

لیکن ایسے واقعات کی بڑی تعداد میں ہیں جو آنحضرت کی شان کی عظمت سے بہت اچھی جاتے ہیں اور خاص طور پر ان حدیثوں کی وجہ سے آپ کی شخصیت کو مطعون بھی کرتے ہیں اور ان کا انکار بھی کرتے ہیں جن میں خاص مستقبل کے واقعات کا ذکر ہے، یا اسلامی فتوحات کے بارہ میں پیشنگوئی کی گئی ہے، جیسے وہ حدیثیں جن کی امام مسلم نے اپنی صحیح میں تخریج کی ہے۔

اس طرح کی ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔

نصرت بالرعب وبینما انا	میری رعب اور دھاک کے ذریعہ مدد
نائم اتیت بمفتاح خزائن	کی گئی، خواب میں مجھے زمین کے خزانوں
الارض فوضعت بین یدی	کی کنجیاں دی گئیں، اور وہ سب میرے
قال ابو ہریرۃ ... فذھب	آگے رکھ دی گئیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ کا تو انتقال
وانتم تنتثلونہا۔	ہو گیا، مگر تم لوگ زمین کے خزانے
صحیح مسلم کتاب المساجد ومواضع الصلوۃ)	نکال رہے ہو۔

اسی طرح ایک حدیث میں فتح قسطنطنیہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے، اور بعض دوسری حدیثوں میں فارس وروم کی فتح اور دجال پر غلبہ کا ذکر ہے۔

مستشرقین کے نزدیک یہ سب حدیثیں درست نہیں جو ان کے قلت علم اور حدیث سے ناقص واقفیت کا نتیجہ ہے۔

۱۸۔ <u>جہاد</u> ڈاکٹر منٹگمری واٹ کے نزدیک جہاد کا حکم صرف نبیؐ کی زندگی تک کے لئے تھا، وہ آیات جہاد کو عام نہیں مانتے۔

اس غلطی میں وہ سب مستشرقین شریک ہیں جن کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام تلوار سے

پہیلا اس کا منشا جنگ سے تھی کیونکہ اسلام دنیا کو نیست و نابود کر دے گا، خوب بدلچسپ اُڑ گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی آیتیں دو طرح کی ہیں ایک تو وہ ہیں جو خصوصی و متعین غزوات بدر، احد اور خندق وغیرہ کے بارہ میں نازل ہوئی ہیں، دوسری طرح کی آیات کا تعلق کسی خاص غزوہ سے نہیں ہے بلکہ ان میں دوام و استمرار کی شان پائی جاتی ہے اس لئے وہ دائمی ہیں بلکہ متعین غزوات کے بارہ میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں ان کے متعلق بھی علمائے تفسیر کا یہی خیال ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ ان میں لفظ کے عموم کا اعتبار کیا جائے گا، اور خاص سبب کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

اسی طرح جہاد اور اس کے فضائل سے متعلق حدیثیں بھی دائمی ہیں۔

ان دلائل و شواہد کی موجودگی میں کون ان مستشرقین کی باتوں کو باور کرے گا۔

وار غزوۂ حنین ڈاکٹر منگمری واٹ لکھتے ہیں "غزوۂ حنین کے خاتمہ کے بعد لوگ قیدی عورتوں پر پل پڑے" یہ دعویٰ کتب سیر کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے، تاریخ طبری اور سیرت ابن ہشام میں ہے:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ اور مال غنیمت کے متعلق حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں" (تاریخ طبری جلد ۳ ص ۷۱ و ابن ہشام جلد ۲ ص ۴۲۹)

ابن جریر طبری دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

"آپ نے طائف کی روانگی کے وقت ہوازن کے اسیروں کے بارہ میں حکم دیا کہ جعرانہ میں محفوظ رکھے جائیں، ان کے کچھ آدمیوں نے اسلام قبول کر لیا، ان کا ایک وفد خدمت نبوی میں حاضر ہو کر عرض گذار ہوا کہ اللہ کے رسول ہم لوگ مصیبت زدہ ہیں۔ ہم پر احسان کیجئے، ارشاد ہوا تمہاری اولاد اور تمہاری عورتیں تمہیں زیادہ محبوب ہیں، یا تمہارا مال و اسباب، انھوں نے جواب دیا کہ ہم اپنی اولاد اور اپنی عورتوں کے برابر کسی چیز کو نہیں سمجھتے۔ . . . پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اور

بنو عبدالمطلب کے حصہ میں جو کچھ تھا واپس کر دیا، اس طرح اور لوگوں نے بھی سب کی اولاد اور عورتوں کو واپس کر دیا۔[1] (تاریخ طبری جلد ۳ صفحہ ...)

ابن اثیر فرماتے ہیں۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیدیوں اور مال غنیمت کو جعرانہ میں جمع کرنے کا حکم دیا اور بدیل بن ورقا خزاعی کو ان کی نگرانی کے لیے مامور فرمایا۔"[2] (کامل ابن اثیر جلد ۲ صفحہ ۲۶۶)

ان تصریحات سے تو یہ معلوم ہوا کہ غزوۂ حنین کے بعد قیدی عورتوں سے کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی گئی، بلکہ ان کی مکمل حفاظت کے خیال سے انھیں جعرانہ جیسے دور دراز مقام پر رکھا گیا، اور بدیل بن ورقا کو ان کی نگرانی سپرد کی گئی، پھر قبیلہ ہوازن کے جو لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے، ان کے قیدیوں کو واپس کر دیا گیا، اس تمام متن کے بعد کیسے کہا جا سکتا ہے کہ ان پر دست درازی کی گئی سبحانک هذا بهتان عظیم۔

یہ اور اس طرح کی بیشمار غلطیاں مستشرقین بالقصد اس لئے کرتے ہیں کہ اسلام اور ہادئ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو ہدف طعن و تشنیع بنائیں، انھیں مستشرقین کی فروگذاشتیں اور خطائیں کہکر ہم ان سے صرف نظر نہیں کر سکتے، ان کا مقصد تو شکوک و شبہات پیدا کرنا ہے۔

کیا علامہ محمد اقبال یورپ کے فلسفہ سے متاثر ہوئے

از

سید صباح الدین عبد الرحمن،

"یہ مقالہ برجستہ لکھ کر قائد اعظم اکیڈمی کراچی کی ایک خصوصی نشست میں
۳۰ر نومبر ۱۹۸۳ء کو پڑھا گیا" "ص ـ ع"

صدر محترم و معزز حاضرین!

میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ لوگوں نے یہاں طلب کرکے اپنے سے ملنے ملانے کا شرف عطا کیا، اور علامہ محمد اقبال پر مجھ اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع دیا، پہلے میرے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ علامہ محمد اقبال سے متعلق جو رائے رکھتے تھے، اس کو سماعت فرمائیں، جب علامہ محمد اقبال کی وفات ہوئی، تو انھوں نے **معارف** کے شذرات میں یہ تحریر فرمایا۔

"صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو (عمر کی ۶۱ بہاریں دیکھ کر)، اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبل ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف، فلسفی، عاشق رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے ذہن کا ہر ترانہ بانگ درا، اس کی جان حزیں کی ہر آواز زبور عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیام مشرق، اس کے شوق کا ہر پرواز بال جبریل تھا،

اس کی والدہ محترمہ ہو گئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید کہ
ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرش الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول مغفرت کے پھول اس پر برسائے جاتے
ہوں گے، خداوندا! اس کی غمخواری فرما، اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلب حزیں کو مسرور کر،
اس کی تصنیفات زندہ جاوید ہیں! قدر بڑھے گی، وہ اسلام کا پیغام ربانی بن کر رہیں گی، انشاء اللہ زندہ جاوید ان کی شرحیں
لکھی جائیں گی، تشریحیں کی جائیں گی، ان سے نظریے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اس کی دلیلیں
ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات
سے ان کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندۂ
جاوید، اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کے گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے
نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلام الٰہی کا محرم، اور رموز شریعت کا آشنا تھا
وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھاتا تھا یعنی
بادۂ انگور چھوڑ کر کوثر و تسنیم کا ساغر تیار کرتا تھا، اقبال! ہندوستان
کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا محرم اقبال
کاروان ملت کا رہنما اقبال، رخصت، رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک۔"

حضرات! ہم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے تمام شاگردوں کی طرح علامہ محمد اقبال سے متعلق جو کچھ
تحریر بھی لکھتے ہیں اسی ایجاز کا اطناب، اسی اجمال کی تفصیل، اور اسی اختصار کی توضیح کرتے
رہتے ہیں، جب ہم کوئی ایسی تحریر پڑھتے ہیں جس میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ علامہ محمد اقبال نے
اپنے تمام افکار کی اساس یورپ کے فلسفہ پر رکھی، یا انھوں نے نٹشے سے استفادہ کیا، یا ان کے
اور برگساں کے فلسفے میں بڑی مشابہت ہے، یا ان کے فکری دلائل روسو، کانٹ، ہیگل، نٹشے
اور شوپنہار کی طرح ہیں تو ہمارا دل کہہ اٹھتا ہے کہ اس سے بڑھ کر اقبال کی اہانت

نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ توہین مشرق اور ہندوستان کے ساتھ اس طرح کی جاتی ہے، جس طرح کہ انگریزوں کے زمانہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ مغلوں کے زمانہ کی نادرۂ روزگار عمارت تاج محل کو استاد عیسیٰ، استاد موسیٰ اور استاد حامد نے نہیں تعمیر کیا، بلکہ اس کے بنانے والے اطالوی معمار تھے علامہ محمد اقبال کو فرنگی فلسفہ کا خوشہ چیں بنانے والے قلمی صناع یا تو اپنی تحریری صنعت گری یا کاریگری دکھانے کی خاطر ایسا کچھ لکھ جاتے ہیں، یا وہ علامہ محمد اقبال کو صحیح معنوں میں سمجھنے سے قاصر ہیں، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جس طرح تاج محل مسلمانوں کے فن تعمیرات میں نادرۂ روزگار اور ان کی ذہنی اختراع کا شاہکار ہے، اسی طرح علامہ محمد اقبال کی شاعری اسلامی افکار کا تاج محل ہے۔ جس طرح تاج محل کی پچی کاری، مرصع کاری اور مینا کاری میں مسلمانوں کے ذہن کی کارفرمائی نظر آتی ہے، اسی طرح علامہ محمد اقبال کی شاعری کے گنبد مینائی پر اسلام کے افکار ہی کی کوکبی اور مہتابی کی رعنائی چھائی ہوئی نظر آئے گی، اور جس طرح تاج محل کے باوقار حسن میں اس کے قرآنی آیتوں کے کتبے سے اضافہ ہوگیا ہے، اسی طرح علامہ محمد اقبال کی شاعری میں قرآن پاک کی تعلیمات کی اصلی اور حقیقی روح کارفرما ہے۔

انھوں نے یورپ کے قیام میں فرنگی فلسفیوں کا مطالعہ ضرور کیا، لیکن ان کے افکار سے متاثر ہونے کے بجائے ان سے بیزار ہوتے چلے گئے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا، تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے۔ (اقبالنامہ ص ۱۴۰) اسی کا اثر ہے کہ وہ نٹشے کے قلب کو مومن لیکن اس کے دماغ کو کافر کہتے ہیں، وہ یہ بھی رقمطراز ہیں کہ نٹشے نے اپنے خیالات کا ایک بتخانہ تعمیر کیا، وہ حلاج ضرور بنا لیکن اس کو دار ورسن نصیب نہیں ہوا، اس کے افکار بظاہر عظیم تھے، مگر اس کے افکار ہی نے یورپ کو دو ٹکڑے کر کے

دکھ دیا ہوگا وہ ان سے ہوسکا بلکہ اپنی پستی میں خدا سے کٹ کر خود سے بھی کٹ گیا ہیگل کے متعلق
کہتے ہیں کہ وہ چراغ لے کر آفتاب کو ڈھونڈنے والا رہا جب انھوں نے اس کا مطالعہ شروع کیا
تو اس کے افکار کے دریا میں ان کی عقل کی کشتی طوفان میں پڑ گئی، اس نے اپنے سکر سے قوموں
کو مسموم کر دیا، وہ خود سو گیا، اور ذوق عمل سے محروم رہا،

گوئٹے فکر و فن عشق سے آشنا برگسان کو بستہ اوہام باطل، نٹشے کو خود پرست
فلسفی، کارل مارکس کو راز دان جز وکل ہونے کے باوجود نامحرم خویش لا
کو ہی جام تصور کرتے رہے، فرنگی فلسفہ کو مجموعی حیثیت سے حجت نا استوار کہتے ہیں
اس پر یہ لکھکر استہزار کیا ہے کہ اس میں جلوہ ہے لیکن جلوۂ بے کلیم ہے شعلہ ہے لیکن شعلۂ
بے خلیل ہے، خرد ہے لیکن یہ متاع عشق کی غارت گر ہے،

اور جب اپنی کتاب Reconstruction of Religious thoughts
in Isla (اسلام میں مذہبی خیالات کی تشکیل جدید لکھی تو اس میں اور بھی کھل کر ان فرنگی فلسفیوں
پر حملہ آور ہوئے، افلاطون نے سقراط کا ارشد تلمیذ بن کر تصور شعور کو حقارت کی نظر سے دیکھکر
یہ جتانے کی کوشش کی کہ اس سے مائے کا تو استنباط کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے حقیقی معلومات
حاصل نہیں ہوتی ہیں، علامہ محمد اقبال نے ان خیالات کو قرآنی تعلیمات کے خلاف قرار دیا
اور فرمایا کہ قرآن نے سماعت اور بصارت دونوں کو مبنی بہار ربانی عطیات کہا ہے،
دونوں کو اپنی دنیاوی سرگرمیوں میں خداوند تعالیٰ کا جوابدہ گردانا ہے، (ص ۴) ارسطو نے
سرگرم عقل کی بقائے دوامی کا نظریہ قائم کیا، تو فرانس اور اٹلی کی زندگی پر اس کے
غیر معمولی اثرات پڑے علامہ محمد اقبال نے اس پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور کہا کہ قرآن نے انسانی
خودی کی جو قدر اور منزل متعین کی ہے، اس کے برخلاف ارسطو کا نظریہ ہے (ص ۱۰۶)

کانٹ کو شہرت اس لئے حاصل ہوئی کہ وہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے فلسفیانہ اصولوں میں عبادی یکسانیت ہے، لیکن علامہ محمد اقبال کو وہ اس لئے پسند نہیں آیا کہ وہ خداوند تعالیٰ کے وجود کی تائید نہ کر سکا، (ص ۵) وہ کانٹ کو اس لئے بھی ناپسند کرتے ہیں کہ جدید فلسفہ کی رو سے علل و اسباب کے اس کے مباحث میں بہت سے گمراہ کن دلائل ہیں، (ص ۱۰۱) وہ کانٹ سے اس لئے بھی ناخوش ہیں کہ اس کا خیال ہے کہ نیکی اور مسرت، فرائض اور رجحانات متضاد تخیلات ہیں (ص ۱۱۳) اقبال پروفیسر میکڈوگل کو اس لئے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے کہ اس کے یہاں عارفانہ اور پیمبرانہ شعور اور احساس میں جو نفسیاتی اختلافات ہیں اُن کے بنیادی تصورات سے وہ بے خبر ہے، (ص ۱) ولیم جیمس کا خیال ہے کہ عارفانہ کیفیت جب عقلیاتی شعور سے جدا ہوتی ہے تو یہ انسان کے نارمل شعور کو قطع کر دیتی ہے، علامہ محمد اقبال اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سراسر غلط قسم کا استدلال ہے' علامہ محمد اقبال فرائڈ کے نفسیاتی نظریے کی مذمت یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ کسی قابلِ قبول شہادت پر مبنی نہیں ہے، نئے ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ نئے نفسیاتی طریقے سے اس بات کی تشریح کی جا سکتی ہے کہ مذہبی Passion محض Knowledge کی ایک قسم ہے' علامہ محمد اقبال اس کی مخالفت کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس قسم کی کوشش لاک اور ہیوم کی مساعی کی طرح رائیگاں ہو کر رہ جائیں گی، (ص ۲۶) برگساں کا خیال ہے کہ اصلی خواہش اور اصلی خیالات میں ناقابلِ اصلاح ثنویت ہے' علامہ محمد اقبال اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایسے خیالات اسی وقت قائم کئے جا سکتے ہیں، کہ جب عقل سے متعلق (Partial view) ادھوری رائے رکھی جائے ص۵۲

میک ٹگارٹ کا خیال ہے کہ زمان ایک غیر حقیقی چیز ہے کیونکہ ہر شے کے ساتھ ماضی، حال اور مستقبل وابستہ ہے، علامہ محمد اقبال اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ میک ٹگارٹ کی یہ دلیل ہے کہ مستقبل کا انحصار محض ایک کھلا ہوا امکان ہے، یہ کوئی حقیقت نہیں، علامہ محمد اقبال کہتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں اور کچھ

خیال میں حال و مستقبل کا ماضی کے ساتھ لازم و ملزوم ہونا ضروری نہیں، فرزل کا بیان ہے کہ
حقیقت ایک مبہم وسیع pervasive cosmic light ہے جو کہ شامل نور ہے، علامہ
محمد اقبال اس سے اتفاق نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ مذہب کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ بعض مذہبی خیالات
کی بنا پر وحدت الوجود کا تخیل بروئے کار آیا لیکن قرآن کی تعلیمات کے مطابق فرزل کی رائے صحیح قرار
نہیں دی جا سکتی ہے، اسپنگلر نے اپنے فلسفیانہ انداز میں مسلمانوں کے تصور زمان کے تخیلات کا تجزیہ
کیا، تو علامہ محمد اقبال نے اس کو یہ کہکر رد کیا کہ اس نے صحیح اسلامی تصورات سے استفادہ کرنے
کے بجائے مسلمانوں کے عامیانہ خیالات کی ترجمانی کی ہے، اس نے اس کو جس طرح پیش کیا ہو وہ
عجیب وغریب ہے، وہ انا کے اسلامی تصور کو مطلق نہیں سمجھ سکا ہے (۱۴۳-۱۴۴) علامہ
محمد اقبال فرنگی فلسفۂ جنگ سے آزردہ رہے کہ اس نے مذہب کی بنیادی اساس کی وجہ
سے انسانیت کو جو نشو و نما ہوئی ہے اس کی اصلی روح کو وہ سمجھ نہ سکا، اور اپنے تمام اصول
میں تضاد اور ان سے انحراف کرکے مذہب کی ایسی بحث چھیڑ دی ہے جس سے ذہن کو ایک
مایوس کن اور غلط سمت میں لے جاکر چھوڑ دیا ہے، اور اپنے نظریوں کا انبار لگاکر مذہب کی
نوعیت سے سراسر غلط فہمی پیدا کردی ہے، علامہ محمد اقبال کا یہ خیال تھا کہ یورپ کی لادینیت
دین کے خلاف ایک بغاوت ہے لیکن یہ لادینیت خود ایک دین بن گیا ہے، جس میں بھیڑ کا بچہ
بھیڑیے کے لئے حلال کر دیا گیا ہے،

علامہ محمد اقبال اس کے بھی قائل نہیں کہ یورپ کے سارے فلسفیانہ خیالات ان کے
اپنے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اگر ان کے سارے فلسفیانہ خیالات کا تجزیہ کیا جائے، تو سب
میں مسلم حکماء کی کچھ نہ کچھ خوشہ چینی پائی جائے گی، یورپ کا تجرباتی طریقہ
Experimental method عربوں کا رہین منت ہے، یورپ میں [illegible]

تھا جب تصور بھی پیدا نہیں ہوا تھا تو بقول علامہ محمد اقبال عراقی کے یہاں اس مسئلہ پر پوری بحث ملتی
علامہ محمد اقبال نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ نگاری کے نظریہ کے سلسلہ میں زماں
کی حقیقت اور زندگی کے تصور میں دونوں کا جو تسلسل اور اتصال دکھایا ہے، اس کو پڑھ کر فرنگی
فلسفی (FLINT) فلنٹ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سلسلہ میں افلاطون، ارسطو اور اگسٹائن تو
ابن خلدون کے مدمقابل سمجھے جا سکتے ہیں، بقیہ اور فلسفیوں کو ابن خلدون کے بغل میں جگہ نہیں
دی جا سکتی ہے (ص ١٤١)

ان باتوں کی طرف توجہ دلانے کا مقصد یہ ہے کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ علامہ محمد اقبال یورپ کے فلسفیوں کی گاڑیوں کے حامل نہ تھے، بلکہ وہ تو اس کے قائل تھے کہ خود یورپ کے فلسفی مسلمان فلسفیوں کی گاڑیوں کے قلی ثابت کیے جا سکتے ہیں، وہ تو فرنگیوں کی دلآویزی، شیرینی، پرویزی سے پناہ مانگتے رہے، کیونکہ ان کی نظر میں یہ چنگیزی کے سوا کچھ بھی نہیں، ان کے کانوں میں کبھی آواز پڑ جاتی کہ انھوں نے مغرب کے فلسفیوں سے استفادہ کیا ہے، تو ان کو بڑا دکھ ہوتا، اور اس کا اظہار اپنی دکھ بھری آواز میں اس طرح کیا ہے کہ فرنگی بتوں کو انھوں نے دل ضرور دیا، مگر ان کے دیرنشینوں میں اپنے کو پگھلا ہوا پایا، اس طرح کہ اپنے سے ایسا بیگانہ ہو گیا کہ اپنے کو دیکھ کر پہچان نہ سکا،

بہ فرنگی بتاں دل باختم من ز تاب دیریاں بگداختم من
چناں از خویشتن بودم من چو دیدم من خویش نشناختم من

پھر یہ بھی کہتے ہیں کہ مغرب کے میخانہ سے مے ضرور چکھی، مگر اس کو چکھ کر درد سر مول لیا، ان فرنگیوں کے ساتھ بیٹھا بھی، مگر احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دن بے سود ہی گذرے

مے از میخانۂ مغرب چشیدم بجان من کہ درد سر خریدم
نشستم با نکویان فرنگی از آں بے سوز تر روزے ندیدم

ان حقائق کے بعد اگر کوئی پوچھے کہ ان کے افکار کا آخر کونسا سرچشمہ تھا تو یہ کہنے میں تأمل
نہیں کہ قرآن پاک، اقبال نے فرنگی فلسفہ کا مطالعہ ضرور کیا لیکن اس کا اثر قبول اس پیمانہ پر نہیں ہوا
اسی لئے بڑے وثوق کے ساتھ اعلان کیا کہ ان کا مسلک وہی رہا جو قرآن کا ہے، اسی کو ہمارے استاذ
محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس طرح ادا کیا ہے، کہ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر
اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھاتے تھے، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا
ساغر تیار کرتے تھے۔

علامہ محمد اقبال کو قرآن میں وہ سب کچھ ملا جن کی ان کو تلاش تھی، ان کے خیال کے
مطابق کہ قرآن ہی نے انسان کو اس کے اس اعلیٰ شعور کا احساس دلایا ہے، کہ خدا اور کائنات
کے ساتھ اس کے گوناگوں رشتے ہیں، (ص ۸) اور خود علامہ محمد اقبال کو قرآن ہی کے ذریعہ
یہ معلوم ہوا کہ یہ کائنات کسی تخلیقی تفریح کے نتیجہ میں ظہور میں نہیں آئی، بلکہ یہ ایک قابلِ قدر
حقیقت ہے، یہ اس کی تخلیق میں بے پناہ بینائی اور وسعت مضمر ہے، (ص ۱۰) اسی کے مطالعہ
سے ان کو معلوم ہوا کہ حقیقت کی کوئی اور شکل اتنی طاقتور اتنی حوصلہ افزا اتنی خوبصورت
نہیں جتنی کہ انسان کی اسپرٹ ہے، وہ تخلیقی سرگرمیوں کا پیکر ہے جس میں بلندی تک پہنچنے
کی قوت عطا کی گئی ہے، اور جب وہ متحرک ہو کر کوچ کرتا ہے تو ایک وجود کو چھوڑ کر
دوسرے وجود کو طے کرتا جاتا ہے، اس کے اردگرد جو کائنات نظر آتی ہے، اس میں اس کے
حوصلے منتقل ہو جاتے ہیں، پھر وہ خود اپنی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے، اور اپنی تقدیر کا معمار
بن کر خود کائنات کی تقدیر کا معمار بن جاتا ہے، اور جب اس کائنات میں نئی قوتیں ابھرتی
ہیں تو ان قوتوں کو اپنے عمل کی سرگرمیوں سے اپنے قابو میں کر لیتا ہے، اور ان کو اپنے اغراض
و مقاصد کی تکمیل کے لئے مصرف میں لاتا ہے، جس کے بعد خود خدا اس کا شریکِ کار بن جاتا ہے،

کہ یہی وقت تھی جب انسان خود اپنی قوت کو جو دے کار لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی گئی ہے، ان کو قرآن پاک ہی سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے انسان میں اس شعور کو پیدا کیا ہے جس کا مظہر وہ چیز ہے جس کو فکر کہا جاتا ہے، قرآن میں وہ ساری باتیں ہیں جن کو آج کے کل کے سائنسداں (Emperical attitude) کہتے ہیں اور اسی (Emperical attitude) کو اللہ تعالیٰ صحیح سمت میں ڈال دیتا ہے، تو انسان سائنس کے انکشافات کرنے لگتا ہے، (ص ۱۳) قرآن ہی نے بتایا کہ جب انسانی ذہن تبدیلی چاہتا ہے اور اس تبدیلی پر قابو پا کر اس کا صحیح مصرف لیتا ہے تو وہ ایک پائدار تمدن کا مالک بن جاتا ہے، (ص ۱۴) ان کو قرآن ہی سے معلوم ہوا کہ جب زمان ایک (Organic whole) یعنی نامیاتی کل میں تبدیل ہونے لگتا ہے تو اسی کا نام تقدیر پڑ جاتا ہے،، اور وہ دعوی کرتے ہیں کہ خودی اور انا کا تخیل ان کو سورۂ اخلاص سے ملا جو ان کے خیال میں انسان سے ایسے ہی وابستہ ہے جیسے اس کی گردن کی رگ اس کے ساتھ ہے، خودی میں مصطفائی، خودی میں کبریائی، اور خودی کی زد میں ساری خدائی کا راز بھی ان کو قرآن پاک ہی میں ملا، رموز بے خودی اور (Reconstruction) میں سورۂ اخلاص کی جو وضاحت و تشریح ہے اس سے ان کے ان خیالات کا اندازہ ہوگا، اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ وہ تمام عمر قرآن پڑھتے رہے، قرآن سے متعلق سوچتے رہے، اور قرآن ہی کی مدد سے سب کچھ کہتے رہے اور یہ جو ان کے عشق کا فلسفہ ہے اس کا سرچشمہ کہاں پایا جاتا ہے، وہ جب جمال عشق، جلال عشق، کمال عشق، اور زوال عشق کی داستان بیان کرتے ہیں، یا جب وہ یہ کہتے ہیں کہ عشق دم جبرئیل، عشق دل مصطفیٰ، عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام، عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام، عشق فقیہ حرم، عشق امیر جنود،

[illegible] حیات، عشق نورِ حیات، عشق نارِ حیات ہے، تو یہ عشق کون سا عشق ہے کسی لیلیٰ
کسی عذرا، کسی شیریں کا نہیں، بلکہ عشقِ الٰہی ہے، جس میں سرشار ہو کر یہ بھی کہہ گئے ہیں،

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ؛ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اس کو ایک نئے علاج کی شطحیات سمجھیں، یا عشقِ الٰہی کی سوزناکی جو ان کو قرآن ہی سے ملی
پھر اسی سرشاری میں وہ انسان کے متعلق کہہ اٹھے ہیں،

ع :- ہستی او ظلِ اسمِ اعظم است ،

اور اسی کی تشریح اس طرح کرتے ہیں، کہ خدا نے آدمی کو کھو دیا ہے اور وہ کائنات کی ہر چیز میں
آدمی کو تلاش کر رہا ہے، آدمی کو لالہ اور نرگس کی دل آویزیوں، پرندوں کے سینوں، پھولوں کی
خوشبوؤں، دنیا کی ہر چیز کی رنگینیوں، محلوں، وادیوں اور ماہتاب کی کرنوں میں ڈھونڈتا ہے،
زندگی کا موتی انسان کے جسمِ خاکی میں گم ہو کر رہ گیا ہے، اور اب یہی فیصلہ کرنا ہے کہ یہ دنیا خود
آدمی ہے یا خداوند تعالیٰ ہے،

ع :- ایں گوہرے کہ گم شدہ مائیم یا کہ اوست

انسان کا یہ مرتبہ علامہ محمد اقبال نے جو بلند کیا ہے وہ قرآن ہی کی تعلیم کی بنا پر ہے، اس
کو سمجھ کر ہم کو اور آپ کو اپنے کو سمجھنا ہے، ان کا پیام ہے کہ مسلمانوں کا زیستن اس وقت تک
ممکن نہیں جب تک وہ اپنے زیستن کو قرآن سے منسلک نہیں کریں گے،

قرآن پاک کے بعد علامہ محمد اقبال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک سے سب سے
زیادہ متاثر ہوئے، آپ کی رسالت کو وہ جہان کی تکمیلِ دین اور ختمی قرار دیتے ہیں، آپ کی [illegible]
کو قلبِ مومن کی قوت، آپ کی حکمت کو حبل الورید ملت سمجھتے ہیں بعض اسباب کی بنا پر ان کی
حاضری مدینہ منورہ میں تو نہ ہو سکی لیکن آخر وقت میں ارمغانِ حجاز میں مدینہ منورہ کا جو خیالی

کو منظوم کیا، وہ دنیا کے شعر و ادب کے شاہکاروں میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، وہ وہاں پہونچنے سے پہلے اپنے کو شہید جلوہ سمجھتے ہیں، ان کا قدم مستانہ وہاں کے صحرا پر پڑتا ہے، تو اس کی ریگ ان کو حریر معلوم ہوتا ہے، اس کو مقامِ عشق و مستی کی منزل، شانِ جمال، زمانِ جاوداں کی وادی، تب و تابِ دل، میخانۂ شوق، رات کی تاریکی میں تابِ ماہ، ضمیرِ زندگی، شریکِ درد و سوزِ لالہ قرار دیتے ہیں، اور پھر پرنم آنکھوں کے ساتھ ملتجی ہوتے ہیں کہ

نگاہے یا رسول اللہ نگاہے،

اور آپ سے کیا مانگتے ہیں:

ز سوزِ ایں فقیرِ رہ نشینے　　بدہ اورا ضمیرِ آتشینے
دلش را روشن و پایندہ گرداں　　ز امیدے کہ زاید از یقینے

اور یہی ضمیر آتشیں اور دل روشن اپنے کلام میں منتقل کرتے رہے، جسکو ہم صحیح طور پر سمجھیں تو ہم اپنے کو بھی سمجھا سکیں گے۔

صحابۂ کرام میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شمع رسالت کے گرد جو پروانہ کا عشق دکھایا، اور اس عشق و محبت میں جو استواری دکھائی، اس سے بھی علامہ محمد اقبال متاثر ہوئے، ان کو خواب کے ذریعہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ ہی نے بشارت دی کہ سورۂ اخلاص کے ذریعہ سے ان کو زندگی کی تب و تاب حاصل ہو سکتی ہے، وہ آئینِ صدیقؓ و عمرؓ کی تجدید چاہتے رہے، وہ حضرت عمرؓ فاروق کے فقر و سلطانی، خلافت اور تاج و سریر، جہانگیری اور خاک نشینی کی حسین آمیزش کو اسلامی ملوکیت کا صحیح تصور جانتے رہے، حضرت علیؓ کے عشق رسول کو سرمایۂ ایمان، ان کی تلوار کو قوتِ دینِ مبین، ان کے نام کو سرِّ زندگی سمجھتے رہے، انھوں نے حضرت بلالؓ کی فطرت کو نورِ نبوت سے مستنیر پایا، حضرت ابن مسعودؓ کو چراغ افروزِ عشق سمجھتے رہے، حضرت سلمان فارسیؓ کو سب سے [illegible] ناموسِ اسلام قرار دیا، حضرت بوذرؓ کے درد دل اور آہ نیم شبی کے تذکرے

رہے حضرت خالد بن ولید کی قوت بازو اور جبر کے معترف تھے۔ انھوں نے حضرت فاطمہ الزہرا کی عفت میں ملت اسلام کے اصلی ناموس اور ان کی امومت میں نسوانیت کا اصلی جوہر پایا۔
پھر بڑے فخر کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے، کہ وہ شروع سے آخر تک بحر آل عباء کے غلام رہے، ان ہی سے راز زندگی اور سرمرگ ان پر فاش ہوا، ان ہی سے سرور پاکر مقام کبریائی کا سرور حاصل کیا، ان ہی کے فیض سے ان کے سبو میں جیحون منتقل ہوا، ان ہی کی آتش سوز سے ان کا علاج ہوا۔ اسی کے ساتھ ان کو یہ بھی اعتراف ہے، کہ انھوں نے حضرت فضیل اور حضرت ابو سعید میں پاک مردانگی پائی، حضرت جنیدؒ اور بایزید بسطامیؒ کے جمال کو بے نقاب دیکھا، منصور کے عرفان کی تجلیوں میں فطرت کی تجلی دیکھی، حضرت سید احمد رفاعیؒ کے ضمیر سے نور کو کسب کرنے کی فکر کی، حضرت علی ہجویریؒ کو مخدوم امم، پاسبان عزت ام الکتاب قاصد طیار عشق قرار دے کر کہتے ہیں کہ ان ہی کے جمال کی وجہ سے عہد فاروقی کی یاد تازہ ہوگئی اور خاک پنجاب زندہ ہوگئی، انھوں نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے دل بے تاب اور درد ناشکیبائی میں ایک خاص کیفیت محسوس کی، خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی قبر کی زیارت میں دل کی زندگی پائی، حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے ذریعہ ان کو شعور ولایت اور شعور نبوت کا فرق معلوم ہوا، حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ کے مزار کی خاک کو زیر فلک مطلع انوار سمجھا، اور ان کو صاحب اسرار تصور کر کے ان سے چشم بینا کے ساتھ چشم بیدار کے خواہاں ہوئے۔

حکمائے اسلام میں امام غزالی کی طرف ان کی نظر اٹھی، بو علی سینا کے مقام تفکر تک پہنچنے کی کوشش کی، سنائی کے صدق و اخلاص کے جویا ہوئے، حیرت فارابی سے متحیر رہے، نظریۂ نور سے متعلق ان کے خیال کو ابن رشد سے تقویت پہونچی، ابوالورد سنائی اور جنید بغدادی کے خیالات اپنے اشعار میں منتقل کیے، ابن خلدون نے انسانی نفسیات کو سامنے رکھ کر زندگی اور

[illegible] ہے، اس سے بھی استفادہ کیا، وہ شاہ ولی اللہ کا احترام اس لیے کرتے ہیں کہ انھوں نے اس برصغیر میں مسلمانوں کے مذہبی خیالات میں جلا پیدا کی، وہ جمال الدین افغانی کی حق گوئی، حق بینی اور تجلی اپنے فکر سے بھی متاثر تھے، سرسید احمد خاں نے اس برصغیر میں جو نئی زندگی پیدا کی اس کا بھی اثر ان پر رہا۔

مسلمان حکمرانوں میں حشمِ فاروق اعظمؓ اور ان کی شانِ محبوبی کے رطب اللسان رہے۔ ہارون رشید کے ساتھ طغرل و سنجر کے آئینِ جہانبانی کو سراہا ہے، صلاح الدین ایوبیؒ کی تلوار کی تعریف میں لکھا ہے، کہ اگر تیغِ ایوبی کے ساتھ نگاہ بایزید مل جائے تو یہ ہر دو عالم کے گنج کی کلید ہو جائے، ان کو فخر رہا کہ دولت عثمانیہ کے سلطان محمد فاتح نے بازنطینی سلطنت پر ضرب کاری لگائی۔ ترکی کے حلیم پاشا کی عزت ان کے دل میں اس لیے رہی کہ ان کا پیغام تھا کہ:

شعلہ افرنگیاں نم خوردہ است چشم شاں صاحب نظر دل مردہ است

وہ اس برصغیر کے مسلمان حکمرانوں میں قطب الدین ایبک اور شیر شاہ سوری کی پامردی کی تعریف کرتے ہیں، وہ بابر کے مزار پر حاضر ہوئے تو پکار اٹھے کہ یہ بادشاہ خوش نصیب ہے کہ اس جگہ ہے جو طلسم فرنگ سے آزاد ہے، اورنگ زیب کی تعریف میں ان کا قلم چلا تو چلتا گیا، اس کو اعتبار دودمان گورگان، شعلۂ توحید کا پروانہ، اور صف شاہنشاہاں میں یکتا کہتے ہیں، اور پھر اس کے بارے میں یہ لکھ کر تو ایمان کو تازہ کر دیتے ہیں کہ

درمیان کارزار کفر و دین ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

وہ ٹیپو سلطان کا بھی احترام کرتے ہیں، ان کے خیال میں وہ یہ پیام چھوڑ گیا ہے کہ:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول

مسلمان فاتحوں میں طارق بن زیاد کے حالات اور کارنامے پڑھ کر ان پر نشاط طاری

ہو گیا ہے، اور دیکھتا ہے کہ یہ غازی یہ پراسرار بندے جن کو ذوقِ خدائی بخشا گیا تھا پیدا کر گیا ہے:

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

وہ محمود غزنوی کو بھی بہت پسند کرتے تھے کہ اس کی تیغِ بے زینہار کی یلغار سومنات ہی کا قصہ تھا، سخن گوئی میں شیخ فریدالدین عطار سے متاثر ہوئے، عراقی کے اشعار سے لذت آشنا ہوئے، حدیث بوعلی قلندر پانی پتی میں گل رعنا کی دل آویزی دیکھی، اللہ تعالیٰ سے امیر خسرو کے سینہ کے آتشدان کے سوز کے طلبگار ہوئے، اپنے کو کشتۂ انداز جامی قرار دیا، عرفی کی غیرت اور تخیل، اور فیضی کی توانائی اور جوش کو اپنایا، صائب، ملک قمی، ابوطالب کلیم، میر رضی دانش، عبدالقادر بیدل کے اشعار سے متاثر ہو کر تضمینیں لکھیں، غنی کشمیری جیسے فقیر لیکن اقلیم معنی کے امیر کی نوا سنجی ان کے ذہن پر چھائی رہی، غالب اور میر کا انداز بھی پسند کیا۔

حضرات! اس سمع خراشی کا مطلب یہ ہے کہ ان حقائق کے پیش نظر کیسے یقین کیا جائے کہ اقبال فرنگی فلسفیوں کی گاڑی کھینچنے میں لگے رہے، ان کا فلسفۂ خودی بہت مقبول ہے، اس کو فرنگیت سے ملوث کرنا اپنی بے خبری کا ثبوت دینا ہے، اقبال خود ہی لکھتے ہیں کہ اسرار خودی کا فلسفہ مسلمان صوفیہ کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے، اور وقت و زمان کے متعلق برگساں بھی ہمارے صوفیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں، وہ تو یہ بھی لکھتے ہیں کہ زمان و مکان پر خود ہندوستان کے مسلمان حکما، اور صوفیہ نے بہت کچھ سوچا اور لکھا ہے، ان کو یہ افسوس رہا کہ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفہ کی تعلیم سے ناآشنا ہیں، ان کی خواہش تھی کہ اسلام کے حکما، اور صوفیہ کے نقطۂ نگاہ سے یورپ کو روشناس کیا جائے، ان کو

صحیح تھا کہ اس کا بہت اچھا اثر ہوگا، وہ اس پر کوئی مستقل کتاب تو نہیں لکھ سکے، لیکن اسلام کے حکماء اور صوفیائے کرام کے یہاں جو چیزیں غیر مرتب تھیں، ان کو انہوں نے اپنی شاعری میں بہت ہی منظم اور دل آویز طریقہ پر پیش کر کے اپنے خیالات کی کوثر و تسنیم بہا دی۔ اگر ہم علامہ محمد اقبال کو اس حیثیت سے پہچان لیں گے، تو ہم اپنے کو بھی پہچان سکیں گے۔

علامہ محمد اقبال نے قرآن مجید کے تدبر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ، صحابۂ کرامؓ کی زندگی، حکمائے اسلام، صوفیائے کرام اور فرمانروایان اسلام وغیرہ سے جو کچھ پایا تھا، اس کو مسلمانوں تک پہونچایا، انہوں نے صداقت، عدالت، شجاعت، دنیا کی امامت، رمز مسلمانی، اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی، عشق کی گرمی، عشق مکاں، تجلیات کلیم، مشاہدات کلیم، قلب سلیم، نور خودی، نار خودی، خودی کی مصطفائی، خودی کی کبریائی، روح قرآنی، مومن بن کر، دین کی نفس گدازی کی تعلیم دے کر کاروان ملت کے حدی خواں اور فلسفۂ اسلام کے ترجمان بننا چاہتے تھے، مگر وہ شکستہ دل اور آزردہ خاطر ہو کر شاید اس دنیا سے رخصت ہوئے کہ وہ اس پیام سے مسلمانوں کو مرد مومن، مرد مجاہد، مرد حر اور نوجوانوں کو شاہین نہ بنا سکے، اس لیے کہ یہ لوگ ان کو شاعر اسلام کے بجائے شاعر شیوہ بیان سمجھتے رہے، ان کے شکوہ سے زیادہ لطف لیا، جواب شکوہ کو خاطر میں نہیں لائے، ان کی نظموں میں جگنو، شمع، چاند اور ستارے، جلوۂ حسن، ماہ اور شاعر، پھول، محبت، عشرت امروز سے زیادہ محظوظ ہوئے، صقلیہ، بلاد اسلامیہ، گفتگو اسلام، دنیائے اسلام اور طلوع اسلام کو زیادہ پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی، سرمایہ و محنت کو غور سے پڑھا، اسی کے ساتھ زندگی اور سلطنت پر جو نظمیں کہی گئی تھیں، وہ زیادہ قابل اعتنا نہیں سمجھی گئیں، اسرار خودی کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کیا گیا، مگر رموز بے خودی کو بھلا دینے کی کوشش کی گئی، زبور عجم کی غزلوں کی موسیقیت، ترنم، شیریں دیوانگی، اور جذبات کی پسی ہوئی

جلیوں اور کبھی جوش تجلیوں پر سر دیا وہ دھنا گیا، مگر پیام مشرق کی طرف زیادہ توجہ نہیں
دی گئی، جاوید نامہ کی اشاعت پر چراغاں ہوا کہ ادبیات کی دنیا میں کامیڈی کی طرح کا ایک
مسلمان شاعر بھی پیدا ہو گیا، مگر جاوید نامہ میں جو کچھ لکھا گیا اس پر عمل کرنے کی کوشش نہیں کی
گئی، ضرب کلیم میں خودی میں ڈوب کر ضرب کلیم پیدا کرنے اور بال جبریل میں نفس سوختۂ شام
وسحر کو تازہ کرنے کا جو پیام تھا، وہ تو نظرانداز کر دیا گیا، اور اس پر بحث ہونے لگی کہ اس وقت
تک علامہ محمد اقبال کی شاعری کی صناعی اور کاریگری کس ارتقائی منزل کو پہونچ گئی تھی، پس چہ
باید کرد میں نگاہ مرد مومن، تطہیر فکر، حکمت کلیمی کی جو کرامت دکھائی گئی ہے، یا سیاسیات حاضر
اور حرف چند با امت عربیہ کے عنوانوں سے جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، وہ نقش و نگار طاق نسیاں
بنا دیے گئے۔ یا ارمغان حجاز میں جو کچھ قلمبند کیا گیا ہے، وہ شعر و ادب کی مجلس کے لیے
نشاط و انبساط کا سامان تو بن گیا، لیکن جس مقصد کے لئے یہ لکھا گیا تھا، اس کی تکمیل کی کوشش
نہیں ہوئی، خود علامہ محمد اقبال کو اپنی زندگی میں ان سب باتوں کا احساس ہو گیا تھا، اس لیے
انہوں نے بارگاہ رسالت میں فریاد کی:

بآں رازے کہ گفتم پے نبردند — ز شاخ نخل من خرما نخوردند
من اے میر امم داد از تو خواہم — مرا یاران غزل خوانے شمردند

یعنی مسلمانوں نے مجھ سے کچھ نہیں سیکھا، مجھ کو صرف غزل خوان ہی سمجھتے رہے، ہمیشہ ان کو یہ شکایت رہی کہ لوگ
کہ وہ سمجھ رہے تھے کہ سرمایۂ حیات کیلئے خون دل و جگر چاہیے، اس لئے کہ فطرت ہو تو نگ ہے مگر غافل مسلمان جل ترنگ ...
اپنی اس مایوسی کے باوجود وہ مسلمانوں کے روشن مستقبل سے مایوس نہیں ہوئے، مفکر، مصلح اور
متکلم اسلام ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کی چھپی ہوئی صلاحیت اور بے پناہ جوہر سے اچھی طرح واقف تھے،
ان کے زمانے میں عالم اسلام پر آشوب دور سے گزر رہا تھا، پھر بھی ان کی پیشین گوئی تھی،

مسلمان گرچہ بے خیل و سپاہے است ضمیر او ضمیر شاہے است

اگر او را مقامش باز بخشند جمال او جلال بے پناہے است

مسلمانوں کا یہ بے پناہ جمال اور جلال ان کو اب تک واپس نہیں ملا ہے، کیوں؟ علامہ محمد اقبال کی وفات اب تک ان کی شعری، مابعد الطبیعاتی، علمی، نظری اور فکری کارناموں کا بہت کچھ مطالعہ کیا گیا ہے مگر وہ اب تک کتابوں، رسالوں، اخباروں، سیمیناروں، بین الاقوامی کانگرسوں اور موسیقی کی مجلسوں ہی تک محدود ہیں، مسلمانوں کی عملی زندگی میں کہیں نہیں دکھائی دیتے۔ کیا اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کو صرف ادبی گل کاری، قلمی صناعی اور علمی کاریگری سمجھا جائے، یا علامہ محمد اقبال چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے خواب گراں سے بیدار ہوں، ناموس ازل کے امین، جبریل و اسرافیل کے صیاد، ظاہر و باطن کی خلافت کے سزاوار، زہر کا تریاق، مہر و مہ و انجم کے حاکم، خودنگر، خودگر، خودگیر، بانگ درا، بال جبریل اور ضرب کلیم بن کر رہیں، مگر وہ اب تک نہ بن سکے، ہمارے دانشور اور اہل قلم بتائیں کہ آخر کیوں؟ شاید اس لیے کہ علامہ محمد اقبال شاعر شیریں مقال کی حیثیت سے تو سمجھے گئے، لیکن اقبال اپنے اصل جوہر کمال کے ساتھ نہیں پائے گئے، اگر مسلمان عارف باللہ اقبال، عاشق رسول اقبال، فلسفۂ اسلام کے ترجمان اقبال اور کاروان ملت کے حدی خواں اور رجز خواں اقبال کو پالیں، تو وہ خود اپنے کو بھی پالیں گے، جس کے بعد وہ کبھی دریا سے مثل موج ابھر کر کبھی دریا کے سینے میں اتر کر اور کبھی دریا کے ساحل سے گزر کر مقام اپنی خودی کا فاش بلکہ فاش تر کر سکتے ہیں۔

شجرۂ نسب پر ایک نظر

از۔ جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی چیرمین اتر پردیش، اردو اکاڈمی لکھنؤ

(۲)

برناوا میں جو دہلی متھرا کے راستہ پر واقع "اب ضلع میرٹھ میں شامل ہے، مزار گنبد اور خانقاہ کے آثار اب بھی موجود ہیں، مگر اب کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو تاریخی ذمہ داری کے ساتھ عہد ماضی کے مستند ماخذوں سے روشنی ڈال سکے یا دستاویزی ثبوت فراہم کر سکے۔

یہ صحیح ہے کہ برناوا میں آباد قدیم خاندان کے باقیات "انصاریان ہرات" ہی میں ہیں جس کا ثبوت ایک قدیم مخطوطے "چشتیہ بہشتیہ" سے ملتا ہے، مگر وہ علاء الدین جو علمائے فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں دسویں نمبر پر ہیں کیا علاء الدین "برناوی" ہو سکتے ہیں؟ ممکن ہے نام کے اشتراک سے دھوکا ہو بھی جائے لیکن برناوی علاء الدین کی تاریخ وفات ([illegible]) سے حقیقت حال بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ اور ان کے عمود نسب کو جان لینے کے بعد غلط فہمی کا امکان بھی باقی نہیں رہنا چاہیے۔

ورقۂ نسب میں علمائے فرنگی محل شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کے [illegible] کی اولاد میں، اور برناوی علاء الدین شیخ الاسلام کے جن بیٹے کی اولاد ہیں ان کا نام اسماعیل ہے شجرہ یہ

علاء الدینؒ بن نصیر الدینؒ بن بدر الدینؒ بن شرف الدینؒ بن خواجہ فضیلؒ بن خواجہ کلاںؒ بن خواجہ داؤدؒ بن خواجہ حامدؒ بن خواجہ جلال الدینؒ بن خواجہ سلیمؒ بن خواجہ اسماعیلؒ بن شیخ الاسلام ہروی۔

انہی خواجہ جلال الدین (اس عمود نسب میں نویں نمبر پر) کے بارے میں "احوال علمائے فرنگی محل" میں صراحتہً لکھا ہے (اور جو بعینہٖ "تذکرۂ علمائے فرنگی محل" میں نقل بھی ہو گیا ہے) کہ اس کنبے کے وہی پہلے شخص ہیں جو ہرات سے ہندوستان آئے۔[۱]

مصنف قرۃ الابصار نے چشتیہ بہشتیہ مخطوطے سے بعض اقتباسات نقل کرتے ہوئے جن میں علاء الدین برناوی کا مدفن شیخوپورہ راپڑی میں بتایا گیا ہے چشتیہ کے یہ الفاظ بعینہٖ درج کر دیئے ہیں۔

علاء الدین کے بیٹے مولانا نظام الدین تھے جو راپڑی سے اپنے بھائی کے ساتھ ہرات واپس گئے۔ پھر یہ دونوں بھائی ہرات سے واپس آئے اور برناوا میں ایک خانقاہ قائم کی پھر مولانا نظام الدین قصبۂ راپڑی چلے گئے۔ ان کی اولاد قصبۂ راپڑی کے نواح میں موجود ہے۔[۲]

ان مولانا نظام الدین ساکن راپڑی کی نسل میں ایک صاحب نواب بدھن کے بارے میں مصنف قرۃ الابصار کا بیان ہے:

"نواب بدھن سے راقم کی ملاقات پاک پٹن میں ہوئی تھی .... پھر دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے اخلاق سے پیش آئے اپنا شجرۂ نسب اور چشتیہ بہشتیہ دیکھنے کو دی، اسی وقت بقدر ضرورت، رسالۂ "چشتیہ" کے مذکورہ اقتباسات راقم نے لے لیے تھے۔"[۳]

راپڑی ــــــ جہاں مولانا نظام الدین برناوا سے آکر مقیم ہو گئے تھے۔ اور جس کے نواح میں

---

[۱] حوالہ علمائے فرنگی محل مطبوعہ ص ۔ [۲] تذکرۃ الابصار (مخطوط) [۳] حوالہ بالا

ان کی اولاد یہاں ہے ...... ضلع سیتا پور کی تحصیل شکوہ آباد میں ایک بستی بانہ ہے۔ جہاں ایک تفریحی سفر کے سلسلے میں ایک محقق نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی (م ۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء) کو جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ بعض قدیم مزارات اور پرانی عمارتیں دیکھ کر اپنے ذوق تحقیق کے تحت انھوں نے یہ معلوم کر لیا کہ یہ مزار کس زمانے کے ہیں۔ ان کا بیان ہے :-

"جن بزرگوں کے یہ مزار ہیں ان کا اصل مسکن برناوا ضلع میرٹھ تھا۔ وہاں ایک بزرگ علاء الدین چشتی نے اگلے زمانہ میں "چشتیہ بہشتیہ" ایک کتاب لکھی ہے اس میں راپڑی کے مزارون کا حال درج ہے، اس کی عبارت فارسی کا خلاصہ متعلق مقام یہ ہے :-

مخدوم بدرالدین، صاحب ولایت، حضرت ابوایوب انصاریؓ کی اولاد میں ہیں ..... یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ کے خلیفہ تھے، سو برس سے زیادہ عمر پا کر (۷۸۸ھ ۱۳۸۶ء) میں رحلت کی۔ ان کا مزار برناوا کے متصل پنیڈن ندی کے کنارے پر ہے، ان کے صاحب زادے نصیر الدین بزرگ تھے۔ یہ اپنے والد کے خلیفہ اور مرید تھے ۱۰ ذی الحجہ ۸۴۹ھ ۱۴۴۶ء میں ان کا انتقال ہوا۔ شیخوپورہ راپڑی کے مزار میں ان کی قبر سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے، ان کے دو بیٹے علاء الدین عرف بدھن کی وفات ۲ شوال ۸۷۶ھ ۱۴۷۲ء روز دوشنبہ ہوئی، ان کی قبر اپنے والد کی قبر کے متصل سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے۔ دوسرے شیخ فرید الدین عرف شیخ فدو (وفات ۸۳۵ھ) ان کی قبر احاطے کی شمالی دیوار کے متصل اپنے والد کے مزار کے پس پشت ہے۔"

"چشتیہ بہشتیہ" میں مذکور علاء الدین برناوی کے بیٹے "چشتیہ بہشتیہ" ہی کے اقتباس کے مطابق مو نظام الدین تھے۔ جو اپنے والد ماجد کی وفات (۸۷۶ھ ۱۴۷۲ء) کے بعد ہرات (آبائی وطن) چلے گئے؟ وہاں سے واپس آکر راپڑی میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔

ان نظام الدین کے ہراست سے سہالی آنے اور رداپٹری میں قیام اختیار کرنے کا زمانہ کم و بیش پندرہویں صدی عیسوی کا آخری یا سولہویں صدی عیسوی کا بالکل ابتدائی زمانہ ہوگا۔ گویا سکندر لودھی (۸۹۴ھ/۱۴۸۹ء تا ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) کے یہ نظام الدین معاصر تھے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بدرالدین ؒ دحیمی کی وفات سو برس کی عمر میں ۹۰۶ھ/۱۵۰۰ء میں ہوئی اس بنا پر ان کی پیدائش ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء قرار پاتی ہے، نظام الدین تک پوری دو صدیاں محض تین پیڑھیوں میں پوری ہو گئیں، اب اگر ان نظام الدین کو جو علمائے فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں نویں نمبر پر ہیں، وہ نظام الدین مانا جاتا ہے جو دو سو سال میں محض تین پیڑھیاں گزارنے والے اور سکندر لودھی کے معاصر ہیں تو انکی اولاد میں ملا محمد حافظ (ورقۂ نسب میں پانچویں نمبر پر) کو اکبر کا معاصر ماننا تاریخی طور پر خلاف قیاس اس لیے قرار پائے گا کہ محض نصف صدی کے اندر ان ملا حافظ کی چار پیڑھیاں کیسے بیت گئیں، جب کہ ان چار پیڑھیوں سے اوپر کی تین پیڑھیوں کے بیتنے میں دو سو برس صرف ہو گئے تھے —— اور ملا محمد حافظ کا مغل بادشاہ اکبر کا ہم عصر ہونا، دستاویزی ثبوت رکھتا ہے۔ مزید یہ کہ ملا محمد حافظ کی عمر عہد اکبری کی ابتدا میں پچاس پچپن برس اگر قرار دی جائے —— جب کہ قرائن کا تقاضا اس سے زیادہ کا معلوم ہوتا ہے —— تو ملا محمد حافظ خود سکندر لودھی کے معاصر نظر آتے ہیں یعنی اپنے دادا کے بھی دادا کے معاصر ہو جاتے ہیں۔

یہ سراسر خلافِ قیاس نتیجہ صرف اس لیے نکلتا ہے کہ "چشتیہ بہشتیہ" میں مذکور برنادی علاء الدین اور انکے بیٹے نظام الدین کو سہالوی علاء الدین اور ان کے بیٹے نظام الدین میں ناموں کے اشتراک کی وجہ سے خلط ملط کر دیا گیا۔

رضی الدین محمود فتح پوری نے غصان الانساب (فارسی مخطوطہ) میں علاء الدین کے بارے میں جو کچھ روایت کیا ہے وہ اور زیادہ محل تعجب ہے۔

ان کی تحریر کے مطابق علاء الدین "چار بھائیوں سمیت چنگیز خاں کے زمانے میں وہاں کی سفاکی اور خون ریزی سے فرار اختیار کرتے ہوئے اپنے وطن ہرات سے ہندستان آگئے۔ اور یہ سلطان غیاث الدین تغلق کا زمانہ تھا۔ اور یہ عہد حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا تھا۔ علاء الدین اور ان کے ایک حقیقی بھائی مسعود متبحر عالم تھے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے سلسلہ میں مسئلہ سماع پر علمائے دہلی حرمت سماع کے فتوے پر دستخط اور مہریں کر رہے تھے۔ نو وارد علاء الدین اور مسعود سے بھی حرمت سماع اور اس "حرام" پر اصرار کرنے والے کو واجب القتل قرار دینے پر دستخط چاہے گئے۔ دونوں بھائیوں نے اپنے نو وارد و مسافر ہونے کا عذر پیش کر کے کسی طرح محضر پر دستخط کرنے سے نجات حاصل کر لی۔ اس صورت حال کی اطلاع حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے گوش گزار ہو گئی۔ جب یہ دونوں بھائی حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے۔ اور اپنی زبان سے صورت حال بیان کی تو حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے خوش ہو کر علاء الدین کو نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ الی غیر النہایہ دعائے ترقی علم اور مسعود کو اسی طرح دعائے فراوانی دولت دنیاوی۔ بہرحال کچھ روز دہلی میں بسر کرنے کے بعد ان چار بھائیوں میں ۲ دو پانی پت میں آباد ہو گئے۔ ان میں سے ایک بھائی صاحب اولاد ہوئے اور پانی پت کے تمام انصاری زادگان ان ہی کی اولاد ہیں۔ دوسرے بھائی لاولد فوت ہو گئے۔ بقیہ ۲ دو بھائیوں میں سے ایک نے قصبہ سنبھل میں اقامت اختیار کی اور سنبھل کے تمام انصاری زادے ان کی اولاد ہیں اور خود علاء الدین نے مشرق کی راہ اختیار کی اور بالآخر سہالی پہنچ کر وہیں سکونت اختیار کر لی۔

"اغصان الانساب" کی روایت کا جو اور تفصیل سے وہاں بیان ہوئی ہے یہ خلاصہ ہے!

تاریخ کی کسوٹی پر یہ "روایت" کھری بھی اترتی ہے؟ چنگیز خاں کا ہرات پر حملہ جس کے نتیجے میں علاء الدین اور ان کے تین حقیقی بھائیوں نے وطن چھوڑا اور ہندوستان کا رخ کیا ۶۱۹ھ

نہیں ہوا تھا ہندوستان میں اس وقت سلطان شمس الدین التمش (سنہ ۶۰۷ھ تا سنہ ۶۳۳ھ) حکمراں تھا، اور یہ غیاث الدین تغلق کی سلطنت سے سو برس پہلے کی بات ہے، اس وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی بدایوں میں ولادت بھی نہیں ہوئی تھی۔

اگر ان علاء الدین اور ان کے تین حقیقی بھائیوں کو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کا کسی طرح ہم عصر مان لیا جاتا ہے تو شجرۂ نسب کے تعلق سے ایک اور لاینحل سوال سامنے آجاتا ہے، علاء الدین جو بلاشک وشبہہ علمائے فرنگی محل کے اجداد میں ہیں ــــــ اس لیے کہ ملا قطب الدین شہید سہالوی (م سنہ ۱۱۰۳ھ) نے بھی اپنی تحریروں میں اپنی نویں یا دسویں پیڑھی کا جد "علاء الدین کو بتایا ہے ــــــ اگر نظام الدین اولیاءؒ کے ہمعصر تھے تو حضرت نظام الدین اولیاؒ کی وفات سنہ ۷۲۵ھ سے ملا محمد حافظ کے نام شہنشاہ اکبر کے ہجری فرمان کی تاریخ (سنہ ۹۶۷ھ) تک دوسو بیالیس سال ہوتے ہیں اور ان دوسو بیالیس برسوں میں علاء الدین (ورقۂ نسب میں دسویں نمبر) کی تا ملا محمد حافظ صرف پانچ پشتیں ہوتی ہیں۔ اور حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی وفات اور حضرت شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی کی وفات (سنہ ۴۸۱ھ) کے درمیان جو دوسو چوالیس سال بیتے ان میں علاء الدین سے شیخ الاسلام تک پوری نہیں پشتیں گزریں۔

تاریخی طور پر اس سے نتیجہ یہی نکالا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی عالم علاء الدین، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے معاصر تھے جن کے تین حقیقی بھائی اور تھے جن میں ایک کی اولاد پانی پت میں اور دوسرے کی اولاد سنبھل میں پائی جاتی ہے تو ہمیں کوئی وجہ انکار کی نہیں، لیکن یہ وہ علاء الدین نہیں ہو سکتے جن کی بعد کی پانچویں پشت میں ملا محمد حافظ شہنشاہ اکبر کے معاصر ہوئے ہیں اور جو ورقۂ نسب میں دسویں نمبر پر ہیں۔

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ علاء الدین ہم نامی جن کے بیٹے نظام الدین، سکندر لودھی کے معاصر تھے، اور وہ علاء الدین جو حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ہمعصر مانے جاتے ہیں، اور جن کے بھائیوں کی

اولاد پانی پت ... ہے۔ علمائے فرنگی محل کے ورثہ نسب ... مذکرہ علاوالدین ... ان کا ... شخصیتیں ہیں۔

اس سلسلے میں ضمناً یہ یاد کر لینا بھی مناسب ہوگا کہ پانی پت کے دو ممتاز انصاری خاندان
خواجہ الطاف حسین حالی (م ۱۳۳۳ھ / ۱۹۱۴ء) اور قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (م ۱۳۱۴ھ / ۱۸۹۶ء)
کے شجرہائے نسب اس دوران میں سامنے آچکے ہیں، ان دونوں پانی پت کے انصاریوں کا جدی
سلسلہ علمائے فرنگی محل کے جدی سلسلے سے نہ صرف جد اگانہ ہو بلکہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہروی
(م ۴۸۱ھ) سے پہلے کہیں ملتا نہیں ہے۔ قاری صاحب شیخ الاسلام کے بیٹے خواجہ محمد انصاری
کی اولاد میں ہیں[۱] جبکہ علمائے فرنگی محل شیخ الاسلام کے بیٹے جابر کی اولاد ہیں، اور قاری صاحب کے
اجداد میں جو بزرگ سب سے پہلے ہرات سے ہندوستان آئے، وہ خواجہ ملک انصاری ہیں جن کی
ہندوستان میں آمد کا زمانہ بھی صراحۃً بتا دیا گیا ہے۔ یعنی ۶۶۵ھ / ۱۲۶۶ء، جب غیاث الدین بلبن۔
(۶۶۴ھ / ۱۲۶۶ء تا ۶۸۵ھ / ۱۲۸۶ء) دہلی کے تخت سلطنت پر تھا[۲]۔ مولانا حالی کے شجرۂ نسب میں بھی خواجہ
ملک علی انصاری آتے ہیں[۳]۔ اس طرح قاری عبدالرحمٰن پانی پتی اور مولانا حالی پانی پتی ہم نسب ہوئے
علمائے فرنگی محل کے ہم نسب کہیں سے نہیں ہوئے۔ اغصان الانساب کے مصنف نے علاء الدین
اور ان کے تین بھائیوں کی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی معاصرت پر مبنی جو روایت بیان کی ہے
وہ "شنیدم" (میرے سننے میں آیا ہے) سے شروع کی ہے، جو "تحقیق" کے حدود کے اندر نہیں آتی،
تذکرہ علمائے فرنگی محل کے مصنف نے "اغصان الانساب" کی یہ روایت بعینہٖ نقل کر دی ہے[۴]، مگر
دعائے حضرت نظام الدین اولیاؒ کے جزو کو مشکوک قرار دیا ہے[۵]۔ جس بنیاد پر اس جزو کو مشکوک قرار دیا

[۱] تذکرۂ رحمانیہ مطبوعہ (محبوب المطابع دہلی ۱۹۳۵ء) [۲] حوالہ بالا۔ [۳] رسالہ جامعہ دہلی ...
شمارہ ۱، ۱۹۳۵ء [۴] تذکرہ علمائے فرنگی محل ص ۸ [۵] حوالہ بالا۔

کا قیاس پر سہالی، سنبھل، اور پانی پت کے انصاری زادگان کے ہم نسب ہونے کی کہانی بھی بے بنیاد قرار پاجاتی ہے۔

مصنف "قرۃ الابصار" لکھتے ہیں :۔

"نصیر اور مسعود جو پانی پت کے ہیں جو اگرچہ نسب نامہ رکھتے ہیں اور سنبھل کے انصاری زادگان اس سے مختلف نسب نامہ رکھتے ہیں۔ اور ہمارے جد، علاء الدین کا شجرۂ نسب دوسرا ہے۔ یہ سب (سہالی، پانی پت، اور سنبھل کے انصاری زادگان) ایک باپ کی نسل سے ہو ہی نہیں سکتے، مسعود پانی پتی کی اولاد میں دولت دینا کی دعا کا جو اثر پایا جاتا ہے وہ شاہ بوعلی قلندرؒ پانی پتی کی دعا تھی، جیسا کہ مسعود پانی پتی کی اولاد سے سننے میں آیا ہے۔ علاء الدین جو ہمارے جد ہیں ان کا شجرۂ نسب وہی ہے جو ہمارے پاس (ورقۂ نسب) ہے۔ ان علاء الدین کو برناوی کہنا بھی محض مہمل بیہودہ بات ہے ۔۔۔۔ اگر کوئی کہے تو تمہارے جد علاء الدین کی قبر کہاں ہے؟ تو میں جواب دونگا: "مٹ چکی ہے" ویسے ہی جیسے شیخ محمد حافظ (معاصر شہنشاہ اکبر) اور ان کے بیٹوں کی قبروں کے نشان محو ہو چکے ہیں۔ میں نے بچشم خود ملا حافظ کی قبر کو جہاں انکے بیٹوں کی قبریں بھی تھیں، دیکھا تھا۔ مگر اب وہ ساری آراضی زیر کاشت ہے"[1]

علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر اس تفصیل بحث سے مقصود اُن روایتوں کی عدم صحت کو سامنے لانا ہے، جو علم الانساب سے ناواقفیت کے اس دور میں حقیقت اور صحت کا درجہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔

خاندان فرنگی محل میں وہ کون بزرگ تھے جو سب سے پہلے ہندوستان آئے؟ اس کا صحت و ثبوت کے ساتھ بتانا اب ممکن نہیں۔ البتہ اس خاندان کے اکابر کے ہندوستان میں مقامات قیام کے

---

[1] قرۃ الابصار (مخطوطہ فارسی)

بارے میں فرنگی محل کے نامور عالم مصنف مورخ اور محقق مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحئی لکھنوی (۱۸۸۶ء،
جن کی تحقیق خاندان فرنگی محل کے عمود نسب کے بارے میں اوپر مذکور ہو چکی (جو در قہ نسب کے مطابق
ہے۔) اپنی تحقیق یوں بیان کرتے ہیں :۔

" ہمارے اجداد مدینہ منورہ سے ہرات، وہاں سے دہلی، وہاں سے سہالی ـــــ
جہاں پر ملا قطب الدین شہید کی قبر ہے ـــــ وہاں سے لکھنو منتقل ہوئے[1]"

مولانا عبد الحئی کی تحقیق میں ان کے اجداد کے " سرسل " برناوا " شیخوپورہ اور راپڑی میں
قیام کا کوئی ذکر نہیں ہے " مقامات قیام " کے سلسلے میں مولانا نے پہلے لاہور کا بھی نام لیا تھا۔
اور جب قیام لاہور ان کی تحقیق کے خلاف ثابت ہوا تو انھوں نے اس کا ذکر حذف کر دیا،
یہی وجہ ہے کہ ان کی مذکورہ حوالے کی کتاب النافع الکبیر کے پہلے ایڈیشن میں جو مطبع مصطفائی
سے نکلا تھا۔ قیام لاہور کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن ان کی حیات ہی میں اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع
دبدبۂ احمدی سے نکلا تو اس میں " قیام لاہور " کا ذکر متروک تھا۔

دبدبۂ احمدی ایڈیشن میں قیام لاہور کا ذکر نہ پا کر مصنف قرۃ الابصار نے لکھا ہے :۔

" میں نے دبدبۂ احمدی میں چھپنے والے ایڈیشن کا مسودہ دیکھا تو پایا کہ مصنف
(مولانا عبد الحئی) نے قیام لاہور کا ذکر قلم زد کر دیا تھا۔ سنا ہے کہ چونکہ ہمارے
قبیلہ انصار کا قیام لاہور ثابت نہیں ہوا، اس لیے اسے قلم زد کر دیا[2]"

قبیلۂ انصار کا سہالی میں قیام کب سے ہوا، اس خاندان کے بعض مورخوں نے
ملا علاء الدین کو ورقہ نسب میں جد... اور بعض مورخوں نے ان کے بیٹے مولانا نظام الدین کو
سہالی کا اولین باشندہ قرار دیا ہے۔ دونوں طرف کے مورخوں نے جو کچھ کہا ہے اس کی کوئی

---

[1] النافع الکبیر (عربی مطبوعہ) از مولانا ابو الحسنات محمد عبد الحئی فرنگی محلی، [2] قرۃ الابصار (مخطوطہ) ورق ۱۵

سند نہیں بیان کی ہے۔ اس لیے اب اس کو موضوع بحث و تحقیق بنانے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی ہے۔

اس سلسلے میں جو بات سند و ثبوت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے وہ یہ کہ درقۂ نسب میں پانچویں نمبر پہ مذکور ملا محمد حافظ، شہنشاہ اکبر کے عہد میں (۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ/۱۶۰۵ء)، تھے، نہ صرف تھے، بلکہ "مدرس" کے لقب سے مشہور بھی ہو چکے تھے، شہنشاہ اکبر نے اپنی تخت نشینی کے تین برس گزرنے کے بعد، ان کے نام اپنی مہر سے مدد معاش کا جو فرمان صادر کیا تھا اس میں علاوہ اور القاب و آداب کے مدرس کے لقب کا بھی ذکر ہے۔

فرمان اکبر کی تفصیل میں جانے سے قبل شجرہ نسب ہی سے متعلق ایک اور روایت کا ذکر بھی ہو جانا چاہیے جس کے اولین راوی ملا عبدالعلی فرنگی محلی (م ۱۲۲۵ھ) ہیں۔

(باقی)

ابن الدمامینی اور اسکی شاعری

از ڈاکٹر حامد علی خان صاحب ریڈر شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شیخ بدرالدین محمد بن ابوبکر بن عمر ابن ابوبکر بن محمد ابن سلیمان بن جعفر بن یحیٰی بن حسین ابن محمد بن احمد بن ابوبکر بن یوسف بن علی بن صالح ابن ابراہیم البدر القریشی المخزومی کی ولادت ۷۶۳ھ[1] میں مصر کے مشہور شہر اسکندریہ میں ہوئی، شیخ بدرالدین "ابن الدمامینی" کے نام سے مشہور ہیں، ان کا خاندان علم وفضل کے اعتبار سے ممتاز تھا، ان کے جد امجد کے حقیقی بھائی "بہاء الدین عبداللہ بن ابوبکر الدمامینی" ایک بلند پایہ فاضل تھے، اور نانا "ناصر الدین بن المنیر" اپنے دور کے بے نظیر عالم اور اعلیٰ مصنف تھے، ان کی تصانیف میں سے "المقتفی، الانتصاف من الکشاف، الثلاثۃ من المأۃ الثامنۃ" کو بہت شہرت حاصل ہوئی،

ابن الدمامینی نے بہاء الدین عبداللہ دمامینی، عبدالوہاب قروی اور اپنے وطن کے دیگر فضلائے وقت سے کسب علم کیا، بعد ازاں قاہرہ گئے اور وہاں سراج الدین بن الملقن شوبری اور مجد الدین اسماعیل حنفی وغیرہ افاضل کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، آخر میں مکہ مکرمہ جا کر قاضی ابوالفضل نویری سے علمی استفادہ کیا، اور اپنی اعلیٰ ذہانت، فہم وفراست، عمدہ قوت حافظہ اور ذاتی جد وجہد کی وجہ سے عربی زبان کے فنون ادب یعنی نثر ونظم، صرف و

---

[1] ابن عماد نے سنہ ولادت ۷۶۶ھ لکھا ہے (شذرات الذہب ج ۷ ص ۱۸۱) لیکن یہ سہو کتابت یا مصنف کی فروگذاشت ہے کیونکہ ابن عماد کا ماخذ سیوطی کی بغیۃ الوعاۃ ہے، جسمیں وہی سنہ ولادت درج ہے جو ہم نے تحریر کی

نحو اور لغت وغیرہ میں کامل مہارت حاصل کر لی تھی، اسی لیے "ابن الدمامینیؒ" کی "نحوی ادیب" کے لقب سے شہرت پائی، ان کے معاصرین ان کے تفوق اور علمی فضیلت کے معترف تھے۔

حالات و واقعات زندگی | ابن الدمامینی نے تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسکندریہ کے چند مدرسوں میں یکے بعد دیگرے تدریس کی خدمت انجام دی، پھر محکمۂ قضا میں ابن التنیسی کے نائب مقرر ہوئے، اور کچھ عرصے تک اپنے وطن میں فرائض منصبی ادا کیے، جب ابن التنیسی قاہرہ گیے، تو یہ بھی ان کے ساتھ گیے، اور قاہرہ میں نیابت کی ذمّہ داریوں سے بحسن اسلوب عہدہ برآ ہوئے، لیکن تعلیم کی طرف ذاتی میلان کی وجہ سے جامع ازہر میں پڑھانا شروع کر دیا، ۸۰۰ھ میں اپنے چچا زاد بھائی کے ہمراہ دمشق پہنچے، اور حجاز مقدس کا رخ کیا، حرمین شریفین میں حاضری کا شرف حاصل کیا، اور فریضۂ حج سے فراغت کے بعد اپنے وطن اسکندریہ کو مراجعت کی، اور عہدۂ نیابت سے سبکدوشی حاصل کر کے جامع اسکندریہ میں خطابت کا منصب قبول کیا، ساتھ ہی تجارتی کاروبار کی طرف توجہ کی، اور اعلیٰ پیمانے پر کام شروع کرنے کے لیے کئی لاکھ روپیے کی رقم ادھار لے کر پارچہ بافی کا ایک بہت بڑا کارخانہ قائم کیا، مگر بدقسمتی سے کارخانے میں آگ لگ گئی، اور وہ قرض خواہوں کے خوف سے بھاگ کر صعید چلے گیے، مگر قرضخواہوں نے تعاقب کیا، اور جب یہ ان کے ہاتھ لگے، تو وہ انھیں ذلیل و رسوا کر کے قاہرہ لے آئے، یہاں تقی الدین بن حجہ کی دستگیری کام آئی، اور ناصر الدین البارزی نے بڑی فراخ دلی سے مدد کی جس سے ان کی پریشانی بھی رفع ہو گئی اور مالی حالت بھی بہتر ہو گئی۔

اس کے بعد وہ الملک المؤید کے دربار میں باریاب ہوئے، اور مالکی محکمۂ قضا میں ان کا تقرر کر لیا گیا، مگر مخالفوں نے چین نہ لینے دیا، اور ایسے بے بنیاد الزامات اور رکیک اعتراضات عائد کیے کہ بالآخر تنگ آ کر حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گیے۔

فریضہ حج ادا کرنے کے بعد یمن تشریف لائے، اور تقریبا ایک برس تک جامع زبید میں درس دیا، مگر یہاں بھی حالات ناسازگار دیکھکر سفر ہند کا عزم کیا، اور شعبان ۸۲۰ھ کے آخر میں سلطان احمد بن محمد بن مظفر گجراتی کے عہد حکومت میں گجرات تشریف لائے،[1]

اہل ہند نے ابن الدمامینی کی پذیرائی اور واقعی قدر دانی کی، اور ان سے علمی استفادہ بھی کیا، اس طرح یہاں کے قیام کے زمانہ میں یک گونہ فراغت نصیب ہوئی، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور شعبان ۸۲۷ھ[2] میں دکن کے شہر گلبرگہ میں انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کسی حاسد نے انہیں انگور میں زہر دے دیا تھا جس کے اثر سے وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہ سکے،[3]

ابن الدمامینی فنون ادب میں ماہر اور ایک بلندپایہ ادیب وشاعر تھے، ان کے ہمعصر ادیبوں نے ان کے فضل وکمال اور شعر وادب میں بلندپایگی کا اعتراف کیا ہے،

ابن الدمامینی کے شاگردوں کی تعداد بےشمار تھی، ان کے سب سے مخلص، جاں نثار اور اطاعت شعار شاگرد زین الدین عبادہ تھے، جو یمن میں قیام کے زمانہ تک برابر ان کے ساتھ رہے، مگر جب یہ ہندوستان تشریف لائے، تو دونوں میں جدائی ہوگئی، اس موقع پر مشفق استاذ نے بطور یادگار انہیں اپنا تحریر کردہ "حاشیہ المغنی" عطا کیا تھا۔

تصنیفات | ابن الدمامینی کا محبوب ترین مشغلہ تصنیف وتالیف تھا، جسے انہوں نے سفر وحضر

---

[1] تمام سوانح نگاروں نے ابن الدمامینی کے ہندوستان آنے کی یہی تاریخ لکھی ہے، خود مولانا سید عبدالحئی صاحب نے بھی نزہۃ الخواطر (جلد ۳ ص۱۳۱) میں یہی لکھا ہے، مگر مولانا نے اپنی دوسری تصنیف "یاد ایام" میں لکھا ہے، کہ وہ ۸۱۰ھ میں وارد ہند ہوئے، جو غلط ہے، [2] بستان المحدثین ص۱۳۱، کشف الظنون جلد ۱ ص۵۴۹ و ص۶۹۶، معجم المطبوعات جلد ۱ ص۹۱۹، میں سنہ وفات ۸۲۸ھ

تعلیم و تدریس، قضا و خطابت اور تجارت وغیرہ سے وابستگی کے دور میں بھی جاری رکھا، اس لیے انھوں نے گوناگوں موضوعات پر کتابیں لکھیں، جو ان کی علمی فضیلت و عظمت کی آئینہ دار ہیں، مگر ارباب تذکرہ نے انکی چند ہی کتابوں کے نام گنائے ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) تاریخ الفرائد:۔ مصنف کا بیان ہے کہ ہندوستان کے سفر میں ابن مالک طائی کی تصنیف "التسہیل" ان کے ساتھ تھی، جس سے اہل ہند ناواقف تھے، بعض طلبہ نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ اس کی شرح لکھوں، انہی کی درخواست کے پیش نظر میں نے یہ شرح لکھی، اس کے خطبہ میں شارح نے ابو الفضل احمد شاہ گجراتی کے حسن سلوک اور احسانات کی تعریف و توصیف کی ہے۔

(۲) مصابیح الجامع شرح البخاری:۔ اس شرح میں اعراب اور نحوی مسائل بیان کیے گیے ہیں، اور یہ سلطان احمد شاہ گجراتی کے لیے لکھی گئی تھی،

(۳) عین الحیاۃ:۔ یہ کتاب دمیری کی مشہور تصنیف "حیاۃ الحیوان الکبریٰ" کی تلخیص ہے، شعبان ۸۲۳ھ میں مرتب ہوئی، اور مصنف نے سلطان احمد شاہ گجراتی کے پاس اسے ہدیۃً بھیجا،

(۴ و ۵) تحفۃ الغریب فی شرح مغنی اللبیب لابن ہشام النحوی:۔ ابن الدمامینی نے "مغنی اللبیب" کا پہلا حاشیہ یمن میں لکھا، اور اپنے تلمیذ رشید زین الدین عبادہ کو مرحمت فرمایا، دوسرا حاشیہ ہندوستانی طلبہ کی خاطر ہندوستان میں لکھا، اس میں ابن ہشام نحوی کی کتاب کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا، اور مفصل گرفت کی ہے، التقی الشمنی نے اس کے جواب میں ابن الدمامینی پر نقد

بقیہ حاشیہ (ص ۱۳۸) مرقوم ہے، علامہ سیوطی نے حسن المحاضرہ (ج ۱، ص ۲۳۱) میں ۸۲۷ھ لکھا ہے، مگر وہ اپنی دوسری تصنیف بغیۃ الوعاۃ ص ۶۹ میں اس پر شک و تردد ظاہر کرتے ہیں، اور اسکے بجائے ۸۳۶ھ یا ۸۳۹ھ وفات کا سال بتاتے ہیں ۳؎ شاہ عبد العزیز صاحب نے بستان المحدثین ص ۱۳۲ میں اس روایت کی یہ حقیقت بتائی ہے کہ انکی موت اچانک ہوئی تھی اور وہ پہلے سے بیمار نہ تھے، اس لیے بعض لوگوں کو گمان ہوا کہ انہیں زہر دے دیا گیا ہے،

(تعقب) کیا ۔ مگر ان کے معاصرین نے ان کے خیالات کی ہنسی اڑائی اور اپنے استاد کی حمایت کی ۔ ابن الدمامینی نے معترضین کی نکتہ چینی کے جوابات دیے ہیں،

(۶) جواہر البحور فی العروض :- علم عروض کی تشریح میں یہ کتاب لکھی گئی ہے،

(۷) العیون الفاخرۃ الغامزہ علی الخبایا الرامزہ :- یہ کتاب "الخزرجیہ" کی شرح ہے،

(۸) نزول الغیث الذی انسجم فی شرح لامیۃ العجم :- ابن الدمامینی نے علامہ صلاح الدین صفدی کی تالیف "شرح لامیۃ العجم" کا تنقیدی جائزہ لے کر اس کے اغلاط کی نشاندہی کی ہے، یہ کتاب اہل علم کے لیے ایک بہترین تحفہ اور قیمتی سرمایہ ہے،

(۹) الفواکہ البدریہ :- ابن ناہض نے "الملک المؤید" کے سوانح حیات کتابی شکل میں لکھے تھے، ابن الدمامینی نے "سیرۃ المؤید لابن الناہض" کو نظم کا جامہ پہنایا، اور اسے "الفواکہ البدریہ" کے نام سے موسوم کیا،

(۱۰) مقاطع الشرب :- ابن الدمامینی کی نظموں کا ایک مجموعہ ہے،

(۱۱) الفتح الربانی :- علم حدیث میں ایک تالیف ہے،

(۱۲) اظہار التعلیل المغلق :- اس میں ایک پیچیدہ نحوی مسئلے کو بسط و تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے،

(۱۳) شمس المغرب فی المرقص والمطرب :- ابن الدمامینی کی یہ کتاب فن ادب میں ہے،

مذکورۂ بالا کتابوں میں سے صرف دو کتابیں "تحفۃ الغریب" اور "العیون الفاخرہ" ہی حلیۂ طباعت سے آراستہ ہوئیں، اور سب ابھی تک مخطوطہ ہیں،

شاعری :- ابن الدمامینی ایک قادر الکلام، پرگو اور زود گو شاعر تھے، ان کا کلام شعری محاسن کا حامل اور نقائص سے خالی ہے، اس میں جزالت، پختگی، انسجام، روانی اور تنوع ہے،

مگر ظاہر ہے متفرق دفتروں کا ثبت نہیں ہوتے، اور کسی مجموعہ میں مرتب و یکجا نہیں جانے کی بنا پر اشعار کی تعداد کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہم کو جس قدر ز، شاہ اشعار دستیاب ہوئے ہیں انہیں مع ترجمہ نقل کرتے ہیں، اس کا یہ فائدہ بھی ہوگا کہ کلام محفوظ ہو جائے گا۔

ابن الدمامینی کے گردش نہ ہونے میں "الحافظی" نامی شخص پیش پیش تھا، جس نے ان کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، یہاں تک کہ اس نے "الملک المؤید" سے بھی ان کی شکایت کی تھی، اسی کے پیش نظر ابن الدمامینی نے مؤید کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ کہا تھا جس کے تین شعر یہ ہیں:

أیا ملک العصر ومن جوده ... فرض علی الصامت والافظِ[1]

"اے شاہ زمانہ اور اے وہ ذات گرامی جس کی سخاوت خاموش و گویا دونوں پر یکساں طور پر لازم و فرض ہے، یعنی تیرے دریائے فیض سے انسان و حیوان سب ہی سیراب ہو رہے ہیں"

أشکو إلیک الحافظ المعتدی ... بکل لفظ فی الدجی غائظِ

"میں آپ کے پاس حافظ کی شکایت لے کر حاضر ہوا ہوں، جو غیظ و غضب کے ہر قسم کے الفاظ استعمال کر کے میرے اوپر ظلم کر رہا ہے۔"

وما عسی أشکو وأنت الذی ... صح لک البغی من الحافظِ

"میرے لیے شکایت کرنا ممکن نہ تھا، مگر آپ ہی ایسے مرتبے کے حامل ہیں، جس کے لیے حافظ کی درازدستی سے نپٹنا صحیح ہوگا۔"

دو اور شعر ملاحظہ ہوں:[2]

رمانی زمانی بما ساءنی ... فجاءت نحوس وغابت سعود[2]

---

[1] الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، [2] ایضاً

"اس نے بے شمار ملامت کے تیر مجھ پر برسائے، اس لیے میں ہر قسم کی نحوست سے دوچار ہوں، اور خوش قسمتی مجھ سے کافور ہو گئی ہے۔"

واصبحت بین الوری بالمشیب ... علیلا فلیت الشباب یعود

"میں مخلوق کے درمیان بڑھاپے کی وجہ سے بیمار انسان کی مانند ہو گیا ہوں، کاش جوانی لوٹ آتی، اور مسرت بخش زندگی نصیب ہوتی۔"

محبت و الفت کے باقی رہنے اور فراق کی مذمت کے بارے میں:

قلت له والدجی مول ... ونحن بالانس فی التلاقی[1]

"میں نے محبوب سے اس وقت درخواست کی جبکہ رات کی تاریکیاں چھٹنا شروع ہوئیں، اور (ابھی) ہم انسیت کے ساتھ باہم محو ملاقات تھے۔"

قد عطس الصبح یا حبیبی ... فلا تشمته بالفراق

"اے میرے محبوب! پو پھٹ چکی ہے، اس لیے تو عاشق کو فراق کے ذریعہ محروم کر کے مسرور نہ ہو۔"

ناصح کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

یا عاذلی فی مغن مطرب ... حرک الاوتار لما سفرا[2]

"اے میرے ملامت گر ایسے نشاط انگیز موسیقار کے سلسلہ میں جس نے صبح کے وقت سرود کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔"

لم یهتز العطف منه طربا ... عند ما تسمع منه وتری

"اگر تو اس کا نغمہ سنے اور اس کا رخِ روشن دیکھے تو (تجھے بھی یقین ہو جائے گا کہ) بیشمار قلوب میں اس کی وجہ سے ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔"

---

[1] الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، [2] ایضاً۔

بدا وكان قد اشتكى من عزه قلت: هذا قاتلي بعينه وحاجبه[1]

"محبوب اپنے محافظے سے مخفی ہو کر جب میرے سامنے جلوہ گر ہوا، تو میں نے اس سے کہا: یہی وہ ذات ہے جو اپنے چشم و ابروسے قتل کرنے والی ہے۔"

لا ما عذاريك هما اوقعا قلب المحب الصب في الحين[2]

"اے محبوب! یہ تمہارے گیسوؤں کے دو لام ہیں، جنہوں نے غمزدہ عاشق کے دل کو موت کے کرب و الم میں مبتلا کیا ہے۔"

فجد له بالوصل واسمح به فقد غدا هائم بلا مين

"پس تو ایسے عاشق کو وصل سے سرفراز کر، کیونکہ وہ تیری ہی وجہ سے بلا شبہہ پاگلوں کی طرح آوارہ پھر رہا ہے۔"

حسین اور بزدل عورت کے بارے میں کہتے ہیں:

مذ تعانت صناعة الجبن خود قتلتنا عيونها الفتانة[3]

"جب سے کہ نازک بدن نوجوان عورتوں نے بے تکلف بزدلی کے طریقہ کو اپنایا ہے، تو انکی فتنہ انگیز آنکھوں نے ہمیں قتل کر ڈالا ہے۔"

رو تقل لي كم مات فيها قتيل كم قتيل بهذه الجبانة

"مجھے کشتگانِ عشق کا علم ہے، اس لیے مجھے نہ بتاؤ کہ ان کی وجہ سے کتنے لوگ مقتول ہوگیے

---

[1] الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، [2] ایضاً۔ بستان المحدثین: ۳۶۶ میں یہ شعر اس طرح درج کیا گیا ہے:

الا يا عذاريك هما اوقعا قلب المغنى الصب في الحين

ترجمہ: "آگاہ ہو! یہ تمہارے گیسو ہیں جنہوں نے مصیبت زدہ عاشق کے دل کو موت کے رنج و الم میں مبتلا کیا ہے"

[3] بغیۃ الوعاۃ: ۲۸۔

ہی عشاق میں بزدل ہو جن کے ہاتھوں بہت سے قتل ہو چکے ہیں۔"

قم بنا نرکب طرف اللہو مستقابہا الامم

داتن یا صاح عنانی ... لکمیت ولہو[1]

"(۱) اے معشوق! ہمارے ساتھ چل تاکہ ہم شراب نوشی میں سبقت کرتے ہوئے لہو ولعب میں منہمک ہو جائیں، (۲) لہذا اے میرے ساتھی! میرا سرخ و سیاہ رنگ کی دیرانی شراب اور جام کی طرف پھیر دے۔"

اللہ اکبر یا محرابہ طرتہ ... کم ذا اتصلی بنار الحرب صبا

"معشوق کی پیشانی کے بالوں کی محراب کا حسن تعریف سے بالاتر ہے، اے محبوب! تو کسی مشتاق کو جنگ کی آگ میں کتنا جھونکے گا۔"

وکم اقمت باحشائی حروب ہوی ... منک قلبی مفتون بحہا

"تم نے میرے قلب و جگر میں عشق کے بہت سے نیزے پیوست کر دیے، لہذا تمہاری وجہ سے ہی میرا دل (تم جیسے) جنگجو کا دیوانہ ہو چکا ہے۔"

ناصر الدین بن التنیسی نے ابن الدمامینی کو حاکموں سے حلف وفاداری لینے کی خدمت عطا کی تو انہوں نے کہا:

یا حاکما لیس یلفی ... نظیرہ فی الوجود[3]

قد زدت فی الفضل حتی ... قد ستنی بالعقود

"(۱) اے حاکم! جس کی نظیر عالم وجود میں نہیں پائی جاتی، (۲) آپ نے میری عظمت و فضیلت میں اضافہ فرمایا، یہاں تک کہ آپ نے حکام سے وفاداری کا حلف لینے کی خدمت میرے سپرد کی۔"

---

[1] الضوء اللامع ۷: ۱۸۶، [2] ایضاً، [3] ایضاً۔

برہان المحلی تاجر کی مدح میں لکھے ہوئے قصیدے کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

بقيا مدح تاليه بقلبي حيه ... وزكا بالفرع و الاصل[1]

"اس ممدوح جس کے احسانات حد شمار سے باہر ہیں، اور اسے رئیس جو اپنی اصل و فرع دونوں کے اعتبار سے پاکیزہ ہے۔"

من علا فی الوری محلک عزا ... قلت هذا هو العزیز المحلی

"عجیب ہے کہ آپ کا مرتبہ و درجہ عزت کے اعتبار سے مخلوق میں بلند ہوا ہے، تو میں نے کہا: یہی محلی شریف و نادر اور غالب بادشاہ ہے۔"

شہاب فاروقی کی مدح کے دو شعر یہ ہیں:

قل للذی اضحی یعظم حاتما ... ویقول لیس لجوده من لاحق[2]

"جو شخص کہ حاتم طائی کو بہت بڑا سمجھتا ہے، اور اس بات کا قائل ہے کہ اس کی سخاوت تک کوئی نہیں پہنچ سکتا، تو اس سے کہو:"

ان قسته بسماح اهل زماننا ... اخطأ قیاسك مع وجود الفارق

"مگر تو نے شہاب فاروقی کا قیاس ہمارے اہل زمانہ کی سخاوت کے معیار پر کیا، تو تیری قیاس آرائی بالکل غلط ہوگی، کیونکہ ممدوح اور دیگر انسانوں کے درمیان عظیم تفاوت ہے، اس لیے اس کو ان پر قیاس کرنا باطل و محال ہے۔"

ہرن کو چیستان کے طریقے پر تحریر کیا ہے:

ان من قد هویته ... محنتی فی وقوفه[3]

"بے شک میں جس پر فریفتہ ہوا ہوں تو میری آزمائش اس کے ٹھہرے رہنے میں ہے۔"

---

[1] الضوء اللامع ۷: ۱۸۷، [2] ایضاً، [3] شذرات الذہب ۷: ۱۸۳

فاذا زال ربعه ۔۔۔ زال باقی صحوفه

"یعنی جب اس کا محلہ ویران ہو جائے، تو اس کے تمام اطراف بھی ویران ہو جاتے ہیں یعنی جس طرح چراگاہ کی گھاس ہر طرف سے ختم ہونے کے بعد باعثِ کشش نہیں رہتی، اسی طرح جیسے معشوق کی جوانی ڈھلنے کے بعد اس کے تمام محاسن ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں"

ملک مصر کی تعریف کے دو[۲] شعر درج ہیں :

رعی اللہ مصرا اننا فی ظلالها   نروح و نغدو سالمین من[۳] الکلٰ

"خدا ملک مصر کو محفوظ رکھے، ہم اپنے ملک کے زیر سایہ ہر ایک رنج سے عافیت میں رہ کر صبح و شام کرتے، یعنی زندگی بسر کرتے ہیں"

ونشرب ماء النیل منها براحة   واهل زبید یشربون من[۴] الکلٰ

"ہم اپنے ملک میں نہایت آرام سے دریائے نیل کا پانی پیتے ہیں، جبکہ زبید کے لوگوں کو مشقت کے بعد ہی پانی نصیب ہوتا ہے"

زبید اور اہل زبید کی ہجو کے مزید دو[۲] شعر ملاحظہ ہوں :

قالت وقد فتحت عیونا نعسا   ترمی الوری بالجور فی الاحکام[۵]

"محبوبہ نے ایسی اونگھتی ہوئی آنکھوں کو کھولا، جو اپنے فیصلوں سے مخلوق پر ظلم ستم کے تیر برسا رہی تھیں، اور یہ کہا کہ:

احذر هلالک فی زبید فاننی   للذوی الغرام فتحت باب سهامی

"زبید میں ہلال (یا چاند) دیکھنے سے پرہیز کر کیونکہ میں نے گرفتارانِ عشق کے لیے اپنے تیروں کا دروازہ کھول دیا ہے"

---

[۱] نزہۃ الخواطر وبہجۃ المسامع والنواظر ۳ : ۱۳۰، [۵] ایضاً۔

ہندستانی علما سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

ایا علماء الھند انی سائل　　فمنوا بتحقیق بہ یظہر السر[1]

"اے ہندستان کے علما و فضلا! میں آپ حضرات سے ایک سوال کر رہا ہوں، پس آپ لوگ اس سوال کا ایسا جواب دے کر مجھے ممنون بنایے، جس سے راز سربستہ واضح ہو جائے۔"

فما فاعل قد جرّ بالخفض لفظہ　　صریحا ولا حرف یکون بہ الجر

"وہ کون سا فاعل ہے، جس کو رفع کے بجائے صراحت کے ساتھ لفظاً زیر دیا گیا ہو، حالانکہ وہاں کوئی ایسا حرف نہیں ہے، جس کی وجہ سے زیر دیا جائے۔"

ولیس بذی جر ولا بمجاور　　لذی الخفض والانسان بالجہل یضطر

"نہ تو فاعل کے پہلے حرف جار ہے، اور نہ وہ مجرور سے متصل ہے۔ اور انسان مجبور ہو کر ہی غلطی کا مرتکب ہوا کرتا ہے۔"

فمنوا بتحقیق بہ استفیدہ[2]　　فمن بحرکم ما زال یستخرج الدر

"اس سوال کا تحقیقی جواب مرحمت فرما کر احسان کیجئے، میں اس سے استفادہ کروں گا، کیونکہ آپ کے سمندر سے سدا موتی نکالے جاتے رہے ہیں، یعنی آپ حضرات کے علم و فضل سے برابر فائدہ حاصل کیا جاتا رہا ہے، اور آپ لوگ ہمیشہ علمی گتھیاں سلجھاتے رہے ہیں۔"

طرفہ بن العبد البکری عہد جاہلیت کا نامور شاعر ہے، جو اصحاب معلقات میں بھی شمار کیا جاتا ہے، ابن الدمامینی کا اشارہ اسی کے رائیہ قصیدے کے حسب ذیل شعر کی طرف تھا جس میں رِدا مکسور ہے، حالانکہ فعل "جاج" کا "منسر" فاعل ہے، اور فاعل مرفوع ہوا کرتا ہے،

---

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۳ ص ۱۳۰ [2] یہ مصرع اس طرح بھی منقول ہے، ع فھل من جواب عندکم استفیدہ

یعنی کیا آپ حضرات کے پاس اس کا کوئی جواب ہے، جس سے میں مستفید ہو سکوں۔

بجفان، تعتری نادیتا ۔۔۔ من سدیف حین ھاج الصنبر[1]

شاعر اپنے قبیلے کے ۔۔۔ بیان کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ شب سرد میں جب کہ عام طور سے لوگ پریشانی و بدحالی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو ہمارے قبیلے کے لوگ ان کو مدعو کرتے ہیں اور نہایت فراخ دلی سے مہمان نوازی کرتے ہیں۔

طرفہ کا یہ قصیدہ چھہتر[76] اشعار پر مشتمل ہے، راقم نے مکمل قصیدہ پڑھنے کے بعد یہ ناقص رائے قائم کی ہے، کہ اگر قافیہ "راء" کو اعراب دیا جائے تو زیادہ تر اشعار میں "راء" کو زیر دیا جانا ضروری ہے، مگر قافیہ "راء" ساکن ہے، اس لیے مرفوع اور مجرور دونوں بہ حالت سکون صحیح ہیں، یہی جواب دیگر اشعار مثلاً "جنون مستعر، ینتقر، ما نقر، تنبہر، تمر" وغیرہ کے قوافی میں بھی دیا جائے گا، کہ ان سب میں "راء" یقیناً مضموم ہے، مگر ساکن ہونے کی صورت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

ابن الدمامینی نے "کادی[2]" کے بارے میں بطور چیستاں کہا

وما شیء لہ شطر ذکی ۔۔۔ لعاطرہ الی الطیب انتساب

"وہ کیا چیز ہے جس میں مشک کی سی مہک ہے، اور جس کے استعمال کرنے والے کو خوشبو سے نسبت ہے، یعنی اس کا شمار خوشبو استعمال کرنے والوں میں ہوگا"

تروح لہ علی رجلیک تمشی ۔۔۔ وتقلیہ یداک فما الجواب

وہ تیرے پاؤں پر چل کر آتی ہے، اور تیرے ہاتھ اس کو بھونتے ہیں، بتاؤ اس

---

[1] دیوان طرفۃ بن العبد بہ تحقیق کرم البستانی (دار صادر، دار بیروت ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء) ص ۵۸، [2] علامہ سیوطی نے "بغیۃ الوعاۃ"، ۶۷ میں اس چیستاں کے دو شعر اور اس کے جواب میں دو شعر نقل کیے ہیں لیکن یہ چیستاں کوشش کے باوجود حل نہیں ہو سکی، جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ چیستاں کا جواب بھی چیستاں ہی ہے۔

ا کیا جواب ہے"۔

بن الدمامینی کا بیان ہے کہ اسکندریہ کے سفر میں جب میں اُس کے حدود میں داخل مذکورہ بالا دونوں شعر پڑھے، تو ان کا جواب بھی برجستہ بصورت نظم یہ لکھدیا:

مذ سمعت بهذا اللغز اُذُنی　　　اتانی من تفضله الجواب

ب میرے کان نے اس چیستاں کو سنا تو اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے مجھے ب معلوم ہوگیا"

ن الطیب اذا صحفت منه　　　اخیریه له فی الخبث یاب

ں وہ خوشبو ہے، جب تم اس کے آخری دو حرفوں میں تقدیم و تاخیر کی غلطی کردو ے خبیث چیز سمجھی جائے گی"

سلسلۂ شعر العجم

رسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا، عہد بہ عہد کی ترقیوں اور ہر دور کی شاعری میات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے حسب ذیل پانچ حصے ہیں:

مۂ اول: عباس مروزی سے نظامی تک کے شعرا کا تذکرہ، قیمت ۱۰ روپے،

مۂ دوم: خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ ابن یمین تک کے شعرا کا تذکرہ مع تنقید کلام، قیمت ۱۲ روپے

مۂ سوم: فغانی سے ابوطالب کلیم تک کے شعرا کا تذکرہ مع تنقید کلام، قیمت ۹ روپے،

مۂ چہارم: شاعری کے تمام انواع و اقسام میں سے مثنوی خصوصاً فردوسی کے شاہنامہ پر بسیط تبصرہ، قیمت ۱۲ روپے

مۂ پنجم: فارسی کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ، قیمت ۱۱ روپے،

مؤلفہ: علامہ شبلی نعمانی　　　"منیجر"

وفیات

پروفیسر کلیم الدین احمد مرحوم

از عبدالرحمن پرواز اصلاحی رفیق دارالمصنفین

گزشتہ سال کے آخر میں اردو دنیا کو جس حادثۂ فاجعہ سے دوچار ہونا پڑا وہ مشہور نقاد پروفیسر کلیم الدین احمد کا انتقال پُر ملال ہے، ان کی شخصیت ایک جلوۂ صد رنگ تھی، وہ پروفیسر بھی رہے اور ایڈمنسٹریٹر بھی، ناقد بھی تھے اور ماہر تعلیم بھی، محقق بھی تھے، اور شاعر بھی، اور ان سب سے بلند ایک شریف انسان بھی۔

ان کی شخصیت میں جہاں گوناگوں صلاحیتیں جمع ہوگئی تھیں وہاں وہ بڑی متنازعہ فیہ بھی رہی، ان کی رایوں سے اختلاف بھی ہوا اور اتفاق بھی، اردو شعر و ادب کے ایوان میں ان کی آواز سب سے جداگانہ اور منفرد تھی، ان کی تحریریں کچھ ایسی انتہا پسندانہ اور سخت تھیں کہ ایک بڑا طبقہ ان سے ناراض ہوگیا، مگر ان کی رایوں سے اختلاف کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے قلم سے اردو کے سرمایہ میں اضافہ ہوا، اور تاریخ ادب اردو میں اپنا ایک خاص مقام بنا گئے، جس کی وجہ سے وہ کبھی فراموش نہیں کئے جاسکتے۔

کلیم الدین احمد ۱۹۰۸ء میں پٹنہ کے ایک علمی و دینی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد عربی و فارسی کے فاضل اور پٹنہ یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے۔ ان کے پرنانا حکیم عبدالحمید پریشاںؔ نہ صرف اعلیٰ درجہ کے طبیب، علامۂ وقت بلکہ اردو، فارسی عربی کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر تھے، یہ حکیم عبدالحمید وہ بزرگ تھے جن کے والد مولانا احمد اللہ صاحب صادقپوری ممتاز اہلحدیث عالم اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک سے وابستہ تھے، مجاہدین کے خلاف جو مقدمہ

ٹ انھیں بھی حبسِ دوام بعبور دریائے شور کی سزا ملی تھی، اور جزیرۂ انڈمان میں
انتقال ہوا۔ ان کی ساری جائداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔
دین احمد بچپن ہی سے پڑھنے لکھنے کے شوقین تھے، اور اسی شوق نے ان کو تنہائی پسند اور
بنا دیا۔ ان میں ذہانت خداداد بھی اور وہ خود نہایت محنتی طالب علم بھی رہے، بی۔ اے آنرز اور ایم۔ اے
میں فرسٹ کلاس اور فرسٹ پوزیشن حاصل کی، جس کی وجہ سے ان کو اعلیٰ تعلیم کیلئے سرکاری وظیفہ ملا
انگلستان گئے اور کیمبرج یونیورسٹی سے انھوں نے انگریزی ادب اور فرانسیسی زبان و ادب میں اعزاز حاصل کیا،
ہندوستان میں واپسی پر پٹنہ کالج میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوئے، اپنے عمدہ اوصاف محنت اور
سے اپنے شعبہ میں سارے اعلیٰ مدارج طے کر لئے اور شعبۂ انگریزی کے صدر بھی ہوئے۔
دلچسپی کی وجہ سے بہار سکنڈری اکزامینیشن بورڈ کے چیرمین بھی رہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کی
فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین منتخب ہوئے، پھر پٹنہ کالج کے پرنسپل ہوئے، کچھ دنوں بھاگلپور
کے وائس چانسلر بھی رہے، اور آخر میں حکومت بہار کے ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن یعنی
کے عہدہ پر فائز ہو کر سبکدوش ہوئے، وہ جس عہدے پر بھی رہے ان کے کاموں کا ریکارڈ
شاندار رہا۔ ان کی کامیابی کا راز ان کی معاملہ فہمی، منصف مزاجی اور دوسروں پر
اعتماد تھی، وہ دوسروں کے تجربے، محنت اور ایمانداری کی قدر کرتے اور ان کی
کھل کر حوصلہ افزائی کرتے، ہر معاملے میں بے لاگ اور غیر جانبدار طرزِ عمل
زبان سے کم بولنے کے باوجود ترقی کے تمام منصوبوں کو کامیابی کے ساتھ عملی جامہ
کی صلاحیت، پڑھانے کی استعداد، ہوشمندانہ طرزِ عمل اور قوتِ تحریر سے طلبہ
میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔
بڑی خوبی تھی انتھک محنت اور مسلسل گھنٹوں کام کرنا۔ وہ پڑھے لکھے بے روزگار

لوگوں کی مدد کیلئے ہمیشہ تیار رہتے ، انھیں اخلاقی مدد پہنچاتے ، وہ نیک ، شرافت اور باحمیت انسان تھے۔ ان کی ان خوبیوں کے ان کے مخالف بھی معترف تھے ، اور اس کا برابر ذکر کرتے رہتے تھے۔

ان کی دلچسپی زیادہ تر مغربی ادبیات سے رہی ، وہ انگریزی زبان میں بھی لکھتے تھے ، ایک کتاب انگریزی میں بھی ہے ، وہ اردو کی دنیا میں اچانک وارد ہوئے ، جس سے ہلچل مچ گئی ۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں اپنے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد کے تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو جمع کر کے ایک مجموعہ "نغمۂ گل" کے نام سے شائع کیا ۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں جدید اصول تنقید کے مطابق "اردو شاعری پر ایک نظر" کے نام سے اپنی کتاب شائع کی ، جس سے ادبی حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اس کتاب میں انھوں نے مغرب کی عینک سے اردو شاعری کو دیکھنے کی کوشش کی اور مغربی اصولِ تنقید کے معیار پر مشرقی ادب کو جانچنے کی سعی فرمائی ، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اور ان کی کتاب بھی ہدفِ ملامت بن گئی ۔ سنہ ۱۹۴۱ء میں دائرۂ ادب کے نام سے ایک ادبی انجمن قائم کی اور رسالہ "معاصر" جاری کیا ۔ دائرہ کے صدر اور رسالہ کے ایڈیٹر ان کے والد ڈاکٹر عظیم الدین احمد بنائے گئے۔ کلیم الدین مرحوم معاصر کے لیے مسلسل مضامین لکھتے رہے ، سترہ اٹھارہ سال میں انھوں نے جو مضامین لکھے ، ان ہی کے مجموعے "اردو تنقید پر ایک نظر" "سخنہائے گفتنی" "عملی تنقید" اور "فن داستان گوئی" وغیرہ کے نام سے شائع ہوئے ، انھوں نے تحقیق کی طرف بھی توجہ کی ، ان کا تحقیقی شوق اتنا بڑھا کہ اردو کے تقریباً سارے مطبوعہ تذکرے جمع کر لئے اور غیر مطبوعہ کی نقلیں حاصل کر لیں ۔ انھوں نے پٹنہ کالج لائبریری میں مخطوطات و نایاب کتابوں کا شعبہ قائم کیا ۔ تذکرۂ شورش ، تذکرۂ عشقی ، دیوانِ جہان ، تذکرۂ عمدۂ منتخبہ ، تذکرۂ معیار الشعراء ، اور مجمع الانتخاب خود اپنے ہاتھ سے نقل کئے ، ان میں بعض شائع بھی ہو گئے ، وہ شاعر بھی تھے ، اور ان کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ۔

ا ہے کہ انسان کی شخصیت اس کے کمالات کے ساتھ اس کی کمزوریوں سے بھی
ہ، یہ بات بڑی حد تک پروفیسر کلیم الدین احمد کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ ان کی
رمضامین کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بعض جگہ نہ اردو شاعری کے ساتھ
ملکے ہیں اور نہ اردو کے تنقیدی سرمایہ سے۔ وہ بلاشبہ کثیر المطالعہ اور بڑے باصلاحیت
یکن غلو، انتہا پسندی اور عدم توازن نے ان کی کتابوں کے وزن کو کم کر دیا ہے
بکے گہرے مسائل سے بحث کرتے ہیں اور حسن و قبح کے اعلیٰ معیار کو سامنے رکھتے ہیں
ے مزاج، ماحول، فضا اور اس کے تدریجی تسلسل کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ ان پر
کا رعب اس قدر طاری ہے کہ اسی معیار پر مشرقی ادب کو بھی جانچنے لگتے ہیں
ے مشرقی تہذیب، روایات، اور اس کی خصوصیات ان کی نگاہوں سے اوجھل
ان کا یہ فیصلہ کہ "غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے، حد درجہ مضحکہ خیز ہے، انکے
، سودا، غالب، مومن اس لئے اعلیٰ درجہ کے شاعر نہ تھے کہ وہ مغربی ادبیات
تھے، اقبال کی اعلیٰ درجہ کی نظمیں بھی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔
دو شاعری پر تنقید" میں جس طرح اردو کے شعری کارناموں پر بحث کی ہے اس سے
بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔

ین احمد نے اپنی کتاب "اردو تنقید پر ایک نظر" میں لکھا ہے کہ "اردو میں تنقید کا
ے، اقلیدس کا خیالی نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر ہے"۔ ان کا یہ خیال صحت سے بعید
چشم پوشی ہے، انھیں اردو کے ہر دور کے ناقدوں میں یہی کمی نظر آتی ہے کہ وہ انگریزی
ت تھے، انگریزی تنقید کے اصولوں کو سمجھنے سے قاصر تھے، اور اردو شاعری کے تجزیہ کیلئے
میار سے باہر نہ جا سکے، ان کی نگاہ میں محمد حسین آزاد، حالی، مولانا شبلی اور

مولوی عبدالحق کوئی صحیح معنوں میں نقاد نہ تھا۔ ان کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا گیا، اور بڑی شدت کے ساتھ ان کی مخالفت کی گئی۔

ان کے متعلق ایک کتاب "حیات کلیم" شائع ہوئی تو معارف کے صفحات میں اس پر مکمل تنقید کی گئی، اس لئے ہم اس موقع پر مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر ان کی تنقیدوں میں توازن اور اعتدال ہوتا تو یقیناً بڑے اعلیٰ درجہ کے نقاد ہوتے اور نہایت احترام کی نظروں سے دیکھے جاتے، بہرحال اپنی خامیوں کے باوجود انھوں نے اردو کے ادبی سرمایہ میں اضافہ کیا ہے اور اردو کا حلقہ انھیں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالےٰ انکی لغزشوں کو معاف فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

قاضی عبدالودود

پروفیسر کلیم الدین احمد کے انتقال کے بعد اردو دنیا کو دوسرا بڑا صدمہ مشہور محقق قاضی عبدالودود کی وفات سے پہنچا، قاضی صاحب نے ۲۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو پٹنہ میڈیکل کالج میں ۸۰ برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔ وہ بھی ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے، میر زاہد پر حاشیہ لکھنے والے ملا غلام یحییٰ بہاری آپ کے اجداد میں تھے، ملا غلام یحییٰ کے بیٹے قاضی کمال الحق شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے اور ناصر علی کے پیرو تھے۔ ان کے پوتے قاضی اکرام الحق حضرت سید احمد شہید کے مریدوں میں تھے، ان کے بھائی واعظ الحق ان علماء میں سے تھے، جو شورش کے زمانہ میں نظربند کئے گئے، قاضی اسمٰعیل قاضی اکرام الحق کے بیٹے اور موزوں طبع شخص تھے جو اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے، ان کے بیٹے قاضی عبدالحمید قاضی عبدالودود کے دادا تھے اور والد قاضی عبدالوحید عالم دین تھے، مگر ان میں تبدیلی آئی اور عقائد میں بریلوی ہوگئے۔ اس لئے انھوں نے

عقائد و خیالات کی تبلیغ کے لیے ایک ماہانہ رسالہ "تحفہ" نکالا تھا، وہ شاعر بھی تھے، اور
(ا)لہ آبادی کی صحبت پائی تھی، ان کا اردو کلام گلدستوں میں ملتا ہے، انکی وفات ۱۳۵ ـــــہ میں ہوئی۔

قاضی عبدالودود ۱۸۹۶ء میں پٹنہ کے اندر پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم پرانے طریقہ پر پائی۔
(انگریز)ی شروع کرنے سے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر عربی صرف و نحو اور منطق میں متوسطات تک
(کتا)بیں پڑھیں، اس کے بعد وہ پٹنہ کے محمڈن اسکول میں داخل ہوئے، اس اسکول میں سال
(ب)سال رہنے کے بعد میجر سید حسن بلگرامی کے بلگرامی ٹیوٹوریل کالج علی گڑھ گئے، وہاں ان میں
(مطالعہ)ب بینی کا شوق بڑھا۔ بے شمار کتابوں اور رسالوں کو پڑھا۔ پھر پٹنہ واپس آکر کلکتہ یونیورسٹی
(مي)ٹرکیولیشن میں بیٹھے، اسے پاس کرکے پٹنہ کالج میں داخل ہوئے۔ اور چار برس میں بی اے کرلیا۔
(ا)نہی دنوں سیاسی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہوگئی اور تحریک خلافت سے وابستہ ہوگئے، اب
(تعلیم) کا سلسلہ بند ہوگیا، اور کانگرس سے بھی تعلق پیدا ہوگیا، جس کے مختلف اجلاس میں سرگرمی
(کے س)اتھ شریک ہوئے پھر کچھ دنوں کے بعد تعلیم کی طرف توجہ ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے مارچ ۱۹۲۳ء
(ا)نگلستان گئے، کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اقتصادیات اور قانون کی تعلیم حاصل کی، بار ایٹ لا
(ہوئ)ے، لیکن غیر معمولی علمی دلچسپی کی بنا پر بیرسٹری کا پیشہ اختیار نہیں کیا، قدرت کو منظور تھا کہ قانون
(اور ا)قتصادیات کے بجائے علمی و ادبی تحقیق کے میدان میں ان کا جوہر کمال چمکے۔ تمام عمر وہ اپنے طبعی
(رجحانا)ت کے مطابق کتب خانوں کی خاک چھانتے رہے انکا حافظہ اور قوت یادداشت غیر معمولی
(تھی)، وہ اپنے بے مثال حافظہ کی بدولت تاریخ ادب کے ایسے ایسے حوالے دیتے تھے جو بہتوں کو
(برسو)ں کی تلاش و جستجو کے بعد بھی میسر نہیں ہوتے۔ ادب، عروض، قافیہ، تاریخ، تذکرہ اور ان سے
(متعلقا)ت مطبوعات اور مخطوطات سے گہری واقفیت تھی۔

وہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی کے علاوہ فرانسیسی اور جرمن بھی جانتے تھے، لیکن

مشغلہ اردو و فارسی ہی سے رہا، اور زندگی بھر اس کے نامعلوم گوشوں کی تلاش میں سرگرم عمل رہے پچھلے پچاس برس کے اندر انھوں نے اردو کے دامن کو مالا مال کیا، اور ادبی تحقیق کے ذوق و رجحان کی تربیت کی۔

ان کی کتاب "عیارستان" اور "اشتر سوزن" ان کی علمی بصیرت اور گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ "دیوان جوشش" "دیوان رضا" "قطعات دلدار" کی تدوین میں انھوں نے جس محنت اور کاوش سے کام لیا ہے، اس سے ان کے تحقیقی مرتبے کا اندازہ ہوتا ہے "تذکرہ ابن طوفان متنی" تحقیق کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

انھوں نے غالب اور میر سے متعلق جو معلومات ان کی زندگی اور کلام کی صحت کے بارے میں بہم پہنچائی ہیں وہ ہمارے ادب کا قیمتی حصہ ہے، انھوں نے دراصل ادب کے ایسے گوشوں کو روشناس کرایا جو تحقیق کے مستحق تھے، "جہان غالب" ان کا بڑا اہم کارنامہ ہے۔ "آوارہ گرد اشعار" کے بارے میں بڑی نادر معلومات فراہم کی ہیں، قدیم شعرا کے بارے میں ان کی واقفیت بے نظیر تھی ان کے مضامین سے اردو کے مشہور مصنفوں کی غلطیوں کا پتہ چلا۔ "آب حیات کا تحقیقی جائزہ" "میر حیات و شاعری" "فائز دہلوی" "لکھنؤ کا دبستان شاعری" "عبدالحق بحیثیت محقق" اور "بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا" جیسے مضامین میں نکتہ چینی کے ساتھ بہت سی نئی معلومات ملتی ہیں، صداقت و حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

وہ تحقیق کے سلسلے میں نہ کسی سے مرعوب ہوئے اور نہ اپنی رائے کے اظہار میں رو رعایت کی، ہر بات بے لاگ اور دو ٹوک طریقے پر کہنے کے عادی تھے، اور اسی بنا پر بہت سے لوگ ان سے خوش نہ تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اردو تحقیق کو ترتیب مقدمات اور فکری تنظیم سے آشنا کیا، ان کی خوبی یہ تھی کہ وہ مقدمات اور نتائج میں ایک منطقی ربط و ترتیب تلاش کرتے اور جہاں انھیں یہ ربط

ہنسی مذاق یہاں بے رحمی سے اس بے ربطی کو بے نقاب کر دیتے تھے۔ انکی تحریروں سے اردو تحقیق کے مبادیات، اصول، ضابطے اور طریق کار کے بارے میں بڑی رہنمائی ملتی ہے، جن سے تحقیق کام کرنے والوں کو آئندہ بڑی مدد ملے گی۔ انھوں نے اردو میں تحقیق و تنقید کا معیار ہی بلند نہیں کیا، بلکہ ہر اہل قلم کو زیادہ احتیاط، زیادہ محنت، اور زیادہ علمی دیانت داری کی ضرورت کا احساس دلایا ہے۔ انکا اردو میں تحقیقی رسالہ "معیار" اہم رسالوں میں تھا اس سے بہتوں کو تحقیق کا سلیقہ آیا۔

قاضی صاحب نثر میں انداز بیان کی وضاحت، منطقی ربط اور سادگی کے قائل تھے، انکے نزدیک نثر کا حسن سادگی اور وضاحت میں مضمر ہے، جس قدر صاف اور مدلل طریقے پر نثر اپنے مضمون کو ادا کر سکے گی اسیقدر وہ معیاری کہلانے کی مستحق ہوگی۔

قاضی صاحب نے آزادی سے قبل سیاسی تحریکوں میں عملاً حصہ لیا تھا، اور اپنی تعلیمی زندگی کو حب وطن کی خاطر خیرباد کہدیا تھا، اس لئے ہندوستان کے مقتدر سیاسی لیڈر انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور ان سے گہرے مراسم رکھتے تھے، قاضی صاحب نے اپنی خود نوشت کہانی میں اس کا تذکرہ کیا ہے، اردو زبان کے سلسلے میں گاندھی جی، راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے درمیان جو تاریخی بات چیت ہوئی اور معاہدہ طے پایا تھا وہ قاضی صاحب کی قیام گاہ پٹنہ میں ہی ہوا تھا، گو اس معاہدے پر عمل نہ ہو سکا لیکن اردو کی تاریخ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

قاضی صاحب طبعاً حلیم، شریف النفس، وضعدار اور خلیق انسان تھے، مذہبی لحاظ سے انکے عقائد کے بارے میں لوگ مشکوک رہے، لیکن انھوں نے اپنی تحریروں میں اس کا اظہار نہیں کیا، ان کی شخصیت اس لحاظ سے بھی اہم تھی کہ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ زبان و ادب کی خدمت میں بسر کیا، ان کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی بنا پر حکومت ہند نے پدم شری اور صدر جمہوریہ کے سرٹیفکیٹ سے نوازا، غالب انسٹی ٹیوٹ دلی نے غالب ایوارڈ دیا، اور اردو اکیڈمیوں نے انکی ادبی خدمات کا اعتراف کیا لیکن قاضی صاحب ان سب باتوں سے کہیں بلند تھے وہ اردو ادب کی تاریخ میں لازوال نقوش چھوڑ گئے ہیں، جو کبھی مٹائے نہیں جا سکتے۔

مطبوعات جدیدہ

پیغمبر اعظم محمد صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول و دوم مرتبہ، مولانا طاہر حسن صاحب امروہوی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت معمولی مجموعی صفحات ۵۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ، ضلع مراد آباد۔

یہ کتاب جامعہ اسلامیہ عربیہ جامع مسجد امروہہ کے شعبۂ تصنیف وتالیف کی پہلی پیشکش ہے اس کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانحعمری ہے لیکن در اصل اس میں مختلف پہلوؤں سے آپ کا نبی ورسول ہونا ثابت کیا گیا ہے، اس ضمن میں آپ کے بعض حالات وواقعات زندگی بھی زیر بحث آگئے ہیں مصنف نے پہلے رسولوں کی ضرورت بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ وہ انسان کو امور خیر وفلاح سے مطلع کرنے کے لئے مبعوث کئے جاتے ہیں پھر ان کی علامات، اہم خصوصیات اور خدا کی جانب سے کئے گئے اس اہتمام کا ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے لوگ ان کے پیغمبر ہونے کا یقین کر لیتے ہیں، اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں گذشتہ انبیاء اور آسمانی کتابوں نیز ہندو مذہب کے رشیوں منیوں اور دوسرے مذہبوں کے بزرگوں کی پیشین گوئیاں نقل کی گئی ہیں اور آپ کی ولادت سے قبل وبعد کے متعدد واقعات تحریر کئے ہیں جن سے بھی آپ کا نبی ہونا ظاہر ہوتا ہے مصنف نے اسلام کے غیر معمولی اثر ونفوذ اور مختلف ملکوں اور قوموں میں اس کی حیرت انگیز اشاعت کی داستان بیان کر کے بھی آپ کی نبوت ثابت کی ہے، اسی طرح آنحضرت کی عظمت، مقبولیت اور محبوبیت دکھانے کے لئے اسلام، پیغمبر اسلام اور قرآن کے تراجم پر غیر مسلم مصنفین کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، اور یورپین مورخین اور دوسرے فضلاء کی آپ کے بارہ میں رائیں نقل کی ہیں، اسی سے اور مختلف صحابہ کرامؓ اور اشخاص کے

قبول اسلام کے واقعات قلمبند کر کے بھی انھوں نے اپنے مقصود و مدعا کو ثابت کیا ہے، آخر میں قرآن کریم کے اعجاز کے متعدد دلائل پیش کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں خاص طور پر بائبل و انجیل سے قرآن کی حقانیت و صداقت کا ثبوت فراہم کیا ہے، اور اقتصادیات، مساوات، الہیات، رسالت، عبادت طہارت، معاملات، اخلاق، تعزیرات، فلکیات اور آخرت کے متعلق قرآنی نظریہ کی وضاحت کے علاوہ اس کا عالمگیر، آفاقی اور مکمل ضابطۂ حیات ہونا ثابت کیا ہے اور صلح و جنگ، مذہبی آزادی اور عقل و فکر کی اہمیت کے بارے میں اس کی تعلیم و ہدایت بیان کی گئی ہے، اور توثیق و تائید کے لیے مغربی و مشرقی مفکرین کے خیالات بھی نقل کئے گئے ہیں، اس ضمن میں غلاموں اور عورتوں کے حقوق پر بھی گفتگو ہے، الہیات کی بحث میں نصاریٰ کے نظریۂ تثلیث و عقیدۂ الوہیت مسیح کا ابطال بھی کیا ہے، آخر میں آپؐ کی ولادت سے مدینہ کی روانگی تک کے بعض واقعات بیان کئے ہیں جن کا مقصد بھی آپؐ کی نبوت کا اثبات ہے، مثلاً حضرت آمنہ کا خواب، محمد اور احمد آپؐ کا نام تجویز کیا جانا، حضرت حلیمہ کے یہاں شق صدر کا واقعہ، بکریاں چرانے کی حکمت، بحیرا راہب، تجارت اور دوسرے معاملات میں آپؐ کی امانت، دیانت و راستبازی اور اس کا عام اعتراف، آغاز وحی کے وقت ورقہ بن نوفل کے یہاں جانا، اعلان دعوت کے بعد آپؐ پر اور صحابہ کرامؓ پر مشرکین کے مظالم اور مدینہ میں اشاعت اسلام وغیرہ، گو مصنف نے اس کتاب میں گوناگوں معلومات جمع کر دیئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ثبوت کیلئے دلائل و شواہد کا انبار لگا دیا ہے، مگر ترتیب میں ناہمواری اور تحریر کو سمیٹنے کی وجہ سے تکرار، طوالت، بے ربطی، انتشار اور خلط مبحث پیدا ہو گیا ہے، ولادت اور تاریخ ولادت کا ذکر دونوں حصے میں ہے، دوسرے حصہ کی ابتدا میں بسم اللہ کی بحث بے محل ہے ان کی جو توجیہ کی گئی ہے، اور رحمٰن و رحیم کا جو مطلب بیان کیا گیا ہے، وہ بھی محل نظر ہے، غیر معتبر اور بے اصل واقعات و روایات بھی محض شہرت کی وجہ سے نقل کر دیئے ہیں، حوالے ثانوی اور ضمنی

مارچ سنہ ۱۹۸۳ء
معارف
لمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ
مرتبہ
سید صباح الدین عبد الرحمن
قیمت بیس روپیے سالانہ
فتر دار المصنفین اعظم گڈھ

فاؤنڈیشن کی طرف سے جناب حکیم محمد سعید کے اہتمام میں ۱۴ ر دسمبر سے [illegible] تک ہوتا رہا،
جناب حکیم محمد سعید کو بڑی بڑی بین الاقوامی کانفرنسوں اور مذاکروں کو انتہائی خوش سلیقگی سے انجام
دینے اور دلانے میں غیر معمولی وصف حاصل ہے، اس مذاکرہ میں بھی اُن کی میزبانی کی رعنائی ہر طرف دیکھنے
میں آئی، ہندوستان کے نمایندوں میں اس خاکسار کے علاوہ ڈاکٹر مشیر الحق صدر شعبۂ اسلامیہ جامعہ ملیہ
دہلی بھی تھے، پاکستان کی نمایندگی پورے طور پر تھی جس میں سابق وزراء بھی تھے، سپریم کورٹ کے سابق
چیف جسٹس بھی، ہائی کورٹ کے جج بھی، ممتاز قانون داں بھی، علماء بھی، یونیورسٹی کے اساتذہ بھی اور صحافی
بھی، اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی، کہ جو مضامین پڑھے جاتے، اُن کے خلاصے دوسرے دن جریدۂ ہمدرد
میں چھاپ کر اجلاس میں تقسیم کر دیئے جاتے،

اس خاکسار نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں جن خیالات کا اظہار
کیا وہ معا[illegible] کے زیر نظر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین ہے مولانا کوثر نیازی سابق وزیر حکومت پا[illegible]ان
کے مقالہ اسلامی سیاست میں جماعتیں کے ایک خصوصی اجلاس کی صدارت بھی تفویض کی گئی، مقالہ پر سوال
و جواب کے سلسلہ میں بڑی تلخی پیدا ہونے لگی تو اپنے صدارتی اختیار سے جلسہ کو ختم کرنا پڑا، جس سے کچھ
نمایندوں کو ناگواری بھی ہوئی،

اسلامی سیاست کی تلاش و تحقیق سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک مسلمانوں کی ریاست اور سیاست
[illegible] اسلام میں سارے سیاسی تصورات موجود ہیں

... [illegible] ... شیدی نہیں

... [illegible] ... یہاں خلیل گر نہیں تہذیب زندگی کا

... [illegible] ... ہوگا، جہاں ہر زمانہ میں ذہن کی سکینت

... [illegible] ... ہوگی، پھر قصد ریاست گیا زندگی کی سانس کی بھی تلاش جاری

... [illegible] ... اور بصیرت ہو تو فرنگیوں کا دیو بے زنجیر بھی مجبور بن سکتا ہے،

اس مذاکرہ ملی کے درمیان جناب حکیم سعید صاحب نے اپنے مجوزہ ادارہ مدینۃ الحکمۃ کا سنگ بنیاد نہایت شاندار طریقے سے اپنے نامور برادر بزرگ جناب حکیم عبدالحمید سے رکھوایا، اس کی امتیازی شان یہ تھی کہ مذاکرہ ملی کے ہر نمائندہ اور شہر کے اکابر سے بھی بنیادی اینٹیں رکھوائی گئیں، اور ان سب کے نام پہلے سے دیوار پر کندہ تھے، اس کے لئے طرح طرح کے اداروں کی تعمیر میں جو کثیر اخراجات ہوں گے، ان سے جناب حکیم سعید کی سعی پیہم کی ترانہ دے کم وکیف حیات کا اندازہ ہوتا ہے،

کراچی کے قیام میں ۲۶ر دسمبر ۸۳ء کی رات میرے لئے بڑی دلنواز بن گئی، میری نواسی کے ختم قرآن اور میرے نواسہ کی بسم اللہ خوانی کی تقریب میں جناب حکیم محمد سعید اپنے اشاف کے ساتھ میری لڑکی کے گھر پر تشریف لائے، اس موقع پر جناب اے کے بروہی سابق وزیر حکومت پاکستان، جناب نبی بخش بلوچ سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی، مولانا ظفر احمد انصاری رکن اسلامی نظریاتی کونسل، جناب [illegible] سکریٹری جنرل موتمر اسلامی، جناب مسرت حسین زبیری آئی سی ایس، جناب ڈاکٹر محمد بقائی، جناب [illegible]، جناب شریف المجاہد ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی، پروفیسر ڈاکٹر اقبال صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر ڈاکٹر حسین جعفری، پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام، مولانا عبدالقدوس ہاشمی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا غلام محمد، مولانا رشید حسن ندوی، مولانا فضل ربی ندوی، جناب صلاح الدین اڈیٹر جسارت، جناب علی محمد مالک پاکولا، اور [illegible] مشروبات جاپانی والا،

جلد ۱۲۳ ماہ جمادی الاولیٰ و جمادی الثانی مطابق ماہ مارچ ۱۹۷۹ء عدد ۳

مضامین

مقالات

وفیات

شذرات

کراچی کے سفر میں "مذاکرۂ ملی تعلیمات نبوی تصور ریاست اسلامی" میں بھی شرکت کرنے کا موقع ملا، جو ہمدرد فاؤنڈیشن کی طرف سے جناب حکیم محمد سعید کے اہتمام میں ۱۴ر دسمبر سے ۱۷ر دسمبر ۱۹۸۸ء تک ہوتا رہا، جناب حکیم محمد سعید کو بڑی بڑی بین الاقوامی کانفرنسوں اور مذاکروں کو انتہائی خوش سلیقگی سے انجام دینے اور دلانے میں غیر معمولی وصف حاصل ہے، اس مذاکرہ میں بھی اُن کی میزبانی کی رعنائی ہر طرف دیکھنے میں آئی، ہندوستان کے نمایندوں میں اس خاکسار کے علاوہ ڈاکٹر مشیر الحق صدر شعبۂ اسلامیہ جامعہ ملیہ دہلی بھی تھے، پاکستان کی نمایندگی پورے طور پر تھی جس میں سابق وزرار بھی تھے، سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس بھی، ہائی کورٹ کے جج بھی، ممتاز قانون داں بھی، علمار بھی، یونیورسٹی کے اساتذہ بھی اور صحافی بھی، اس کی نمایاں خصوصیت یہ تھی، کہ جو مضامین پڑھے جاتے، اُن کے خلاصے دوسرے دن جریدۂ ہمدرد میں چھاپ کر اجلاس میں تقسیم کر دیئے جاتے،

اس خاکسار نے اس کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبہ میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ معارف کے زیر نظر شمارہ میں ہدیۂ ناظرین ہے مولانا کوثر نیازی سابق وزیر حکومت پاکستان کے مقالہ "اسلامی سیاست میں جماعتیں" کے ایک خصوصی اجلاس کی صدارت بھی تفویض کی گئی، مقالہ پر سوال و جواب کے سلسلہ میں تلخی پیدا ہونے لگی تو اپنے صدارتی اختیار سے جلسہ کو ختم کرنا پڑا، جس سے کچھ نمایندوں کو ناگواری بھی ہوئی،

اسلامی ریاست کی تلاش و تحقیق سے یہ الزام آتا ہے کہ اب تک مسلمانوں کی ریاست اور سیاست کسی تصور کے بغیر چلتی رہی، اس سے کیسی اہانت ہوتی ہے، اسلام میں سارے سیاسی تصورات موجود ہیں

...ذہنی کی ضرورت نہیں ہے اور ان ہاتھ میں ہو تو جمعیت اور ملت کی تشکیل میں کوئی دشواری نہیں،
دنیا دین نہیں تو جمعیت کے ساتھ ملت اور سیاست بھی ختم ہو جاتی ہے، یا ان خلیل اگر نہیں تو زندگی کا
ریزہ ہی تھا کستر ہے جہاں اور جس ملک کا وجود سراپا تخلیل افرنگ ہوگا، جہاں ہر زمانہ میں ذہن کی مسکینی
اور محکومی کے ساتھ ناامیدی جاوید رہے گی، پھر تصور ریاست کیا زندگی کی سانس کی بھی تلاش جاری
رہے گی، لیکن اگر دل خبیر اور بصیر ہو تو فرنگیوں کا دیو بے زنجیر بھی مجبور بن سکتا ہے،

اس مذاکرۂ ملی کے درمیان جناب حکیم سعید صاحب نے اپنے مجوزہ ادارہ مدینۃ الحکمۃ کا سنگ بنیاد
نہایت شاندار طریقہ سے اپنے نامور برادر بزرگ جناب حکیم عبدالحمید سے رکھوایا، اس کی امتیازی
شان یہ تھی کہ مذاکرۂ ملی کے ہر نمایندہ اور شہر کے اکابر سے بھی بنیاد کی اینٹیں رکھوائی گئیں، اور ان سب کے
نام پہلے سے دیوار پر کندہ تھے، اس کے لئے طرح طرح کے اداروں کی تعمیر میں جو کثیر اخراجات ہوں گے،
ان سے جناب حکیم سعید کی سعی پیہم کی توانائی کم و کیف حیات کا اندازہ ہوتا ہے،

کراچی کے قیام میں ۲۶ر دسمبر [illegible] کی رات میرے لئے بڑی دلنواز بن گئی، میری نواسی کے
ختم قرآن اور میرے نواسہ کی بسم اللہ خوانی کی تقریب میں جناب حکیم محمد سعید اپنے اسٹاف کے ساتھ
میری لڑکی کے گھر پر تشریف لائے، اس موقع پر جناب اے کے بروہی سابق وزیر حکومت پاکستان،
جناب نبی بخش بلوچ سابق وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی، مولانا ظفر احمد انصاری رکن اسلامی
نظریاتی کونسل، جناب انعام الحق سکریٹری جنرل موتمر اسلامی، جناب مسرت حسین زبیری آئی سی ایس،
جناب ڈاکٹر محمد بقائی، جناب [illegible]، جناب شریف المجاہد ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی، پروفیسر ڈاکٹر ابواللیث
صدیقی، پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پروفیسر ڈاکٹر منظور احمد، پروفیسر ڈاکٹر حسین جعفری، پروفیسر ڈاکٹر
[illegible] اسلم، مولانا عبدالقدوس ہاشمی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا غلام محمد، مولانا رشید حسن ندوی، مولانا فضل ربی
ندوی، جناب صلاح الدین اڈیٹر جسارت، جناب علی محمد مالک پاکولا، ادارہ [illegible] مشروبات جناب [illegible] والا،

ا عبدالغفور فاضل دیوبند، جناب لطف اللہ خان، جناب شان الحق حقی، جناب محمد علی، جناب محمد حسین صدیقی اور جناب افضال حسین نے شرکت کرکے میری عزت افزائی کی۔ ایک شعری نشست بھی منعقد ہوئی،

بھی نوازا، اس باوقار اجتماع کی قندیل میں جو میں بار بار فروزاں ہو گئی شرکاء کے نام قصداً لکھ دیئے گئے ہیں تاکہ یادیں

اسی دسمبر ۱۹۸۳ء کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے ہندوستان میں تاریخ نویسی کے موضوع پر لیکچر کے لئے مدعو کیا گیا، اس کا جلسہ نیپا کے مشہور ہال میں ہوا، انجمن کے صدر جناب جمیل جالبی، اس کے سکریٹری جنرل جناب نجم الحسن جعفری وغیرہ

ست راست جناب ضیاء الدین صاحب نے ہر طرح کی توضیح کی، جب بول چکا تو سوال و جواب میں اس پر بڑی گرم بحث

بادشاہت اسلام میں جائز ہے کہ نہیں اور تاریخ نویسی میں معروضیت کس حد تک ضروری ہے، خاکسار کی تقریر

وضہ میں انجمن کی روایات کے مطابق ایک ہزار کی رقم پیش کی گئی، اس کو قبول کرنے کا اصرار بڑھا تو یہ رقم لے کر

اپنی طرف سے ہدیہ کر دی، جناب نجم الحسن جعفری نے انجمن ترقی اردو کے دفتر میں بلایا، دوسرے دن بلایا، اس کی

سرگرمیوں کی تفصیل بتائی، پھر ایک رات اپنے گھر پر جناب خالد اسحٰق ایڈوکیٹ، جناب جمیل جالبی، جناب

ن اور جناب مشفق خواجہ صاحب سے ملانے کا موقع فراہم کیا،

۲ جنوری ۱۹۸۴ء کو شمالی ناظم آباد کی بزم ہمایوں کی طرف سے مدعو تھا، اس کے جنرل سکریٹری جناب

ل حسین بڑے فعال اور متحرک ہیں، اور مشکل سے مشکل کام انجام دینے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں، یہ نشست ڈاکٹر

یت کے دولتکدہ پر ہوئی جس میں کئی بینکوں کے صدر اور نائب صدر ہائی کورٹ کے جج، یونیورسٹی کے اساتذہ

سرے معززین شریک ہوئے، اس کی صدارت پاکستان کے مشہور ایڈوکیٹ جناب خالد اسحٰق صاحب نے کی

ازیادہ تر تقریریں اس پر تھیں کہ ہمارا معاشرہ کس طرح اچھا بن سکتا ہے، اس موقع پر جناب افضال حسین نے

جمن کی مطبوعات کی ایک نمائش کا بھی اہتمام کیا تھا،

ب رفقد ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ڈائرکٹر اردو ڈکشنری بورڈ نے اپنے نئے دفتر کی رسم افتتاح کے موقع پر مدعو کیا،

مولانا جمال میاں فرنگی محلی کی زبانی ذکر رسول سننے کی سعادت حاصل ہوئی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے

پنی مستند تحقیق اور عرق ریزی سے اردو لغت کئی جلدوں میں مرتب کرایا ہے، ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے
جس پر نہ صرف اردو زبان بلکہ علم و ادب کو بھی ناز ہو سکتا ہے،

کراچی کے اس قیام میں شب و روز بڑی پرکیف مشغولیتوں میں گزرے، ایک روز پاکستان کے مشہور
شاعر جناب شان الحق حقی نے اپنے یہاں بلا کر کراچی کے ممتاز دانشوروں سے ملایا، ان کے گھر کے اس
اجتماع میں جناب آل احمد سرور میر مجلس بنے رہے، جناب خالد اسحٰق صاحب نے دوسرے دن اپنے دولتکدہ پر مدعو
کیا جس میں کچھ ارباب علم و فضل بھی شریک ہوئے، وہ بڑے مہمان نواز ہیں، اپنی فیاضی اور خاطر داری میں
اپنے دسترخوان کو پرتکلف بنانے کے ساتھ اپنی بذلہ سنجیوں اور نکتہ پروریوں سے پرکیف اور پرلطف بنا دیتے ہیں،
ان کے یہاں کی نشست میں علمی ادبی اور مذہبی گفتگوؤں کی کہکشاں اور ادبی چشمکیں رہتی ہیں، وہ اپنی شگفتہ گفتگو سے اس کو زعفران زار بنا کر
اپنی شخصیت میں رعنائی اور دلبری پیدا کر دیتے ہیں، ان کی ذاتی لائبریری میں ستر ہزار کتابیں ہیں جو ان کے ہر کمرہ میں رکھی
رہتی ہیں، ان ہی کے بیچ میں بیٹھ کر شستہ بیانی اور شیریں کلامی کی مے دو آتشہ و سہ آتشہ کے ساغر و مینا چھلکتے رہتے ہیں۔

ایک رات پاکستان کے بزرگ ملی یا ابن ندیم جناب مشفق خواجہ کے یہاں نشست ہوئی جس میں پاکستان کے مشہور
شاعر دلنواز، ادیب اور کہنہ مشق کالم نویس جناب جمیل عالی، کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور تاریخ
ادب اردو کے لائق مصنف جناب جمیل جالبی، اکونومسٹ کے سابق اڈیٹر ابن الحسن، کراچی کی بہت ہی
دلآویز شخصیت جناب محمد ارزمن اور مشاہیر کی آوازوں کو کیسٹ میں محفوظ کرنے کے ماہر جناب لطف اللہ
خاں بھی شریک تھے، یہ مجلس علم و ادب کے محبوبوں کی تھی، ان محبوبوں کے محبوب مشفق خواجہ بنے ہوئے تھے۔

ایک رات جناب لطف اللہ خاں صاحب کے یہاں بھی نشست رہی، جن کی بیگم صاحبہ نے اپنی خوش سلیقگی
سے اپنے فلیٹ کو مینو نظر بنا رکھا ہے، وہاں انگریزی کے مشہور اخبار ڈان کے چیف اڈیٹر جناب احمد علی خاں
صاحب اور ان کی مشہور افسانہ نگار بیگم ہاجرہ مسرور سے بھی ملنے کا موقع ملا، یہ خاکسار ڈان اخبار کا ممنون ہو کر
رہا کہ اس کے متعلق دو تحریریں شائع ہوئیں، ایک تو جناب محمد علی صدیقی صاحب کی تھی جو ایریل کے نام سے اس کے

ہندوستان کے میگزین میں ایک شستہ و شگفتہ مضامین لکھنے والی خاتون نے میرے متعلق

"Torch Bearer of Dying Tradition."

کے عنوان سے بہت کچھ لکھا اس میں جو کچھ لکھا گیا ہے معلوم نہیں میں اس کا مستحق ہوں بھی کہ نہیں ڈان کے اسٹاف میں قلم کے ایک اور ماہر کا نام بھی محمد علی صدیقی ہے انھوں نے میرا ایک انٹرویو اسلام اور مستشرقین پر لیا اور اس میں اپنے قلم کی طاقت، زورِ انشاء اور جادو طرازی دکھا کر اس کو بڑی نمایاں سرخی

"Challenge From The Orientalist"

کے ساتھ ڈان میں شائع کیا

ایک روز جسارت کے اڈیٹر جناب صلاح الدین صاحب نے فاران ہال میں پاکستان کے صحافیوں سے ملنے کا موقع دیا پھر اپنے گھر پر مدعو کر کے بعض مزید کالم نگاروں اور دانشوروں سے ملاقات کرائی انہی کے اخبار میں "اسلام اور مستشرقین" پر میرا ایک لمبا انٹرویو بھی شائع ہوا ایک رات پاکستان کے مشہور صحافی جناب مجیب شامی نے استاذی المحترم حضرت سید صاحب کا ایک انٹرویو لیا اور نوائے وقت کے کئی کالموں میں اس کو بہت اچھے انداز میں شائع کیا،

ایک رات جناب نوری والا نے اپنے سفرِ کرم پر بلا کر اپنی محبت کی نکہت بیزی سے مشامِ جان کو معطر کیا، یہ پاکستان سٹیل مل کے بڑے اہم عہدیدار تھے، دارالمصنفین اور معارف کے بڑے قدردان ہیں ان ہی کے یہاں جناب علی محمد صاحب سے بھی نیاز حاصل ہوا جو پاکستان کی ٹکسٹائل کی صنعت اور مشروبات کو فروغ دینے میں بڑے کارنامے انجام دے رہے ہیں انھوں نے اپنے بے پایاں الطاف و اکرام سے نواز کر اپنی علم نوازی اور قدردانی کا ثبوت دیا، ان ہی سے مولانا عبدالشکور فاضلِ دیوبند ملے جو اپنے دینی اور علمی معلومات سے اثر انداز ہوتے رہتے ہیں، جناب نوری والا صاحب کے یہاں نشست میں زیادہ تر مذہبی مسائل پر گفتگو رہی وہ انگریزی میں بڑے اچھے مضامین بھی لکھا کرتے ہیں۔

استاذی المحترم حضرت سید صاحبؒ کے خلیفہ ارشد مولانا غلام محمد صاحب چونکہ بھائی ہی کی طرح ہیں کراچی میں اخلاص و محبت کا ثبوت دیتے رہے اپنے یہاں مدعو کر کے بھی نوازا، انھوں نے اپنے ملنے والوں کے حلقہ میں بڑی وقعت کا

پہنچایا گیا تو ناظم آباد کے جناب شمس الدین قالینی والے نے اپنے روز افزوں دولت کدہ پر بلایا، جہاں مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے علمی معلومات کے دریا سے سیراب ہوتا رہا، وہیں جناب ضیاء الدین سابق ڈپٹی گورنر اسٹیٹ بنک پاکستان سے ملاقات ہوئی جو بینک کے سودی نظام پر دیر تک گفتگو کرتے رہے، ڈاکٹر عبداللطیف کویت میں عرصہ دراز تک رہ کر وہ معارف اور دارالمصنفین کے بڑے قدر داں اور مربی ہیں، ایک رات ان کے یہاں نارتھ ناظم آباد کے معززین کے ساتھ بڑی اچھی علمی اور مذہبی گفتگوؤں کی صحبت رہی، اُن کے چھوٹے بھائی بھی ڈاکٹر ہیں، اور بڑے اچھے عہدہ پر مامور ہیں، ان کے یہاں بھی ان کے ہم پیشہ ڈاکٹروں کے ساتھ ایک رات اچھا وقت گذرا، محب محترم مولانا ناظم ندوی کا گھر تو خانۂ بے تکلف بنا رہا، وہ ہر طرح سے نوازتے رہے،

ایک روز فیڈرل بی ایریا میں حلقۂ شاداب میں ایک اچھے مسلمان کی سیرت و کردار پر کچھ دیر تک بولنے کا موقع ملا، اس کے ناظم جناب عبدالرحیم کی وجہ سے بڑی علمی اور مذہبی سرگرمیاں رہتی ہیں، یہاں تنظیم دعوت حق کے ماتحت درس قرآن بھی ہر جمعہ کو ہوا کرتا ہے، اسی حلقہ میں ایک روز جناب قمر رشید صدیقی کے یہاں بھی مدعو ہوا، ایک روز سابق ہم وطنوں نے سمندر کے کنارے دیسنہ ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ کیا، وہاں مدعو کر کے اپنا خصوصی مہمان بنایا، اور بچوں کو انعامات دلوائے،

۱۹ فروری کو پورٹ ٹرسٹ کی ایک مسجد رحمت کی رسم افتتاح کر کے اپنی مغفرت کے لئے توشۂ آخرت حاصل کیا، اس کے صدر ریر ایڈمیرل جناب ام آئی ارشد ہیں، جو پورٹ ٹرسٹ کے علاقے میں اب تک پندرہ مسجدیں بنوا چکے ہیں، ان کو آراستہ و پیراستہ کرنے میں خاص لذت حاصل کرتے ہیں، وہ بڑے خدا ترس، دیندار اور تہجد گذار ہیں، اپنی باتوں میں کلام پاک کی آیتوں کے حوالے دیتے رہتے ہیں، مسجد کی رسم افتتاح بہت ہی باوقار طریقہ پر انجام پائی، اس کے احاطہ میں ایک درخت نصب کرنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، اور وہاں کی بزم ادب کے ایک بہت ہی منتخب مجمع میں اسلام اور مستشرقین کے عنوان سے ایک تقریر بھی کرائی گئی، سوال و جواب سے یہ مجلس بڑی دلچسپ رہی، پورٹ ٹرسٹ کے لوگوں نے اپنی میزبانی میں ہر طرح کی خوش سلیقگی دکھائی،

وہاں سے واپس ہو رہا تھا تو جناب مولانا قاضی عبدالرحمٰن اپنے ادارہ الرابطۃ العالمیۃ الاسلامیہ مارٹن روڈ

دکھائے جہاں اپنا دفتر اور مطبع دکھایا، صحیح بخاری کی جو اردو شرح حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی تعلیمات کو مد نظر رکھ کر کر رہے ہیں، یہ شائد دس جلدوں پر مشتمل ہو، دو جلدیں نذر کیں، جو بہت عمدہ کتابت اور طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، ان کا یہ شاندار اور مفید کارنامہ ہر طرح کی مبارکباد اور تحسین کا مستحق ہے، انشاء اللہ معارف میں اس پر تفصیلی ریویو ہوگا، انھوں نے ہر طرح کی خاطر داری اور تواضع سے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے،

اسلام اور مستشرقین پر جو سمینار دار المصنفین میں فروری ۱۹۸۲ء میں ہوا تھا اس میں طے پایا تھا کہ اس کی دوسری نشست قطر میں ۱۹۸۳ء میں ہو مگر اس کے بعد اس کی تیسری نشست پاکستان میں ہو جس کے داعی جناب حکیم محمد سعید تھے، قطر میں بعض اسباب کی بنا پر دوسری نشست نہ ہو سکی، جناب حکیم محمد سعید صاحب سے ان کے دولت کدہ پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے یہ منظور کر لیا کہ قطر میں نہ ہو سکی تو پاکستان میں ہو جائیگی، اس سلسلہ میں ایک دوسری نشست کراچی کے بڑے نامور اور لائق سرجن ڈاکٹر تقاعی کے گھر پر ہوئی، اس کے بعد ۱۲ جنوری کو جناب فضال مبین کے گھر آخری نشست ہوئی جس میں کراچی کے بہت سے اکابر شریک ہوئے، اور طے پایا کہ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، بزم ہمایوں اور بزم نور کے زیر اہتمام یہ ۵ مر ۶ مر ۷ دسمبر ۱۹۸۴ء کو کراچی میں ہو، اس کے ضروری مسائل دار المصنفین سے طے ہو رہے ہیں

اس سفر میں بکثرت کتابیں تحفے میں ملیں جن کا ذکر معارف کے کسی آئندہ اشاعت میں آئیگا، ان کو ہندوستان ڈاک سے بھجوانے میں جناب محمد طیب طاہر نے بڑی مدد کی، وہ استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی کے بڑے معتقد اور گرویدہ ہیں، انھوں نے گرین ٹاؤن میں بچوں اور بچیوں کو کلام پاک پڑھانے کے لئے مدرسہ سلیمانیہ قائم کیا ہے، ان کا یہ ایثار ہے کہ اپنے مکان کا نصف حصہ اس کے لئے دے رکھا ہے، اس کے لئے نئی زمین خریدنے کی فکر میں ہیں، حضرت سید صاحبؒ کے ایک دوسرے معتقد جناب انیس الرحمٰن صاحب ایڈوکیٹ ہیں، انھوں نے اورنگی میں بہت بڑا رقبہ حاصل کر لیا ہے جس میں وہ ان کے نام پر ایک اسکول، ایک ڈگری کالج، ایک اکیڈمی اور درس نظامیہ کا ایک مدرسہ کھولنے کا عزم رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اپنے ارادے میں کامیاب کریں۔ آمین،

مقالات

بحث و تحقیق میں مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی

مترجمہ: ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ بحث و تحقیق میں علمی نہج و طریقہ اختیار کرنے سے یکساں نتائج برآمد ہوتے ہیں، ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کرنے والے اپنے مطالعہ و تحقیق میں مثبت و منفی، مدح و قدح اور حق و باطل دونوں ہی رخوں اور پہلوؤں کو اختیار کریں، مگر اس کے برخلاف مستشرقین کی بحث و تحقیق میں عموماً شدید اختلاف و تعارض بلکہ کبھی کبھی تو سخت تناقض بھی ہوتا ہے۔

اگر واقعتہً ان کی تحقیقات علمی اور معروضی اصول و نہج پر مبنی ہوتیں تو ہرگز یہ اختلاف و تعارض نہ ہوتا، بعض مسلمان مصنفین نے اس تضاد و تعارض کی نشاندہی کر کے بتایا ہے کہ یہ محض مستشرقین کی جہالت و حیرانی ہی کا ثبوت نہیں ہے بلکہ اس کی تہہ میں ان کے یہ اغراض بھی کارفرما ہوتے ہیں کہ وہ دوسروں اور خاص طور پر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو جاہل ثابت کرنا اور ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔

مستشرقین کا یہ تعارض و تضاد کبھی تو خود اپنی ہی تحقیق کے خلاف ہوتا ہے جیسے وہ کبھی ایک

موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کوئی چیز ثابت کرتے ہیں، مگر دوسری جگہ اس کی نفی و تردید کر دیتے ہیں یا کسی بحث کے سلسلہ میں ایک موقع پر جو رائے ظاہر کرتے ہیں، اسی بحث میں دوسرے موقع پر اس سے مختلف کوئی اور خیال پیش کر دیتے ہیں، مثلاً کبھی تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امیت (ناخواندہ ہونا) ثابت کرتے ہیں اور کبھی اس کی نفی و تردید کر دیتے ہیں، کبھی یہ تسلیم کرتے ہیں۔ کہ قرآن مجید وحی الہی ہے، پھر خود ہی اپنے اس خیال کو منہدم کر کے کہتے ہیں، کہ وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہن و دماغ کی اختراع ہے۔

مستشرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کی دو نوعیتیں ہیں (۱) خود اپنی ہی رائے و تحقیق سے انحراف و اختلاف (۲) دوسرے مستشرقین سے ان کا اختلاف۔

پہلی نوعیت | اس میں شبہ نہیں کہ ایک انصاف پسند محقق کے سامنے کبھی کبھی مختلف نقطہ ہائے نظر ہوتے ہیں، ایسی صورت میں وہ علمی و منطقی اصولِ ترجیح سے کام لیکر کسی ایک نقطہ نظر کو دوسرے پر ترجیح دیتا ہے، علمائے محققین کسی خاص روایت حدیث یا ثبوت و سند کی بنا پر پہلے کوئی رائے قائم کرتے ہیں، مگر جب اس سے زیادہ قوی اور مرجح کوئی صورت ان کے سامنے آجاتی ہے تو وہ پہلی رائے کو ترک کر دیتے ہیں، اجتہادی امور و مسائل میں یہ طریقہ ہمارے علما کے یہاں بہت معروف ہے، یہی وجہ ہے، کہ بعض بعض علما سے ایک ہی مسئلہ میں متعدد آراء و اقوال منقول ہوتے ہیں اور ہر ہر قول کی کوئی نہ کوئی دلیل و حجت ضرور ہوتی ہے، مگر آخر میں وہ زیادہ صحیح اور مرجح قول کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں مستشرقین کے یہاں جو تعارض اور تضاد پایا جاتا ہے، اسے نہ بحث و تحقیق سے کوئی واسطہ ہوتا ہے اور نہ معروضیت و معقولیت سے کوئی تعلق، یہ سب کے سب یا اکثر اپنی پچھلی غلطیوں اور اوہام سے رجوع کرنے کے باوجود ان کی تلافی پر قادر نہیں ہوتے۔
جرمن مستشرق نولدیکی کو مسلمان محققین اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمنوں میں شمار کرتے ہیں چنانچہ اسکی

کتاب تاریخ القرآن میں قرآن مجید اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر رکیک حملے کئے گئے ہیں، یہ دوسرے مستشرقین کا قابل اعتماد ماخذ ہے، حالانکہ یہ کتاب اس نے جوانی میں لکھی تھی، اس میں جن غلطیوں کا وہ مرتکب ہوا ہے ان کے بارہ میں معذرت کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"شباب کی بے پروائی اور غلطی کے اثرات اسی وقت محو ہو سکتے ہیں جب گذشتہ تحریر پر مکمل نظر ثانی کی جائے یا نئے سرے سے ایسی کتابیں لکھی جائیں جو پرانی کتاب کے اثرات زائل کر دیں، کیونکہ پہلے جن مسائل کو میں صحیح سمجھتا تھا، بعد کی تحقیق سے وہ غیر صحیح ثابت ہوئے"[1]

سیرت نبوی کے علاوہ دوسرے موضوعات و مباحث قرآن، حدیث اور عقائد وغیرہ میں بھی مستشرقین کے یہاں اس قدر تعارض اور تناقض ہے، جو حد شمار سے باہر ہے، اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں گولڈزیہر کی کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی کے صفحات ۱۲، ۳۰، ۳۱، ۳۲، ۳۳، ۴۸، ۴۹، ۵۵ اور ۹۶ پر خاص طور سے اس کی تحقیق بے راہ روی نظر آتی ہے، اس کتاب کے مترجم ڈاکٹر عبدالحلیم نجار نے اس کی نشاندہی کی ہے، اور ڈاکٹر مصطفے سباعی نے کتاب السنۃ ومکانتہا میں مستشرقین کے ساتھ ان عرب علما و محققین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی کو بھی نمایاں کیا ہے، جو مستشرقین ہی کا انداز اور طریقہ بحث اختیار کئے ہوئے ہیں۔

خاص سیرت نبوی کے موضوع پر مارگولیتھ نے ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے نہایت نادر و نامانوس اور عجیب و غریب باتیں بھی لکھی ہیں اور یہ کذب و باطل کا مجموعہ بھی ہے، اس کا ایک نہایت مضحکہ خیز خیال یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مصر کا سفر کیا تھا، کیونکہ اس کے بارہ میں آپ نے جو کچھ بیان دیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو مصر کے بارے میں مکمل واقفیت تھی

---

[1] بحوالہ مجلۃ المجمع العلمی العربی دمشق جلد ۲۱ ص ۲۵۲۔

.... حضرت خدیجہ کے ساتھ تجارت کا ذکر کرتا ہے کہ آپ نے محض ایک قافلہ کا سفر کر کے ساتھ اپنی بیوی کا مال تجارت میں لگا دیا تھا۔

فاضل مستشرق نولدکی اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ محمد کو یہ معلوم نہ تھا کہ مصر میں بارش بہت کم ہوتی ہے، اگر انھوں نے وہاں کا واقعی سفر کیا ہوتا تو وہ اس بات کو ضرور جانتے کیونکہ یہ عام بات تو کسی بھی واقفیت رکھنے والے سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی۔[1]

یہی مارگولیتھ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام و نسب کے بارہ میں بھی شک و شبہہ ظاہر کرتے ہیں اور ایک جگہ تو اسے ایک تاریخی معما قرار دیتے ہیں اور دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ آپ علی ابن ابی طالب کے چچا کے لڑکے تھے۔

رینان کی رائے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تعصب و عناد پر مبنی ہے، یہ ایک موقع پر آپ کو دھوکہ، فریب اور مکر وغیرہ کا حامل قرار دیتے ہیں اور دوسرے موقع پر آپ کی سچائی اور مصالحت کا اعتراف کرتے ہیں، ان کی اسی تضاد بیانی کی وجہ سے ایک بڑے محقق بریکافیہ نے ان کے بارہ میں کہا ہے کہ یہ شخص واقعات و مسائل کو توڑ مروڑ کر ان کی ہیئت اور صورت ہی کو الٹ پلٹ دیتا ہے، کیونکہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے اس کے اندر خاص کر دو عداوت رچ بس گئی تھی۔"

دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ فرانسیسی استشراق اور مستشرقین کو بگاڑنے میں اس کی اسی قسم کی راہوں کا دخل ہے۔[2] گستاف لوبون نے بھی رینان کے خطبوں کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تردید کی ہے اور اس کے تناقض کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ ایک طرف وہ عربوں کے عجز و درماندگی کو ثابت کرنا چاہتا ہے، اور دوسری طرف اس کے قریب ہی جو کچھ لکھتا ہے اس سے

---

[1] اسلام اور یورپ ص ۹۲ [2] اسلام اور عربی ثقافت ص ۱۴۲

اس کی تردید ہوتی ہے، کبھی وہ عرب مورخین پر ایک الزام عائد کرتا ہے اور کبھی اس کی تردید کرتا ہے، مثلاً وہ عرب مورخین پر الزام عائد کرتا ہے کہ وہ تصنیف و تالیف، نقد و بحث اور تجزیہ و تحلیل میں عاجز و قاصر ہوتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ وہ کتب سیر کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے ان کی ثقاہت و صحت کا اعتراف بھی کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سیرت نبویؐ کی عربی تصنیفات جیسے سیرت ابن ہشام کا پایہ تاریخی حیثیت سے انجیل سے بڑھ کر ہے۔

رباط یونیورسٹی کے استاذ فلسفہ ڈاکٹر حکمت ہاشم نے رینان کے آراء کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لے کر ان کی تردید کی ہے۔

کورنیل باڈلے نے محمدؐ کی لائف پر کتاب الرسول تصنیف کی ہے، دوسرے مشرقی موضوعات پر بھی اس کی کتابیں ہیں، سیرت پر اپنی کتاب کا یہ نام اس نے اس لیے رکھا ہے کہ ہر لٹریچر میں آپؐ کو اسی نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس سے کسی کو دھوکہ نہ ہو کہ وہ بھی اسلام پر اسی طرح ایمان رکھتا ہے، جس طرح مسلمان رکھتے ہیں، کیونکہ اس کی کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام مذاہب کو یکساں سمجھتا ہے، اور یہ خیال کرتا ہے کہ اذان اور دوسرے شعائر و مراسم ہی ایک دین سے دوسرے دین کے اختلاف کا باعث ہیں، البتہ وہ رسول اللہؐ کی فضیلت و عظمت کا معترف ہے، اور اسلام اور دوسرے مذاہب کے ان منکرین کی تردید میں نہایت سختی کی ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقد ہیں،

عقاد نے اس کتاب کی فکری گمراہی، بے راہ روی اور تضاد بیانی وغیرہ کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا ہے، حالانکہ اس کی چوتھی فصل میں وحی کے متعلق نہایت گمراہ کن اور اس قدر متضاد باتیں لکھی گئی ہیں، جن کی ابتدا و انتہا کا پتہ نہیں، اس میں آپؐ کے عقیدہ کے متعلق یہ شک و اعتراض عائد کیا ہے کہ بعثت سے پہلے آپؐ کی بیوی اور خود آپؐ بھی بت پرست تھے، اور

اللہ کے ساتھ عرب کے شرکا کی پرستش کرتے تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ آپ نے نسطوری راہب اور دوسرے لوگوں کا اثر قبول کیا تھا، اور آپ پر ایک اعصابی کیفیت طاری ہوتی تھی جو آپ کے افکار پر اثر انداز ہوتی تھی مگر اس کے بعد وہ اس کی تردید بھی کرتا ہے کہ یہ مرگی اور اعصابی بیماری نہ تھی۔

وحی کے معاملہ میں اس نے اس تناقض و تردد کا اظہار کیا ہے کہ وہ مرگی یا ملیریا کا نتیجہ ہویا روحانی سفر کا فیض ہو، وحی کی کیفیت سے لیکر سورۂ علق کی ابتدائی آیات کے نزول تک جو کچھ لکھا ہے اس میں بھی اسی قسم کا تردد و تذبذب پایا جاتا ہے، آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے یا امی اور ناخواندہ تھے اس کی بحث میں بھی تردد، اشتباہ اور تعارض پایا جاتا ہے۔

دوسری قسم | اسلام اور پیغمبر اسلام کے دشمن مستشرقین ہوں یا نرم پسند اور معتدل مستشرقین دونوں گروہوں کی اکثر تحقیقات شکوک و شبہات اور کذب و افترا پر مشتمل ہوتی ہیں، باقی جو تحقیقات معقولیت و انصاف پسندی پر مبنی ہوتی ہیں، ان میں بھی کجی، بے راہ روی اور تعارض نمایاں ہوتا ہے۔

مستشرقین نے جن موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے وہ مستحکم اختلافات اور قوی اعترا[ضات] کا باعث بنے ہوئے ہیں، مختلف پہلوؤں سے مثبت اور علمی اسلوب و نہج پر جن مسائل کی باقاعدہ تحقیق و تنقیح ہو چکی ہے، انھیں بھی غرض پسند مستشرق اپنی کجی اور گمراہی سے ڈھ[انا] چاہتے ہیں۔

ان کی ایک جماعت ضعیف بنیادوں پر کسی گڑھی ہوئی رائے یا مطعون قول پر متف[ق] ہو جاتی ہے اور اسے صحیح باور کر کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اسکی نشر و اشاعت کرتی ہے، لیکن اصلی عربی ماخذ پر مبنی دوسری تحقیق اس کو دلیل و برہان سے غلط ثابت کر دیتی ہے۔

...ود اس اختلاف رائے اور چیز ہے اور تحقیق کی گمراہی اور بے راہ روی اور چیز ہے،
...ف رائے کی صورت میں اس کا امکان ہوتا ہے کہ بحث و تحقیق کرنے والا کسی مرجح رائے
...تیجہ تک پہنچ جائے اور شک و تردد کے بندھن سے آزاد ہو کر خود اپنے تئیں صحیح فکر
...قع نتیجہ کی تلاش و تفتیش کرے۔ لیکن تحقیق گمراہی اور بے راہ روی میں نہ کوئی دلیل د...
...ی ہے اور نہ اس سے فہم سلیم کا پتہ چلتا ہے جو کسی طالب حقیقت انسان کے اندر ہوتی
...عارض کی اصل و بنیاد ہو تو اس میں تطبیق کی گنجائش ہوتی ہے مثلاً یہ ممکن ہے کہ بعض محدثین
...ہ سے ایک روایت کو ضعیف قرار دیتے ہوں اور دوسرے اسے صحیح مانتے ہوں کیونکہ
...، نزدیک دلائل سے اس کا ضعیف ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ دونوں
...کے نزدیک نقد کے کچھ اصول اور قاعدے ہیں، ایسی صورت میں ظاہری تعارض
...ہو جانے کا امکان ہے۔

...بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسراء و معراج روحانی ہوئی تھی، مگر دوسرے محققین
...ل یہ ہے کہ معراج روحانی کے ساتھ جسمانی بھی تھی ثبوت میں دونوں نصوص و دلائل
...تے ہیں ایسے موقع پر غالب گمان یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تعارض رفع ہو جائے۔
...ہی تحقیقی بے راہ روی اور تضاد بیانی تو اس میں علمی ذمہ داری اور دیانتداری نہ
...حقیق نہیں ہوتی اس لئے جدال و خصومت کی نوبت آجاتی ہے، جس کا نتیجہ کینہ و کدورت
...ں ظاہر ہوتا ہے، اس میں نہ کوئی ممتاز حجت و دلیل ہوتی ہے جو دوسری حجت د...
...غالب آجائے اور نہ روشن فکری موقف ہوتا ہے، جو دوسرے دقیق اور مبہم موقف
...ردے، بلکہ پراگندہ رائیں اور متضاد و مختلف اقوال ہوتے ہیں جو کسی حقیقت پر
...ہوتے۔

[illegible] پر بحث و تحقیق کرنے والے کسی موضوع میں اس کے سوالات [illegible]

[illegible] آخر دلیل کیا ہے؟ اس رائے کی علمی قدر و قیمت کیا ہے، اور اختلاف و نزاع کے موقع پر
تطبیق کی کیا صورت ہوگی اور اس کے قریب و بعید، مقصود و غیر مقصود مرادات کیا ہیں؟ مگر
مستشرقین کے تعارض، تضاد اور بے راہ روی کے دائرے میں یہ سب باتیں نہیں آتیں۔

یہاں ہم نے ایک پہلو کی وضاحت کی ہے۔ اس سے اختلاف رائے اور تحقیق اور بے راہ روی
و تضاد بیانی غیر معروضی و علمی مناقشہ اور جدال و تعصب پر مبنی مناقشہ کے فرق کا اندازہ کیا جا سکتا
ہے، مزید تفصیل کا موقع نہیں ہے اس لئے اب مستشرقین کے باہمی تضاد اور بے راہ روی کی بعض
صورتیں بیان کی جاتی ہیں۔

اسلامی تاریخ کے بارہ میں بے راہ روی | ایک مستشرق بگر اسلامی تاریخ اور اس کے مولفین کی
نسبت لکھتا ہے کہ اسلامی فتوحات کے بارہ میں عربوں کی کتابیں جھوٹ کا انبار اور غلطیوں
سے پر ہیں، تاریخ کے مسائل اور واقعات کے زمانے کی ترتیب میں وہ خاص طور پر غلط بیانی
سے کام لیتے ہیں دوسرے مستشرق جین نے بھی یہ لکھ کر اس کی تائید کی ہے کہ تاریخ میں مہارت
و کمال کا ایشیائی قوموں میں فقدان ہے کیونکہ وہ نقد و فلسفہ کے اصول و قوانین سے ناواقف ہیں

تعصب، عداوت اور کینہ سے بھرے ہوئے ان جانبدارانہ اقوال کے مقابلہ میں سید یلو
اور براؤن کہتے ہیں کہ عربوں سے عمدہ اور بہتر تاریخ آج تک غیر عربوں نے نہیں لکھی، نلینو[1] نے بھی
تاریخ نگاری میں عربوں کی دقت نظر اور باریک بینی کی شہادت دی ہے وہ لکھتا ہے کہ
انھوں نے تاریخ کے مختلف اصول اور طریقے وضع کئے ان کا ایک طریقہ تو یہی ہے کہ
وہ سال بسال سنین کا ذکر کرتے ہیں، دوسرے بقدر استطاعت سباق کے اعتبار سے

---

[1] بحوالہ مجلۃ العلمی العربی دمشق ج ۱۱ ص ۶۶۰ سنہ ۱۹۳۱ء

بعثت نبوی کی روایت کی جانب اعتنا کرتے ہیں[۱]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے عوامل، آپ کی نفسیات، بعثت سے قبل کے میلانات اور علالت و وفات کے اسباب کے بارہ میں بھی اسی قسم کی بے سرو پا باتیں کہی گئی ہیں جنہیں ڈاکٹر عبد الحلیم محمود نے تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔[۲] ہم دو ہی باتوں کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

بعثت سے قبل کے میلانات | ڈوزی کا بیان ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مزاج سودادی تھا، آپ برابر خاموش رہتے تھے، تنہا طویل سیر و سیاحت سے آپ کو رغبت تھی، مکہ کی وحشتناک تنہائیوں کے اندر غور و فکر میں غرق رہتے تھے۔[۳] پادری لامانس نے تمام حقائق کو بالائے طاق رکھ دیا ہے، وہ اس کی تردید میں لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوت گزیں اور معتکف ہونے کا کوئی ثبوت ہی نہیں ملتا۔[۴]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور موت کے اسباب | لامانس نے اپنی اسلام دشمنی کے جذبات کو تسکین دینے کے لئے جو کچھ لکھا ہے اسے معقولیت، حقیقت اور تاریخ سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ لکھتا ہے "محمد کی شہوانیت حد سے بڑھی ہوئی تھی، ان کا جسم مرغوب اور لذیذ غذاؤں کی وجہ سے موٹا ہو گیا تھا، اعضاء بے حس و حرکت ہو گئے تھے، اور سکتہ کی بیماری کی وجہ سے آپ دہشتناک اور ڈراونے معلوم ہوتے تھے"۔

اس کے بالکل ہی برخلاف دوسرا مستشرق بینیہ سفلہ لکھتا ہے کہ بعض دفعہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جسم پر بھوک کی وجہ سے شدید ضعف کے اثرات نمایاں رہتے تھے، لگاتار دو روز تک ہذیانی بخار میں مبتلا رہنے کی وجہ سے آپ کی وفات ہوئی۔

تیسرے مستشرق کلیمان ہیار نے ان دونوں کی تردید کی ہے ان کا بیان ہے کہ محمد کے جسم

۱۔ اسلام اور عربی ثقافت ص ۳۴۳ تا ۴۰۰ یورپ اور اسلام ص ۹۳ تا ۹۳ اندلس کے مسلمان ص ۱ تا ۱۸

۲۔ ملاحظہ ہو اس کی کتاب "کیا محمد سچے تھے"، ص ۱۔

... ور شس اور جلن کے عوارض ظاہر ہوئے اس بنا پر آپ کے قویٰ نہایت تیزی سے کمزور ہو گئے[1]
... پادری یا دوو لکھتے ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک یہودی عورت نے زہر کھلا دیا تھا اسکی وجہ سے
... کی وفات ہو گئی۔[2]

ڈاکٹر عبد الحلیم ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں اوپر جو کچھ گذرا ہے اسے ملاحظہ کرنے کے بعد کیا ہم
... شرقین کے آراء پر اعتماد کر سکتے ہیں، حالانکہ ہم نے ان کے بیشمار اختلافات میں سے نہایت تھوڑے اختلافات
... بیان کئے ہیں، ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ خود ایک مستشرق ہی دوسرے مستشرق کی بنیاد ڈھا دیتا
... اس کے خیالات کی تردید کرتا ہے۔

... رت نبوی سے متعلق بعض مسائل میں | لفظ محمد اور محمدیت کے مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں بوڈلے لکھتا ہے[3]
... شرقین کی بے راہ روی اور تضاد بیانی | لفظ محمد (ammet) بمعنی اصنام کے معنی میں مستعمل ہے اور
... ات کا (Mahomerie) مشتق ہے اور کلمہ (Mumery) مصدر کے طور پر مجون کے لئے اور
... ن کی پرستش کے لئے محمدیت (Mametry) آتا ہے، جون سلدن نے اس بیان پر نقد و تعقب
... ہے وہ لکھتا ہے کہ اس تعریف و تشریح کے نتیجہ میں محمد اور محمدیت مبغوض اور ناپسندیدہ نام ہو گئے ہیں جب کہ
... ری دنیا جانتی ہے کہ ترک یعنی مسلمانوں کے دین میں بتوں کی پرستش حرام ہے، بوڈلے نے محمدیت کی جو تعریف کی
... اسکی تردید کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور انکے اتباع نے اپنے قائد کا مکمل احترام و توقیر کرنے کے
... وجود کبھی محمدی یا محمدیت کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہو بلکہ وہ اس نام سے ہمیشہ احتراز کرتے رہے ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے
... ن دین کی اساس و بنیاد رکھی اسکو اختیار کرنے والوں کی تعبیر ہمیشہ لفظ مسلم سے کی جاتی ہو، جس کے معنی اپنے آپ کو
... شیت الٰہی کے حوالہ کرنے والے کے ہیں پھر وہ آپ کے زہد کا تذکرہ کرتا ہے اور آپ کے دوسرے بشری اوصاف
... کمالات نیز آپ کی قائدانہ اور پیغمبرانہ خصوصیات کو گنا تا ہو اور آخر میں آپ کی زندگی میں ہونے والی آپ کی
... کامیابی کو بیان کر کے کہتا ہے کہ یہ غیر ذمہ دارانہ بیانات آپ کی شان سے کس قدر بعید تھا۔

---

[1] ملاحظہ ہو مصنف کی کتاب تاریخ العرب ج ۱ ص ۱۱۸ ، [2] خلاصات محمد ... ص ۱۱۱ ، [3] ایضاً ص ... ۱۸

اسلام میں تصور ریاست

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

"کراچی میں ہمدرد سیرت کانفرنس کے تحت مذاکرۂ ملی تعلیمات نبوی میں تصور ریاست اسلامی پر ۱۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کے پہلے اجلاس میں خاکسار نے جو اپنا صدارتی خطبہ پڑھا، اس کی نقل ذیل میں درج ہے۔"　　"ص - ع"

حضرات!

میں آپ لوگوں اور خصوصاً اس مذاکرہ کے مہتممین کا شکر گذار ہوں کہ اس مقام سے اپنے کچھ خیالات کے اظہار کرنے کا موقع دیا، ایک ماہر ریاست داں کی حیثیت سے تو نہیں بلکہ تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے عرصۂ دراز سے اس کو معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ قرآن پاک اور احادیث مبارک میں اسلامی حکومت کی نوعیت کیا متعین کی گئی ہے، اور اس میں حکمرانی کے اصول کیا بتائے گئے ہیں، اور گذشتہ چودہ سو سال کے اندر اس کی عملی صورت کیا رہی ہے، اپنی حقیر کتابوں اور ناچیز تحریروں میں اپنے خیالات کو پیش کرتا رہتا ہوں، آج مختصر طریقہ پر ان کا اعادہ کرنے کی اجازت آپ سے چاہتا ہوں، آپ اس لحاظ سے بھی سماعت فرمائیں کہ ایک غیر اسلامی ملک کا رہنے والا مسلمان اسلامی ریاست کا کیا تصور رکھتا ہے،

اپنے ناچیز مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ قرآن میں اسلامی حکومت کی نوعیت متعین

نہیں کی گئی ہے، ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کوئی واضح ہدایت نہیں دی ہے کہ حکومت کی نوعیت کیا ہو، اس کے سربراہ کا انتخاب کیسے ہو، اور اس کو غیر واضح رکھنا مصلحت اندیشی اور دور بینی پر مبنی تھا، تاکہ لوگ زمانے کے تقاضے، اپنے سیاسی مصالح، جغرافیائی حالات اور معاشرتی ضروریات کی بنا پر جیسی حکومت چاہیں، قائم کرتے رہیں، البتہ قرآن پاک اور حدیث میں حکمرانی کے اصول واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں، قرآن پاک میں ہے:

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا
لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ	تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور پیغمبر (آخر الزماں)
وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرہ: ۱۴۳)	تم پر گواہ بنیں،

پھر فرمایا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	مومنو! جتنی امتیں (قومیں) لوگوں میں
لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	پیدا ہوئیں، تم ان سب سے بہتر ہو کہ نیک کام
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَ	کرنے کو کہتے ہو اور برے کاموں سے
تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ (آل عمران: ۱۱۰)	منع کرتے ہو، اور خدا پر ایمان رکھتے ہو،

یعنی مسلمان ایک امت کی حیثیت سے اعلیٰ اور اشرف ہوں، دنیا کی قوموں کے درمیان صدر ہوں، وہ بہترین گروہ بن کر انسان کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں اتریں، اور نیکی کا حکم دیں، اور بدی کو روکیں،

اور اگر ان کی حکومت قائم ہو تو وہ تسلیم کریں کہ ملک اور حکومت کا اصل مالک خداوند تعالیٰ ہے، وہی حکومت دیتا ہے اور وہی چھین بھی لیتا ہے، وہی زمین اور آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے،

وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان اور زمین اور جو کچھ ان دونوں میں ہے
وَمَا بَیْنَہُمَا وَاِلَیْہِ الْمَصِیْرُ (مائدہ ۱۸)	سب پر خدا ہی کی حکومت ہے اور سب کو اسی کی طرف لوٹ جانا ہے
وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ	اور وہی تو ہے جس نے زمین میں تم کو اپنا نائب
الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ	بنایا، اور ایک دوسرے پر درجے بلند کیے،
بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ	تاکہ اس نے جو کچھ تمہیں بخشا ہے اس
فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ (انعام: ۱۶۵)	میں تمہاری آزمائش کرے،

اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کا احساس دلانے کا مقصد یہ ہے کہ حکومت پانے والوں کے دلوں میں کسی کا ڈر ہے، اور جب وہ ساری کائنات کا مالک ہے، تو اسی کے احکام کی بالادستی ہوگی، اس کا حکم ہے کہ زمین کی حکومت کے وارث نیک بندے اور عبادت گذار ہوں گے،

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ	میرے نیکوکار بندے ملک کے
الصّٰلِحُوْنَ ٥ (انبیاء: ۱۰۵)	وارث ہوں گے،

اس وراثت میں نیک بندے اور عبادت گذار کا انتخاب کیسے ہو؟ اس کی وضاحت کلام مجید میں نہیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ یہ لوگوں کی مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے،

امرھم شوریٰ بینھم کی تلقین ضرور ہے، مگر یہ سیاست کے سلسلہ کی نہیں، بلکہ ہر شعبۂ زندگی کے لیے ہے، اس کا اطلاق سیاست پر بھی ہو سکتا ہے، یعنی باہمی مشورے سے حکومت کے لیے نیک اور عبادت گذار بندوں کا انتخاب ہو، مگر اس کی وضاحت نہیں کہ پہلے سربراہ حکومت کا انتخاب ہو جو مجلس شوریٰ کی تشکیل کرے، یا پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو جو سربراہ حکومت منتخب کرے، یہ بھی لوگوں کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے، اگر پہلے مجلس شوریٰ کا انتخاب ہو تو اس کا انتخاب کون کرے گا، مجلس شوریٰ حکومت چلانے کے لیے ہوگی، اس لیے

اس کے افراد کو قرآن کے حکم کے مطابق صالح اور عبادت گذار ہونا چاہیے، جس کے یہ معنی بھی ہیں
کہ وہ صاحب تدبر، صاحب فہم، صاحب بصیرت اور صاحب ادراک بھی ہوں، ان کے انتخاب کے
لیے تو یہ اصول ہونا چاہیے، کہ ان کے انتخاب کرنے والے بھی صالح، عبادت گذار، صاحب فہم، صاحب
ادراک اور صاحب بصیرت ہوں، اس طرح یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ہر بالغ کو اس کے انتخاب میں شرکت
کا حق ہے، پھر بھی مجلس شوریٰ حکومت کے سربراہ کا انتخاب کرسکتی ہے، جس کے لیے قرآن مجید کی
یہ شرط بھی ہے کہ وہ دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرے، حالت خوف کو امن سے بدل دے، اللہ
کی بندگی کرے اور کسی کو شریک نہ جانے، پھر وہ اللہ کے احکام کے مطابق انصاف کے ساتھ حکومت
کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، چوروں، زانیوں اور شرابیوں کو
خاص خاص قسم کی سزا دے، تاکہ معاشرہ ان برائیوں سے پاک رہے، وہ معروف کی ترویج اور
منکر کا استیصال کرے، دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری برتے، کیونکہ خدا چاہتا تو ساری دنیا
کو ایک عقیدہ کا بنا دیتا، ان شرائط کی پابندی جو بھی کرے، وہ حکومت کا سربراہ ہوسکتا ہے، پھر اس
کے لیے حکمرانی کے اصول بھی متعین کیے گیے ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ بھی حکم ہے کہ جو زمین پھیلائی گئی
ہے، اور جو پہاڑ جمائے گیے ہیں، اور جو نباتات اگائے گیے ہیں، اس سے معیشت کے اسباب فراہم
کیے جائیں، اور یہ معیشت سب کے لیے ہو، اس طرح معیشت سوشلزم یا ویلفیر اسٹیٹ کا تخیل پیش
کیا گیا ہے، نجی جائداد کی ممانعت نہیں کی گئی ہے، مگر شرط یہ ہے کہ باطل طریقہ سے حاصل نہ کی
جائے، ظلم اور زیادتی سے دولت جمع کرنے والوں کو آگ میں جھونک دینے کی دھمکی دی گئی ہے،
نجی جائداد کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی رہے، ورنہ یہ ناجائز ہے، یہ تقسیم
سرمایہ داری کے انسداد کے لیے ہے، اس روک کی خاطر یہ بھی حکم الٰہی ہے کہ جو مال جمع کیا جائے
یتیموں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ پر خرچ کیا جائے، تاکہ یہ مالداروں ہی کے درمیان گردش

ذکر موجود ہے ، اسی لیے زکوٰۃ کو لازمی قرار دیا گیا ہے ، صدقات کرنے کی بھی تلقین ہے ، جو فقیروں اور مسکینوں کے علاوہ قرضداروں کی مدد کے لیے بھی ہیں ، جنگ و صلح کے بھی باضابطہ احکام ہیں ، ان لوگوں سے دوستی نہ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے جنھوں نے مسلمانوں سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ، یا ان کو گھروں سے نکال دیا ، یا ان کے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ، اپنے ظالموں سے جنگ کرنے کی تلقین کی گئی ہے ، مگر اس کی بھی ہدایت ہے کہ جنگ کرنے میں بے اعتدالی نہ ہو پھر یہ بھی حکم ہے کہ جب دشمن صلح کی طرف مائل ہوں ، تو ان سے صلح کر لی جائے ، لیکن وہ فریب اور دغابازی سے صلح کی خلاف ورزی کریں ، تو ان کی ایسی خبر لی جائے کہ دوسروں کے حواس باختہ ہو جائیں تیمیوں کے ساتھ حسن سلوک کی نصیحت کی گئی ہے ، حکمرانی کے یہ وہ اصول ہیں جن پر یو۔ ان۔ او (U.N.O) بھی عمل کر کے دنیا اور انسانیت کو سنوار سکتی ہے ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانے میں انہی احکام کی پابندی کی ، آپ نے فرمایا کہ تمھارے حاکموں میں سے بہترین حاکم وہ ہیں ، جن سے تم محبت کرو ، اور وہ تم سے محبت کریں ، اور جن کے لیے تم دعا کرو ، اور وہ تمھارے لیے دعا کریں ، اور بدترین حاکم وہ ہیں جن سے تم بغض رکھو ، اور وہ تم سے بغض رکھیں ، اور لعنت کرو تم ان پر ، اور وہ لعنت کریں تم پر ، آپ نے رحمۃ للعالمین بن کر اپنی زندگی میں سچائی ، عفت ، پاکبازی ، دیانت داری ، رحم ، عدل و انصاف ، عہد کی پابندی ، عفو و درگذر ، حلم و بردباری ، تواضع و خاکساری ، اعتدال ، میانہ روی ، سخاوت ، حق گوئی ، ایثار اور استغنا وغیرہ کے جو نمونے پیش کیے ، وہی آپ کی حکمرانی کے بھی اصول بنے ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد اپنے جانشین کے انتخاب کی کوئی خاص ہدایت نہیں دی ، شاید اس لیے کہ لوگ اپنی خواہش کے مطابق اس کا انتخاب کریں ، اسی لیے خلفائے راشدین کے انتخاب میں یکسانیت نہیں رہی ، حالات کے تقاضے کے مطابق انتخاب کا اصول بدلتا رہا ، اس سے ظاہر ہے کہ

کوئی حکومت چاہے تو اپنے سربراہ حکومت کے انتخاب کے موقع [illegible]
کے مطابق دوبارہ انتخاب کر بدل سکتی ہے۔

قرآن پاک اور حدیث مقدس کے ذریعہ ہم حکومت کی نوعیت تو متعین نہیں کر سکتے۔ مگر خلفائے راشدین کی حکومت کا مطالعہ کر کے ہم اسلامی حکومت کا تصور قائم کر سکتے ہیں، کیا یہ جمہوری طرز کی حکومت تھی؟ اس سوال کا جواب نفی میں دیا جا سکتا ہے، کیونکہ جمہوریت میں جمہور کے بنائے ہوئے قوانین کی پابندی کی جاتی ہے، مگر خلفائے راشدین جمہور کے بنائے ہوئے قوانین کے بجائے قرآن مجید اور حدیث کے احکام کے پابند رہے، اور کتاب و سنت ہی کی بالادستی رہی اس لیے کہ کلام پاک میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی پر اصرار ہے، غیر مسلم کہتے ہیں کہ یہ تھیوکریسی (Theocracy) تھی، مگر یہ تھیوکریسی بھی نہ تھی، کیونکہ تھیوکریسی میں چرچ کی طرف سے حکومت ہوتی ہے، اسلام میں کوئی چرچ نہیں، ایک خیال ہے کہ یہ حکومت تھیوڈیموکریسی (Theo Democracy) تھی، مگر یہ تھیوڈیموکریسی بھی نہیں کہلا سکتی ہے کیونکہ تھیوڈیموکریسی میں کوئی سربراہ حکومت زندگی بھر کے لیے منتخب نہیں ہوتا، خلفائے راشدین میں ہر خلیفہ کا انتخاب زندگی بھر کے لیے ہوتا رہا، اس طرح یہ بادشاہت کی بھی ایک قسم تھی، وہ معزول نہیں کیے جا سکتے تھے، اس طرح رائے عامہ سے بے نیاز بھی رہ سکتے تھے، امت کے مشوروں کو ماننے پر قطعاً مجبور نہ تھے، بلکہ ان کی اطاعت امت پر واجب تھی، اس طرح وہ ڈکٹیٹر یعنی آمر بھی تھے، مگر وہ لوگوں کے مفاد اور فلاح کے خواہاں اور کوشاں رہے، ان کی بہبود کو اپنی حکمرانی کا اصل مقصد سمجھتے رہے، اس لیے بعض لوگوں کے خیال میں ان کی حکومت اسلامی سوشلزم کے طرز کی تھی، مگر سچ تو یہ ہے کہ یہ جمہوریت، تھیوکریسی، بادشاہت، آمریت اور سوشلزم کی تمام خوبیوں سے معمور رہی، اور ان کی تمام برائیوں سے پاک تھی، اس لیے یہ بہترین حکومت قرار دی گئی۔

اس لیے حکومت بہتر نہیں چلی، یہ بھی ہوئی کہ اس دور میں حکومت کی ظاہری شکل، یعنی نظم و نسق کے طریقے، مختلف شعبوں کی ترتیب، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، انتظامات کے طریقے اور دوسرے متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں سمجھے گئے۔ اصل چیز حکومت کے سربراہ اور ان کے عمال کا تقویٰ تھا، یعنی قرآن اور سنت کے احکام کے مطابق اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی اور ایمانی احساس تھا، جس کی کارفرمائی اور بالادستی کی وجہ سے پوری اسٹیٹ ایک ویلفیئر اسٹیٹ بنی رہی۔

گو خلفائے راشدین کے بعد ایسی حکومت پھر قائم نہ ہو سکی، شام اور اندلس کے بنو امیہ، بغداد کے بنو عباس، مصر کے فاطمی، تاتاری خاندان نے اسلام کے فدائی بن کر، اور جنگ صلیبی کے ہیرو، یعنی ایوبی فرمانروا، سلجوقیوں، دولت عثمانیہ، غزنویوں، غوریوں، سلاطین دہلی اور ہندوستان کے مغل فرمانرواؤں وغیرہ نے خاندانی حکومتیں قائم کیں، کیوں؟ ایک رائے تو یہ ہو سکتی ہے کہ قرآن پاک اور حدیث مقدس میں حکومت کی نوعیت متعین نہ تھی، اور جمہوریت کا ذکر نہیں تھا، اس لیے خاندانی حکومت قائم ہو گئی اور چلتی رہی، مگر ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ خلفائے راشدین نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو اپنا جانشین نہیں بنایا، اس لیے خاندانی حکومت کی بادشاہت اسلام کی اسپرٹ کے خلاف ہے، مگر اس کا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن مجید میں جمہوریت کے بجائے بادشاہت کا ذکر تو بار بار آیا، خود اللہ تعالیٰ نے طالوت کو اسرائیلیوں کا بادشاہ مقرر کیا، اسی کے حکم سے حضرت داؤدؑ یہودیوں کے بادشاہ ہوئے، اور ان کے بعد حضرت سلیمانؑ ان کے جانشین ہوئے، یہ تو خاندانی وراثت ہی تھی، انبیاء میں بھی نبوت خاندانی وراثت بنی رہی، حضرت ابراہیمؑ کے خاندان سے حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ یکے بعد دیگرے نبی ہوتے رہے، اس لیے بادشاہت یا خاندانی وراثت کوئی کراہت کی

[illegible] کی خاندانی نوعیت عارضی تھی، اس لیے ان کی مثال اسلام کی حکومت [illegible]
میں پیش نہیں کی جا سکتی ہے۔

تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد جتنی حکومتیں قائم ہوئیں کیا وہ غیر [اسلامی] تھیں؟ اگر ہم ان کو غیر اسلامی قرار دیں تو ہماری سیاسی تاریخ کیا باقی ہے۔ وہ تو ہماری [illegible] کا جز بن چکی ہیں، ان کو اپنے سیاسی جسم کا بدگوشت قرار نہیں دے سکتے جن سے ہماری [illegible] عظمت کے کارنامے وابستہ ہیں، اور ان ہی سے اسلام کی آن بان و شان میں اضافہ ہوتا رہا، اور اگر یہ غیر اسلامی تھیں تو ہمارے علماء نے دعوت عزیمت اور مسلمانوں نے بغاوت اور جہاد سے اس کو ختم کرنے کی کوشش کیوں نہ کی؟ وہ کیوں خاندانی حکومت کو برداشت کرتے رہے؟ اس کی وجہ جہاں یہ بتائی جا سکتی ہے کہ ظالم اور جابر حکمرانوں نے ان کی مرضی کے خلاف ان کو اپنا اطاعت گزار بنا لیا، وہاں یہ بھی وجہ بتائی جا سکتی ہے کہ جس حکومت سے امت مطمئن رہی اس کو گوارا کرتی رہی خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی ہو، یہی اس کے پولیٹیکل کلچر کا تقاضا رہا۔ امت کا پولیٹیکل کلچر اصل تو یہ ہے کہ ہر جگہ خلافت راشدہ کی ایسی حکومت ہو، مگر جب ایسی نہ ہو سکی، تو جس حکومت نے شریعت کی بالادستی قبول کر لی گو یہ زبانی اور کاغذی ہی سہی، مگر ایسی حکومت سے امت کی مذہبی حمیت اور ایمانی غیرت کی پاسبانی، نگہبانی اور پشتیبانی کی ضمانت ملتی رہی، تو امت اسی کو پولیٹیکل کلچر بنا کر حکومت کی معاون ہو گئی، پھر اس کو اس کی فکر رہی کہ حکومت کا سربراہ کیسا ہے، اور اس کا طرز حکومت کیا ہے۔ امت کی یہ تائید و معاونت خاندانی حکمرانوں کی حکومت کی اصلی ضمانت تھی اور عوام کی یہ بیعت سمجھی جاتی، جس کے بعد حکمران اپنی حکمرانی کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنے کے لیے مجبور ہو جاتے، اور وہ کم از کم ظاہری طور پر دین کا نفاذ

بنا ... وقت کا ہوا شد، مستعصم باللہ معتضد باللہ منتصر باللہ وغیرہ اختیار کرتے۔ اور آج کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ خاندانی حکومت کے دور میں کتاب و سنت کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، شیخ الاسلام، صدر الصدور، قاضی، قاضی القضاۃ، مفتی اور محتسب وغیرہ جیسے اور عہدے تو اسی لیے تھے کہ وہ امت سے مل کر اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی کراتے رہیں اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سارے ادارے اسلام کی خاطر نہیں بلکہ اقتدار کے تحفظ کے لئے قائم ہوتے رہے، تو اسی طرح کی بدگمانی ہر اسلامی تحریک سے کی جا سکتی ہے، کہ وہ اسلام کی خاطر نہیں بلکہ ذاتی قیادت اور مفاد کی خاطر چلائی گئی۔

میری یہ تحریر خاندانی حکومت کی مدافعت کے لیے نہیں، بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ امت کا ایک پولیٹیکل کلچر تھا، اگر اس کو اطمینان رہا کہ کسی حکومت میں قرآن اور سنت کی بالادستی قائم ہے، اور اس کی ملی حمیت اور ایمانی غیرت کی نگہبانی ہو رہی ہے تو اس سے وہ مطمئن رہ کر اس کا ساتھ دیتی رہی، اسی لیے خاندانی حکومتیں قائم رہیں، اس کا پولیٹیکل کلچر یہ بھی تھا کہ اگر وہ کسی حکمراں سے بدظن ہو جاتی، تو وہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتی، بعض اوقات اس کے خاندان کے حکمرانوں کی قبریں بھی کھود دیتی اور دوسری حکومت قائم کرنے میں معاون ہو جاتی۔

اب بھی امت اپنے پولیٹیکل کلچر کی بنا پر یہ چاہتی ہے کہ خلافت راشدہ کی طرح حکومت کا قائم ہونا ممکن نہیں، تو اسلامی حکومت ضرور قائم کی جائے، جس میں قرآن اور سنت کی بالادستی ہو وہ غیر شعوری طور پر مغربی طرز کی جمہوریت سے بیزار ہو چکی ہے، اس لیے کہ اس میں میلا و ترم کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کبھی اس کے سربراہوں کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے، کبھی کہا کچھ جاتا ہے اور کیا کچھ اور جاتا ہے، کبھی جمہوریت اصل چیز قرار دی جاتی ہے جمہو

[illegible] کو پسند کرتے ۔ وہ لقب اختیار کرتے وقت کا ہر بادشاہ معتصم باللہ، معتز باللہ جیسے شمس الدین، محی الدین وغیرہ اختیار کرتے ۔ اور آج کوئی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ خاندانی حکومت کے زمانے میں کتاب و سنت کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، شیخ الاسلام صدر الصدور، قاضی، قاضی القضاۃ، مفتی اور محتسب وغیرہ جیسے اور عہدے تو اسی لیے تھے کہ وہ امت سے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی پابندی کراتے رہیں اگر کوئی یہ کہے کہ یہ سارے ادارے اسلام کی خاطر نہیں بلکہ اقتدار کے تحفظ کے لئے قائم ہوتے رہے ۔ تو اس طرح کی بدگمانی ہر اسلامی تحریک سے کی جا سکتی ہے ۔ کہ وہ اسلام کی خاطر نہیں بلکہ ذاتی قیادت اور مفاد کی خاطر چلائی گئی ۔

میری یہ تحریر خاندانی حکومت کی مدافعت کے لیے نہیں ۔ بلکہ یہ دکھانا مقصود ہے کہ امت کا ایک پولیٹیکل کلچر تھا ۔ اگر اس کو اطمینان رہا کہ کسی حکومت میں قرآن اور سنت کی بالادستی قائم ہے ۔ اور اس کی ملی حمیت اور ایمانی غیرت کی نگہبانی ہو رہی ہے تو اس سے وہ مطمئن رہ کر اس کا ساتھ دیتی رہی ، اسی لیے خاندانی حکومتیں قائم رہیں ، اس کا پولیٹیکل کلچر یہ بھی تھا کہ اگر وہ کسی حکمراں سے بدظن ہو جاتی ، تو وہ اس کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ، بعض اوقات اس کے خاندان کے حکمرانوں کی قبریں بھی کھود دیتی اور دوسری حکومت قائم کرنے میں معاون ہو جاتی ،

یہ امت اپنے پولیٹیکل کلچر کی بنا پر یہ چاہتی ہے کہ خلافت راشدہ کی طرح حکومت کا قائم ہونا ممکن نہیں ، تو اسلامی حکومت ضرور قائم کی جائے ، جس میں قرآن اور سنت کی بالادستی ہو مگر شعوری طور پر مغربی طرز کی جمہوریت سے بیزار ہو چکی ہے ، اس لیے کہ اس میں میکاولزم کے پیدا ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے ، کبھی اس کے سربراہوں کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے ، کبھی کہا کچھ جاتا ہے اور کیا کچھ اور جاتا ہے ، کبھی جمہوریت اصل چیز قرار دی جاتی ہے جمہور

[illegible] کے لیے بہت ہی [illegible] جمہوریت [illegible]

زیادہ ان کا ووٹ عزیز ہوتا ہے، ووٹ حاصل کر کے کوئی فاسق منصب پر آجائے تو وہ مقدس اور اعلیٰ سیرت و کردار کا مالک اس لیے قرار دیا جاتا ہے، کہ اس کو بہت زیادہ ووٹ ملے ہیں، جمہوریت میں نیشن اسٹیٹ قائم کی جاتی ہے، جس کے بعد مختلف نیشن میں جو خونریزی ہوتی ہے، اس کا نام نیشنلزم رکھا جاتا ہے۔ نیشنلزم کے نام پر ہر قسم کا استحصال کیا جاتا ہے، جمہوریت میں دین اور دنیا کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بند رکھا جاتا ہے، خدا کا حکم الگ ٹھہرایا جاتا ہے، اور قیصر کا حکم الگ۔

یہ ساری چیزیں اسلامی حکومت کے لیے منافی ہیں، اسلامی حکومت میں ہر وہ چیز رد کیے جانے کے قابل ہے جو قرآن اور سنت کے احکام کے خلاف ہے، اصل چیز ان احکام کی تکمیل ہے، اگر کوئی جماعت کسی زمانہ میں مرتد، ملحد، اباحتی، ناصبی، رافضی بن جائے یا علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں بٹ کر تشدد پسند ہو جائے تو اگر کوئی آمر حضرت عمرؓ کی طرح ہاتھ میں درے لے کر ان کو اللہ اور رسول کا پابند بنائے، تو اسلامی حکومت میں اس کی آمریت جائز اور قابل قبول ہے اور اگر کوئی سربراہ حکومت جمہور کے ووٹ سے صاحب اقتدار و اختیار ہو جائے، لیکن دین کا پابند اور اس کی عزت و ناموس کا نگہبان اور محافظ نہ بن سکے، تو وہ اسلامی حکومت کا سربراہ نہیں کہلا سکتا۔ اگر منتخب اراکین کی قومی مجلس کا ایوان نہایت عالیشان اور سر بفلک ہو لیکن ان مکینوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا ایمانی اور قلبی احساس نہ ہو، تو یہ عالیشان ایوان اسلامی حکومت کا ایوان نہ ہوگا، اگر سکریٹریٹ کی عمارتیں دیدہ زیب ہوں لیکن ان کے اندر بیٹھنے والوں میں محض مالی منفعت کی وجہ سے فرائض کی ادائیگی کا جذبہ موجود ہو تو اسلامی حکومت کا سکریٹریٹ نہیں کہلائے گا۔ اگر عدالت میں اسلامی قوانین کے تحت جھگڑوں

تو ہمیں کوئی فیصلہ دینا چاہیے تو یہ اسلامی حکومت کی حالت دیکھو گے گی، اگر ملک کا اقتصادی
نظام، تعلیمی، تہذیبی، عدالتی نظام قرآن اور سنت کے مطابق نہیں تو یہ اسلامی مملکت کا نظام
نہیں کہلا سکتا۔ اگر کسی اسلامی ملک کے پررونق شہر کی سڑکوں پر مسلمان اپنی وضع قطع اور لباس
میں مسلمان نظر آئیں، تو وہ اسلامی مملکت کے شہری نہیں کہلا سکتے، اگر کسی اسلامی ملک کے
معاشرہ میں وہی ساری چیزیں نظر آئیں جو فاسقانہ، فاجرانہ یا ملحدانہ نظام مملکت میں نظر آتی
ہوں تو وہ اسلامی معاشرہ نہیں کہلایا جا سکتا ہے۔

ہماری ملی غیرت اور ایمانی حرارت کے لیے یہ المناک چیز ہے کہ چودہ سو [1400] برس کے
بعد بھی ہم اسلامی مملکت کے تصور کی تلاش میں ہیں، یہ اس لیے کہ ہم ذہنی طور پر گرین، لاک
ہابس وغیرہ کے سیاسی افکار اور موجودہ دور کے جمہوری نظام کی جادوگری سے کچھ ایسے متأثر
ہو گئے ہیں کہ ہم لذت کردار اور افکار عمیق سے محروم ہو کر قرآن و سنت کے احکام پر عمل کرنے
کے بجائے ان کو بدل دینے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں، یہ محض اس لیے کہ خود مسلمان سے مسلمان
کا مقام پوشیدہ ہے، اسلام کا محاسبہ یورپ کے ذریعہ سے کر رہے ہیں، اگر مسلمان خودنگر، خودگر
اور خودگیر ہو جائیں، تو کتاب و سنت میں ان کو ہر زہر کا تریاق مل جائے، فرنگی نے مسلمانی
خریدلی ہے، اس لیے مسلمان مقام ظل سبحانی سے محروم ہو گئے ہیں، اگر مسلمانوں کا دل
اب بھی خبیر و بصیر ہو جائے۔ تو ان کو قرآن اور سنت میں وہ ساری چیزیں مل سکتی ہیں،
جن سے وہ سیاست افرنگ کو شکست دے سکتے ہیں، اور بعض مسائل ملفوظ کو حل کرنے
کے لیے قیاس، اجماع اور اجتہاد کو بروئے کار لائیں، تو ان کے سمجھنے میں مشکل دور ہو
کر پیام مل سکتا ہے۔

آخر میں آپ حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرانی ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی

[illegible] چند ہی لوگ مدعو [illegible] ایک ہی [illegible] سیمینار [illegible] تو وہ بھی تھے، اتفاق سے ان میں ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کے جسٹس [illegible] بھی تھے۔ ان سے ان کے خیالات کے اظہار کرنے کو کہا گیا، تو وہ اٹھ کر آئے، اور صرف یہ کہہ کر بیٹھ گئے

"جہاں تک میرا مطالعہ ہے، میں بہت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامی قوانین ہی صرف ایسے قوانین ہیں، جو بین الاقوامی قوانین بنائے جا سکتے ہیں۔"

ایک غیر مسلم تو یہ کہے، اور اسلامی ملک کے مسلمان اسلامی مملکت کے قوانین بنانے میں اپنے کو قاصر تصور کریں؟

آخر میں یہ بھی عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اسلامی ریاست کے تصور میں اب نعروں کی خطابت، سمپوزیم کی وکالت، سمینار کی موشگافی اور کانفرنس کی ہنگامہ آرائی نہیں چاہئے بلکہ پاکستان کی تحریک کے سلسلہ میں شہروں کی جو غارت گری، اور بستیوں کی جو بربادی ہوئی ہے، کا معاوضہ چاہیے۔ پاکستان کی تحریک میں بکثرت شہید ہوئے، ان کے خون کا خون بہا چاہیے، ان کی بیواؤں کے نالوں اور ان کے یتیموں کی سسکیوں کا مداوا چاہیے۔ کس طرح پاکستان ایک مثالی اسلامی اور فلاحی ریاست کی شکل میں ہو سکتا ہے۔ شکریہ۔

علی فواد باشگل

جناب ثروت صولت صاحب شمالی ناظم آباد کراچی

"یہ مضمون، مضمون نگار کی ایک زیر طبع کتاب "ترکی اور ترک" کا ایک باب ہے۔ ناظرین کی دلچسپی کے لیے شایع کیا جاتا ہے۔" "م"

علی فواد باشگل (Bashgil) جدید ترکی کے ایک ممتاز قانون داں، ماہر تعلیم اور سیاست داں تھے۔ ان کا شمار ان جرأت مند دانشوروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے ترکی میں ایک پارٹی کی آمرانہ حکومت کو ختم کرنے اور جمہوریت کی بحالی اور آزادیِ فکر کے اصول کو منوانے کے لیے کامیاب جدوجہد کی۔ انھوں نے سیکولرازم کی ایک ایسی تعریف کی جس سے دینی حلقے مطمئن ہوگئے، اور ترکی میں دینی تعلیم کے فروغ میں تو شاید ان کا سب سے بڑا ہاتھ ہو۔

علی فواد باشگل شمالی ترکی کے قصبہ چارشنبہ میں پیدا ہوئے، جو صوبہ سامسون میں واقع ہے۔ ان کا سال پیدائش عام طور پر ۱۸۹۳ء لکھا جاتا ہے، لیکن شکرو داؤد اغلو نے ۱۳۰۹ھ لکھا ہے، جو ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء سے مطابقت رکھتا ہے۔[1] ان کے والد کا نام محمد شکر و تھا اور دادا کا نام حافظ ابراہیم۔ ابتدائی تعلیم قصبہ چارشنبہ میں پائی، پھر استنبول چلے گئے،

---

[1] علی فواد باشگل: ۱۹۷۰ کا انقلاب اور اس کے اسباب (ترکی ترجمہ از شکرو داؤد اغلو)

[illegible] تعلیم حاصل کی، جنگ عظیم اول چھڑنے پر وہ ۱۹۱۴ء میں قسطنطنیہ کے [illegible] گئے جہاں انھوں نے چار سال تک محفوظ فوج کے افسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ ۱۹۱۸ء میں علی فواد باشگل اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس چلے گئے، ۱۹۲۱ء میں انھوں نے پیرس کے بوفون کالج (Buffone) میں تعلیم مکمل کی، اس کے بعد گرینوبل یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں داخلہ لیا، یہاں سے سند حاصل کرنے کے بعد وہ پھر پیرس آ گئے، اور سوربون یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اور باسفورس اور درہ دانیال کے مسئلہ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، اس کے بعد فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ترکی واپس آ گئے، یورپ میں قیام کے دوران انھوں نے پیرس میں سیاسی علوم کے مدرسہ سے بھی سند حاصل کی، اور ہیگ (ہالینڈ) میں واقع قانون بین الممالک کی اکادمی کے نصاب کی تکمیل بھی کی۔

ترکی آنے کے بعد پہلے وزارتِ تعلیم میں اعلیٰ تعلیم کے جنرل ڈائرکٹوریٹ (نظامت عامہ) میں معاون ہوئے، پھر ۱۹۳۰ء میں انقرہ کی قانون کی فیکلٹی میں معاون پروفیسر کا امتحان دے کر یونیورسٹی سے ملحق ہو گئے، یہاں رومی قانون ان کا موضوع تھا، ایک سال بعد وہ پروفیسر ہو گئے، ۱۹۳۳ء میں استنبول یونیورسٹی میں آئینی قانون کے پروفیسر ہو گئے اور اس منصب پر وہ ۱۹۶۳ء تک فائز رہے، اس سال ترکی کی فوجی حکومت نے ایک سو سینتالیس افراد کو یونیورسٹی سے برطرف کر دیا، ان میں علی فواد باشگل بھی تھے، اگرچہ بعد میں قانون معطلی کالعدم قرار دے دیا گیا، لیکن وہ پھر یونیورسٹی واپس نہیں آئے۔

یونیورسٹی کی ملازمت کے دوران انھوں نے تجارت اور اقتصادیات کے اعلیٰ مدرسہ میں (۱۹۳۶ء) اور مکتب ملکیہ (سول سروس کا مدرسہ) میں بھی فرائض انجام دیئے ۱۹۳۹ء

یہ استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ قانون کے صدر بھی ہو گئے تھے۔

اس دوران میں علی فواد باشگل نے متعدد قانونی اور آئینی سرگرمیوں میں بھی حصہ لیا۔ انھوں نے ترکی میں پہلی مرتبہ مزدوروں سے متعلق قوانین پر لکچر دیئے، ۱۹۳۶ء میں جب فرانس نے خطائے (Hatay) کا صوبہ شام سے الگ کر کے آزاد علاقہ قرار دیا، تو انھوں نے صوبہ کا آئین تیار کیا، اور خطائے کے ترکی کے ساتھ الحاق سے متعلق جمعیۃ اقوام کے کمیشن کے اجلاس میں شرکت کے لیے ترکی وفد کے مشیر قانون کی حیثیت سے جنیوا گئے، ۱۹۴۱ء میں حکومت جرمنی کی دعوت پر علوم نظم ونسق کی اکادمی کی کانگریس میں شرکت کے لیے برلن گئے، علی فواد باشگل نے قانون بین الممالک کے انسٹی ٹیوٹ کے رکن کی حیثیت سے نفش (یوگوسلاویا)، میڈرڈ، لزبن اور استنبول کی کانگریس میں شرکت کی۔[۱]

جمعیت اشاعت حریت افکار | علی فواد باشگل، آزادیٔ فکر، انسانی حقوق اور جمہوری اقدار کے بہت بڑے علمبردار تھے، انھوں نے یونیورسٹی کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے ان افکار کی اشاعت کے لیے سرگرمی سے کام کیا، اس کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ اگرچہ ترکی میں بادشاہت کو ختم کر کے ۱۹۲۳ء میں جمہوریت قائم کر دی گئی تھی، لیکن اس جمہوریت نے جلد ہی آمریت کی شکل اختیار کر لی تھی، جمہوری خلق پارٹی (ری پبلکن پیپلز پارٹی) ستائیس سال تک واحد پارٹی کی شکل میں حکمراں رہی، اور اس دوران میں اس پارٹی کی حکومت نے اپنی اصلاحات کے خلاف ہر قسم کی سرگرمیوں کو کچل دیا تھا، اور مخالف مطبوعات اور اخبارات پر پابندیاں لگا دی تھیں، علی فواد باشگل نے اس جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ تعلیمی لکچروں کے ذریعہ بھی، اور مضامین اور کتابوں کے ذریعہ بھی، انھوں نے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کے لیے اپنی مطبوعات میں قانون، حقوق اور آزادی کے مسئلوں پر

... نے ان میں بحث کی ... میں ...

چند یہ ہیں:

(۱) فرد کے حق اور آزادی کا کلاسیکی نظریہ اور سرکاری کنٹرول کا ... (۲) ترکی کا آئین اور سیاسی حکومت (۱۹۳۹ء) (۳) عالمی امن اور انسانی حقوق (۱۹۴۸ء) (۴) ترکی زبان کا مسئلہ (۱۹۴۵ء) (۵) شہری آزادی اور اس کی ضمانت (۱۹۴۸ء) (۶) ڈیموکریسی اور حریت (۱۹۴۹ء)

۱۹۴۷ء میں علی فواد باشگل نے "جمعیت اشاعت حریت افکار" قائم کی، جس نے سیاسی جبر و تشدد کے خلاف آواز بلند کی اور جد و جہد کی، علی فواد باشگل اپنے لکچروں کی وجہ سے طلبہ میں پہلے ہی ہردلعزیز ہو چکے تھے، اب اس جمعیت کی سرگرمیوں کی وجہ سے ان کا وسیع حلقوں میں تعارف ہوا، اور وہ ترکی کی ایک مقبول اور مشہور شخصیت بن گئے مصطفیٰ کمال کے انتقال کے بعد عصمت انونو کے دور صدارت میں وہ ہر ناجائز اور خلاف قانون طریقوں کے خلاف آواز بلند کرتے رہے، اس دور پر علی فواد باشگل کو تین سب سے بڑے اعتراضات تھے،

اول یہ کہ سیاسی اور اقتصادی میدان میں سخت کنٹرول قائم کر کے ملک کو ایک عظیم فوجی بارک میں تقسیم کر دیا گیا ہے، حکومت کے اختیارات بے انتہا ہو گئے ہیں، اقتصادی میدان میں سرکاری اجارہ داری کی وجہ سے نجی کاروبار بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے ان دونوں اسباب کی وجہ سے ملک پر ایک آہنی پردہ ڈال دیا گیا ہے، اور ہر طبقے کے لوگ بے چون وچرا حکومت کے آگے سر جھکانے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں،

دوم یہ کہ سیکولرازم کے اصول کی غلط تشریح کی جا رہی ہے، مغرب میں اس ...

[illegible] ایک [illegible] سمجھا جائے اور
[illegible] مذہب کو انفرادی اور نجی حد تک محدود رکھا جائے، لیکن اتاترک نے
[illegible] بالکل منفی تعریف کی، اور کمیونسٹوں کی طرح مذہب کی مخالفت شروع کردی،
سیکولرازم کو ایک ایسی مادہ پرستی کی شکل دے دی، جس کا مقصد لوگوں کے دلوں سے
دین اور اللہ کی محبت نکالنے کے لیے جدوجہد کرنا ہو،

سوم قوم پرستی کی تعبیر اس طرح کی جاتی ہے، جو ملی عقائد اور روایات کے خلاف ہے،
اس غلط قوم پرستی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ترکی زبان سے عربی اور فارسی کے وہ الفاظ بھی نکال
دیئے گئے ہیں، جو صدیوں سے ترکی زبان کا ایک حصہ بن گیے تھے، اور اس طرح ایک مصنوعی
زبان اختیار کی گئی ہے، ۱۹۴۳ء میں ترکی آئین کی زبان بھی بدل کر نئی مصنوعی زبان
اختیار کی گئی، جس کی وجہ سے یہ آئین ناقابل فہم بن گیا،

ڈیموکریٹ پارٹی کا دور

۱۹۲۳ء سے ترکی میں ایک ہی سیاسی جماعت کی حکومت رہی تھی،
اس دوران میں پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں ایک مخالف پارٹی قائم کرنے
کی اجازت دی گئی تھی، چنانچہ ۱۷ر نومبر ۱۹۲۴ء کو ترقی پرور جمہوریت پارٹی کے نام سے
ایک حزب اختلاف قائم کی گئی تھی لیکن اس کو سات ماہ بعد ہی ۵ر جون ۱۹۲۵ء کو حکومت
نے توڑ دیا، اس کے بعد ۱۲ر اگست ۱۹۳۰ء کو سربست (لبرل) جمہوریت پارٹی وجود میں
آئی، لیکن تین ۳ ماہ بعد ۱۷ر نومبر کو وہ بھی توڑ دی گئی، ۱۹۳۸ء میں مصطفی کمال کے
انتقال کے بعد کچھ تو ترکی میں جمہوریت کی بحالی کے لیے دباؤ بڑھا، اور کچھ دوسری جنگ کے
بعد بیرونی دباؤ بڑھا، دوسری عالمی جنگ ختم ہونے پر جب اقوام متحدہ وجود میں آئی،
اور ترکی نے اس کا رکن بن کر جمہوری اصولوں کو فروغ دینے کی پابندی قبول کی تو ۱۹۴۵ء

میں ترکی میں ایک سے زیادہ سیاسی جماعتوں کے قیام کی اجازت دی گئی۔ اس کے بعد [illegible]
کے کچھ سابق ارکان نے جن میں جلال بایر، عدنان مندریس اور فواد کوپرولو کے نام قابل ذکر ہیں
۷ جنوری ۱۹۴۶ء کو ڈیموکریٹ پارٹی کے نام سے ایک نئی سیاسی جماعت قائم کی۔ اس
جماعت نے جو عوام کی امنگوں کی ترجمان تھی، ۱۴ مئی ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں سرکاری
خلق پارٹی کو عبرت ناک شکست دیکر اس کی ستائیس سالہ اجارہ داری ختم کر دی، ڈیموکریٹ
پارٹی اس کے بعد ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب تک برسراقتدار رہی، علی فواد باشگل کے
خیال میں ترکی صحیح جمہوریت سے اسی دور میں روشناس ہوا، اور اس کا سہرا عدنان مندریس
کے سر ہے، جو علی فواد باشگل کے خیال میں مصطفےٰ کمال کے بعد ترکی کے سب سے ہردلعزیز
رہنما تھے،

ڈیموکریٹ پارٹی کے دور میں جو اصلاحات کی گئیں، ان میں سے تین کا علی فواد باشگل
نے خاص طور پر خیر مقدم کیا، اوّل اذان کا عربی زبان میں دینے کی اجازت ملنا، دوّم دینی
تعلیم کا نفاذ اور سرکاری مدرسوں میں چوتھی جماعت کے بعد ماں باپ کی مرضی سے دینی
تعلیم کی اجازت، اور سوّم آئین کو اس کی اصلی زبان میں بحال کرنا،

دینی تعلیم | جہاں تک دینی تعلیم کے نظام کی بحالی اور فروغ کا تعلق ہے، اس میں علی فواد
باشگل کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ڈیموکریٹ پارٹی کے دور میں سرکاری مدرسوں میں
دینی تعلیم کی اجازت کے علاوہ امام و خطیب کی ٹریننگ کیلئے مدرسے بھی قائم کیے گئے، تاکہ مسجد کے لیے
اماموں اور مبلغوں کی تربیت کی جاسکے، لیکن علی فواد باشگل کے خیال میں اس نوعیت کے
مدرسے دینی تعلیم کے تقاضے پورے نہیں کر سکتے تھے، یہ تقاضے اعلیٰ دینی تعلیم کے ذریعہ ہی
پورے کیے جا سکتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے حکومت کو ایک مکمل تعلیمی پروگرام

درج ہے کہ بیرکس کی مشہور کتاب "ترکی میں جدیدیت اور سیکولرازم" میں موجود ہے، ترکی میں اعلیٰ تعلیم کا جو اسلامی انسٹی ٹیوٹ جو ۱۹۵۹ء میں قائم کیا گیا بنیادی طور پر علی فواد باشگل ہی کی سوچ کا نتیجہ تھا، اس کی تفصیل خود ان کی زبان سے سنیے، وہ کہتے ہیں:

"۱۲ دسمبر ۱۹۵۹ء کو وزارت تعلیم کے خصوصی دفتر کے سکریٹری نے مجھے ٹیلیفون پر بتایا کہ وزیر تعلیم جن کا ڈیموکریٹ پارٹی سے تعلق تھا، مجھ سے ملنے کے لیے سہ پہر کو آرہے ہیں، وزیر تعلیم عاطف بندرلی اوغلو، انقرہ یونیورسٹی کے شعبۂ قانون کے سابق طالب علم رہ چکے ہیں، چنانچہ وہ وقت پر پہنچ گئے، اور مزاج پرسی کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا: میرے عزیز استاذ! میری آپ سے ایک درخواست ہے، اور وہ یہ کہ استنبول میں قائم ہونے والے یوکسک اسلام انسٹی ٹیوٹ (اعلیٰ اسلامی ادارہ) میں مدیر (ڈائرکٹر) کی جگہ خالی ہے، اور ہم اس کے لیے آپ کو سب سے موزوں شخص سمجھتے ہیں، ویسے بھی حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیمی ادارہ آپ کی سوچ کا نتیجہ ہے، اگر آپ اس فرض کی ذمہ داری قبول کریں، تو میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔"

میں نے وزیر تعلیم کا شکریہ ادا کیا، اور اس ادارے کے قیام سے مجھے جو مسرت ہوئی، اس کا بھی ذکر کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں خود کو اس بلند منصب کے لائق نہیں سمجھتا، میں ایک گنہگار بندہ ہوں اور دین پر عمل کرنے کے معاملے میں مجھ میں کوتاہی پائی جاتی ہے، دینی تعلیم کے ایسے بلند ادارے کی سربراہی کے لیے صرف علمی قابلیت کا ہونا کافی نہیں، بلکہ آدمی میں زہد و تقویٰ بھی ہونا چاہیے، اس لیے آپ مجھے معذور سمجھیں، وزیر تعلیم کا اصرار جاری رہا، اور میں

[illegible] آخر کار [illegible]

[illegible] کردی اور اس کی تشکیل اور نصاب کے [illegible]

چنانچہ میں اگلے دن وہاں گیا، اور تعلیمی ادارے کے اساتذہ [illegible]

اور موجودہ نصاب کا جائزہ لینے کے بعد چند دن محنت کی، اور ایک طویل رپورٹ تیار کی مرتب کرنے کے ساتھ ایک درسی پروگرام اس کے ساتھ منسلک کرکے وزیر تعلیم کو پیش کیا۔[1]

یہ پروگرام اور نصاب جو پروفیسر علی فواد باشگل نے پیش کیا تھا، نظریاتی اور عملی دونوں ضرورتوں کو سامنے رکھکر تیار کیا گیا تھا، اس کے مطابق نظریاتی ہدف یہ ہے کہ طالب علم اسلام کو اس کے بنیادی سرچشمے قرآن اور سنت کے ذریعہ سمجھ سکے، اور اس میں اتنی صلاحیت پیدا کی جائے کہ وہ اہل سنت کے طریقے پر قائم رہتے ہوئے ان دونوں قانونی ماخذوں کی مدد سے زمانہ کی ضروریات کے مطابق فیصلہ کرسکے، علاوہ ازیں ادارے میں ایسے لوگ اور عالم تیار کیے جائیں جو اسلامی اخلاق اور کردار کے مالک ہوں، کیونکہ ترکی اور تمام اسلامی دنیا کے موجودہ مصائب کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ ایسے مفکروں اور علماء سے محروم ہوگئی ہے، جو با صلاحیت اور صاحب کردار ہوں۔[2]

تعلیمی پروگرام کے عملی مقاصد یہ ہیں کہ امام خطیب مدرسوں اور دوسرے دینی تعلیمی اداروں کے لیے اساتذہ کی ضرورت پوری کی جائے، اور ترکی میں ایسے مفتی اور واعظ تیار کیے جائیں، جو علم و ثقافت کے زیور سے آراستہ ہوں، اس کے علاوہ خود انسٹی ٹیوٹ کے لیے اس کے اعلیٰ اغراض و مقاصد کو پورا کرنے والے لکچراروں اور پروفیسروں کی تربیت کی جائے، اور اگر ممکن ہوسکے تو یونیورسٹیوں اور اسی قسم کے دوسرے اداروں کے جملہ اساتذہ کے لیے اعلیٰ صلاحیت کے افراد تیار کیے جائیں، اعلیٰ تعلیم کے ان اسلامی انسٹی ٹیوٹوں

---

[1] یتی آسیا، استنبول، [2] ایضاً

[illegible] ہیں، ان کی تصنیفات [illegible] کی زندگی میں حرکت پیدا [illegible] روحانی قوت کو [illegible] انقرہ [illegible]، قونیہ [illegible] ۱۹۶۲ء، قیصری [illegible]، استنبول [illegible] میں ہے۔

اسی زمانے میں علی فواد باشگل نے اپنی معرکہ آرا کتاب "دین اور سیکولرازم" لکھی، جس میں مذہب کی ضرورت اور دینی تعلیم اور مذہبی آزادی کی اہمیت کو جدید ترین انداز میں ثابت کیا۔

خلق پارٹی کے حامیوں کو ترکی میں بڑھتی ہوئی دینی سرگرمیاں ناگوار گزریں، اور انہوں نے پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ ڈیموکریٹ پارٹی رجعت پسندوں کے آگے جھک گئی ہے، اور اتاترک کی اصلاحات کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ اس موقع پر علی فواد باشگل نے ڈیموکریٹ پارٹی کی غلطیوں پر اس کو خبردار بھی کیا، اور مخالفوں کی خفیہ سازشوں سے باخبر بھی کیا تھی ۱۹۶۰ء کے انقلاب سے پہلے جلال بایار نے ان کو انقرہ طلب کر کے سیاسی صورت حال پر ان سے تبادلۂ خیال کیا، علی فواد باشگل نے حکومت کو مستعفی ہونے کا مشورہ دیا لیکن جلال بایار نے یہ مشورہ تسلیم نہیں کیا۔[1]

فوجی انقلاب۔ ۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کو بالآخر مصطفےٰ کمال کی اصلاحات کی حامی فوج نے ڈیموکریٹ پارٹی کی منتخب حکومت کا تختہ پلٹ دیا، اور ملک میں مارشل لا لگا دیا، اس کے بعد ستمبر ۱۹۶۱ء میں عدنان مندریس اور ان کے دو[2] ساتھیوں کو پھانسی دے دی گئی، اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے علی فواد لکھتے ہیں:

لہ وہی، وقاص اوغلو؛

[illegible]

[illegible] جزیرے امرالی میں [illegible] گیا، روشن خیال مندریس [illegible]

فرزند مندریس کی زندگی کا یہاں خاتمہ کر دیا گیا، کون تصور کر سکتا تھا کہ اس نرم دل [illegible] اور مخلص انسان کی روشن سیاسی زندگی کا چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح یوں پھانسی کے تختے پر لے جاکر خاتمہ کیا جائے گا، لیکن تقدیر کا لکھا اسی کو کہتے ہیں"۔

۲۷ مئی ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان کی وجہ سے علی فواد باشگل پہلی مرتبہ عملی سیاسی زندگی میں داخل ہوئے، فروری ۱۹۶۱ء میں جب عدالت پارٹی قائم ہوئی تو وہ اس میں شامل ہوگئے، اس سے قبل ان کو ایک تحریر کی وجہ سے ان کو گرفتار کر کے بال موجو کے فوجی قید خانہ کے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا تھا، جہاں وہ تین ماہ نظر بند رہے، آخر کار، مارشل لا عدالت نے ان کو بری کر دیا، علی فواد باشگل عدالت پارٹی کی مدد سے ۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۱ء کو صامسون سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ترکی سینیٹ کے رکن منتخب ہوئے، ان کو عدالت پارٹی کی طرف سے صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا لیکن انہوں نے بعض نامعلوم اسباب کی وجہ سے اپنا نام واپس لے لیا، اور سینیٹ کی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا، کہا جاتا ہے کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں، چنانچہ ملک کے اتحاد اور یک جہتی کی خاطر وہ ان بلند مناصب سے دست بردار ہو گئے، ۱۹۶۲ء میں وہ ترکی چھوڑ کر جنیوا چلے گئے، جہاں ان کو جنیوا یونیورسٹی میں ترکوں کی تاریخ اور زبان کے شعبہ کا چیرمین مقرر کیا گیا،

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے زمانہ میں علی فواد باشگل نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں "۱۹۶۰ء کے انقلاب

[illegible] کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی، اس میں انہوں نے عسکری
کے [illegible] ناجائز [illegible] کیا ہے، اور لکھا ہے کہ فوج نے آئین کی خلاف ورزی کی
ہے، اور بیرون ملک حکومت کی ساکھ کو نقصان پہونچایا ہے، اس کتاب میں انہوں نے سماجی
انصاف اور سماجی تحفظ کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث بھی کی ہے، صدر انونو کی حکومت
نے جو ۱۹۶۱ء کے انتخاب میں فوج کی مدد سے کامیاب ہوگئی تھی، اس کتاب کی وجہ سے
علی فواد باشگل کو مجرم قرار دیا، اور ۱۹۶۲ء میں ان پر ترکی کی عدالت میں مقدمہ قائم
کر دیا، اور سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے ان کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کیا، اس واقعہ کی
تفصیل خود علی فواد باشگل سے سنیئے، وہ کہتے ہیں کہ:

"لوزان سے میری روانگی سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے گھر پر ایک ٹیلیفون آیا،
میں نے رسیور اٹھایا تو مخاطب نے بتایا کہ وہ پروفیسر علی فواد سے گفتگو کرنا چاہتا
ہے، وہ لوزان کا سکیورٹی افسر تھا، اس نے کہا کہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا
ہوں، اس لیے آپ کل دس بجے میرے دفتر آنے کی زحمت کریں، چنانچہ دوسرے
دن میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دفتر گیا، اور سکیورٹی افسر کے سامنے میز
پر بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ میں میری کتاب تھی، جس کو دکھاتے ہوئے اس نے
پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی اس کتاب کی وجہ سے آپ پر حکومتِ
ترکی نے ترکی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے، میں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے
معلوم ہے، افسر نے کہا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہم صرف ان کتابوں کی تفتیش کرتے
ہیں، جو عام آداب و اخلاق کے خلاف ہوں، باقی کسی کتاب پر اشاعت کی
پابندی نہیں، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات

"آخر کار ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء کے ایک ابر آلود اداس دن مندریس اور ان کے دو ساتھیوں فطین رشدی زورلو اور حسن پولاد کان کو سزائے موت دینے کے لیے بحیرہ مرمرہ کے ایک چھوٹے جزیرے امرالی میں لے جایا گیا، روشن خیال اور دولت مند زراعت پیشہ خاندان کے بے مثل فرزند مندریس کی زندگی کا یہاں خاتمہ کر دیا گیا، کون تصور کر سکتا تھا کہ اس نرم دل، شائستہ اور مخلص انسان کی روشن سیاسی زندگی کا چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح یوں پھانسی کے تختے پر لے جا کر خاتمہ کیا جائے گا، لیکن "تقدیر کا لکھا" اسی کو کہتے ہیں۔"

۲۷ مئی سنہ ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان کی وجہ سے علی فواد باشگل پہلی مرتبہ عملی سیاسی زندگی میں داخل ہوئے، فروری سنہ ۱۹۶۱ء میں جب عدالت پارٹی قائم ہوئی تو وہ اس میں شامل ہو گئے، اس سے قبل ان کو ایک تحریر کی وجہ سے ان کو گرفتار کر کے بال موجو کے فوجی قید خانہ کے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا تھا، جہاں وہ تین ماہ نظر بند رہے، آخر کار، مارشل لا عدالت نے ان کو بری کر دیا، علی فواد باشگل عدالت پارٹی کی مدد سے ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو صامسون سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ترکی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے، ان کو عدالت پارٹی کی طرف سے صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا لیکن انہوں نے بعض نامعلوم اسباب کی وجہ سے اپنا نام واپس لے لیا، اور سینٹ کی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا، کہا جاتا ہے کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں، چنانچہ وطن کے اتحاد اور یک جہتی کی خاطر وہ ان بلند مناصب سے دست بردار ہو گئے، سنہ ۱۹۶۲ء میں وہ ترکی چھوڑ کر جنیوا چلے گئے، جہاں ان کو جنیوا یونیورسٹی میں ترکوں کی تاریخ اور زبان کے شعبہ کا چیرمین مقرر کیا گیا،

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے زمانہ میں علی فواد باشگل نے دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء میں "سنہ ۱۹۶۰ء کے انقلاب

اور اس کے اسباب" کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی، اس میں انہوں نے ۲۷ مئی کے واقعہ کو حادثۂ فاجعہ و فلاکت کہا ہے، اور لکھا ہے کہ فوج نے آئین کی خلاف ورزی کی ہے، اور بیرون ملک حکومت کی ساکھ کو نقصان پہونچایا ہے، اس کتاب میں انہوں نے سماجی امداد اور سماجی تحفظ کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث بھی کی ہے، صدر انونو کی حکومت نے جو ۱۹۶۱ء کے انتخاب میں فوج کی مدد سے کامیاب ہوگئی تھی، اس کتاب کی وجہ سے علی فواد باشگل کو مجرم قرار دیا، اور ۱۹۶۲ء میں ان پر ترکی کی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا، اور سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے ان کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کیا، اس واقعہ کی تفصیل خود علی فواد باشگل سے سنیئے، وہ کہتے ہیں کہ:

"لوزان سے میری روانگی سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے گھر پر ایک ٹیلیفون آیا، میں نے رسیور اٹھایا تو مخاطب نے بتایا کہ وہ پروفیسر علی فواد سے گفتگو کرنا چاہتا ہے، وہ لوزان کا سکیورٹی افسر تھا، اس نے کہا کہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ کل دس بجے میرے دفتر آنے کی زحمت کریں، چنانچہ دوسرے دن میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دفتر گیا، اور سکیورٹی افسر کے سامنے میز پر بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ میں میری کتاب تھی، جس کو دکھاتے ہوئے اس نے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی اس کتاب کی وجہ سے آپ پر حکومت ترکی نے ترکی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے، میں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم ہے، افسر نے کہا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہم صرف اُن کتابوں کی تفتیش کرتے ہیں، جو عام آداب و اخلاق کے خلاف ہوں، باقی کسی کتاب پر اشاعت کی پابندی نہیں، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات

"آخر کار ستمبر سنہ ۱۹۶۱ء کے ایک ابر آلود اور اداس دن مندریس اور ان کے معتمدین فطین رشدی زورلو اور حسن پولادکان کو سزائے موت دینے کے لیے بحیرۂ مرمرہ کے ایک دور افتادہ جزیرے امرالی میں لے جایا گیا، روشن خیال اور دولت مند زراعت پیشہ خاندان کے بے مثل فرزند مندریس کی زندگی کا یہاں خاتمہ کر دیا گیا، کون تصور کر سکتا تھا کہ اس نرم دل، شائستہ اور مخلص انسان کی روشن سیاسی زندگی کا چوروں اور ڈاکوؤں کی طرح یوں پھانسی کے تختے پر لے جاکر خاتمہ کیا جائے گا، لیکن تقدیر کا لکھا اسی کو کہتے ہیں"

۲۷ رمئی سنہ ۱۹۶۰ء کے فوجی انقلاب کے بعد جو واقعات پیش آئے، ان کی وجہ سے علی فواد باشگل پہلی مرتبہ عملی سیاسی زندگی میں داخل ہوئے، فروری سنہ ۱۹۶۱ء میں جب عدالت پارٹی قائم ہوئی تو وہ اس میں شامل ہو گئے، اس سے قبل ان کو ایک تحریر کی وجہ سے ان کو گرفتار کرکے بالموجے کے فوجی قید خانہ کے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا تھا، جہاں وہ تین ماہ نظر بند رہے، آخر کار مارشل لا عدالت نے ان کو بری کر دیا، علی فواد باشگل عدالت پارٹی کی مدد سے ۱۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۱ء کو صامسون سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے ترکی سینٹ کے رکن منتخب ہوئے، ان کو عدالت پارٹی کی طرف سے صدارتی انتخاب کے لیے امیدوار نامزد کیا گیا، لیکن انہوں نے بعض نامعلوم اسباب کی وجہ سے اپنا نام واپس لے لیا، اور سینٹ کی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا، کہا جاتا ہے کہ ان کو جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئی تھیں، چنانچہ وطن کے اتحاد اور یکجہتی کی خاطر وہ ان بلند مناصب سے دست بردار ہو گئے، سنہ ۱۹۶۲ء میں وہ ترکی چھوڑ کر جنیوا چلے گئے، جہاں ان کو جنیوا یونیورسٹی میں ترکوں کی تاریخ اور زبان کے شعبہ کا چیرمین مقرر کیا گیا،

سوئٹزرلینڈ میں قیام کے زمانہ میں علی فواد باشگل نے دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء میں "سنہ ۱۹۶۰ء کے انقلاب

اور اس کے اسباب" کے نام سے فرانسیسی زبان میں ایک کتاب لکھی، اس میں انہوں نے ۲۷ مئی کے واقعہ کو حادثہ فاجعہ و ہلاکت کہا ہے، اور لکھا ہے کہ فوج نے آئین کی خلاف ورزی کی ہے، اور بیرون ملک حکومت کی ساکھ کو نقصان پہونچایا ہے، اس کتاب میں انہوں نے سماجی امداد اور سماجی تحفظ کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث بھی کی ہے، صدر انونو کی حکومت نے جو ۱۹۶۱ء کے انتخاب میں فوج کی مدد سے کامیاب ہوگئی تھی، اس کتاب کی وجہ سے علی فواد باشگل کو مجرم قرار دیا، اور ۱۹۶۴ء میں ان پر ترکی کی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا، اور سوئٹزرلینڈ کی حکومت سے ان کو ملک بدر کرنے کا مطالبہ کیا، اس واقعہ کی تفصیل خود علی فواد باشگل سے سنیئے، وہ کہتے ہیں کہ:

"لوزان سے میری روانگی سے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے گھر پر ایک ٹیلیفون آیا، میں نے رسیور اٹھایا تو مخاطب نے بتایا کہ وہ پروفیسر علی فواد سے گفتگو کرنا چاہتا ہے، وہ لوزان کا سکیورٹی افسر تھا، اس نے کہا کہ میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں، اس لیے آپ کل دس بجے میرے دفتر آنے کی زحمت کریں، چنانچہ دوسرے دن میں اپنے ایک ساتھی کے ساتھ دفتر گیا، اور سکیورٹی افسر کے سامنے میز پر بیٹھ گیا، اس کے ہاتھ میں میری کتاب تھی، جس کو دکھاتے ہوئے اس نے پوچھا کہ کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کی اس کتاب کی وجہ سے آپ پر حکومت ترکی نے ترکی کی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے، میں نے جواب دیا کہ ہاں مجھے معلوم ہے، افسر نے کہا کہ سوئٹزرلینڈ میں ہم صرف اُن کتابوں کی تفتیش کرتے ہیں، جو عام آداب و اخلاق کے خلاف ہوں، باقی کسی کتاب پر اشاعت کی پابندی نہیں، میں نے آپ کی کتاب پڑھی ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات

نہیں ملی، لہذا آپ ہمارے ملک میں آرام سے رہ سکتے ہیں، اگر کوئی آپ کو پریشان کرے، تو اس ٹیلیفون نمبر پر فوراً اطلاع دیجئے، فوراً کارروائی کی جائے گی۔"[1]

دراصل ترکی کی مخلوط حکومت نے سوئٹزرلینڈ میں ترکی سفیر کے ذریعہ علی فواد باشگل کو ملک بدر کرانے کی کوشش کی تھی، لیکن کتاب چونکہ کسی قسم کی قانونی خلاف ورزی نہیں تھی، اس لیے یہ مطالبہ رد کردیا گیا، اس کے بعد استنبول کی عدالت نے بھی ان کو بری کر دیا، عدالت میں ان کے وکلائے صفائی نے کہا تھا کہ "پروفیسر باشگل جیسے اہل علم افراد کی دوسرے ملکوں میں بھی عزت کی جاتی ہے، یہ افسوس کی بات ہے کہ ہم ان کو قاتلوں اور ڈاکوؤں کی طرح عدالت جرائم میں گھسیٹ کر لائیں،[2]

۱۹۶۵ء کے انتخابات میں عدالت پارٹی اکثریت سے کامیاب ہوگئی، اور ترکی میں عصمت انونو کی مخلوط حکومت کی جگہ عدالت پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی، ڈاکٹر علی فواد باشگل عدالت پارٹی کے ٹکٹ پر مجلس کبیر ملی کے رکن منتخب ہوئے،

بدیع الزماں سعید نورسی جدید ترکی کی ایک متنازعہ دینی شخصیت رہے ہیں، خاص طور پر کمیونسٹ، ملحد اور سیکولر عناصر جن میں عصمت انونو بھی شامل تھے، ان کے شدید مخالف تھے، لوگ اس ڈر سے کہ ان پر رجعت پسندی کا الزام نہ لگ جائے، سعید نورسی کے حق میں بولنے سے جھجکتے تھے، لیکن ڈاکٹر علی فواد باشگل پہلے شخص ہیں جو ترکی کی پارلیمنٹ میں سعید نورسی اور نور طلبہ کے مسئلے کو زیر بحث لائے، انہوں نے نہ صرف اس مسئلہ پر بحث کی بلکہ ضمیر کی آزادی کے حوالے سے اس کا دفاع بھی کیا، ۱۹۶۶ء میں ایک مقدمہ میں سعید نورسی مرحوم کی خدمات کا دفاع

---

[1] وہبی وقاص اوغلو، [2] ایضاً۔

کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

"آجکل سعید نورسی کی ایمانی اور اخلاقی تحریک کو سیاسی تحریک ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، جس کی وجہ سے یہ تحریک سیاست دانوں کی استعماری ذہنیت کا شکار ہوگئی ہے، میں سعید نورسی کو ذاتی طور پر نہیں جانتا تھا، ویسے بھی آدمی کو دیکھنا ضروری نہیں ہے، اس کے کام کو دیکھنا چاہیے، اور یہ بات محقق ہے کہ وہ ہمارے ملک کے معروف ترین اور عظیم ترین عالم دین تھے، ان کی تحریک نے ہمارے زمانے میں گناہ کے دریا میں غلطاں اور پیچاں انسانوں کو نجات دلانے کی خدمت انجام دی ہے، سعید نورسی کے رسائل نور بھی سیاسی نوعیت کے نہیں ہیں، میں نے ان میں اس قسم کی کوئی بات نہیں پائی، اس کے برعکس میں نے ان میں ایمان اور اخلاق کی پرزور تعلیم دیکھی، میں نے بارہا نور طلبہ کو دیکھا ہے اور ان سے باتیں کی ہیں، سب کو با اخلاق اور نیک پایا، آخر نور طلبہ سے اس دشمنی کی وجہ کیا ہے؟ میں کسی طرح یہ بات سمجھ نہیں سکا، نوری تحریک نہ کوئی صوفیانہ طریقت ہے، نہ وہ مذہب ہے، اور نہ سیاسی نوعیت کی چیز، وہ صرف اور خالص اسلام ہے۔"

مجلس کبیر ملی کا رکن ہونے کے تقریباً ڈیڑھ سال بعد علی فواد باشگل کا ۷ اپریل ۱۹۶۷ء کو استنبول میں انتقال ہوگیا، ان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے جنازہ میں لوگوں نے اتنی بڑی تعداد میں شرکت کی، جس کی ماضی قریب میں مثال نہیں ملتی۔[1]

تصانیف | ڈاکٹر علی فواد باشگل قانونی، سیاسی اور سماجی موضوع پر متعدد چھوٹی بڑی کتابو

---

[1] روزنامہ ینی آسیا، استنبول، ۷ اپریل ۱۹۶۷ء۔

کے مصنف تھے، وہ ترکی کے نہایت عمدہ اور صاف ستھری تحریر لکھنے والوں میں شمار کیے جاتے ہیں، علمی اور مدلل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب تحریر عام فہم، دلچسپ اور دلکش ہے، ترک دلی و ادبیاتی انسی کلو پیدیسی میں ان کی سولہ تصانیف کی فہرست دی گئی ہے[1]، جو حسب ذیل ہیں ہر کتاب کے سامنے اس کے پہلے ایڈیشن کا سال دیا ہوا ہے:

(۱) ترکی کا آئین اور سیاسی حکومت (۱۹۳۹ء) فرانسیسی زبان میں بلجیم میں چھپی (۲) فرد کے حق اور آزادی کا کلاسیکی نظریہ اور سرکاری کنٹرول کا جدید نظام (۱۹۳۸ء) (۳) ہمارے قانون اساسی (۱۹۴۰ء) تین جلد (۴) ترکی میں مزدوروں کا قانون (۱۹۴۰ء) (۵) شہریوں کا مجلس کبیرلی کو مراجعت کرنے کا قانون (۱۹۴۴ء) (۶) قانون کا بنیادی مسئلہ اور ادارے (۱۹۴۴ء) (۷) عالمی امن اور انسانی حقوق (۱۹۴۸ء) (۸) ترکی زبان کا مسئلہ (۱۹۴۸ء) (۹) شہری آزادی اور اس کی ضمانت (۱۹۴۸ء) (۱۰) ڈیموکریسی اور حریت (۱۹۴۹ء) (۱۱) نوجوانوں کے روبرو (۱۹۴۹ء) پچاس صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ نوجوانوں اور طلبہ کی تربیت کے لیے بہترین کتاب ہے، (۱۲) دین اور سیکولرازم (۱۹۵۵ء) یہ شاید پروفیسر باشگل کی سب سے اہم اور سب سے زیادہ مقبول کتاب ہے، اس میں انہوں نے مذہبی عقیدہ کی ضرورت اور مذہبی تعلیم اور آزادی کی اہمیت کو نہایت دلکش طریقے پر دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے، اور اعلیٰ دینی تعلیم کے ادارے قائم کرنے پر زور دیا ہے، یہ کتاب دو حصوں میں چھپی تھی، پہلا حصہ ۱۹۵۴ء میں چھپا اور دوسرا ۱۹۵۵ء میں، دوسرے حصہ کے آخر میں انہوں نے صفحہ ۱۲۰ سے ۱۳۱ تک دینی تعلیم کے نظام کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے، (۱۳) شہری حقوق اور حریت اور ہمارے آئین کے نقائص (۱۹۶۰ء) دو جلد (۱۴) علم کی روشنی میں موجودہ مسائل (۱۹۶۰ء) (۱۵) جمہوریت کی راہ میں (۱۹۶۱ء)

[1] ترک دلی و ادبیاتی انسی کلو پیدیسی جلد اول ص ۳۴۲، ۳۴۳ (۱۹۷۷ء، استنبول)

(۱۶) ۲۷ رمئی ۱۹۶۰ء کا انقلاب اور اس کے اسباب (۱۹۶۳ء) یہ کتاب فرانسیسی زبان میں دسمبر ۱۹۶۳ء میں جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں چھپی تھی، شکر داوغلو نے اس کا ترکی میں ترجمہ کیا، جو ۱۹۶۶ء میں یونیورسٹی استنبول نے شایع کیا،

مذکورۂ بالا فہرست کے بعض چھوٹے کتابچے ان کی بڑی کتابوں "جمہوریت کی راہیں" اور "علم کی روشنی میں موجودہ مسائل" میں شامل کر لیے گئے ہیں۔

علی فواد کی کتاب "۲۷ رمئی کا انقلاب اور اس کے اسباب" میں دو اور کتابوں کا تذکرہ ہے، ایک "بوغازلر مسئلہ سی" (دردانیال اور باسفورس کا مسئلہ) جو ۱۹۲۸ء میں پیرس سے شایع ہوئی، اور دوسری "قانون کے بنیادی مسائل" جو ۱۹۴۴ء میں استنبول سے شایع ہوئی، ان میں پہلی کتاب ان کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے،

افکار | علی فواد باشگل سیکولرازم کے علمبردار تھے، یعنی دین اور حکومت کو نہ صرف یہ کہ اپنے وظیفوں کے لحاظ سے الگ الگ سمجھتے تھے، بلکہ سعید نورسی کی طرح اس بات کے قائل تھے کہ مذہب کو حکومت کے کاموں میں، اور حکومت کو دینی امور میں مداخلت نہیں کرنا چاہیئے، یہ بات وہ آئینی مجبوریوں کی وجہ سے مصلحتاً کہتے تھے، یا واقعی ان کا یہی خیال تھا؟ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر قطعی رائے دینا مشکل ہے، ویسے ان کی تحریروں میں جگہ جگہ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام ایک جامع نظام ہے جو صرف اعتقادات اور عبادات تک محدود نہیں بلکہ دنیوی امور میں بھی رہنمائی کرتا ہے، بہرحال اگر وہ سیکولرازم کے واقعی علمبرداروں میں سے تھے، تو بھی انھوں نے اس کی جو تعبیر کی ہے وہ خلق پارٹی اور اس کے ہمنواؤں کی تعبیر سے بالکل مختلف ہے، اور یہ اسی تعبیر کا نتیجہ ہے کہ ترکی میں سرکاری سطح پر مذہب دشمن سرگرمیوں کا خاتمہ ہوا، اور ڈیموکریٹ پارٹی اور اس کے بعد عدالت پارٹی کے دور میں دینی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا، اور حکومت نے

ان کی حوصلہ شکنی کی بجائے حوصلہ افزائی کی۔

علی فواد باشگل ترکی زبان میں عبادت اور اذان کے خلاف تھے، اس بارے میں انہوں نے اپنے عقیدے کی وضاحت اس طرح کی ہے:

> اسلام میں عبادت کی زبان قرآن ہے، اور قرآن اپنے کلمات، الفاظ، روح اور معانی کے ساتھ قرآن ہے، قرآن کا ترجمہ قرآن نہیں ہے، اور قرآن کے ترجمہ کے ساتھ جو عبادت کی جائے گی، وہ اسلامی عبادت نہیں ہوگی، فی الحقیقت قرآن کا دوسری زبان میں ترجمہ کرنا ناممکن بھی ہے، اور بے معنی اور بلا جواز بھی ہے۔[1]

اس طرح علی فواد باشگل یورپ کی تحریک اصلاح دین کے انداز پر اسلام میں اصلاحات کرنے کے خلاف تھے، جس پر اس زمانے میں ترکی میں بہت زور دیا جاتا تھا، ان کا کہنا تھا کہ اصلاح اس چیز میں کی جاتی ہے جس میں تحریف ہوگئی ہو، اسلامی تعلیمات قرآن وسنت کی شکل میں اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہیں، اس لیے اصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[2]

وہ ترکی زبان سے ان عربی اور فارسی الفاظ کو نکالنے کے خلاف بھی تھے، جو ترکی زبان میں تاریخی عمل کے تحت رائج ہو چکے تھے، اور ٹھیٹ ترکی کو جسے جمہوری دور میں خصوصاً خلق پارٹی کے دور حکومت میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ایک مصنوعی زبان تصور کرتے تھے۔

علی فواد باشگل ترک قومیت کو اہمیت دیتے تھے، لیکن اس قومیت کو جس کے خمیر میں اسلام شامل ہے، اسی طرح وہ اتحاد اسلامی کے علمبردار بھی تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں ترکی میں اسلام کے نام پر مسلمان ملکوں کو متحد کرنا ایک رجعت پسندانہ فعل سمجھا جاتا تھا، علی فواد باشگل ۱۹۵۲ء میں پاکستان میں ہونے والی اسلامی کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، اور اس میں انہوں نے

---

[1] دین اور سیکولرازم (ترکی زبان) حصہ دوم ص۲۲ (استنبول، ۱۹۵۵ء) [2] دین وہ، رفارمجو (دین میں اصلاح کرنے والے)

تقریر بھی کی تھی، واپسی پر انہوں نے روزنامہ نیو یارک ٹائمز (عظیم مشرق) میں اپنے دورۂ پاکستان کے تاثرات پر بارہ مقالے لکھے تھے، ذیل میں ان میں سے دو مقالوں کے اقتباسات دیئے جا رہے ہیں، تاکہ اتحاد اسلامی سے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہو سکے، وہ لکھتے ہیں:

"دوسری عالمی جنگ کے بعد کے دور کی ایک نمایاں خصوصیت بین الاقوامی نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ممالک مختلف بلاکوں میں شامل ہو رہے ہیں، تمام اقوام اپنے حالیہ فائدوں کے لیے تاریخی اور سیاسی یگانگت کے لحاظ سے اور مستقبل کی تعمیر کے لیے ایک ایک بلاک بنا کر متحد ہو رہی ہیں، سلافی قوموں کے طفیلی بلاک کے مقابلہ میں اینگلو امریکی بلاک اسی وجہ سے بنا ہے،

جب یہ صورت ہے تو مسلمان اقوام کیوں متحد نہیں ہوتیں؟ اور چالیس کروڑ انسانوں اور صاحب ایمان لوگوں کا بلاک کیوں قائم نہیں کرتیں؟ اگر وہ ایسا کریں تو اس سے صرف مسلمانوں ہی کو فائدہ نہیں پہنچے گا، دنیا کے امن کو بھی فائدہ پہنچے گا"

اس وقت اسلامی دنیا کے سامنے صرف ایک ہی مسئلہ ہے، یعنی اپنے وجود کا تحفظ کرنا، نظریاتی جنگ اور جوع الارض ان کا مقصد نہیں، لہذا مسلمان قوموں کے اتحاد کا مقصد امن اور انسانیت کے تحفظ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

آج وہ قومیں جو بلاک بنا کر متحد ہو رہی ہیں، ان کا مقصد عارضی خطروں کا انسداد اور مختلف مفادات کا تحفظ ہے، جبکہ مسلمان اقوام کو چودہ سو سالہ تاریخ نے ایک دوسرے سے وابستہ کر رکھا ہے، اور اسلامی دنیا میں عملی طور پر ایک طرح کا اتحاد موجود ہے، اب ہمارے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہمارے درمیان جو تاریخی اور دینی رشتے ہیں، ان کو تقویت دی جائے، اور نسلی، لسانی اور قومی اختلافات سے بلند

ہو کر اور ان اختلافات کے منفی اثرات کو برطرف کر کے مشترک شعور پیدا کیا جائے۔"

(ڈیلی دعوٰی، ۱۵ جون ۱۹۵۲ء)

اپنی بات ختم کرنے سے پہلے میں ایک بات کی طرف اور توجہ دلانا چاہتا ہوں، اسلام دشمن عناصر اتحاد اسلامی کو ایک خطرناک چیز تصور کرتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اگر اس قسم کی کوشش کی گئی تو مسیحی دنیا ہمارے خلاف ہو جائے گی، اور ان کے درمیان ایک نئی صلیبی روح بیدار ہو جائے گی، یہ لوگ اس قسم کے وہم اور اندیشے پیدا کر کے ایک طرف مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف عوام کو اربابِ اقتدار کے خلاف بھڑکانا چاہتے ہیں، میں دوسرے مسلمان ملکوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتا، لیکن ترکی میں ایسے صحافی موجود ہیں، جو ہر وقت اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں، یقین کیجئے کہ یہ ایک چال ہے، اور شکست خوردہ[1] عناصر کے ذہنوں کی شرارت ہے، مسیحی یورپ متحد ہو جاتا ہے، اپنا دفاق بناتا ہے، اور امریکہ سے تعاون کرتا ہے، اور ہم مسلمان اس کا مسرت سے خیر مقدم کرتے ہیں، کیونکہ اس میں امن کی ضمانت نظر آتی ہے، ہم اس کی ان کوششوں کو شک کی نظر سے نہیں دیکھتے، اور ہمارے ذہنوں میں ماضی بعید کے اہل صلیب کے افسانے تازہ نہیں ہوتے، اور ہو بھی نہیں سکتے، کیونکہ دینی جنگوں کا زمانہ اب ماضی کی بات ہو چکی ہے، آج فی الحقیقت نہ تو مسیحی مغرب اسلامی دنیا کا دشمن ہے، اور نہ اسلامی دنیا مسیحی مغرب

---

[1] خلق پارٹی (ری پبلکن پیپلز پارٹی) کی طرف اشارہ ہے، جس نے ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں ڈیموکریٹ پارٹی سے عبرتناک شکست کھائی تھی، اور ڈیموکریٹ پارٹی کے چار سو آٹھ (۴۰۸) ارکان کے مقابلے میں اس کے صرف انہتر (۶۹) ممبر منتخب ہوئے تھے۔

کی دشمن ہے، دشمن کوئی دوسرا ہے، جو ہمارا اور مغرب کا دونوں کا دشمن ہے، اس دشمن کو ہر شخص جانتا ہے، اگر یہ دشمن کسی کو نظر نہیں آتا، اور اس کو کوئی نہیں جانتا تو وہ صرف وہ لوگ ہیں جو تخریبی کارروائیوں میں مصروف ہیں۔"[1] (جیوک دعوہ، ۲۰ جون ۱۹۵۲ء)

آخر میں ہم علی فواد باشگل کی تحریروں سے چند اور اقتباسات دے کر مضمون ختم کرتے ہیں:

"سیاست کی ہوس ایک ابتلا ہے، اور بدترین ابتلا، جو شخص سیاست کے بھیڑیے کا شکار ہو جاتا ہے، تو وہ پیچ و تاب کھاتا ہے، تڑپتا ہے، لیکن اس ابتلا اور مصیبت سے دست بردار نہیں ہو سکتا، ہمارے زمانے میں سیاست بازی کی مثال شہد کے چھتے کی طرح ہے، جس میں مکھیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے، لوگ ایک دوسرے کو دھکیل کر سیاست کے اسی چھتے کی طرف لے جاتے ہیں۔"

"ہر شخص کو یہ مقدس حق حاصل ہے کہ وہ جس دین، فلسفہ، سیاسی، اقتصادی نظریے یا عقیدت کو چاہے پسند کرے، اور اپنے اس عقیدے اور خیال کو بغیر کسی خوف و ہراس کے ظاہر کر سکے، اسی طرح عبادت اور دینی احکام و رسوم پر عمل کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، بشرطیکہ یہ باتیں امن عامہ اور اخلاق کے منافی نہ ہوں۔"

"اس مملکت کے نوجوانوں میں وطن سے حقیقی محبت کرنے کی بجائے تعیش اور آرام پسندی کا جذبہ سرایت کر گیا ہے، وہ صرف کھانے، پینے اور تفریح کو زندگی سمجھتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ کم سے کم محنت کے ذریعہ دولت اور عیش و آرام میسر آ جائے، اور بلند سے بلند مقام تک پہنچ جائیں۔"

---

[1] مذکورۂ بالا دونوں اقتباسات علی فواد باشگل کی کتاب "دین اور سیکولرازم" حصۂ دوم ص ۲۳۳، ص ۲۳۵ کے حاشیہ سے لیے گئے ہیں۔

"ہم ایک خوفناک اخلاقی بحران سے دوچار ہیں، لیکن اس اخلاقی بحران کی ایک اصل وجہ ہے، اور وہ ہے دینی بحران، اخلاق کا سرچشمہ اقتصادی نہیں ہے کیونکہ خوش حال اور روشن خیال طبقہ سب سے زیادہ اس بگاڑ کا شکار ہے، اور یہی تمام سماجی بحرانوں کا باعث ہے، جس ملک میں جھوٹ، دھوکہ، فریب جیسی بداخلاقیاں عام ہو جائیں، اس میں اقتصادی، علمی، فکری، مختصر یہ کہ تمدنی و تہذیبی ترقی ناممکن ہو جاتی ہے۔"

"ایک مومن کے لیے اور ایک محافظ کار[1] محبت وطن کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ مغرب کے علوم، فنون، تکنک، اخلاق کے بلند شعور اور روایتی دیانت کو جو مغربی تہذیب کی بنیادیں ہیں، پسند نہ کرے، آفتاب کی روشنی سے فرار تاریکی کے گڑھے میں گرنے کے مرادف ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک دیندار، ایک محافظ کار محب وطن کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مغرب کے بگاڑ یعنی الحاد، مادہ پرستی، منفعت پرستی اور دنیا کی عارضی زندگی سے محبت کو پسند کرنے لگے۔"

"دینی آزادی صرف عبادت گاہ میں جانے آنے کی آزادی کا نام نہیں ہے دین کی تعلیم، تدریس تبلیغ اور نشر و اشاعت کا حق اور دینی احکام پر عمل کرنے کا حق، دینی آزادی میں شامل ہے، یہ وہ معیار ہے جس کی بنیاد پر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کسی ملک میں دینی آزادی حاصل ہے یا نہیں۔"

"انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں محققوں نے جو تحقیق کی ہے، اس سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ دینی عقیدے اور احساسات بنی نوع انسان کے آغاز

---

[1] ترکی زبان میں (conservative) کے لیے لفظ محافظ کار استعمال کیا جاتا ہے۔

کے وقت سے موجود ہیں، اور ابتدائی تہذیبی کارنامے اور افکار ان ہی دینی عقیدوں کی وجہ سے پیدا ہوئے، حتیٰ کہ قانون، اخلاق، سیاست، تکنیک اور فن کی ترقی اور ان کا سرچشمہ بھی دینی احساسات ہیں۔ انسان زندگی کی منزلیں جیسے جیسے طے کرتا جاتا ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دینی عقیدے کے خلا کو نہ دولت پُر کر سکتی ہے، نہ اثر و اقتدار، اور نہ کوئی دوسری دنیوی چیز، لوگ بالآخر اس حقیقت کو سمجھ جائیں گے کہ وہی ترقی اچھی اور مفید ہے، جس میں مادی ترقی کے ساتھ دینی اور روحانی ترقی کا بھی خیال رکھا جائے"[1]

---

[1] مذکورہ اقتباسات دہبی وقاص اوغلو کی کتاب "بودلی ترک ایدیلر" سے لیے گیے ہیں، اور بالعموم علی فواد باشگل کی کتاب "دین اور سیکولرزم" پر مبنی ہیں۔

دولت عثمانیہ جلد اول

سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ، اور جمہوریہ ترکیہ کے کارناموں کی تفصیل، از عثمان اول ۱۲۰۶ء تا مصطفیٰ رابع ۱۸۰۸ء، قیمت:- ۲۴ــ۰۰

دولت عثمانیہ جلد دوم

سلطنت عثمانیہ کے عروج و ترقی کی تاریخ اور اس کے نظام تمدنی اور سیاسی کارناموں اور بقائے خلافت کیلئے یورپ کی قوموں کیخلاف ترکوں کی نبرد آزمائیوں، جانبازیوں اور سرفروشیوں کی تفصیل، از محمود ثانی ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء تا پہلی جنگ عظیم ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۹ء

مرتبہ:- محمد عزیر صاحب، سابق رفیق دار المصنفین

طبع دوم عکسی معارف پریس اعظم گڈھ، قیمت:- ۲۴ــ۰۰

"منیجر"

علمائے فرنگی محل

کے

شجرۂ نسب پر ایک نظر

از جناب مولانا مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی، چیرمین اتر پردیش اسعد اکاڈمی لکھنؤ

(۳)

شیخ الاسلام ہروی کی اولاد

اگرچہ اب جب کہ انصاریانِ ہرات مقیم ہند و پاک کے مختلف شجرہائے نسب سامنے آ چکے ہیں، جن سے شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہروی (م ۴۸۱ھ) کی اولاد پسری ہونے کے شواہد مل گئے ہیں، پھر بھی ضمناً ان روایات پر ایک نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، جو شیخ الاسلام کی صرف دختری نسل ہونے کے بارے میں بعض تذکروں میں مذکور ہیں،

رسالۂ قطبیہ کے مؤلف مولانا عبد الاعلیٰ فرنگی محلی (م ۱۲۰۷ھ / ۱۷۹۲ء) نے لکھا ہے، اور اسے "قصۂ عجیب" سے خود ہی تعبیر کیا ہے،

"شیخ الاسلام کے خاندان کے ایک صاحب نے جو ایرانی بادشاہ نادشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے ہوئے تھے (۱۱۵۱ھ / ۱۷۳۸ء) ملا نظام الدین سے آ کر ملاقات کی اور پوچھا کہ آپ اپنے کو "شیخ" کیوں لکھتے ہیں، سید کیوں نہیں لکھتے؟ (شیخ الاسلام بے شک سید نہیں، شیخ تھے، لیکن ان کی اولاد نرینہ نہیں تھی، صرف ایک بیٹی تھیں جن کا

عقد شیخ الاسلام کے بھانجے کے ساتھ ہوا، بیٹی کے فرزند کو شیخ الاسلام نے متبنیٰ بنالیا، جس کی اولاد شیخ الاسلام کی اولاد کہلانے لگی، اور "شیخ" کہی گئی، حالانکہ یہ متبنیٰ سید زادہ تھا، اور شرعاً نسب کا اعتبار باپ کی نسبت سے ہوتا ہے، ملا نظام الدین نے جواب میں کہا کہ خبر مشہور کو (کہ ملا نظام الدین کے اجداد شیخ انصاری ہیں) خبر واحد کی بنیاد پر (محض ایک صاحب کے کہنے سے) ترک نہیں کیا جانا چاہیے۔"[1]

نادر شاہ کے ہندوستان پر حملے کے وقت ملا نظام الدین عمر کے ساٹھ[60] سال پورے کر چکے تھے، اور ہندوستان گیر شہرت کے مالک بھی، اس لیے نادر شاہ کے لشکریوں میں آئے شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہرویؒ کے خاندان کے کسی فرد کا ملا صاحب سے ملاقات کے لیے دہلی سے لکھنؤ آنا محل تعجب نہیں، اور ملا صاحب کا جواب جس درجہ اصولی تھا، وہ بھی ان کے علمی مرتبے کے عین مطابق ہے، اور غیر ضروری تکرار سے احتراز، ملا صاحب کی افتاد طبع کا پوری طرح مظہر۔

تقریباً یہی روایت دوسرے الفاظ میں "قرۃ الابصار" کے مصنف مولانا محمد عبدالباقی فرنگی محلی (م ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء) نے بھی درج کی ہے، وہ شیخ الاسلام کے خاندان کے کسی فرد کے بجائے ہرات کے ایک ماہر انساب سے روایت شروع کرتے ہیں کہ:

"لوگوں کا کہنا ہے کہ ہرات کا ایک ماہر انساب، ملا نظام الدین کے پاس آیا، اور کہا کہ شیخ الاسلام عبداللہ انصاری ہرویؒ کے کوئی لڑکا نہ تھا، ایک بچے کو جو نسباً سید تھا، انہوں نے پرورش کیا تھا، چونکہ شیخ الاسلام ایک مشہور شخصیت تھے ان کا پرورش کردہ بچہ جو سید زادہ تھا، ان ہی کی نسبت سے "شیخ" کہلانے لگا"

---

[1] رسالۂ قطبیہ (فارسی مخطوطہ)

درحقیقت اس بیٹے کی اولاد سید ہے (یعنی آپ جو شیخ الاسلام ہروی کی اولاد ہیں، دراصل اس سیدزادے کی اولاد ہوئے، اس لیے سید ہوئے)

ملا صاحب نے فرمایا کہ اگر یہی سہی ہے تو اس کا فائدہ بروز قیامت ہمیں ملے گا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "بروز قیامت تمام انساب اور تمام رشتہ داریاں میرے نسب اور میری رشتہ داری کے سوا منقطع ہوجائیں گی۔"[1]

اس روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملا صاحب نے اس ماہر انساب کے بیان کو قابل قبول نہیں سمجھا، بحث و مباحثہ بھی لاطائل قرار دیا، اور ایک دوستانہ جواب دے کر سکوت اختیار فرمالیا۔

جیسا کہ اوپر گزرے شجرہائے نسب سے شیخ الاسلام کی پسری اولاد کا جن میں سے کئی صاحبزادوں کے تمام بھی شجرہائے نسب کے ذریعہ معلوم ہوچکے، علم ہوچکا ہے، لیکن یہ سوال کہ ان کے پسری اولاد تھی یا نہیں، اٹھا کیوں؟

"قرۃ الابصار" کے مصنف کو، جب وہ مدینہ منورہ ہجرت کرچکے تھے، مدینہ شریف میں اس سوال کے اٹھنے کی بنا عجیب طرح سے معلوم ہوئی، وہ لکھتے ہیں کہ:

"مدینہ منورہ میں ہرات سے ایک عالم آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ شیخ الاسلامؒ کی نسل سے ہیں، مگر یہی لوگ ان کا "میر صاحب" کہہ کر ذکر کرتے تھے، میں متحیر کہ "میر" تو سید کو کہتے ہیں، انصاری، سید کیسے ہوگیا؟ ہرات کے ایک باشندے سے میں نے اپنی یہ پریشانی بیان کی تو اس نے بتایا کہ یہ "میر صاحب" شیخ الاسلام کی دختری نسل سے ہیں جو سید نسل ہے، اور شیخ الاسلام کی پسری نسل بھی ہرات میں موجود

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

ہے، مگر وہ بے محل ہو چکی ہے، یعنی شیخ الاسلام کے مزار سے متعلق جو اوقاف ہیں ان
پر دختری نسل نے تغلب حاصل کر لیا، اور شیخ الاسلام کی پسری نسل کے وجود ہی
کی منکر ہو گئی، اب جب کہ مزار شیخ الاسلام کا دروبست اور اس سے متعلق اوقاف
کی آمدنیاں نواسے کی نسل کے قبضہ میں دی جا چکی ہیں، تو اب انکار اور تردید بھی
بے محل ہو چکی ہے۔"[1]

شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہرویؒ کو جو اپنے عہد کے بڑے محدث تھے، اسماء الرجال
اور تواریخ کی کتابوں میں ہر جگہ "ابو اسماعیل" عبد اللہ انصاری سے یاد کیا جاتا ہے، یہ خود واضح
قرینہ ہے، کہ ان کے ایک صاحبزادے اسماعیل نامی تھے، جن سے ان کی کنیت "ابو اسماعیل" ہوئی،
اوپر علاء الدین برناوی کا شجرۂ نسب مذکور ہو چکا ہے، جس میں علاء الدین برناوی کا
شیخ الاسلام کے بیٹے اسماعیل نامی کی نسل سے ہونا بیان ہوا ہے،

علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب میں (جو ورثۂ نسب پر مبنی ہے) شیخ الاسلام کے بیٹے
جابر کو اس خاندان فرنگی محل کا جدّ امجد بتایا گیا ہے، یہ جابر اسمٰعیل کے حقیقی بھائی تھے،

"قرۃ الابصار" کے مصنف نے جابر بن عبد اللہ انصاری ہروی کے بارے میں جو تاریخی
حوالے دیئے ہیں، (جن کی مراجعت یا تصحیح نقل کا موقعہ راقم کو ابھی تک نہیں ملا ہے) بعینہٖ یہاں
نقل کیے جاتے ہیں:

"سلک الدرر فی اعیان القرن العشر سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر بن عبد اللہ کی
نسل میں ایک عالم حلب میں تھے، (دسویں صدی ہجری میں) جن کا نام ہی "شیخ زادہ"
تھا، ان کا شجرۂ نسب یوں ہے: شیخ زادہ بن جمال الدین بن احمد بن نعمت اللہ

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

درحقیقت اس بیٹے کی اولاد سید ہے (یعنی آپ جو شیخ الاسلام ہروی کی اولاد ہیں، دراصل اس سیدزادے کی اولاد ہوئے، اس لیے سید ہوئے)

ملا صاحب نے فرمایا کہ اگر یہی سہی ہے تو اس کا فائدہ بروز قیامت ہی ملے گا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ "بروز قیامت تمام انساب اور تمام رشتہ داریاں میرے نسب اور میری رشتہ داری کے سوا منقطع ہو جائیں گی۔"[1]

اس روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملا صاحب نے اس ماہر انساب کے بیان کو قابل قبول نہیں سمجھا، بحث و مباحثہ بھی لاطائل قرار دیا، اور ایک محدثانہ جواب دے کر سکوت اختیار فرمایا۔

جیسا کہ اوپر گزرے شجرہائے نسب سے شیخ الاسلام کی پسری اولاد کا جن میں سے کئی صاحبزادوں کے نام بھی شجرہائے نسب کے ذریعہ معلوم ہو چکے، علم ہو چکا ہے، لیکن یہ سوال کہ ان کے پسری اولاد تھی یا نہیں، اٹھا کیوں؟

"قرۃ الابصار" کے مصنف کو، جب وہ مدینہ منورہ ہجرت کر چکے تھے، مدینہ شریف میں اس سوال کے اٹھنے کی بنا عجیب طرح سے معلوم ہوئی، وہ لکھتے ہیں کہ:

"مدینہ منورہ میں ہرات سے ایک عالم آئے، لوگوں نے بتایا کہ وہ شیخ الاسلام کی نسل سے ہیں، مگر یہی لوگ ان کا "میر صاحب" کہہ کر ذکر کرتے تھے، میں متحیر کہ "میر" تو سید کو کہتے ہیں، انصاری، سید کیسے ہو گیا؟ ہرات کے ایک باشندے سے میں نے اپنی یہ پریشانی بیان کی تو اس نے بتایا کہ یہ "میر صاحب" شیخ الاسلام کی دختری نسل سے ہیں جو سید نسل ہے، اور شیخ الاسلام کی پسری نسل بھی ہرات میں موجود

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

ہے، مگر وہ بے دخل ہو چکی ہے، یعنی شیخ الاسلام کے مزار سے متعلق جو اوقاف ہیں ان
پر دختری نسل نے تغلب حاصل کر لیا، اور شیخ الاسلام کی پسری نسل کے وجود ہی
کی منکر ہو گئی۔ اب جب کہ مزار شیخ الاسلام کا دروبست اور اس سے متعلق اوقاف
کی آمدنیاں نواسے کی نسل کے قبضہ میں دی جا چکی ہیں، تو اب انکار اور تردید بھی
بے محل ہو چکی ہے۔"[1]

شیخ الاسلام عبد اللہ انصاری ہرویؒ کو جو اپنے عہد کے بڑے محدث تھے، اسماء الرجال
اور تواریخ کی کتابوں میں ہر جگہ "ابو اسماعیل" عبد اللہ انصاری سے یاد کیا جاتا ہے، یہ خود واضح
قرینہ ہے، کہ ان کے ایک صاحبزادے اسماعیل نامی تھے، جن سے ان کی کنیت "ابو اسمٰعیل" ہوئی،
اوپر علاء الدین برناوی کا شجرۂ نسب مذکور ہو چکا ہے، جس میں علاء الدین برناوی کا
شیخ الاسلام کے بیٹے اسماعیل نامی کی نسل سے ہونا بیان ہوا ہے،

علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب میں (جو درۃ نسب پر مبنی ہے) شیخ الاسلام کے بیٹے
جابر کو اس خاندان فرنگی محل کا جدامجد بتایا گیا ہے، یہ جابر اسمٰعیل کے حقیقی بھائی تھے۔

"قرۃ الابصار" کے مصنف نے جابر بن عبد اللہ انصاری ہروی کے بارے میں جو تاریخی
حوالے دیئے ہیں، (جن کی مراجعت یا تصحیح نقل کا موقعہ راقم کو ابھی تک نہیں ملا ہے) بعینہٖ یہاں
نقل کیے جاتے ہیں:

"سلک الدرر فی اعیان القرن العشر سے معلوم ہوتا ہے کہ جابر بن عبد اللہ کی
نسل میں ایک عالم حلب میں تھے۔ (دسویں صدی ہجری میں) جن کا نام ہی "شیخ زادہ"
تھا، ان کا شجرۂ نسب یوں ہے: شیخ زادہ بن جمال الدین بن احمد بن نعمت اللہ

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

ابن جنید بن جمال الدین بن محمد بن احمد بن مسعود بن عبداللہ بن جابر بن منصور
ابن محمد بن جابر بن عبداللہ انصاری ہروی،

بعض لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری ولی کامل تھے،
اور کابل میں مدفون ہیں، اور ان کی قبر ان اطراف میں معروف ہے، اور رسالہ "تحقیقات"
میں خواجہ بہاء الدین نقش بند نے جابر بن عبداللہ انصاری کو "قطب" کے وصف سے
یاد کیا ہے، اسی پہلو سے شجرۂ نسب میں جابر کو "مقرب باری" کے وصف کے
ساتھ لکھا جاتا ہے۔"[1]

"قرۃ الابصار" کے مصنف نے ایک اور مخطوطے کا حوالہ دیا ہے، جو راقم الحروف کو ہنوز دستیاب نہیں ہوا ہے۔ یعنی "جواہر فریدیہ" جو حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کا ملفوظ ہے، اس کا حوالہ دیتے ہوئے مصنف "قرۃ الابصار" نے لکھا ہے،

"جواہر فریدیہ میں ہے کہ (حضرت بابا صاحبؒ نے) حضرت عبداللہ انصاری
ہروی کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس نسل سے ایک گروہ لکھنؤ میں رہتا
ہے، لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ہمارے قبیلے کے سوا (اجداد علمائے فرنگی محل لکھنؤ)
شیخ الاسلام ہرویؒ کی ذریت میں اور کوئی نہیں ہے۔"

بہر حال شیخ الاسلام کی پسری نسل کے سلسلہ میں اس ضمنی گفتگو کے بعد ہمیں اس شخصیت کا ذکر کرنا ہے، جو اس وجہ سے تاریخ کی روشنی میں پوری طرح دکھائی دینے والی شخصیت ہے کہ اس کے نام، شہنشاہ اکبر کا فرمان آج بھی موجود ہے، اس شخصیت کا نام محمد حافظ ہے، جو ورق نسب میں پانچویں نمبر پر ہیں،

---

[1] قرۃ الابصار (فارسی مخطوطہ)

علمائے فرنگی محل کے قریبی اجداد کا لکھنؤ سے پہلے وطن و مسکن قصبۂ سہالی تھا جو ضلع بارہ بنکی (یو.پی) میں اسی نام سے اب بھی موجود ہے، اب ضلع کی تحصیل فتحپور کے مواضعات میں اس کا شمار ہوتا ہے، لکھنؤ سے پختہ سڑک جو بارہ بنکی شہر جاتی ہے، اس پر واقع بارہ بنکی روڈویز بس اسٹیشن سے دیوہ فتحپور سڑک پر پندرہ کیلو میٹر جانے کے بعد کچے راستہ سے مزید پانچ کیلو میٹر آگے سہالی واقع ہے جو اب صرف ایک موضع کی حیثیت رکھتا ہے۔

"سہالی" نام بہت پرانا معلوم ہوتا ہے جو تغلق سلطنت کے زمانہ (تیرہویں صدی عیسوی) سے تحریروں میں ملتا ہے۔

حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی (م ۷۵۶ھ / ۱۳۵۶ء) کے ملفوظ خیر المجالس میں جسے پروفیسر خلیق احمد نظامی (صدر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ) نے ایڈٹ کیا ہے ایک مقام کے مشکوک نام کو اپنی تصحیح کے مطابق "سہالی" بتایا ہے، سہالی کے تعلق سے ملفوظ میں جو ذکر ہے، وہ سہالی کے ماضی قریب سے مطابقت بھی رکھتا ہے، ملفوظ میں ہے:

" ایک عالم (حضرت چراغ دہلیؒ کی) خدمت میں آیا، حضرت نے پوچھا کہاں سے آنا ہوا؟ اس نے کہا حضور کے غلاموں میں ہوں، سہالی نامی دیہات سے آیا ہوں،

حضرت چراغ دہلیؒ نے فرمایا: دیہات سہالی کے مرد باشندے دین دار ہیں اور اکثر یہیں سے تعلق (بیعت کا) رکھتے ہیں، وہاں کی عورتیں بھی یہیں سے (بیعت کا) تعلق رکھتی ہیں، یہ عورتیں اپنے یہاں کے مردوں سے بھی زیادہ دیندار ہیں"

بندہ (مرتب ملفوظ مولانا حمید قلندر) نے عرض کیا، ان لوگوں میں دینداری کی شان اور صلاحیت آپ ہی کے مرید ہونے کی بدولت ہے،

حضرت نے سہالوی عالم سے دریافت فرمایا: مشغلہ کیا ہے؟ عرض کیا بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ فرمایا: بہت نیک کام ہے، معصوم بچوں میں اور قرآن پاک کی تعلیم میں مشغول رہنا، مزید براں بچوں کو قرآن پڑھانے کا کام مسجد میں ہوتا ہے، ہر وقت باوضو رہنا ہوتا ہے، بہترین مشغلہ ہے یہ اور بڑی اچھی مشغولیت ہے تعلیم قرآن پاک۔"[1]

حضرت چراغ دہلیؒ اودھ کے رہنے والے تھے، اور اس خطے سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، سہالی بھی اسی خطے کا ایک حصہ ہے، اس سے ایک سراغ یہ بھی ملتا ہے کہ سہالی اس وقت بھی تعلیم و تعلم اور دین داری و پرہیزگاری میں تاریخی مقام حاصل کر چکا تھا، یعنی آٹھویں صدی ہجری (یا چودھویں صدی عیسوی) میں اس کا علمی اور دینی کردار اس درجہ متعارف ہو چکا تھا کہ حضرت چراغ دہلیؒ نے وہاں کے باشندوں کی اس نہج سے تعریف کی۔

رہا یہ سوال کہ علمائے فرنگی محل کے اجداد میں کون صاحب سب سے پہلے سہالی میں سکونت پذیر ہوئے، تو قدیم خاندانی تذکرے اس کے جواب میں متفق نہیں ہیں، سب سے قدیم خاندانی مورخ ملا عبدالاعلیٰ فرنگی محلی کا بیان ہے:

شیخ علاء الدین در سہالی وطن گرفتند[2]	شیخ علاء الدین نے (ورقۂ نسب میں دسویں نمبر پر) سہالی میں سکونت اختیار کی۔

یہی خیال ان کے ساٹھ[60] برس کے بعد تذکرہ لکھنے والے رضی الدین محمود فتحپوری کا بھی ہے:

شیخ علاء الدین ..... رفتہ رفتہ در	شیخ علاء الدین ..... رفتہ رفتہ سہالی

---

[1] خیر المجالس مرتبہ پروفیسر خلیق احمد نظامی مسلم یونیورسٹی علیگڑھ، شایع کردہ شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۹ء ص ۔۔، [2] رسالۂ قطبیہ (فارسی مخطوطہ)

قصبۂ سہالی رسیدہ آں مقام را	آئے، اور یہ جگہ ان کو پسند آگئی،
خوش کردند واقامت دراںجا گرفتند، چنانچہ اولاد ایشاں در سہالی	اور اقامت اختیار کرلی، چنانچہ ان کی اولاد سہالی میں
سکونت گرفتہ آباداں شدند، [1]	آباد ہوگئی،

رضی الدین محمود کے معاصر اور تذکرہ لکھنے میں ہمعصر مولانا ولی اللہ فرنگی محلی، شیخ علاء الدین کے بیٹے شیخ نظام الدین کو سہالی میں سب سے پہلے سکونت پذیر ہونے والا قرار دیتے ہیں [2]

مولانا ولی اللہ کی اتباع مولانا عنایت اللہ فرنگی محلی نے کی، جنہوں نے اغصان اربعہ کی تصنیف کے سو برس بعد تذکرۂ علمائے فرنگی محل تصنیف کیا تھا، [3]

رضی الدین محمود، شیخ علاء الدین کو سہالی میں سب سے پہلے سکونت اختیار کرنیوالا قرار دینے ہی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان کا بیان ہے کہ شیخ علاء الدین کے بیٹے نظام الدین

تولد ونشو و نما در قصبۂ سہالی یافتند، [4]	مولوی نظام بن شیخ علاء الدین سہالی میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی،

چونکہ شیخ علاء الدین کے مزار کا سراغ سہالی میں نہیں ملتا، اور ان کے بیٹے نظام الدین کا مزار سہالی کی قدیم آبادی سے قدرے فاصلے پر پایا جاتا ہے، اور ان کے مدفن کو ان کے علم و فضل اور دیانت و تقویٰ کے پیش نظر احتراماً "روضہ" کہا جانے لگا تھا، اب تو وہاں بستی ہی بنام روضہ ہوگیا ہے، اس لیے شاید شیخ علاء الدین کے سہالی میں سکونت پذیر ہونے

---

[1] غصان الانساب (فارسی مخطوطہ) [2] اغصان اربعہ مطبوعہ ص۳ [3] تذکرۂ علمائے فرنگی محل مطبوعہ ص۲۔ [4] اغصان الانساب مذکورۂ بالا،

کا دعویٰ کرنے میں بعض مؤرخین تامل سے کام لینے پر مجبور ہو گئے، مگر قرۃ الابصار کے مصنف مولانا عبدالباقی فرنگی محلی نے محض قبر کا سراغ نہ ملنے کو اتنی اہمیت نہیں دی وہ اس عام حقیقت کے پیش نظر کہ قبریں بن کر محو بھی ہو جایا کرتی ہیں، اس سوال پر کہ پھر علاء الدین کی قبر کہاں ہے؟ بتایا جائے، یہ کہنے پر مجبور ہوئے:

در عالم محو چنانکہ آثار تربت شیخ حافظ و پسران وے کہ قبر ش بچشم خود دیدیم، واکنوں آں جا زراعت می شود، ہیچ قبر پیدا نیست۔[1]

شیخ علاء الدین کی قبر اس طرح مٹ گئی جس طرح شیخ حافظ کی تربت کے اور ان کے بیٹوں کی قبروں کے آثار مٹ گئے، حالانکہ شیخ حافظ اور انکے بیٹوں کی قبریں خود ہم نے دیکھی تھیں، اب اس جگہ کھیتی ہو رہی ہے، کسی قبر کا بھی وہاں نشان باقی نہیں۔

تو اگر محض قبر کے ناپید ہو جانے سے اس کے مدفون کی اس سرزمین میں سکونت سے انکار کر دینا جائز ہے، تو شیخ حافظ کے بھی ساکن سہالی ہونے سے انکار کیوں نہ کر دیا جائے، جب کہ ان کی تربت بھی معدوم ہو چکی ہے، لیکن شیخ حافظ بلاشبہ باشندۂ سہالی تھے، اس لیے کہ ان کا سہالوی ہونا ثبوت واقعی رکھتا ہے،

یہ ثبوت واقعی ان کے نام شہنشاہ اکبر کے فرمان کی اصل دستاویز کی شکل میں آج بھی موجود ہے،

شہنشاہ اکبر کا یہ فرمان علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب پر روشنی ڈالنے کے علاوہ

---

[1] قرۃ الابصار (مخطوطہ فارسی) مذکورۂ بالا

ایک اور تاریخی اہمیت بلکہ ندرت کا بھی حامل ہے، اس فرمان کی موجودگی نے علمائے فرنگی محل کے شجرۂ نسب کو قیاسات تاریخیہ کے دائرے سے نکال کر تاریخ کی کھلی روشنی میں لاکر رکھدیا ہے۔

خاندان کے تذکرہ نگاروں میں سے ہر ایک نے رسالۂ قطبیہ، اغصان اربعہ، آثار الاول، اغصان الانساب، قرۃ الابصار اور تذکرۂ علمائے فرنگی محل کے مصنفین میں سے ہر ایک نے اکبری فرمان کا بس اس قدر حوالہ دیا ہے کہ وہ شیخ حافظ کے نام تھا، وہ اب بھی موجود ہے، لیکن اس کا متن کسی نے نقل نہیں کیا تھا،

قرۃ الابصار کے مصنف مولانا عبد الباقی فرنگی محلی پہلے مصنف معلوم ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی عربی تصنیف "برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل" میں فرمان کا متن پورا پورا نقل کیا ہے،

جس زمانے میں یہ فرمان جاری ہوا، اس وقت تک سلطنت مغلیہ میں فرامین کے نستعلیق خط میں لکھنے کا آغاز نہیں ہوا تھا، اگرچہ نستعلیق خط میں فرامین کی تحریر عہد اکبری ہی میں شروع ہوگئی تھی، نستعلیق سے پہلے فرامین کا خط "خط سجلات" ہوا کرتا تھا، وہ خط جس کا لکھنے والا سطر کے شروع میں کاغذ پر قلم رکھتا تو تاختم سطر اٹھاتا نہ تھا، اس طرح کی تحریر میں کسی ایک حرف کے بھی اضافے کا امکان نہیں رہتا تھا، فرامین میں جعل بنانے کا تصور بھی اس تحریر کے سلسلہ میں نہیں کیا جا سکتا ہے،

راقم الحروف کے پاس اس فرمان کا عکس ہے، مگر اس کے رسم خط سے یکسر نابلد ہونے کی وجہ سے اس کا ایک لفظ بھی پڑھنا ممکن نہ ہوا، سب سے پہلے اس عکس کو پروفیسر عرفان حبیب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے پڑھ کر اور نستعلیق خط میں اسے لکھ کر راقم الحروف کو دیا، اس کے بعد "برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل" (عربی مخطوطے) کا عکس دستیاب ہوا

جس میں پروفیسر عرفان حبیب کی صاف لکھی عبارت کے عین مطابق فرمان کا متن نقل ہو

ہے، اکبری مہر کے فرمان کا متن حسب ذیل ہے؛

هو الغنی

(مہر)

فرمان جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی

دریں وقت فرمان عالی شان واجب الاذعان شرف صدور یافت کہ

موازی دو ہزار شش صد بگھہ از مواضع و محال مفصلہ الضمن در پرگنہ فتح پور

من اعمال سرکار لکھنؤ کہ مقبوضہ فضیلت مآب شریعت آیتین تقوی شعارین

صلاح آثار ین شیخ حافظ مدن ولد فضل اللہ و قاضی فتح اللہ قاضی قصبہ سہالی

ولد قاضی شہر اللہ و جماعہ مذکورہ فی الضمن است بہاں دستور بمشار الیہما و جماعہ

متعلق باشد کہ وجہ آں را بشرط قبض و عمل قدیم سال بہ سال بہ مدد معاش خود

متصرف شدہ بمہمات خود قیام نمایند حکام کرام و متصدیان عظام و عمال

مباشران امور و اشغال منوال سرکار مذکور خصوصاً جائے گیرداراں و عاملان پرگنہ

مذکورہ می باید کہ حسب المسطور مقرر دانستہ تغیر و تبدل بقواعد آن راہ ندہند

وبعلت مال وجہات و اخراجات و عوارضات چوں قنلغہ و داروغگانہ و محرفہ

و مہرانہ و ضابطانہ و جریبانہ و صد دوئی و قانون گوئی و تکرار نداعت و پیشکش

و ساوری و کل تکالیف دیوانی و وجوہات سلطانی مزاحمت بحال فضیلت آیین

مشار الیہما و جماعہ ضمن و مزارعان ایشاں نہ رسانند و من کل اموالات و جمیع

المطالبات معاف و مسلم و مرفوع القلم شناختہ مطلقاً پیرامون نہ گردند و ہیچ وجہ

من الوجوہ طمع و توقع نہ کند در عہدہ دانستہ از فرمودہ مہ نہ گردند و ہر سال در ین

باب فرمان ویرواینچہ مجدد طلب نہ دارند تحریراً فی التاریخ غرۂ شہر ربیع الاول ۹۶۷ھ" ہیں
اس فرمانِ اکبری کی تواریخی اہمیت اس پہلو سے ہے، جیساکہ آل انڈیا ہسٹری کانگر
، اپنے اجلاس منعقدہ مسلم یونیورسٹی آخر دسمبر ۱۹۷۵ء میں متفقہ طور سے تسلیم کیا ہے، کہ اکبر
کے اولین فرمانوں سے ایک یہ ہے، جس تاریخ کا یکم ربیع الاول ۹۶۷ھ مطابق یکم دسمبر ۱۵۵۹ء
ں کا اجرا ہوا، اس سے پہلے کی تاریخ کا کوئی اکبری فرمان ابھی تک تاریخ مغلیہ کے ماہرون
رمحققوں کو دستیاب نہیں ہوا ہے، اس لیے اس فرمان کو اکبر کا اولین فرمان مانا جاسکتا ہو
جو اس نے تخت نشین ہونے کے صرف تین برس چار مہینے کے بعد جاری کیا، اس وقت
شہنشاہ اکبر کی عمر سترہ سال تھی، اور اپنے اتالیق سرپرست اور امور سلطنت کے تمام تر ذمہ دار
خان خانان بیرم خاں کے اقتدار سے آزاد ہوئے سال ڈیڑھ سال گذرا تھا،
فرمان میں دو جگہ املا، آج کے املا سے مختلف ہے "لکھنؤ" کو دو واؤ کے ساتھ "لکھنوو"
لکھا گیا، اور جاگیرداران کو "جائے گیرداران" لکھا گیا،
فرمان کی فارسی عبارت کا اردو میں خلاصہ یہ ہے:

"ان مواضع اور محالات میں جو سرکار لکھنؤ کے پرگنہ فتحپور میں واقع ہیں، اور جنکی صراحت فرمان کے پشت پر مرقوم ہے، دو ہزار چھ سو بیگھہ، فضیلت آب، شریعت آیات، تقویٰ شعار اور صلاح آثار شیخ حافظ مدرس ولد فضل اللہ اور قاضی فتح اللہ قاضی قصبۂ سہالی ولد قاضی شہر اللہ اور ان لوگوں کے جن کے ناموں کی صراحت فرمان کے پشت پر ہے، بدستور قبضے میں رہیں گے، اور اس آراضی کی آمدنی سے بدستور اپنی گزر کرتے اور اپنے فرائض بدستور ادا کرتے رہیں گے،

حکام متعلقہ کو لازم ہے کہ اس قدیم قبضے میں کسی قسم کا تغیر و تبدل روا نہ رکھیں،

اور کسی نگرانی یا مال سبب سے (فرمان میں مذکور) ٹیکسوں کی زحمت ان حضرات کو نہ دیں، نہ ان کے کاشتکاروں کو زحمت دیں، ہر قسم کے ٹیکس اور سرکاری مطالبے سے اس آراضی کو معاف سمجھیں، اور سال بہ سال فرمان کی تجدید کی سند نہ مانگیں۔"

اس فرمان میں ایک درجن سے زیادہ ٹیکسوں کے نام آئے ہیں، اور ان سب ٹیکسوں سے مدد معاش میں دی جانے والی دو ہزار چھ سو بیگھہ آراضی کو مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے، اس فرمان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ عہد مغلیہ میں آراضی پر کیا کیا ٹیکس ازروئے ضابطہ لگا کرتے تھے۔

مال وجہات :- آراضی کا لگان، اور اس کے متعلق ٹیکس،

اخراجات :- تحصیل وصول کے مصارف جو کاشتکاروں سے لیے جاتے تھے،

قلقہ :- ہدیہ یا تحفہ جو حکام کو پیش کیا جاتا تھا،

داروغگانہ :- داروغہ کی فیس،

محترفہ :- دستکاروں سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا تھا،

مہرآنہ :- قاضی کے مہر لگانے کی فیس جو کسی سند پر اس کے مستند ہونے کے لیے لگائی جاتی تھی،

ضابطانہ :- زمین کی پیمائش کرنے والی جماعت کی فیس،

جریبانہ :- ناپنے کی فیس،

صدردوئی، قانون گوئی :- قانون گوئی کے لیے لگان پر ڈھائی فی صدی کا ٹیکس،

تکرار زراعت :- آراضی قابل کاشت پر کھیتی نہ کرنے کا جرمانہ،

پیش کش :- نذرانہ،

سادرسی :- مویشیوں کا ٹیکس،

ایسے القاب و آداب کے ساتھ شیخ حافظ مدرس سعد فتح اللہ قاضی کا فرمان میں ذکر

بھی قابل لحاظ ہے، جب کہ اس عہد میں عموماً ایک لقب یا ایک احترامی لفظ سے فرمان پانے والے کا نام لکھا جاتا تھا، پھر اتنی بڑی آراضی (دو ہزار چھ سو بیگھہ) کا فرمان تو اس زمانے میں جاری ہی نہیں ہوا کرتا تھا اس سے زیادہ اہم یہ کہ مدد معاش کی آراضی کو ہر قسم کے آراضی ٹیکس سے اس طرح چھوٹ بھی نہیں دی جاتی تھی، اگر چھوٹ دی جاتی تو بعض ٹیکسوں سے؟

فرمان کی ضمن (پشت) کا عکس دستیاب نہیں ہے، کاغذ کو مضبوط و محفوظ بنانے کے خیال سے نہ معلوم کب اس کی پشت کو دبیز کاغذ سے منڈھ دیا گیا تھا، جس کا اب الگ کرنا اصل فرمان کے لیے ضرر کا سبب بن سکتا ہے، افسوس یہ ہے کہ ضمن میں مندرج ناموں کے نہ معلوم ہو سکنے سے خاندانی تاریخ کی ایک کڑی بیچ سے غائب ہو گئی۔

جہاں تک فرمان کے متن میں مذکور دوسرے نام قاضی فتح اللہ ولد قاضی شہر اللہ کا معاملہ ہے، ان کے حالات بھی کہیں سے دستیاب نہ ہو سکے، فرمان کے متن میں انہیں "قاضی سہالی" سے یاد کیا گیا ہے، سہالی میں قاضیوں کا ایک خاندان ابھی تک موجود ہے، اس خاندان میں قضاء (عدالت) کئی پشتوں سے چلی آتی ہے، اب اگرچہ امور عدالت سے کوئی تعلق افراد خاندان کا نہیں ہے، مگر "قاضی" ان کے ناموں کا جزء اب تک ہے، یہ خاندان بھی نسلاً انصاری ہے، علمائے فرنگی محل کے شجرے سے اس قاضی خاندان کا اتصال شیخ حافظ مدرس پر ہوتا ہے، برکۃ الباری فی سلالۃ ملا حافظ الانصاری (عربی مخطوطہ) سے پتہ چلتا ہے، پھر بھی قاضی فتح اللہ کا معاملہ صاف نہیں ہوتا۔[۱]

مذکورہ بالا تفصیل سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ شیخ حافظ جو فرمان جاری ہونے کے وقت مدرس کی حیثیت سے مشہور و معروف ہو چکے، یہ عہد اکبری کے ابتدائی دور میں ایک ممتاز شخصیت

---

[۱] سلالۃ ملا حافظ الانصاری مصنفہ مولانا عبدالباقی فرنگی محلی (عربی مخطوطہ)

کے مالک تھے،

شیخ حافظ مدرس کے ذکر میں ہر تذکرہ نگار اور ہر مورخ نے ان کے نام فرمان اکبری
کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے، جیسے ان کے علم و فضل کی شہرت بڑھتے بڑھتے شہنشاہ اکبر تک
پہنچی، اور اس نے ان کے علم و فضل کے اعتراف کے طور پر یہ اتنا وسیع رقبہ ان کی اور
اشخاص کی مدد معاش میں دے دیا،

علامہ شبلی نعمانی (م ۱۹۱۴ء) نے تو اپنے مقالہ "درس نظامی" میں صراحت سے لکھ دیا
"شیخ حافظ نے علم و عمل میں زیادہ شہرت حاصل کی، یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا تیموری
حکومت کی یہ خصوصیت اس کے کارناموں کا طغرائے زریں ہے کہ چپہ چپہ پر واقعہ
نویس موجود تھے، جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ ارباب کمال کے وجود سے
بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے، چنانچہ خبر پہنچنے کے ساتھ ان لوگوں کی جاگیریں
مقرر ہو جاتی تھیں..... شیخ حافظ کی بھی جاگیر مقرر ہوئی"[1]

حالانکہ اکبر کے فرمان کے الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے، کہ اکبر کو شیخ
کے علم و فضل کا علم ہوا، اور اس نے مدد معاش کا فرمان جاری کر دیا، بلکہ یہ مدد معاش
بالکل ابتدائی عہد میں بھی مدد معاش پانے والوں کے قبضے میں تھی، اکبر نے صرف اس کی توثیق
یہ جملے کہ "بدستور قبضے میں رہے گا" اور "قدیم دستور کے مطابق .... اپنی گزر
اور اپنے فرائض میں مشغول رہیں" بتا رہے ہیں کہ قدیم سے یہ مدد معاش ان حضرات کے
پاس تھی،

اکبر کے عہد سے کس قدر پہلے سے یہ مدد معاش ان حضرات کے پاس تھی؟ اس کا

---

[1] مقالہ علامہ شبلی بعنوان "درس نظامیہ" مطبوعہ ۱۹۱۰ء،

سراغ اب نہیں مل سکتا، پھر بھی یہ مانا جاسکتا ہے کہ ہمایوں سے بھی پہلے (۹۳۷ھ/۱۵۳۰ء سے ۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء تک) سے یہ جاری تھی، اس لئے کہ اگر بابر یا ہمایوں نے پہلے پہل اسے جاری کیا ہوتا تو مغل حکمرانوں کے عام رویے کے مطابق اکبر کے فرمان میں فخریہ طور پر اس کا حوالہ ضرور ہوتا،

پھر کیا سوری یا لودھی حکمرانوں میں سے کسی نے اول اول یہ مدد معاش جاری کی؟ کون بتائے اور کیسے: اتنا بہرحال سمجھ لیا جاسکتا ہے کہ شیخ حافظ جو اکبر کے ابتدائی چار برسوں ہی میں "مدرس" کی حیثیت سے معروف اور مستند ہو چکے تھے، درس و تدریس کے شغل میں عمر کا خاصا حصہ صرف کر چکے ہوں گے، یعنی اکبر کی تخت نشینی کے وقت (۹۶۳ھ/۱۵۵۵ء میں) نوجوانی یا جوانی کی سرحدوں کو پار کر چکے ہوں گے، اگر اندازاً اس وقت انہیں چالیس سال کی پختہ عمر کا بھی مان لیا جائے تو ان کی پیدائش کا زمانہ ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء تک جا کر قرار پاتا ہے، یعنی لودھی حکمرانوں میں سکندر لودھی (م ۹۲۳ھ/۱۵۱۷ء) کی حکمرانی کے آخری سال میں،

شیخ حافظ مدرس کی (علمائے فرنگی محل کے ورقۂ نسب میں پانچویں نمبر پر) نہ تاریخ وفات کہیں ملتی ہے نہ عمر کی صراحت، مگر اس سلسلہ میں ایک روایت پر بھی نظر ڈال لینا ضروری ہے، جو بادی النظر ہی میں غلط ٹھہر جاتی ہے، پھر بھی ایک مورخ خاندان نے اس کو اپنے تذکرے میں بغیر کسی جرح کے جگہ دے دی ہے،

مولانا ولی اللہ فرنگی محلی (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء) نے اغصان اربعہ میں، اور ان کی پیروی میں مولانا عبدالباقی فرنگی محلی (م ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء) نے "برکۃ العلم والعمل فی سکان فرنگی محل" (عربی مخطوطہ) میں لکھا ہے کہ:-

شیخ حافظ مخدوم شیخ سارنگؒ کے ہمعصر تھے، اور دونوں میں بڑا اخلاص تھا۔ اور شیخ حافظ مخدوم سے ملنے اور مخدوم شیخ سارنگؒ ان سے ملنے آیا کرتے تھے

قدیم حویلی (واقع سہالی) میں ایک پتھر موجود ہے، لوگوں کی زبانوں پر ہے کہ مخدوم شیخ سارنگؒ اور شیخ حافظؒ اسی پتھر پر پاس پاس بیٹھا کرتے تھے"[1]

مخدوم شیخ سارنگ اور شیخ حافظ کو ایسا معاصر تسلیم کر لینا کہ دونوں ہم سن یا قریب عمر کے ہوں سراسر خلاف قیاس ہے، مخدوم سارنگؒ نے ایک سو بیس (۱۲۰) برس کی عمر میں ۱۶ر شوال ۸۴۷ھ مطابق جنوری ۱۴۴۴ء میں انتقال کیا،[2]

شیخ سارنگ اپنے عنفوان شباب میں فیروز تغلق کے ممتاز درباری تھے، اور وہ "ملک سارنگ" کہلاتے تھے،[3] فیروز تغلق کا عہد ۷۵۱ھ/۱۳۵۰ء سے ۷۹۰ھ/۱۳۸۸ء تک محیط ہے،

جب مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ اور ان کے بھائی مخدوم راجو قتالؒ کی توجہ سے ملک سارنگ سے مخدوم شیخ سارنگ ہوئے تو انہوں نے حج وزیارت کا سفر کیا، اس کے بعد لکھنؤ آئے، اور حاجی الحرمین حاجی قوام الدین لکھنوی سے عرفانی تربیت لے کر ضلع بارہ بنکی کے مجھگاواں بستی میں جو سہالی سے قریب ہی ہے بود و باش اختیار کرلی،[4]

اس وقت مخدوم شیخ سارنگؒ عمر کی آٹھ نو دہائیاں گذار ہی چکے ہوں گے، اب اگر شیخ حافظ سہالوی سے اسی زمانے میں ان کا میل جول اور آنا جانا ہوا، تو شیخ حافظ

---

[1] اغصان اربعہ مطبوعہ ص۳، [2] فوائد سعدیہ (مخدوم شیخ سعد خیرآبادی متوفی ۹۲۲ھ/۱۵۱۶ء کی تصنیف مجمع السلوک (مخطوطہ) کا انتخاب از قاضی ارتضیٰ علی خاں گوپاموی متوفی ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) مجمع السلوک شیخ سعد خیرآبادی کا مرتب کردہ اپنے شیخ و مرشد مخدوم شاہ مینا لکھنوی وفات ۸۸۴ھ/۱۴۷۹ء کے ارشادات پر مشتمل ملفوظ ہے، [3] حوالۂ بالا، [4] ایضاً،

کی عمر اس وقت کیا ہونا چاہیئے؟ قیاس چاہتا ہے کہ اگر وہ مخدوم کے ہم سن نہیں تو عمر کی چار پانچ دہائیاں تو گذار ہی چکے ہوں گے، ورنہ باہم مخلصانہ روابط کے کوئی معنی نہیں رہتے،

اب خیال کیا جائے کہ مخدوم شیخ سارنگؒ کی ۸۴۸ھ (۱۴۴۴ء) میں ایک سو بیس (۱۲۰) برس کی عمر میں وفات کے وقت شیخ حافظ کی عمر ایک سو بیس برس کی آدمی تو ہونا ہی چاہیئے یعنی ساٹھ برس، اس پر ایک صدی گذرتی ہے تو سنہ ۹۴۸ھ میں شیخ حافظ ایک سو ساٹھ برس کے ہو جاتے ہیں، اور اس پر مزید دس سال گذرتے ہیں تو سنہ ۹۵۸ھ میں شہنشاہ اکبر ان کے نام فرمان صادر کرتا ہے، اس وقت وہ ایک سو ستر (۱۷۰) برس کے ہو چکے ہوتے ہیں، اگر فرمان صادر ہوتے ہی ان کو دنیا سے کوچ کرنے والا نہیں مانا جاتا، اور دس پانچ برس مہلت دی جاتی ہے تو شیخ حافظ کی عمر پونے دو سو برس سے تجاوز کر جاتی ہے ــــ ایسی طویل العمری خارج از امکان نہ سہی، مگر اس کا وقوع پذیر ہونا تحریری سند اور حوالہ چاہتا ہے، ایسی نادر الوقوع عمر تاریخ کی نگاہ سے مخفی نہیں رہ سکتی تھی،

شیخ حافظ سہالوی نہ صرف عمر کے بارے میں مجہول الحال ہیں، بلکہ تاریخ وفات کے بارے میں بھی ان کا یہی حال ہے، مدفن قصبۂ سہالی میں تھا، جیسا کہ مصنف "قرۃ الابصار" نے بتایا ہے، اسی مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے مدفن کو اس نے خود دیکھا تھا مگر اس کے زمانے ہی میں وہ معدوم ہو گیا، اور اب اس زمین پر کاشت ہو رہی ہے، جیسا کہ اوپر اسی حوالے سے گذر چکا ہے،

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کا مذاکرۂ علمی

عربی مدارس کا نصاب و نظام تعلیم

از ضیاء الدین اصلاحی
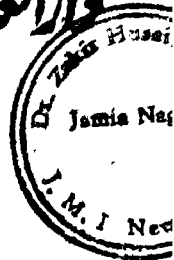
عربی مدارس کے نصاب و طریقہ تعلیم کی اصلاح کے لیے ندوۃ العلماء کی عظیم الشان تحریک اور خود دار العلوم ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا تھا، اس دور میں بھی عربی مدارس کی افادیت کو باقی رکھنے کے لیے ان کے نصاب کا وقت اور عہد سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے، اس کے پیش نظر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اساتذہ کی دعوت پر وہاں ۲۸، ۲۹ فروری اور یکم مارچ ۱۹۸۶ء کو عربی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کے موضوع پر ایک علمی مذاکرہ ہوا، جس میں تقریباً ملک بھر کے مدارس کے نمائندوں نے شرکت کی،

پہلے روز ۹ بجے دن میں کتب خانہ ندوۃ العلماء کی جدید عمارت کا افتتاحی جلسہ اس کے وسیع ہال میں مولانا منت اللہ رحمانی ناظم امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کی صدارت میں ہوا، جس میں ندوۃ کے علاوہ شہر کے معززین بھی بڑی تعداد میں شریک تھے، قاری ودود الحق صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد مولانا سید ابو الحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی دلنشین تقریر سے جلسہ کا آغاز ہوا، ندوہ کی ابتدائی تاریخ کا ذکر آیا، تو وہ شدت تاثر سے آبدیدہ ہوگئے، کچھ دیر کے بعد پھر تقریر شروع کی تو ان کی آواز گلو گیر تھی، کتب خانہ کی جدید عمارت علامہ شبلیؒ کے نام سے منسوب کی گئی ہے، مولانا نے بتایا کہ یہ تجویز ندوہ کے چودھویں اجلاس میں نواب علی حسن خاں صاحب نے پیش کی تھی جس کی

تائید کرتے ہوئے مولانا سید سلیمان ندویؒ نے فرمایا "اس (مولانا شبلیؒ) نے اپنی تصنیفات سے دلوں کو مسخر کیا ہم یادگار کہاں بنائیں؟ دل میں، اس کا دل کہاں رہتا تھا؟ کتابوں میں، کتابوں کا گھر کہاں ہے؟ کتب خانہ ہم کتب خانہ کی عمارت بناتے ہیں کہ وہ اس کی روح کا مسکن ہو، مسجدیں خدا کا گھر ہیں، کیا خدا کی روح وہاں رہتی ہے؟ نہیں، اس کی محبت وہاں رہتی ہے، ہمارا کتب خانہ بھی اس کی محبت کا گھر ہوگا۔ اللہ نے ادارے کے موجودہ خادموں کو بزرگوں کی تمنائیں پوری کرنے کی توفیق دی ہم بے وفا اور احسان فراموش نہیں ہیں،

مولوی نذر الحفیظ ندوی نے علامہ شبلی اور کتب خانہ" کے موضوع پر، اور مولانا مرتضیٰ صاحب ناظم کتب خانہ نے "کتب خانہ ندوۃ العلماء۔ منزل بہ منزل" کے عنوان سے مقالے پیش کیے، متحدہ عرب امارات کی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے نمائندہ ڈاکٹر محمد المہدی البدوی کی عربی تقریر کا خلاصہ اسی وقت مولوی سلمان ندوی نے پیش کیا، صدر جلسہ اور جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین نے بھی خطاب کیا، اور صدر کی دعا پر یہ جلسہ ختم ہوا، ناظم ندوۃ العلماء نے نئی کتاب تاریخ ندوہ کے دونوں حصے مولانا منت اللہ رحمانی کو پیش کیے،

اسی روز مغرب بعد مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کی نئی عمارت کا جلسہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن ناظم دار المصنفین کی صدارت میں ہوا، مجلس کے رفقا مولانا شمس تبریز خاں اور مولوی عتیق احمد قاسمی نے مقالات پڑھے، جناب صدر نے فرمایا "ندوہ کے بزرگوں نے علم کے پھولوں کا رس چوس چوس کر علم کے شہد کا چھتا لگا دیا ہے، امید ہے کہ علوم کا یہ چشمہ پہلے کی طرح آیندہ بھی بہتا رہیگا، اور ندوے کی آیندہ نسل کھوئے ہوئے وقار کو بحال کریگی، انھوں نے موجودہ دور میں تحقیقی معیار کی پستی اور اصحاب علم کی تن آسانی پر افسوس ظاہر کیا، انکی تقریر ادبی رعنائی و لطافت سے معمور تھی،

دوسرے روز ندوۃ العلماء کے عباسیہ ہال میں مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی امیر تاج المساجد بھوپال کی صدارت میں مذاکرہ شروع ہوا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی افتتاحی تقریر میں نصاب تعلیم کو صحیح،

ندگی میں پیش قدمی کا حوصلہ ملا، انہوں نے نصاب میں اصلاح و تبدیلی کی ضرورت محسوس کرنے کے ساتھ
ہی یہ بھی کہا کہ یہ کام بعد مدتوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں مولانا ابو العرفان ندوی، مولانا
محمد رابع ندوی، مولوی نور عظیم ندوی اور مولوی نذر الحفیظ ندوی نے اس اجلاس میں مقالات پڑھے، ملک
کے تین اور اجلاس میں مولانا منت اللہ رحمانی، ڈاکٹر عبد الحفیظ سلفی، ڈاکٹر شفیق احمد ندوی (جامعہ ملیہ اسلامیہ
دہلی)، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مولوی سلمان حسنی ندوی، ڈاکٹر غیاث الدین ندوی، مولوی
سجاد حسین ندوی، مولوی ابو سحبان ندوی، مولوی ابو العاص بستوی نے مقالات پڑھے، راقم الحروف نے
دوسرے اجلاس میں "عربی مدارس اور ان کا نصاب تعلیم" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا، مولانا ابو البقا ندوی
دار المصنفین کے کاموں میں اس قدر منہمک رہے کہ اپنا مضمون "علامہ شبلی اور اصلاح نصاب" نہیں پڑھ سکے،
ڈاکٹر مولانا عبد اللہ عباس ندوی اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی وغیرہ نے اپنے خیالات وقتاً فوقتاً زبانی پیش کیے،

آخری اجلاس میں جو تجویزیں منظور کی گئیں، ان میں مدارس عربیہ کو ہندوستان میں اسلام کے تحفظ کی ضمانت
اور ان کے مقاصد اور کردار کے تحفظ کو مسلمانوں کا ملی فریضہ بتا کر اس پر زور دیا گیا کہ وہ ایسے علما پیدا کریں
جو داعیانہ جذبہ، مضبوط کردار اور تفقہ فی الدین کے حامل اور اپنے عہد کے افکار سے واقف ہوں، اس کیلئے
ایسا جامع نصاب مرتب کیے جانے کی سفارش کی گئی جس میں مدارس کے بنیادی اغراض اور موجودہ عہد کے
تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علوم مقصودہ کو خاص اہمیت دی جائے، ایک مستقل کمیٹی کی تشکیل کے
جانے کے لیے مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی اور ڈاکٹر عبد الحفیظ سلفی بنیادی رکن مقرر کیے گئے،

خدا کرے یہ اجتماع مدارس کی تاریخ میں ایسے انقلاب کا پیش خیمہ ہو جو قوم و ملت کیلئے مفید اور موجب خیر و برکت ہو،
تینوں روز ندوۃ العلماء میں بڑی چہل پہل رہی، مولانا محمد رابع ندوی، مولوی نور عظیم ندوی، مولوی نذر الحفیظ ندوی
اور مولوی سید سلمان حسینی ندوی مجلس کی کامیابی کیلئے ہر وقت سرگرم عمل نظر آئے، مولانا معین اللہ ندوی نائب ناظم، مولانا
ابو العرفان ندوی، مولانا محمد واضح ندوی بھی ہر موقع پر پیش پیش رہے، اور مولانا علی میاں کی دعا و برکت سے ہر کام خوش اسلوبی
سے انجام پایا، طلبہ کی انجمنوں، النادی العربی اور جمعیۃ الاصلاح نے بھی مہمانوں کا استقبال کیا، ان کی روداد عربی اور

وفیات

جناب سعید انصاری مرحوم

از ضیاء الدین اصلاحی

قارئین معارف کو گذشتہ شمارہ سے جناب سعید انصاری کے انتقال کی خبر معلوم ہو چکی ہے انکا وطن اعظم گڈھ ہی تھا، اپنے محلہ اور شہر کے قدیم مدرسہ اسلامیہ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے مشن اسکول میں داخلہ لیا، یہ بڑا پر آشوب دور تھا ملک کے گوشہ گوشہ میں خلافت اور ترک موالات کی تحریک کے اثر سے انگریزوں کے خلاف ہیجان برپا تھا،

تحریک کے پروگرام میں سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا مقاطعہ بھی تھا، سعید انصاری صاحب نے اس سے متاثر ہو کر اسکول چھوڑ دیا اور بنارس جاکر کاشی ودیا پیٹھ سے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کیا، انٹرمیجیٹ میں بارہ روپیہ ماہوار وظیفہ ملا مگر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی کشش انہیں علی گڑھ کھینچ لائی، ۱۹۲۴ء میں وہ طلبہ کی انجمن اتحاد کے سکریٹری اور ان کے ہم سبق ڈاکٹر یوسف حسین خاں مرحوم نائب صدر ہوئے، ۱۹۲۵ء میں بی۔ اے کیا اور ۱۹۲۶ء میں جامعہ میں استاد کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا، اس زمانہ میں اس کی مالی حالت نہایت خراب تھی کئی کئی مہینے تک استادوں کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں جامعہ کے امناء ٹرسٹیز، اسے بند کر دینے کے لیے آمادہ ہو گئے تھے مگر انجمن تعلیم ملی کے ارکان نے بیس برس تک جامعہ کی خدمت کرتے رہنے اور ڈیڑھ سو سے زیادہ مشاہرہ نہ لینے کا عہد کیا تھا، ابتدا میں گیارہ استاد اسکے حیاتی رکن تھے جن میں سعید انصاری مرحوم بھی تھے۔

وہ اپنی علمی و تعلیمی استعداد بڑھانے کیلئے پہلے شانتی نکیتن گئے پھر ۱۹۳۰ء میں امریکہ گئے اور

کولمبیا یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، ان کی واپسی کے بعد جامعہ میں ٹریننگ کالج (استادوں کا مدرسہ) قائم ہوا جس کے یہ پرنسپل مقرر کئے گئے، انھوں نے اپنی سوجھ بوجھ اور کفایت شعاری سے اس مدرسہ کو خودکفیل بنا دیا تھا۔

۱۹۳۷ء کانگریس کے سالانہ اجلاس میں گاندھی جی اور ذاکر صاحب کی "قومی بنیادی تعلیم" کی اسکیم منظور ہوئی تو اسے جامعہ کے استادوں کے مدرسہ میں رائج کیا گیا، سعید انصاری صاحب نے اسکیم کو چلانے اور کامیاب بنانے میں سرگرم حصہ لیا، ذاکر صاحب نے ثانوی مدرسہ کے لئے انفرادی طریقہ تعلیم رائج کرنے کی تجویز سوچی تو ان کی تعلیمی مہارت اور دلچسپی کی وجہ سے یہ کام بھی انہی کے ذمہ کیا جس کو انھوں نے محنت، کامیابی اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔

تصنیف و تالیف سے بھی انھیں دلچسپی تھی، جامعہ میں اردو اکاڈمی کا قیام عمل میں آیا تو وہ رفیق کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہوئے، طالب علمی کے زمانہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم کے چھوٹے بھائی محمود حسین خاں صاحب کے اشتراک سے ایک قلمی رسالہ "الرشید" کے نام سے نکالا، بعد میں انھوں نے اس کا نام بدل کر مولانا محمد علی کے تخلص کی نسبت سے جوہر کر دیا، اپریل ۱۹۲۶ء میں پیام تعلیم کا اجرا ہوا، چند ماہ بعد اس کی ادارت سعید انصاری صاحب کو تفویض کی گئی، کچھ دنوں تک مولانا محمد علی کے روزنامہ ہمدرد کے ادارۂ تحریر میں بھی شریک رہے، ابتدا میں معارف کیلئے بھی انھوں نے بعض انگریزی مضامین کے ترجمے کئے، رسالہ جامعہ کے تو وہ خاص مضمون نگار تھے، الناظر (لکھنؤ) میں بھی انکے مضامین شائع ہوئے بلکہ اسی کے ایک مضمون سے انکی علمی شہرت کا آغاز ہوا، اس کے اڈیٹر مولانا ظفر الملک علوی نے اردو کے عناصر اربعہ پر ایک کل ہند انعامی مقابلہ کا اعلان کیا جسمیں مختلف اہل قلم نے حصہ لیا، یہ اسوقت بی۔ اے کے طالب علم تھے مگر انکا مضمون "مولانا شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز" انعام کا مستحق قرار دیا گیا جو رسالہ میں چھپنے کے علاوہ اسی زمانہ میں کتابی صورت میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے دیباچہ کے ساتھ بھی شائع ہوا۔

انکا اصلی موضوع تعلیم اور اسکی تاریخ تھا اس پر اور بچوں کے موضوعات پر انھوں نے کئی کتابیں لکھیں جنکے نام

یں، (۱) بچوں کی نظمیں (۲) بچوں کے مسائل (۳) بھولا بچہ (۴) ایک بچہ کی کہانی (۵) تعلیم و سماج (۶)
ندوستانی تعلیم کو مسئلہ (۷) زندگی کا مدرسہ (۸) کارو تعلیم (۹) گاندھی جی کے تعلیمی خیالات۔

طالب علمی کے زمانہ میں انھوں نے ٹیگور کے ایک رسالہ کا "ہندوستانی تعلیم کا مرکز" کے نام سے اردو ترجمہ
پھر جان اسٹوورٹ مل کی کتاب لبرٹی کا "آزادی" کے نام سے ترجمہ شائع کیا، حال میں ترقی اردو بورڈ نے ان سے
کتابوں کے ترجمے کرائے ایک "تعلیم ہندوستان کے اسلامی عہد میں" اور دوسری "عصری تعلیم"۔

دار المصنفین سے ان کا تعلق بہت پرانا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی کے
انے سے ابتک کے ہر ہر فرد سے حسب حیثیت ان کے تعلقات تھے، وہ جب بھی وطن آتے تو دار المصنفین
رور آتے، اس معمول میں زندگی بھر کوئی فرق نہیں آنے دیا، حضرت سید صاحب کے دور ہی میں وہ اسکی مجلس
نظامیہ کے ممبر ہو گئے تھے اور پابندی سے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، ندوۃ العلماء سے بھی انھوں نے
یشہ اخلاص و ہمدردی کا تعلق قائم رکھا اور اس کی مجلس انتظامیہ کے بھی ممبر تھے۔

وہ ہمیشہ قوم پرور اور ملک کی آزادی کی تحریک سے وابستہ رہے، ان کی ابتدا خلافت اور نان کوآپریشن
ریک سے ہوئی تھی، اسی زمانہ سے کھدر پہننے لگے تھے، جسے آخر تک نہ چھوڑا۔

دین و مذہب سے غیر معمولی شغف تھا، انھیں موجودہ جامعہ سے یہ شکایت تھی کہ وہ اپنی اصل خصوصیات اور دینی
دار سے منحرف ہو گئی ہے، آخر عمر میں انھوں نے جامعہ کی خوبصورت مسجد تعمیر کرائی اور اپنے مکان میں ایک نرسری
ول کھولا، ان صدقات جاریہ کا ثواب انھیں ہمیشہ ملتا رہے گا۔

بڑے سادگی پسند اور کفایت شعار تھے، ان میں نمود و نمائش اور ظاہر داری نہ تھی، انکی نظر لوگوں کی خامیوں پر زیادہ پڑتی تھی
کا وہ صفائی اور بے تکلفی سے اظہار بھی کر دیتے تھے، جو لوگ انکی افتاد طبع سے واقف نہ تھے وہ انکی نفرت بازی کا برا مان جاتے مگر انھیں
پٹ نہ تھا، وہ ہمیشہ تندرست رہے اور بیمار بہت کم ہوئے، اسی برس سے متجاوز ہونے کے باوجود ضعف اور بڑھاپے کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا
مگر دفعتہً معلوم ہوا کہ انکی آنتوں میں کینسر ہو گیا ہے، بیماری کے زمانہ میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور جناب سید صباح الدین
عبد الرحمن صاحب سے ملنے کے بہت آرزو مند تھے، مولانا سے تو ملاقات ہو گئی مگر سید صباح الدین صاحب سے ملاقات کی تمنا پوری نہیں ہو سکی
ئے قابل رشک موت پائی، دو ماہ تک مرض کی شدتوں کا صبر سے مقابلہ کرنے کے بعد خندہ روئی سے موت کا خیر مقدم کیا۔

تجلیات قرآن کے چند عجائبات مرتبہ جناب امۃ الکریم بیگم اسحٰق صاحبہ، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۸، قیمت تحریر نہیں، پتہ مصنفہ معرفت عائشہ باوانی وقف، بنک ہاؤس نمبرا۔ حبیب اسکوائر، بندر روڈ، پوسٹ بکس ۴۲۷۴ کراچی ۲۔

مصنفہ کے بیان کے مطابق یہ کتاب قرآن حکیم کے بعض اہم اور عجیب اشاروں کو واضح کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، ان کے نزدیک ان اشاروں کو تشبیہ و تمثیل کہا گیا ہے جن کا ذکر آیات متشابہات میں ہے، اور آیات متشابہات میں طرح طرح کی خبریں اور پیشین گوئیاں تشبیہوں اور مثالوں کے ذریعہ بیان کی گئی ہیں، اور انکی تاویل کو اللہ کے علاوہ راسخون فی العلم بھی جانتے ہیں، ان کے خیال میں آج کل کے موجد و محقق سائنسداں آیات متشابہات کی عملاً مجسم تاویل بن گیے ہیں، جو ان میں اشارہ کیے گیے ایجادات و تحقیقات کو بحکم خداوندی کرکے دکھاتے جارہے ہیں، اس کے ثبوت میں وہ سورۂ عنکبوت کی دو آیتیں پیش کرتی ہیں، لیکن ان کے استدلال کا نرالا انداز ہے، وہ عربی متن کے بجائے صرف اردو ترجمہ پر اکتفا کرتی ہیں، اور ترجمہ بھی انہی فقروں کا کرتی ہیں جن سے ان کا مطلب نکلتا ہو، اور جو حصے ان کے خلاف ہوتے ہیں، انہیں نظر انداز کر دیتی ہیں، نیز مطلب برار کے لیے مقدم آیات کا ترجمہ موخر، اور موخر کا مقدم کر دیتی ہیں، یہاں تک کہ قرآن مجید کی معروف قرات کو بدل دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتیں، چنانچہ وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا کو انہوں نے اذا تلھی کہہ کے اس کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ ہم کو چاند کی اس حالت کی قسم جب کہ اس میں داخل

ہوکر آپس میں دلچسپ کھیل کھیلیں گے، اور ایک دوسرے کے بعد لگاتار آتے چلے جائیں گے، پانی نکالیں گے، اور ہر قسم کے تلاش و تجسس میں رہیں گے، اور انتظار گاہیں بنائیں گے، اس سلسلہ میں تلمیحی کی جو صرفی بحث کی ہے وہ صرف و اشتقاق میں ان کی مہارت کا دلچسپ اور عجیب نمونہ ہے، وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ کے متعلق لکھا ہے کہ یہ تسقیہ سے مشتق ہے، جس کے معنی پانی بھرنے کا پیشہ ہے، ان کے نزدیک اس میں ایک اشارہ یہ ہے کہ سمندر کا مدوجزر چاند کی کشش سے ہے، دوسرا اس بات کا کہ آیندہ چاند میں جاکر وہاں رہنے والوں کو پانی مل جائے گا، اور لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا میں چاند اور سیاروں کے سفر کا اشارہ ہے، ان کے خیال میں حواریین علیسٰی سے سفید جلد والے یورپین یعنی سفید قومیں مراد ہیں، جن کے لیے سورۂ مائدہ میں آسمانی نعمتوں کا مجموعہ نازل کرانے کا ذکر ہے، چنانچہ بجلی، ہوا، سورج، چاند تمام آسمانی نعمتوں سے فائدے حاصل کر رہے ہیں، انسان کے خدا کا خلیفہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ایسے کام کرنے چاہئیں جن سے کچھ تو خدا کا قرب نصیب ہو، چونکہ انبیاءؑ کی زندگی عام انسانوں کے لیے نمونہ ہے، اس لیے انھوں نے جس کام کا نمونہ دکھایا ہے، اسے انسان بھی کر سکتا ہے، وہ معجزے بھی دکھا سکتا ہے، آج سائنسداں جو ایجادات کر رہے ہیں، وہ عام لوگوں کے لیے معجزے سے کم نہیں ہیں، حضرت نوحؑ نے بڑا اور طاقتور بحری جہاز بنایا تھا، جو ان کا معجزہ تھا، اب ان کی اولاد سے بھی اللہ نے ایسے جہاز بنوا دئے، حضرت ابراہیمؑ کے لیے بھڑکتی آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی، حال میں ان کی اولاد نے ایسا لباس ایجاد کر لیا ہے جس کو پہن کر آگ کے الاؤ میں کود جائیں تو انسان کا ایک رواں بھی نہ جل سکے، حضرت موسیٰ کا ایک معجزہ ید بیضا تھا، اس سے اشارہ بجلی کی روشنی کا ہے، معلوم ہوا کہ بجلی کی ایجاد کسی یہودی سائنسداں نے کی ہے، حضرت داؤدؑ کی آواز کی دلکشی، چڑیوں کے جمع ہونے اور ان کے لیے لوہے کے نرم کیے جانے جیسے معجزوں سے ان کا تار برقی، ٹیلیفون اور ریڈیو کا موجد ہونا ثابت ہوا،

ج یہ ایجادیں یہودیوں اور عیسائیوں ہی سے کرائی جا رہی ہیں، کیونکہ حضرت داؤدؑ بنی اسرائیل
سے تھے، حضرت سلیمانؑ کیلئے تانبے کا چشمہ بہا دینا اس کا ثبوت ہے کہ اب حضرت داؤدؑ کے
بنائے ہوئے لوہے کے تاروں کے بجائے تانبے کے تار سب جگہ پھیلا دیئے گئے، محاریب و تماثیل سے
سینما اور ٹیلی ویژن کی طرف اشارہ ہے، حضرت عیسیٰؑ کے اندھوں کو آنکھ والا بنانے کا معجزہ آج
عیسائی اس طرح دکھا رہے ہیں کہ پیدائشی اندھوں کی آنکھوں کے گڑھوں میں دوسرے انسانوں
کی آنکھیں لگا دینے سے ان کو بینائی مل جاتی ہے، مصنف کو امت محمدیہ سے یہ گلہ ہے کہ وہ اپنے
نبیؐ کے نمونہ پر عمل کرکے ویسے معجزے نہیں دکھا رہی ہے، تاہم گذشتہ زمانہ کے مسلمانوں نے تسخیر کائنات
سے متعلق آیتوں پر غور کرکے ایسی ایسی تحقیقات کیں، اور سائنس کے وہ فارمولے ایجاد کیے، جن کی
بنیاد پر آج کے سائنسدانوں نے سائنس کی عظیم الشان عمارت کھڑی کی ہے، پوری کتاب اسی قسم
کے انکشافات اور عجائب سے بھری ہے، اور کیوں نہ ہو جبکہ مصنف کے بقول قرآن سمجھنے کے لیے کسی
لمبی چوڑی علمیت کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف مفتاح القرآن جس کا ہنتوں نے نام بھی نہ سنا
ہوگا، جیسی لغت سے یہ سارے حقایق منکشف ہو سکتے ہیں، قدیم کتب لغت و تفسیر اور تراجم قرآنی
اس کیلئے بالکل غیر موزوں ہیں، دراصل مصنف کی بنیاد ہی غلط اور خشت اول کج ہے، اس لیے تا ثریا
می رود دیوار کج، قرآن تو یہ کہتا ہے کہ آیات متشابہات کی تاویل کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، اس نے
راسخین فی العلم کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ متشابہ اور محکم سبھی آیتوں پر ایمان لاتے ہیں، باقی جن لوگوں
کے دلوں میں کجی اور فتنہ انگیزی ہوتی ہے وہی متشابہات کے درپے ہوتے ہیں، قرآن مجید سائنس اور
جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ مرئی تحقیق کا خواہ مخواہ اس سے پتہ لگایا جائے، بلکہ وہ صحیفۂ ہدایت ہے، جو
لوگ نیک نیتی اور ہدایت طلبی کے جذبہ سے اسے پڑھیں گے، انہی کو اس کا کچھ علم حاصل ہوگا، اس کے
لیے لکھنا لکھانا بڑی ذمہ داری کا کام ہے، ہر بوالہوس کو اسے تختۂ مشق نہیں بنانا چاہیے، قرآن مجید

کے ساتھ اس سے بڑا مذاق اور کیا ہوگا کہ جو عربی کے معمولی الفاظ اور صیغے تو کجا، اردو بھی صحیح لکھنا نہ جانتا وہ بقلم خود مبلغ و مفسر قرآن ہو جائے، ع: ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا،

اسلامی سیرت و اخلاق: مترجمہ مولوی شمس الحق ندوی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۲۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ: اسلامک بک سینٹر، سکام نگر، لکھنؤ۔

شیخ محمد بن احمد بن حسن خزرجی، ابوظبی کے خطیب و عالم اور وزارۃ العدل والشؤن الاسلامیہ والاوقاف کے مستشار ہیں، یہ ان کے جمعہ کے خطبوں کا اردو ترجمہ ہے، اس میں انہوں نے کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، حج، مسجد، عشرۂ ذی الحجہ، ماہ شعبان، اسراء و معراج، ربیع الاول اور علم و علماء کی فضیلت و اہمیت بیان کی ہے، شیخ مسلمانوں کے موجودہ دینی و اخلاقی انحطاط سے بہت متاثر اور مغموم ہیں اس لیے انہوں نے انہیں اسلامی سیرت و اخلاق اختیار کرنے کی خاص طور پر تاکید کی ہے، اس سلسلہ میں جہاں خوف و خشیت الٰہی اور ایمان کے تقاضے پورا کرنے کی دعوت دی ہے، وہاں دنیا کی زیب و زینت میں پڑ کر آخرت سے بے پروا ہونے سے روکا ہے، اور شادی کی ضرورت و مصلحت بھی بیان کی ہے، اور زنا و شراب نوشی کے مفاسد بھی واضح کیے ہیں، تاکہ ایک اچھا اور پاکیزہ ماحول وجود میں آئے، گو ان خطبوں میں ایک مستقل تصنیف کی طرح ربط و ترتیب نہیں ہے، تاہم ان مفید باتوں سے مسلمانوں کو عملی زندگی میں بڑی رہنمائی ملے گی، مولانا شمس الحق ندوی استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے خطبوں کا اچھا اردو ترجمہ کیا ہے، جس کے لیے وہ لائق تحسین ہیں، مگر انہوں نے قرآن مجید کی آیتوں کے ترجمے یا تو آزادانہ کیے ہیں، یا کسی ایک ہی ترجمہ کو سامنے رکھا ہے، اس لیے بعض جگہ مفہوم کی پوری وضاحت نہیں ہوئی ہے، اور کہیں کہیں غلطی بھی ہو گئی ہے جیسے كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللَّهِ أَنْ تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ (یہ اللہ کو بہت ناپسند ہے کہ تم کہو، اور کرو نہ کچھ (ص ۶۱) اور نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (ص ۹۶) میں فی الآخرہ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے، صفحات ۵۸ تا ۶۲ درست نہیں لگے ہیں،

کامٹی کی ادبی تاریخ :- مرتبہ ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل، تقطیع متوسط، کاغذ و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۷، مجلد مع حسین گرد پوش، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ: کامٹی، ضلع ناگپور، ۴۴۱۰۰۱، مہاراشٹر۔

یہ کتاب مصنف کے تحقیقی مقالہ "ناگپور میں اردو" کا ایک حصہ ہے، جو کامٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی داستان ہے، شروع میں کامٹی کی مختصر تاریخ اور وہاں اردو کی ... اس کے بعد کامٹی میں اردو شاعری کی ابتدا و ارتقاء کا اجمالی حال اور شعراء کا مختصر تذکرہ ... ان کے حالات و کمالات کے علاوہ ہر ایک کی شاعری پر مختصر تبصرہ کیا ہے، اور نمونۂ کلام بھی ... میں نثری ادب کا جائزہ لیا ہے، اور کچھ اہل قلم کے حالات اور خدمات ادب بیان کیے ہیں، ... شایع ہونیوالے اخبار اور رسالوں کے متعلق معلومات درج ہیں، نیز ان ادبی انجمنوں اور تعلیمی ... جنھوں نے شاعروں اور ادیبوں کی نشو و نما میں حصہ لیا ہے، آخر میں وہاں ہونیوالے بعض مشا... کی ہے، یہ کتاب مرتب کر کے مصنف نے ایک مفید ادبی خدمت انجام دی ہے، صفحہ ۳۵ پر عبدالشکور ... "طبع" کو مذکر باندھا ہے، ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو، ایک جگہ بہادر گنج کو اعظم گڑھ کا قصبہ بتلایا ہے ... غازیپور میں ہے، ایک اور جگہ غازیپور (ضلع اعظم گڑھ) لکھا ہے (صفحہ ۲۳) غازی پور تو خود ہی ضلع ...

چند ارباب کمال :- مرتبہ ضیاء الدین اصلاحی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت ... صفحات ۳۰۸، قیمت پچیس ۲۵ روپیے، پتہ: ضیاء الدین اصلاحی، دار المصنفین، اعظم گڑھ۔

یہ کتاب چار حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں عربی شعر و ادب کی تین ممتاز شخصیتوں جاحظ، ابو ... امرؤ القیس کا تذکرہ ہے، دوسرے حصہ میں علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ و متوسلین میں مولانا عبدالماجد دریابادی ... احسان احمد، اور مولانا مسعود علی ندوی کی شخصیت و کمالات پر بحث کی گئی ہے، اسکے بعد تین علمی تعلیمی شخصیتوں ... مولانا مفتی محمد شفیع اور قاضی محمد عدیل عباسی کے متعلق تاثرات قلمبند کیے گئے ہیں، آخر میں اردو کے ایک محقق اور ... نقاد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے علاوہ دو ہندو محسنین اردو منشی دیا نرائن نگم اور منشی نول کشور کا ذکر ہے

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی قوم، خاندان یا فرماں روا شخص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ اس کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار یا پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، ان کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور ان کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت :- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"

مولانا شبلی کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں حضرت رسول کریم صلعم کی ولادت باسعادت سے لیکر وفات تک کے حالات و غزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ۔ قیمت: ۲۹ روپیہ

سیرۃ النبی حصہ دوم: [illegible] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان۔ قیمت: بیس روپیہ

الفاروق: حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانح عمری اور ان کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل۔ مولانا شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا۔ قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی: حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل، ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ۔ قیمت: ۱۱ روپیہ

المامون: خلیفہ مامون الرشید کی سوانح و حالات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی، علمی، مذہبی، اخلاقی، تمدنی حالات، جن سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔
قیمت: ۱۱ روپیہ

سیرۃ النعمان: امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری اور ان کے اجتہادات [illegible] اور فقہ حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ۔ (زیر طبع)

موازنہ انیس و دبیر: مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی شاعری پر ریویو اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ۔
زیر طبع

کلیات فارسی: مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ۔
قیمت: ۱۱ روپیہ

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جن میں مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق نظمیں۔ قیمت: ۶ روپیہ

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں، عزیزوں، بزرگوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ۔ حصہ اول، حصہ دوم
۱۶ روپیہ، ۱۲ روپیہ

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۰ ۵

اپریل ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس ۲۰ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

کاتب سید اقبال احمد (پن ۱ ۰۰ ۲۷۶)

مجلس ادارت

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:- ۱۸

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:- ۱۰ روپے؛

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......مرتبہ......

سید صباح الدین عبد الرحمن

جلد ۱۳۲ ماہ رجب المرجب مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۳ء عدد ۴

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

معارف کے خریداروں سے ایک ضروری گذارش

رسالہ معارف ہر ماہ کی ۱۵ / ۱۶ تاریخوں کو حوالۂ ڈاک کیا جاتا ہے، اگر کسی صاحب کو ماہ کے آخر تک رسالہ موصول نہ ہو تو دوسرے ماہ کے پہلے ہفتہ میں ضرور طلب کر لیں ورنہ بعد میں رسالہ قیمتاً روانہ کیا جائے گا، بہتر ہوتا کہ رسالہ رجسٹرڈ منگوایا جائے، اس کے لئے ۲۰ روپئے چندے کے ساتھ ۳ روپیہ رجسٹری فیس بھی روانہ فرمائیں، چندہ بھیجتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں،

"منیجر"

شذرات

نومبر ۱۹۸۳ء میں علامہ محمد اقبال کی دوسری بین الاقوامی کانگریس میں شرکت کے لئے لاہور گیا تھا، و سے کراچی چلا گیا جہاں بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر قیام طویل ہو گیا، فروری میں واپس ہوا تو مارچ میں پھر کراچی جانا پڑا، سکھر کی تنظیم فکر و نظر کی طرف سے سندھی ادبی میلہ میں شرکت کی بھی دعوت تھی جو ۱۱، ۱۲ مارچ کو منعقد ہوا، ہندوستان سے اس خاکسار کے علاوہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا اطہر مبارکپوری، جناب جمیل احمد اور شری اوپادھیائے بھی شریک ہوئے، موخر الذکر دونوں حضرات تامل نا سے تھے، اس کا افتتاح پاکستان کے صدر جناب جنرل ضیاء الحق نے کراچی کے مشہور ہوٹل شیرٹن میں کیا، سندھ کے نمائندے بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے، پہلے تنظیم فکر و نظر کے جنرل سکریٹری جناب اسلم صبوحی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا، جس میں زیادہ تر سندھ کے مسائل کا ذکر تھا، اس کے بعد پاکستان کے مشہور ایڈوکیٹ جناب خالد اسحٰق نے اردو میں ایک دلپذیر تحریر پڑھی جس میں اس ادبی میلہ کی نوعیت بتائی گئی تھی، پھر سندھ کے مشہور دانشور جناب نبی بخش بلوچ نے انگریزی میں اپنا مقالہ پڑھا، مولانا سعید احمد اکبر آبادی جناب صدر ضیاء الحق کے استاد دہلی میں رہ چکے ہیں، اس لئے ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، وہ اسٹیج پر صدر صاحب کے پاس بٹھائے گئے، انھوں نے سندھ پر بڑی دلنشین تقریر کی، جو بہت پسند کی گئی، پاکستان کے ماہر قانون اور سیاست داں جناب اے کے بروہی کی بھی تقریر ہوئی، آخر میں جناب ضیاء الحق نے بڑے اچھے انداز سے مجمع کو مخاطب کیا، جو کچھ انھوں نے کہا، تالیوں کی گونج میں سنا گیا،

جناب ضیاء الحق نے بیرونی مہمانوں اور اس نشست کے مقالہ نگاروں اور مقررین کو اجرک کی چادر اور سندھی ٹوپی پہنائی اور ایک مخمل کے ڈبہ میں سندھ کے اسلامک سنٹر کا تحفہ دیا، اور یہ بھی اعلان کیا کہ بیرونی مہمان پاکستان کے جس علاقہ میں جانا چاہیں حکومت کے اخراجات پر جا

مقالہ خوانی کے تین اجلاس ہوئے جن میں سندھی، اردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں مقالات پڑھے گئے، بیرونی مہمانوں میں اس خاکسار کے علاوہ مولانا قاضی اطہر مبارکپوری ذو اجلاس کے خصوصی مہمان بنائے گئے، سندھی زبان میں عربی فارسی اور اردو کے الفاظ اتنے ہیں کہ سندھی زبان میں جو مقالے پڑھے گئے ان کو سنتے وقت سمجھ میں آ رہا کہ کیا چیز پیش کی جا رہی ہے، سندھ کے مشہور بزرگوں میں تین حضرات شہباز قلندر، حضرت سچل سرمست اور حضرت عبد اللطیف بھٹائی کا ذکر بکثرت آتا ہے، ڈاکٹر نبی بخش احمد کا مقالہ سندھ کے بعض مآخذ اور منابع پر تھا، اس اجتماع میں مولانا قاضی اطہر مبارکپوری کی کتاب رجال السند والہند کا ذکر بار بار آیا، خود انھوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ گذشتہ بیس سال سے وہ سندھ پر کس طرح کام کرتے رہے ہیں،

میرے مقالہ کا عنوان "اہل سندھ کے لئے لمحات فکریہ" تھا، یہ جناب اے۔کے بروہی کی صدارت میں پڑھا گیا، اس میں بڑی صفائی کے ساتھ یہ عرض کیا گیا کہ خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں کی بڑی بڑی حکومتیں بنیں، مگر وہ سب ختم ہو گئیں، پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی بڑی قربانیوں سے وجود میں آیا ہے، اب آئندہ کا مورخ ہی فیصلہ کرے گا کہ یہ قربانیاں بامقصد رہیں یا رائگاں گئیں،

اس کی بھی توجہ دلائی کہ اس برصغیر میں اسلام نے سب سے پہلے سندھ کو اپنی آغوش میں لیا، اس کو اس برصغیر کا باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل ہے، یہاں بہت سے علما، فضلا، مفسرین اور محدثین گذرے ہیں، اس بنا پر ایک زمانہ میں یہ عرب صغیر کہلاتا تھا، یہاں کی مکلی پہاڑی میں ایک لاکھ پچیس ہزار اولیائے کرام مدفون ہیں، اس طرح یہ مدینۃ الاولیا بھی رہا، یہاں حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ، حضرت صدر الدینؒ، حضرت رکن الدین، حضرت شہباز قلندرؒ، حضرت سچل سرمست اور حضرت عبد اللطیف نے اپنی اپنی تعلیمات سے اس سرزمین کو سونا بنانے کی کوشش کی ہے،

پھر یہاں کے گذشتہ علما کی کچھ تفصیل بتائی کہ یہیں موسیٰ بن یعقوب ثقفی، محمد بن ابی الشوارب اور قاضی

محمد ابو منصور سندھی وغیرہ نے اسلامی علوم و فنون کی شمع روشن کی، اور یہیں سے باہر جا کر ابو معشر سندھی اور
صاحبزادے ابو عبد الملک محمد بن ابی معشر، امام اوزاعی اور خالد ابو محمد بن سالم اور رجا بن سلمہ سندھی نے اپنے
علمی اور مذہبی کارناموں سے سندھ کا نام روشن کیا تھا، کلہوڑہ دور میں مخدوم محمد معین نے اپنی مختلف
تصانیف کے ذریعہ تصوف کو اچھی طرح سمجھایا، مخدوم محمد ہاشم نے اپنی تقریباً ڈیڑھ سو تصانیف سے دین کی تبلیغ،
سنت کا احیاء اور شریعت کی ترویج کر کے سندھ کی آواز عرب و عجم تک پہنچائی، کلہوڑہ کے فرمانروا
نور محمد کو مخدوم عبد الرؤف اسلامی تعلیمات دیتے رہے، علامہ محمد حیات سندھی نے مدینہ منورہ جا کر وہاں کے
لوگوں کو اپنے دینی علوم کے سرچشمہ سے سیراب کیا،

یہ بھی سننے کی زحمت دی کہ شاہ فقیر اللہ علوی کی وجہ سے شکارپور نقشبندیہ سلسلہ کے نیک حضرت
فقیر اللہ علوی کی وجہ سے رشد و ہدایت کا مرکز بن گیا تھا، ان کی اتنی تصانیف ہیں کہ اگر وہ شائع کی جائیں
تو اس زمانہ کے سندھ کے غیر معمولی تشخص کا اندازہ ہوگا، ٹھٹھہ کے مولوی محمد صادق علوم عقلی میں یگانۂ روزگار
سمجھے جاتے ہیں، میر نجم الدین عزلت کی تصنیف طوطی نامہ کو مولانا ضیاء الدین نخشبی کی طوطی نامہ پر فضیلت
حاصل ہے، میاں نعمت اللہ جو چودہ علوم سے واقف تھے، ان کا مدرسہ دینی علوم کا سرچشمہ تھا، ٹھٹھہ اپنی بے شمار
اسلامی درسگاہوں کی وجہ سے علوم و فنون کا مدینۃ الحکمۃ بنا ہوا تھا،

آخر میں عرض کیا کہ قانع ٹھٹوی کی طومار سلاسل برگزیدہ، شجرۂ طریقت اہل سنت اور معیار سالکان
طریقت سے سندھ میں عارفانہ [illegible] ہوتی ہے، قانع ٹھٹوی نے مقالات الشعراء میں سندھ کے بہت سے شعراء کا ذکر کیا
جنھوں نے حمد و نعتیں اور صوفیانہ شاعری پیش کر کے اس سرزمین کو بابرکات بنا دیا ہے، کیا سندھ کے علماء اولیاء اور
اہل دل شعراء کی روحیں یہ پیام نہیں دے رہی ہیں کہ یہ سرزمین پھر باب الاسلام، مدینۃ الاولیاء اور عرب صغیر
بن سکتی ہے، ایک مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو ہندوستان سے ربانی خوشبو آتی ہے،
کیا یہ امید نہیں کی جا سکتی کہ جب سندھ کے ساحل سے بحر عرب ٹکراتا ہے تو اب عرب سے ربانی خوشبو کر سندھ کو معطر کرے گی

جناب محمد اللہ بخش صاحب نے ہندوستان کے مہمانوں کے اعزاز میں حیدرآباد میں بھی جلسہ کرایا، جس میں ان
تقریریں ہوئیں، اللہ بخش صاحب نے اپنی تصنیف اور خاطر داری سے سندھ کی میزبانی کی روایات کو پوری طرح برقرار رکھا،

مقالات

منٹگمری واٹ کی کتاب محمدؐ ایٹ مکہ پر ایک نظر

از۔ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

ڈبلو منٹگمری واٹ نے محمدؐ ایٹ مکہ، محمدؐ ایٹ مدینہ، محمدؐ دی اسٹیٹسمین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کرلی ہے۔ ان کے مضامین ایسے جرائد میں نکلتے ہیں جو مسلمانوں کی راسخ العقیدگی کے حامل ہیں، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی میں قرآن پاک کی ڈسٹری بیوشن پر ایک کانگریس ستمبر ۱۹۸۰ء میں ہوئی تھی تو وہ بھی اس میں مدعو تھے، اور ان کی بعض رائے کے حوالے بھی تقریروں میں سننے میں آئے ان کی تصانیف کی شہرت تو سنی تھی، لیکن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا انکی تصانیف خاص طور پر حاصل کیں، ان کا مطالعہ شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ ان ہی مستشرقین میں ہیں جو انتہائی زہریلی باتیں اپنے طاقت ور اور ماہرانہ انداز میں کہہ کر اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتے ہیں

میرے پیش نظر اس وقت ان کی کتاب محمد ایٹ مکہ کا وہ اڈیشن ہے جو ۱۹۵۲ء میں چھپا، اب اس کے کئی اڈیشن نکل چکے ہیں، نئے اڈیشن سامنے نہ رہنے کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ پہلے اڈیشن اور بعد کے اڈیشن میں کیا کیا ترمیمات کی گئی ہیں، لیکن پہلے اڈیشن میں

پہلے اس کتاب کے ماخذوں پر نظر پڑی، اس میں زیادہ تر ابرنیس، رچرڈبل، بوہل، کائتانی،
انسائکلوپیڈیا آف اسلام گولڈزیہر، جسفری، گینیس، نکلسن، لوئس، لز رکی، سیل اینڈ وہری، نوری ڈلباو
روسط وغیرہ کے نام ملے، بخاری کا ذکر ضرور ہے، لیکن اس سے مدد فرانسیسی ترجمہ سے لی گئی ہے،
ن مجید کو رچرڈبل کے ترجمہ سے سمجھا گیا ہے، زورقی کی کتاب اخبار مکہ کا سہارا جرمن اسکالر وسٹن
لڈ سے لیا گیا ہے، ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول اللہ، ابن سعد کی طبقات، طبری کی تاریخ
ل والملوک اور واقدی کی کتاب المغازی کا ذکر ضرور کر دیا گیا ہے، مگر یورپی مصنفوں کی کتابوں
حوالے اس کثرت سے ہیں، کہ عربی کی تصانیف دبی ہوئی نظر آتی ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے فضلاء نے تحقیق و تدقیق کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے، کہ اس میں حوالے معاصر
خذوں اور نہیں تو زمانہ کے لحاظ سے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالے دے کر اس کو مستند
ر دقیع بنایا جائے، ترجمہ کے حوالوں سے اس کا پایہ گر جاتا ہے پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالوں سے
یقی تحریر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے لیکن زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں
دی کے مصنفوں کی کتابوں کے حوالے دیے ہیں، اور ان ہی کا سہارا لیا ہے، جن سے ان کی
ت کے کھوٹے کو مدد پہنچ سکتی ہے، اور پھر عربی کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجمے سے
ستفادہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کی وقعت بڑی حد تک گر جاتی ہے۔

ابن اسحاق، ابن ہشام، کتاب المغازی از واقدی اور طبقات ابن سعد و تاریخ طبری کے حوالے
مصنف نے ضرور دیے ہیں، مگر اسی حد تک جتنے ان کے لیے مفید تھے، ان کتابوں کا جو ناقدانہ تجزیہ
کیا گیا ہے، اس سے مصنف بظاہر بے خبر معلوم ہوتے ہیں، ابن اسحاق نے فن مغازی میں شہرت
حاصل کی، وہ امام فن مغازی سمجھے جاتے ہیں، مغازی میں زیادہ تر لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر
ہوتا ہے، اس لیے یہ فن سیرت نگاری سے مختلف ہے، ابن اسحاق پر یہ اعتراض ہے کہ

انھوں نے بعض واقعات یہودیوں سے سن کر لکھے ہیں، اس لیے ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا ہے
یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ ان کو ثقہ سمجھتا ہے، تو اسی درجہ کا دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار
دیتا ہے، محمد بن اسحاق ہی کی کتاب کو زیادہ منقح اور اضافہ کرکے ابن ہشام نے اپنی سیرت مرتب کی
لیکن ان پر یہ اعتراض ہے، کہ انھوں نے اس کتاب کو زیادہ تر بکائی کے واسطہ سے روایت کیا ہے،
بکائی اگرچہ رتبہ کے شخص سمجھے جاتے ہیں لیکن امام بخاری کے استاد ابن مدینی اور نسائی کہتے ہیں کہ
وہ ضعیف ہیں، ابوحاتم بھی کہتے ہیں، کہ وہ استناد کے قابل نہیں۔

واقدی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی
جاتی ہیں، کیونکہ اس کی لغو بیانی مسلمہ عام ہو چکی ہے، محدثین کہتے ہیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں
گھڑتا ہے، اس لئے وہ اس کو کذاب کہتے ہیں، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں

"دنیا جانتی ہے کہ واقدی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین
میں نہیں ہو سکتا، تاریخ وسیرت میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملکہ الزبتھ
کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں.......... امام شافعیؒ نے اگرچہ اس سے
روایت کی ہے مگر یہ صاف تصریح ہے کہ امام موصوف اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا
انبار کہا کرتے تھے (مقالات سلیمان جلد ۲ صفحہ ۱۱۰)

پھر واقدی کس طرح معتبر ہو سکتا ہے، ؟

طبقات ابن سعد کا بڑا حصہ واقدی سے ماخوذ ہے، جو روایتیں واقدی سے لی گئی ہیں،
وہ اس لیے صحیح نہیں سمجھی جا سکتی ہیں کہ یہ ابن سعد میں درج ہیں،

طبری کی تاریخ مستند ضرور ہے، لیکن وہ بہت سی روایتیں ایسے راویوں کے ذریعہ بیان
کرتا ہے، جن میں بہت سے ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس لیے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے

ان میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے۔

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلیؒ نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو (سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۹)، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کیجاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لینے اور کد و کاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے، (ص ۱۰۱) مولانا شبلیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ہیں، جس کی وضاحت مختصر طریقہ پر اس طرح کیجاسکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، حدیث صحیح کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کر دی جاسکتی ہیں جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر عام استقراء اور تفحص سے کام لیا جائے، تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، بصورت اختلاف روایات احادیث کے مدونہ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہئے، سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ہوں ان میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے، اور جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی، اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق

دجمعی سے اس کی تسلی کرلینی چاہیے، کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے،
وغیرہ وغیرہ۔

مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا، کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلامؐ میں کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انھوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا، کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے، ڈبلیو، منٹگمری واٹ سے بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے، مگر وہ کیوں اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کی زحمت گوارا کرتے۔

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ہلکا کر دیتے ہیں، . . . . . کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا ہے۔ خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے سارے حالات مل جاتے ہیں، تب ہی ان کے عقائد سمجھ میں آتے ہیں۔

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں رسول اللہؐ پر کتنی کتابیں لکھی ہیں، فارسٹر، ارونگ، اسپرنگر، میور، مارگولیتھ، ڈی لیسی جانسٹن، مینیریو، اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اہل قلم ہیں، جنھوں نے آپؐ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہے، اور ہونی بھی چاہیے، لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق نیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے، منٹگمری واٹ بھی یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے قلم اٹھایا، اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں، ان کا خیال ہے، کہ محمدؐ کی ایک تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی، کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی

اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے۔

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلیؒ نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو (سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۹۰) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کیجاتی ہیں لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لینے اور کد وکاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے، (ص ۱۰۱) مولانا شبلیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ہیں، جس کی وضاحت مختصر طریقہ پر اس طرح کیجاسکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب پر مقدم رکھا جائے، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے اختلافی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ [illegible]یث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کردی جاسکتی ہیں جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر عام استقرا اور تفحص سے کام لیا جائے، تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہئے، سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ہوں ان میں سلسلۂ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے، اور جو روایت عام وجوہ عقلی، مشاہدۂ عام، اصول مسلمہ اور قرائن حال کے خلاف ہوگی، لائق حجت نہ ہوگی، اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق

وجہ سے اس کی تسلی کرلینی چاہیے، کہ راوی سے اداے مطلب میں تو غلطی نہیں ہوئی ہے،
وغیرہ وغیرہ۔

مولانا شبلیؒ نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا، کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلامؐ میں کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انھوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا، کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا بھی سکتا ہے، ڈبلیو، منٹگمری واٹ سے بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے، مگر وہ کیوں اس جانکاہی اور نکتہ سنجی کی زحمت گوارا کرتے۔

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ہلکا کر دیتے ہیں، . . . . . . کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے، اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جا سکتا ہے، خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے سارے حالات مل جاتے ہیں، تب ہی ان کے عقائد سمجھ میں آتے ہیں۔

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں رسول اللہؐ پر کتنی کتابیں لکھی ہیں، فارسٹر، ارونگ، اسپرنگر، میور، مارگولیتھ، ڈی لیسی جانسٹن، مینیرپو، اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اہل قلم ہیں، جنھوں نے آپ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ آپ کی سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہے، اور ہونی بھی چاہئے، لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے تقاضے کے مطابق نیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے، منٹگمری واٹ بھی یہ فخر حاصل کرنا چاہتے تھے، اس لیے قلم اٹھایا، اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں، ان کا خیال ہے، کہ محمدؐ کی ایک تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی، کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی

نقطۂ نظر ۔۔ کرنے کے خواہاں ہیں، اس لیے انھوں نے مورخ بن کر اس کتاب میں اس ز
کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس
ایسے سوالات کے بھی جوابات ملیں گے، جو پہلے نہیں اٹھائے گئے، مگر اس کا فیصلہ ان کے ناظ
ہی کر سکتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا ان کے پیشرو یورپین مصنفین نہیں لکھ چکے ہیں
میور اور مارگولیتھ وغیرہ کے ابتدائی ابواب میں وہ سب کچھ ملے گا، جو مصنف نے اپنے اب
باب میں لکھا ہے، انھوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی تحریروں کو اپنے انداز میں مرتب کرد
اسی کے ساتھ ان کے ناظرین کو یہ حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ چبائے ہوئے نوالے کو چبا ر
ہیں، یا کوئی نئی بات پیش کر رہے ہیں، یا اسی کتاب میں کس حد تک وہ مورخ ہیں اکثر
عیسائیت کے خالص مبلغ اور حامی ہیں، صحیح تو یہ ہے کہ وہ ایک خاص مقصد کے تحت
کتاب لکھنا چاہتے تھے، جس کے لیے وہ ایک نتیجہ پر پہلے پہنچ گیے تھے، اسی کے مطابق اپنی تحقیق
محنت کا صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر لیا، ان کا کیا مقصد ہے وہ آیندہ سطروں میں ظاہر ہو

کتاب کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی
ذہنی پس منظر کا احاطہ کیا گیا ہے، اقتصادی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا دعو
کہ قرآن ریگستانی فضا میں نہیں بلکہ اعلیٰ تمول کی صورت میں نازل ہوا (ص ۳) لیکن اس
کے باوجود وہ ایک چلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں، کہ عرب کے باشندے بھوک سے
فتوحات کے لئے چل پڑے (ص ۳) یہ لکھ کر ان کی فتوحات کی عظمت کو کم کرنے کی کو
کی مگر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نہیں بتایا کہ اس پس منظر میں اسلام کی تبلیغ و
میں مددیار کا وٹ پہنچی، اس کی وضاحت کے بغیر عہد جاہلیت کے مکہ کی سیاست کا ذ
ہیں، جس کے تجزیہ میں ان کے دل کا گوشہ بڑا نرم ہو گیا ہے، مکہ کی سیاست کے عنوان سے

لکھا ہے، اس میں قریش کی دھڑے بندی حلف الفضول، مکہ میں مختلف افراد اور قبائل کے اثرات، اس کی خارجہ پالیسی، اس پر بازنطینی، ایرانی اور حبشہ کی حکومتوں کی للچائی نظر، اس پر ابرہہ کے حملہ وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد رقم طراز ہیں کہ محمدؐ کی بعثت اس وقت ہوئی جب مکہ میں بڑی دولت اور بین الاقوامی سیاست کی آمیزش ناگزیر طور پر تھی (ص ۱۱)

وہ ایام جاہلیت کے قریش کی عقلمندانہ اور صبر آزما سیاست دانی اور حلم کے بھی معترف ہیں، لکھتے ہیں، کہ ان کی سیاسی عقلمندی میں حلم جھلکتا نظر آتا ہے، (ص ۱۱) ان کی رائے ہے، کہ ان کی قبائلی کش کش معمولی درجہ کی تھی، جو مشترکہ مفاد ہی کی خاطر تھی، (ص ۸) وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں، کہ مکہ میں جمہوریت تھی، اس کا موازنہ ایتھنس کی جمہوریت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ ایتھنس میں اخلاقی اصولوں اور ایمانداری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن مکہ کے لوگ اس کے لیے فکرمند رہتے کہ عملی مہارت سے ایک اچھا رہنا کیسے ابھر سکتا ہے، (ص ۱۰)

مکہ کی خارجہ پالیسی پر بھی بحث ہے، جس کو پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ کوئی پچھڑا ہوا نہیں بلکہ ایک ترقی پذیر علاقہ تھا، وہ لکھتے ہیں، کہ بازنطینی اور ایرانی امپائر جیسی دو بڑی قوتوں کے ساتھ حبشہ جیسی چھوٹی قوت کو بھی مکہ سے برابر دلچسپی رہتی، یہ دلچسپی اس کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے رہی، بازنطینی حکومت سے مکہ کے تعلقات دوستانہ رہے حبشہ بازنطینی حکومت کا دوست تھا، اس لیے ان دونوں قوتوں سے جب کوئی خطرہ نہ ہوتا، تو مکہ کا تجارتی کارواں دور دور تک جاتا، مگر جب حبشہ سے تعلقات اچھے نہیں رہے، تو ابرہہ نے مکہ پر حملہ کر دیا، اس کے وجوہ یہ بھی رہے، کہ ابرہہ کی نظر میں مکہ کی بڑھتی ہوئی نفع بخش تجارت کھٹکی، پھر اس کو جو تقدس حاصل تھا، اس کی اہمیت بھی اس کو پسند نہیں آئی، شاید اس کے حرم کی دولت پر بھی اس کی للچائی نظر پڑی، پھر اس تجزیہ سے بھی محظوظ کیا ہے، کہ مکہ اس زمانہ کی بڑی قوتوں کی

کشاکش میں غیر جانب داری ہی کو اپنے لیے ضروری سمجھتا، اور جب بازنطینی اور ایرانی طاقتیں برسر پیکار ہوتیں، تو مکہ کی اس غیر جانب داری کی اہمیت بڑھ جاتی یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ رقم طراز ہیں کہ مفید معلومات کے نہ رہنے کی وجہ سے یہ تمام باتیں قیاسات ہی سے لکھی جا رہی ہیں، جن میں اگر بہت سی تفصیلات صحیح نہیں بھی ہوں گی، تو اس کی عام مرقع آرائی (Sound) ہی نظر آتی ہے، (ص ۱۷) ایسے طرز استدلال اور انداز تحقیق کا کیا جواب ہو سکتا ہے مولانا شبلیؒ نے آج سے بہت پہلے ایسے یورپین سیرت نگاروں کے متعلق لکھا کہ وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلۂ معلومات پیدا کرتے ہیں، جن میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے۔ وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتے ہیں اور تمام واقعات اسی کے گرد گردش کرتے ہیں، (سیرۃ النبیؐ جلد اول ص ۵۰)

مصنف کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے، کہ اگر کوئی ناقد ان پر یہ اعتراض کرے، کہ انکی کتاب میں عرب کے ایام جاہلیت کے تاریک اور داغدار پہلوؤں کا ذکر نہیں تو وہ ان کی نشاندہی آسانی سے کر دیں گے، لیکن ان کے قلم کی چابکدستی اسی میں نظر آتی ہے، کہ یہ تاریک اور داغدار پہلو اس دور کے روشن پہلوؤں کی تفصیلات میں دب کر رہ گئے ہیں، اب تک مسلمانوں کے سامنے ایام جاہلیت کی بڑی بھیانک تصویر تھی، جس کو مصنف اپنے خاص مقصد کے تحت رد کرنا چاہتے ہیں، وہ اس دور کی تجارتی سرگرمیوں اور دوسری خوبیوں کی مرقع آرائی اس لیے کرتے ہیں، کہ یہ ظاہر ہو کہ رسولؐ اللہ کی بعثت کے بعد مسلمانوں سے ان کا تصادم ان کی اپنی قدروں کو برقرار رکھنے کی خاطر تھا، غزوات مذہبی لڑائیاں نہ تھیں بلکہ تجارتی برتری کی خاطر لڑی گئیں، وہ مکہ کے لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتے ہیں، مسلمان مورخین تو یہ بتاتے ہیں، کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے،

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے۔ اس زمانے میں گھروں میں جائے ضرور نہ تھے، چھلنیاں نہ تھیں، بھوسے کو پھونک کر اڑاتے تھے جو رہ جاتا تھا، وہی آٹا ہوتا تھا، بخاری کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے تاریخ اور ادب میں یہ تصریح موجود ہے، کہ عرب کھنکھجورا، گوہ اور گرگٹ اور جانوروں کے چمڑے کھاتے تھے، بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھائی جاتی تھی، باپ کی منکوحہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہیں تھی، قمار بازی شراب خواری اور زناکاری کا رواج عام تھا، لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلا دینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تہ تیغ کرنا عموماً جائز تھا، (سیرت النبیؐ جلد اول ص ۱۱۸ - ۱۲۸) مولانا شبلیؒ نے مستند حوالوں سے لکھا ہے کہ قریش میں سخت بد اخلاقیاں پھیلی ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بد اخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزالِ زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، اخنس بن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور رؤسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نمام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے، (سیرۃ النبی جلد اول، ۲۱، معارف مطبوعہ مصر ۵۵)

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اسی ظلمت، تیرگی اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک آفتابِ عالم تاب کی ضرورت تھی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پوری ہوئی، لیکن ہمارے فاضل مصنف موجودہ دور کی سیاسی، اقتصادی اور عمرانی اصطلاحات کا سہارا لے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان مورخین جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ سراسر غلط ہے، عربوں میں

قبائلی یکجہتی کے ساتھ انفرادیت تھی، جب مختلف قبائل مل جاتے، تو ان کا الحاق تہذیب سمجھا (ص ۱۰) ان میں اتحاد، ایک مشترکہ زبان، شعری روایت اور مادی مفاد کی بنا پر تھا، ان کی بنیاد اقتصادیت تجارتی اور سرمایہ دارانہ اقتصادیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی۔ (ص ۱۰) وہ لڑائی میں بہادر، مصیبت میں صابر، انتقام لینے میں مشتعل مزاج، کمزوروں کے حامی، اور طاقت وروں کے خلاف سرکش ہوتے، (ص ۲۰) ان میں فیاضی، میزبانی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسی اہم خوبیاں تھیں، ان کو اپنی آن، اور عزت زیادہ محبوب تھی جس کے لیے وہ قانون اور کسی بات کے صحیح و غلط کی پروا نہیں کرتے تھے (ص ۲۱-۲۰) یہ عرب *Aristocracy* اور (*Egalitarianism*) کے مجموعہ تھے، ان میں مساوات تھی، لیکن جو بہتر سے بہتر ثابت ہوتا، وہی ان کا قائد بن جاتا، (ص ۲۲) اسی طرح عربوں کی اور خوبیاں، اعلیٰ اخلاق، ان کی انسانی رشتہ داری کی روایت اور انسانی خوبیوں کا اعلیٰ معیار اس لیے دکھایا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت کو عربوں کی ان خوبیوں سے بڑی مدد ملی، اور جب یہودیوں اور عیسائیوں کی وحدانیت کا تصور اس میں شامل کر دیا گیا، تو اس میں اور بڑائی پیدا ہو گئی (ص ۲۳) یہ زورِ بیان اس لیے صرف کیا گیا ہے، کہ اسلام کی عظمت و جلالت میں گویا ربانی پیامات و الہامات کی تعلیمات کو کوئی دخل نہیں رہا، لیکن یہی عرب جب اسلام قبول کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے مصنف جیسے مستشرقین کے دلوں کا نرم گوشہ ختم ہو جاتا ہے، ان عربوں میں زیادہ تر برائیاں نظر آتی ہیں،

مصنف نے عرب کے قدیم مذاہب کا مطالعہ نولدیکی، ولہاوسن، لیمنس اور بارٹن وغیرہ کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا ہے، گو وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی معلومات جستہ جستہ ہیں، اس لیے قیاسات سے زیادہ کام لینے کا امکان ہے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی (ص ۲۳) اور محمدؐ کے زمانہ کے ایامِ جاہلیت میں مذہب کا

...وحدت تھا، (ص ۲۳) وہ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے، (ص ۲۳) مگر اپنی تحریر کا رخ بدل کر یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو یزدانی نہیں سمجھتے، بلکہ یزداں کا مسکن تصور کرتے، ان کی پرستش غالباً بیرونی اثرات کی وجہ سے تھی، وہ ان کی یزدانیت کے قائل نہ تھے۔ بدویوں (Nomads) کو تو ان پر اعتقاد بھی نہ تھا، وہ ان کو محض کاشتکاروں کا دیوتا سمجھتے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ عرب مکہ کے اردگرد کے مقدس مقامات کی زیارت کو بھی جاتے، حرم یعنی مکہ کے مقدس حلقہ کا احترام بھی کرتے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ جنگ احد میں ابوسفیان اپنے ساتھ لات اور منات بھی ساتھ لے گئے تھے، مگر وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں، کہ اس کا تعلق مذہب کے بجائے توہم پرستی سے تھا، وہ لات و منات کا تو سرسری طور پر ذکر کر گئے ہیں لیکن اس زمانہ میں جو اور دوسرے بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، اس کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں، صحیح بخاری (باب مکہ) میں ہے کہ خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سو بت تھے، ان میں سے اہم بتوں مثلاً لات، عزیٰ، منات، یغوث، یعوق، نسر، ود، سواع اور ہبل کا ذکر تو قرآن پاک میں ہے، اس زمانہ کی بت پرستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے مصنف اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کا اصل مذہب قبائلی طرز کی انسان دوستی (tribal humanism) تھا یعنی افراد تو فنا ہوتے رہیں گے، لیکن ان کا قبیلہ باقی رہے گا، اور اس کو رہنا چاہئے۔ اور اس کی بقا کے لیے اس میں شریفانہ اوصاف باقی رہنا چاہیے، جو شریف النسل خون ہی سے ممکن ہے۔ (ص ۲۵)

فاضل مولف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب خدا کے قائل رہے، طرز استدلال ہے کہ قرآن کی شروع کی آیتیں ان کو مخاطب کرتی ہیں، جو خدا پر یقین رکھتے تھے، یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اسی کے بعد یہ بھی کہتے ہیں، ان کا یہ یقین بہت کچھ مبہم اور

گنجلک ہے، (ص ۲۰)، پھر معلوم نہیں کس حوالے سے یہ لکھ گئے ہیں، کہ قرآن میں سوزہ، مقاصد، مواعظہ وغیرہ جیسے الفاظ بظاہر اس کی تاکید سمجھے نہیں گئے، لفظاً بظاہر ہمارا رہا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اس کے خود ان کو یقین نہیں، پھر لکھتے ہیں کہ سورۂ قریش سے یہ گمان (suggests) ہوتا ہے کہ مکہ کے روشن خیال لوگ خدا ہی کی پرستش کر رہے تھے، پھر یکایک یہ کہہ جاتے ہیں کہ خدا کے لیے عربی لفظ اللہ ال الہ کا مخفف ہے، جس کے لیے یونانی لفظ (ho theos) کی طرح دیوتا (god) کے ہیں، لیکن عام طور سے اس سے خدا ہی کا مفہوم لیا جاتا ہے، یہ ممکن ہے، کہ محمدؐ سے پہلے مکہ کے غیر اہل کتاب (pagan) اللہ سے مراد کعبہ کے مخصوص دیوتا ہی کو لیتے۔ اسی طرح جس طرح طائف کا دیوتا ال لات کہلاتا۔ مصنف اپنے احتمالات کو جاری رکھتے ہوئے رقم طراز ہیں، کہ اگر اللہ خدا کے لیے استعمال ہوا جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا بیان ہے، تو پھر اس کے گنجلک ہونے کے مواقع عظیم ہو جاتے ہیں، اس لیے اغلب یہ ہے۔ کہ مکہ کے کچھ لوگ تو خدا کو تسلیم کرتے لیکن ان کا یہ خیال بھی رہا کہ خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کی بنیاد پر وہ اس کو رد کر دیں۔ ان سطروں سے ظاہر ہے، کہ مکہ کے عربوں میں توحید کا تخیل گنجلک سا تھا، لیکن ہمارے مصنف کا قلم جب آگے بڑھتا ہے، تو لکھ جاتے ہیں، کہ وحدانیت کا تخیل عیسائیوں اور یہودیوں کے اثرات کی وجہ سے رہا ہوگا، ان سے تال میل کس کس طرح رہا۔ اس کی کچھ تفصیل بتانے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں۔ کہ مکہ میں عیسائی تھے، ان میں تاجر اور غلام بھی تھے لیکن ان کے اثرات اہم نہ تھے (ص ۲۰) پھر وہ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات میں بہت سے عجیب و غریب خیالات بھی تھے، جن میں وہ غیر معمولی تخیلات بھی تھے، جو جعلی عیسوی عقائد (Gospel) سے حاصل کر کے عرب میں رائج کر دیے گئے تھے، قرآن میں تثلیث یعنی باپ بیٹے اور کنواری مریم کے

تصورِ توحید، یقیناً ان عیسائی عربوں پر تنقید ہے، جو یہ خیال رکھتے تھے، پھر مصنف اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے یہ بھی لکھتے ہیں، کہ جہاں تک یہودیوں کے اثرات کا تعلق ہے، یہ ان کو مقدس صحیفہ کے ذریعہ سے نہیں ہوئے، بلکہ مختلف قسم کے ثانوی ذریعہ سے پہنچے مصنف کا یہ بھی احتمال کہ وحدانیت کے سلسلہ میں یہودیت اور عیسائیت کے اثرات کے علاوہ اور ذرائع سے بھی یہ اثر ہوا گو یہ بہت قلیل رہا ہوگا، وہاں ایسے چھوٹے فرقے بھی رہے ہوں گے، جن پر وحدانیت کے معاملہ میں یونانی فلسفہ کا اثر رہا ہوگا، ایسے فرقے صابیین کے تھے، اس زمانے میں لفظ حنیف کا کچھ استعمال ہوا، تو اس کی بھی ایسی ہی ممکن تعبیر ہے لیکن ان تمام احتمالات کا اشہب دوڑانے کے بعد مصنف یکایک یہ لکھ جاتے ہیں۔

"میں سادہ طریقہ پر یہ کہوں گا کہ وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی، اور اگر کوئی ایسی تحریک تھی، تو اس کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے۔ مثلاً عثمان بن الحویرث نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ وہ بازنطینیوں کی مدد سے مکہ کا تنہا فرماں روا ہو جائے" (ص ۲۰)

یہ لکھ کر مصنف یہ کہہ جاتے ہیں، کہ حنیفیوں کے اس روایتی بیان میں سچائی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے، عرب اور خصوصاً مکہ میں چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جو مذہبی ماحول تھا، اس میں بہت سے ایسے سنجیدہ لوگ رہے ہوں گے، جو ایک خلا محسوس کر رہے تھے اور اپنی گہری ضروریات کو پورا کرکے اپنے کو مطمئن کرنے کے خواہش مند تھے، اسی کے ساتھ اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آخر میں یہی کہا جا سکتا ہے، کہ عربوں نے یہودی و عیسائی خیالات کو کچھ ترمیم کے ساتھ قبول کیا، اس ترمیم کی وضاحت یہ کی ہے کہ انھوں نے تقدیر یا دہر کے بجائے اپنے خیالات کو خدا سے وابستہ کر رکھا تھا۔ عربوں میں خدا کا خیال اس حد تک

حالانکہ یہ تھا کہ وہ اپنے توہمی مراسم کو بھی خدا کے حکم ہی سے منسوب کرے، یہاں سے مصنف کا احتمال آگے بڑھتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں، کہ مکہ سے ابرہہ کی مراجعت کی یہ ابتدائی تعبیر قرآن سے پہلے کی ہو سکتی ہے، اور یہ خیال کہ عاد اور ثمود کے پیغمبر ہودؑ اور صالحؑ تھے، غالباً قرآن سے پہلے کا تھا، اور یہودیت اور عیسائیت کے تخیل نبوت سے لیا گیا ہے، یہ احتمال ان کی اس تحریر سے بھی ظاہر ہے، کہ محمد سے پہلے مسیلمہ نے پیغمبری کا جو دعویٰ کیا اس سے ظاہر ہے کہ نبوت کا خیال وہاں جڑ پکڑ چکا تھا، (ص ۳۹) معلوم نہیں مصنف نے یہ کیسے لکھ دیا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا، یہ تو اسلام کی ہر معمولی تاریخ سے معلوم ہو سکے گا کہ مسیلمہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن آپ کی زندگی میں اس کی آواز نہیں سنی گئی، حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں اس کی آواز ابھری تو اس کے خلاف فوج کشی کی گئی اور وہ وحشی بن حرب کے ہاتھوں قتل ہوا۔

اس قسم کی غلط بیانی اور احتمال کی خامہ فرسائی کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ہیں کہ محمدؐ کی سیرت کے مطالعہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں کیونکہ اس سلسلہ کی بہت سی تفصیلات متنازعہ فیہ ہیں لیکن اس کا احساس رکھنا ضروری ہے کہ ایسی خبریں ہوا میں محمدؐ کے پاس قرآن آنے سے پہلے تھیں، اور یہ آپ کی ذات کی تیاری اور آپ کے مشن کے ماحول کا جز ہو گیا، (ص ۲۹) اپنے قلم کی چابکدستی ظاہر کی ہے،

اس کے بعد مصنف نے اپنا ابتدائی باب ختم کر دیا ہے، لیکن اس میں ان کے یقینیات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بیجا معلولات کو زیادہ دخل ہے، وہ بظاہر، غالباً، اندازہ کیا جاتا ہے، ہوگا، رہا ہوگا، شاید اور خیال ہے۔ احتمال ہے، وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا زیادہ لیتے ہیں، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس کا سمجھنا آسان نہیں،

وہ یہ بھی لکھنا چاہتے ہیں، کہ رسول اللہؐ کی نبوت سے پہلے عرب کچھ نہ کچھ وحدانیت سے متاثر تھے۔ ان پر یہودیت اور عیسائیت کے تخیل وحدانیت کا بھی کچھ اثر پڑا، لیکن جب وہ یہ کہتے ہیں محمدؐ کی سیرت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں۔

قرآن مجید میں وہی سب کچھ ہے جو توراۃ اور انجیل میں ہے، انجیل میں بھی وہی سب کچھ تھا، جو توریت میں تھا، قرآن مجید میں ہے۔

"پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰؑ کو بھیجا، توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا، خود ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی، اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا، اس کی تصدیق کرنے والی تھی۔ خدا ترس لوگوں کے لئے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی، ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں جو اس کے آگے موجود ہے، اس کی تصدیق کرنے والی اور اسکی محافظ و نگہبان ہے۔" (المائدہ۔ ۱۵ رکوع)

پھر بہت صاف صاف قرآن مجید ہی میں ہے۔

"جو کچھ قرآن میں بیان کیا جارہا ہے، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں، ان ہی کی تصدیق ہے۔ (سورہ الرعد رکوع ۱۲)

رسول اللہؐ کے زمانہ میں آج کل کے مستشرقین کی طرح یہ بھی اعتراض ہوا کہ قرآن مجید میں اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں۔ قرآن مجید میں ہے۔

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے، تو

کہتے ہیں کہ اجی یہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، یہ باتیں وہ اس لئے کہتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پورے اٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی ہیں جنھیں یہ بنائے جہالت گمراہ کر رہے ہیں، دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری ہے، جو یہ اپنے سر پر لے رہے ہیں۔ (النحل۔ رکوع ۳)

قرآن مجید میں یہ بھی ہے کہ۔

دوسری طرف خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمھارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اتری ہے، اس طرح کے نیکوکاروں کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر تو ضرور ہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ (النحل۔ ۱۴ رکوع۔۴)

جب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں وحدانیت کی کوئی باضابطہ تحریک ہونے کی کوئی اچھی شہادت نہیں، تو پھر قیاسات اور تاویلات کی گھنی جھاڑیوں میں قلم کا گھوڑا دوڑانا کہاں تک صحیح ہے۔

اصلی یہودیت اور اصلی عیسائیت میں توحید کا جو تصور تھا، وہ ضرور اسلام میں آیا۔ اصل توریت اور اصل انجیل میں توحید کی وہی تعلیمات تھیں، جو اللہ تعالےٰ نے اپنے خاتم النبیین کے ذریعہ سے کلام پاک میں پیش کیں، اگر ان تینوں ربانی صحیفوں میں توحید سے متعلق ایک ہی بات نظر آئے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، خود اللہ تعالےٰ نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ ایک بات مان لو جو تمھارے یہاں بھی وہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ — کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات

كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ ۔ (آل عمران ۔ ۶۳)

کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں۔

مفسرین نے اس کی تفسیر میں یہ لکھا ہے :۔

البتہ کلام پاک میں توحید کی وہ تعلیم نہیں جو تحریف شدہ توریت اور انجیل میں ہے، مثلاً یہود کہتے ہیں، کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، مسیحیوں نے بھی دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، اصل انجیل میں ایسی کوئی تعلیم نہیں، اور نہ اس میں یہ کہا گیا کہ اللہ یسوع مسیح اور مریم تینوں ایک ہیں اسے تین مت کہو ایک کہو، اصل انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی، کہ میری ماں کو معبود مانو، یہود و نصاریٰ نے تو اللہ کو چھوڑ کر احبار و رہبان کو بھی اپنا رب بنا رکھا تھا، قرآن مجید نے ایسے تمام عقائد کی تردید کی۔

قرآن میں ہے :۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ
وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ
ذَٰلِكَ قَوْلُهُم بِأَفْوَاهِهِمْ
يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا
مِن قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ
يُؤْفَكُونَ ۔ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ
وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ
اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا

یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے،
عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے،
یہ بے حقیقت باتیں ہیں، جو وہ اپنی
زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی
دیکھا دیکھی، جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا
ہوئے تھے، خدا کی مار ان پر، یہ کہاں
سے دھوکا کھا رہے ہیں، انھوں نے
اپنے علما اور درویشوں کو ....

رُوا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا
وَّاحِدًا، لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ
عَمَّا یُشْرِکُوْنَ، یُرِیْدُوْنَ
اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَا
ھِھِمْ وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ
نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ

(توبہ ۔۔۳۰ تا ۳۲)

اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے۔
اور اسی طرح مسیح ابن مریم کو بھی
حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا
کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا
تھا، وہ جس کے سوا کوئی مستحق عبادت
نہیں پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں
سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، یہ لوگ
چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں
سے بجھا دیں، مگر اللہ اپنی روشنی کو
مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ
کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کی جس اصل تعلیم کو بھلا دیا تھا، اللہ تعالےٰ نے اپنے خاتم النبیینؐ کے ذریعہ سے اپنے آخری صحیفۂ آسمانی میں یاد دلا دیا، اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اسکی تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کا اثر ہے یا یہودیوں اور عیسائیوں کی سنی سنائی یا ان سے حاصل کی ہوئی باتوں کو قرآن مجید میں جمع کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید نے تو ان کے یہاں جو بگڑی ہوئی تعلیم تھی، اسکو رد کر کے اس کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ کے لغوی اور نحوی اشتقاق کی بحث تو پرانی ہے، جس کو چھیڑ کر اس مفہوم کو گنجلک کر دیا گیا ہے، چاہے اس پر جتنی بحث کیجائے، مسلمان عام طور سے یہی سمجھتے ہیں، کہ یہ عربی لفظ ہے، عربی کے الٰہ سے مشتق ہے، اور یہ تسلیم کہ یہ کلدانی اور سریانی کے الاہیا یا عبرانی کے الوہ سے مشتق، اور یہ تسلیم کہ قرآن سے پہلے جاہلی شعراء کے یہاں یہ لفظ تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کلدانی، سر

جوانی پسند والوں اور جاہلی شاعروں کے یہاں اور قرآن اور اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے؟ اللہ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ ایام جاہلیت میں توحید تھی۔ تو پھر مصنف کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کہ اس زمانے میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی، (ص ۲۳) پتھروں اور درختوں کی پوجا ہوتی تھی، (ص ۲۳) خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کو خیال رہا کہ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کو وہ رد کر دیں اسی طرح وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی۔ (ص ۲۸) وغیرہ وغیرہ ایام جاہلیت میں اللہ کا ذکر ضرور ہے۔ اور کچھ تھوڑے سے لوگ توحید کے قائل رہے، لیکن اس زمانہ کے عام لوگوں کا یہ مقصد رہا۔ کہ اللہ کے سوا اور بھی معبود (الہ) ہے، اس کے کچھ شریک بھی ہیں، اس میں اور جنوں میں باہم کوئی رشتہ قائم ہے، اس کے بیٹے اور بیٹیاں بھی ہیں وغیرہ، اسی لیے ایم، اے میور کو بھی یہ لکھنا پڑا۔ کہ اس زمانے میں بت پرستی اور بنو اسمٰعیل کے بیہودہ اعتقادات کی لہر جوش مارتی ہوئی کعبہ سے آکر ٹکراتی تھی۔ (دیباچہ ۱۱ ۷ x) قرآن مجید نے ایسے تمام باطل عقائد اور توہمات کی تردید کی، اور اللہ کے تصور میں اس کی وحدت، وحدانیت، مشیت، وسعت قدرت، رحمت، محبت کی ایسی اعلیٰ تعلیم پیش کی جو موجودہ توریت اور انجیل میں بگاڑ دی گئی تھی، جس کو قرآن مجید اور اسلام نے پھر سے استوار کر کے نکھار دیا، واضح رہے، کہ جس زمانے میں وحی الٰہی آئی اس نے خدا پرستی میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں سکھائی، پرانی ہی باتوں کی تعبیر انسان کے وجدانی عقائد و تصورات اور علم کے مطابق کر دی، اس حقیقت کو مستشرقین اپنے مخصوص طرز کے معروضی مطالعہ کے ذریعہ جس رنگ میں چاہیں پیش کریں، مگر حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ہی رہے گی

خود قرآن مجید میں ہے:-

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ — اے نبی تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے۔

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ۔
سورۂ حٰم السجدہ۔ رکوع ۶

اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو کہی جا چکی ہو، بے شک تمہارا رب بڑا ہی درگزر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی دردناک سزا دینے والا بھی ہے۔

اسلام کی یہ صریح تعلیم ہے کہ تمام سچے مذاہب درحقیقت ایک ہی ہیں، ایک ہی پیغام ہے جو آدمؑ سے لیکر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا، میرے استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک مضمون "رسول وحدت" میں اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کئے ہیں، دین اور شریعت جس کو منسک اور منہاج بھی کہتے ہیں، دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں، جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہو۔ مثلاً خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کی صفات کاملہ، انبیاؑ کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اچھے اخلاق اور برے اعمال کی جزا و سزا، یہ وہ اصل دین ہے، جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، اس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاؑ آئے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں، نہ قوم و ملت کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہوا تو یا تو طریقۂ تعبیر کی غلطی ہے، یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں، اور اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ہے، دوسری چیز یعنی شرعۃ منہاج اور منسک وہ جزئیات احکام ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے

بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادت الٰہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہے، عبادت
کی سمتیں الگ الگ رہیں، اعمال فاسدکے انسدادکی تدبیریں جداجدا ہیں، اب قرآن کے نقطۂ نظر
سے مذاہب کے اختلاف کا یہ مطلب ہے کہ اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی صداقت ہے
ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے، البتہ متفقہ حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں
کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہتے ہیں، دنیا میں انبیاء
علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا ہے کہ وہ اسی ازلی اور ابدی صداقت
کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں، اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں، اور ساتھ ہی اپنی قوم
و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لئے مناسب
ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں، انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ
ایک صاحب شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت بھیجا گیا ہے جب
پہلا صحیفہ کھو گیا ہے، یا ذہنی تحریکات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ
ہوگئی ہے، حضرت ابراہیم کے صحیفوں کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ پر تورات نازل ہوئی
اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور وغیرہ مختلف صحیفے آتے رہے، جو عہد نامۂ
قدیم میں موجود ہیں، پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی اور جب اس میں انسانی اختراعات
کا دخل ہوگیا تو قرآن اترا۔

باب - ۲

اس باب میں مصنف نے پہلے یہ بحث چھیڑی ہے، کہ رسول اللہ صلعم کے آباؤ اجداد کو
مکہ میں اہمیت حاصل تھی، کہ نہیں، ان کا جو طرز استدلال عام طور سے اس کتاب میں ہے، وہی
اس باب میں بھی ہے، ظاہر ہے، کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں آپ کے اسلاف سے

سے نرم کچھ شکوک ضرور پیدا کر دینا چاہتے تھے، اسی لیے اپنے خاص سلسلہ معلومات سے پھر کام لیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق مولانا شبلی رقم طراز ہیں، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاندان اگرچہ ابا عن جد معزز اور ممتاز چلا آتا تھا لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے فہر کو ملا، اور ان ہی کی اولاد قریش ہے۔ نضر کے بعد فہر اور فہر کے بعد قصی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی علیل خزاعی تھے، قصی نے علیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حبی تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے علیل نے مرتے وقت وصیت کی، کہ حرم کی خدمت قصی کو سپرد کی جائے۔ اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا۔ قصی نے ایک دار الشوریٰ قائم کیا جس کا نام دار الندوہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے، تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے - - - - - - - - - ، قصی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رفادہ جو خدام عرب کا سب سے بڑا منصب تھا، ان ہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کوس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے، قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی، جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا۔ کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے۔ جس پر ایام حج میں چراغ جلائے جاتے تھے، قصی نے اس قدر شہرت اور اعتبار حاصل کیا، کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب ان ہی کو ملا، علامہ ابن عبد ربہ نے

عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے، کہ قصی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کو آس پاس بسایا، اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں۔ قصی کے بعد قریش کی ریاست ان کے منجھلے بیٹے عبد مناف نے حاصل کی اور ان ہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے۔ عبد مناف کے دوسرے بیٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے ذمہ حرم کے زائرین کیلئے سقایہ اور رفادہ کی خدمت سپرد ہوئی، انھوں نے یہ فرض نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو سیر چشمی سے کھانا کھلانے کے لیے سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، روم کے قیصر اور حبش کے بادشاہ سے عرب تاجروں کے لیے ٹیکس معاف کرایا، جس سے قریش کے قافلۂ تجارت کی عزت بڑھی، عرب کے مختلف قبائل میں دورہ کر کے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروانِ تجارت کو ضرر نہ پہنچایا جائیگا۔ ایک دفعہ قحط پڑا، تو ہاشم نے شوربہ میں روٹیاں چورا کر کے لوگوں کو کھلائیں، اسی لیے وہ ہاشم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۱۲۲-۱۲۵)

مگر ہمارے مصنف نے ان کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ حجاج کی دیکھ بھال کا معاملہ ایک ادنیٰ درجہ کی چیز تھی، تجارت سے بڑے منافع حاصل ہوتے تھے، اس لیے یہ کام ہاشم کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ (ص ۳۰)

وہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے دادا عبد المطلب کے متعلق لکھتے ہیں کہ انھوں نے چاہ زمزم کی کھدائی کر کے یہ تو ثابت کر دیا کہ ان میں کام کے ابتدا کرنے اور سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت ہے اور خانۂ کعبہ کی عزت برقرار رکھنے میں بھی حصہ دار تھے، لیکن اس اعتراف کے باوجود وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے، کہ مکہ میں نمایاں آدمی تھے مگر کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود ان کو یہ معلوم ہو سکا کہ حجاج کو پانی فراہم کرنے کا حق ان ہی کو تھا، پھر ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لکھتے ہیں، کہ ان کی لڑکیوں کی شادی

مکہ کے بعض بہترین اور طاقتور ترین خاندانوں میں ہوتی، یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ جب مکہ
پر ابرہہ کا حملہ ہوا تو وہی صلح و صفائی کے لئے بھیجے گئے، اس کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے
کہ وہ مکہ کے لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے ملے پھر لکھتے ہیں کہ ان کے
ملنے کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن جب ابرہہ کی مراجعت ہوئی، تو ان کی حکمت عملی کی خود بخود نفی
ہو گئی، پھر اپنی عادت کے مطابق قیاس سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہم نہیں بتا سکتے، کہ
ابرہہ سے ملنے کے بعد عبد المطلب کا اثر بڑھا کہ نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ان کی وفات ہو گئی
لیکن یہ بہت آسانی سے بتا سکے کہ ابرہہ سے ان کے ملنے سے اندازہ ہوتا ہے، کہ ان کے قبیلہ
حال برا ہو رہا تھا، اس قسم کا اندازہ لگانے میں مصنف بہت ماہر ہیں،

مصنف نے عبد المطلب کی اہمیت بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے پیش رو سوانح
نگاروں میں میور نے ان کی عظمت اور سطوت کی پوری تصویر اپنی کتاب دی لائف آف محمد میں
پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ چاہ زمزم کی کھدائی عبد المطلب کی زندگی میں بڑی کامرانی تھی
دوسرے کنوئیں چھوڑ دیے گئے، اور سب اس کی طرف مائل ہوئے، عبد المطلب اس
تمام زائرین کو پانی مہیا کرتے، اور بہت جلد کعبہ کے حصہ دار ہو گئے، ان کی شہرت بڑھ
چلی گئی، ان کے خاندان کے طاقتور بیٹوں نے ان کے رتبہ کو اور بڑھایا، اور وہ مکہ کے
سردار بن گئے، ان کی یہ سرداری ان کی وفات تک رہی، میور نے یہ بھی لکھا ہے، کہ
امیہ کے قبیلہ کو عبد المطلب کی خوشحالی اور شہرت سے رشک پیدا ہوا تو اس کے لڑکے
حرب نے اپنی فوقیت دکھانے کی خاطر عبد المطلب کو چیلنج دیا، لیکن ایک قریشی
ثالث بن کر عبد المطلب کی برتری کا فیصلہ دیا، جس کو حرب نے تسلیم نہیں کیا، اسی وقت
بنو ہاشم اور بنو امیہ میں رشک و حسد پیدا ہونا شروع ہو گیا، عبد المطلب کے اقتدار

حالت میں اس وقت بھی اضافہ ہوا، جب انھوں نے مکہ کے بنو خزاعہ سے باہمی اعتماد
کا معاہدہ کیا، یہ معاہدہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا، اور جب ابرہہ نے مکہ پر کعبہ کو منہدم
کرنے کے لیے حملہ کیا، تو مکہ کے لوگوں نے عبدالمطلب ہی کو اور سرداروں کے ساتھ
ابرہہ کے پاس بھیجا، ابرہہ نے اس حملہ میں عبدالمطلب کے دوسو اونٹ پکڑ کر ضبط
کر لیے تھے، عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے، تو اس نے ان کی بڑی عزت کی، اس نے
اون کے اونٹوں کو اس امید پر واپس کر دیا کہ وہ کعبہ کے ہدم کرنے میں مدد دیں۔
عبدالمطلب نے اس کی بات نہیں مانی، بات آگے نہیں بڑھی عبدالمطلب مکہ واپس آئے
اپنے لوگوں کو تو پہاڑیوں کی طرف چلے جانے کو کہا، لیکن کعبہ کے دروازہ کو پکڑ کر دعا کی کہ
اے اللہ اپنے گھر کو بچالے اور صلیب کو اس پر فتح نہ عطا کر، اس کے بعد ابرہہ کی فوج
میں وبا پھوٹ پڑی، وہ واپس ہوئی تو سمندر میں غرقاب ہو گئی، اور ابرہہ بھی صنعا
پہنچتے ہی مرگیا۔ (دی لائف آف محمد۔ دیباچہ C X V 11)

میور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب اپنے زمانہ کے اہم ترین، معزز ترین اور
متمول ترین سرداروں میں تھے، مگر منٹگمری واٹ کی تحریروں سے ان باتوں کی
تردید ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے حریف ہونے کی روایت
مشکوک ہے، کیونکہ یہ بات زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے، پھر وہ یہ کہتے ہیں، کہ
عبدالمطلب ابرہہ سے مکہ کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں ملے، بلکہ ایک اقلیت کی طرف
سے نمایندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور ابرہہ سے جاکر ملنے کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے
کہ ان کے قبیلہ کی حالت بدتر ہوتی جارہی تھی، اس قسم کے اندازے لگانا ایک مورخ کے
شایانِ شان نہیں، بہرحال میور اور منٹگمری میں کون صحیح ہے، اس کا اندازہ لگانے کے

بجائے یہ تو آسانی سے کہا جا سکتا ہے، کہ یہ یورپی اہل قلم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہیں لکھیں اور اپنے زور قلم سے لکھ کر ناظرین کو متاثر کریں، ڈی لیسی جانسٹن نے اپنا زور قلم یہ لکھ کر دکھایا ہے، کہ زمزم کی کھدائی کے بعد عبدالمطلب کا رتبہ اور اقتدار اپنے باپ سے زیادہ بڑھ گیا تھا، اور جو فضیلت قصی کو حاصل تھی، وہ ان کو حاصل ہو گئی، اور ان کی شہرت بڑی بلندی پر اُس وقت پہنچی، جب ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا، لیکن وہاں سے اپنی فوج سمیت موت کے گھاٹ اترا۔ (ص ۴۰-۳۹)

حلف الفضول کی تفصیل طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۸۲ کے حوالے سے مولانا شبلیؒ نے یہ لکھی ہے، کہ لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھر برباد کر دیئے تھے قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے، یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی تحریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس ہوئے تو زبیر بن عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور خاندان کے سرگروہ تھے، یہ تجویز پیش کی، چنانچہ خاندان ہاشم زہرہ اور تیم عبداللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک تھے، اور عہد نبوت میں فرمایا کرتے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھکو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے تو میں نہ بدلتا۔ اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جائے تو میں حاضر ہوں (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۸۳) اب اسی بات کو مصنف نے کیا سے کیا کر دیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے لکھتے ہیں:-

کچھ دنوں کے لیے بنو ہاشم کی قیادت زبیر بن عبدالمطلب کے سپرد کر دی گئی، یہ فجار اور حلف الفضول کا زمانہ تھا، زبیر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔

حلف الفضول کمزور قبیلوں کے اتحاد کا معاہدہ تھا، اس میں نمایاں حصہ عبداللہ بن جدعان نے لیا، کیونکہ اس کا اجتماع اس کے گھر میں ہوا تھا، وہ فجار کی جنگ کے موقع پر مکہ کے اہم آدمیوں میں تھا۔ (ص ۳۲)

اوپر کی سطروں میں تو یہ لکھ گئے ہیں کہ حلف الفضول کمزور قبیلوں کا باہمی معاہدہ تھا، لیکن آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

فجار کی جنگ اس وقت ہوئی جب محمد پندرہ اور بیس کی عمر کے درمیان تھے، اور کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں اپنے چچاؤں کی طرف سے اس میں تھوڑا حصہ لیا، وہ حلف الفضول کے موقع پر شاید موجود تھے، کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی تعریف بھی کی، اس معاہدہ کا مقصد نسبتہً مضبوط تر اور متمول تر قبیلوں کی بدعنوانیوں کے خلاف انصاف کو برقرار رکھنا تھا، اور یہ مقصد قرآن کی تعلیمات کے بعض مقصد سے بہت قریب تھا۔ (ص ۳۳)

مولانا شبلیؒ کے بیان سے تو ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ اس لیے ہوا کہ ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا۔ لیکن مصنف نے اپنی طرف سے یہ اختراع کیا، کہ یہ معاہدہ مضبوط اور متمول قبیلوں کے خلاف کمزور قبیلوں کی طرف سے تھا، دونوں تعبیروں میں کافی فرق ہے۔

زبیر بن عبدالمطلب کی نمایاں حیثیت کو مصنف نے اس لیے کم کرنے کی کوشش کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، وہ ابو طالب کی بھی اچھی تصویر نہیں کھینچتے، وہ لکھتے ہیں کہ ابو طالب اپنے قبیلہ کے سردار تھے۔ (ص ۴۲) لیکن مولانا شبلیؒ کی تحقیق ہے کہ عبدالمطلب کی مسند ریاست پر حرب متمکن ہوا، جو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں صرف سقایہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عباسؓ کے ہاتھ میں رہا جو عبدالمطلب کے

سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ (سیرۃ النبی ج ا ص ۱۰، ۱۴۲) ابوطالب برابر تجارت کرتے رہے، لیکن مصنف کا بیان ہے کہ ان کی غربت کی وجہ سے محمدؐ ان کے لڑکے علی کو اپنے ساتھ رکھنے لگے، یہ صورت حال اس لیے پیدا ہو گئی تھی، کہ ابوطالب میں نمایاں خوبیاں نہ تھیں، پھر عبدالمطلب کی وفات سے پہلے اس قبیلہ کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا (ص ۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد بزرگوار کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ شاید محمدؐ کی پیدائش سے پہلے وفات پا گئے تھے، (ص ۳۲) اور محمدؐ کی پیدائش شاید ان کے والد کی وفات کے بعد ہوئی، (ص ۳۳) مصنف نے اس تحریر میں "شاید" لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، کیونکہ اس میں کسی کو شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ہو گئی تھی، میور نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کی وفات محمدؐ کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گئی تھی، (باب اول ص ۴) مارگولیتھ نے تو صاف طور پر لکھا ہے کہ یہ یقینی ہے کہ مستقبل کے پیغمبر کے والد کی وفات بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہو گئی (ص ۴۵)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ کی اہمیت کو مصنف نے اپنی معروضی تحقیق سے ایک بار پھر گھٹانے کی کوشش کی، پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے یہ اثر پڑتا ہے۔ کہ محمدؐ کا قبیلہ مکہ کی زندگی میں ایک زمانے میں آگے آگے تھا، لیکن محمد کے مشن کے آغاز سے پہلے یہ زوال پذیر تھا، یہ محض کمزور اور غریب قبیلوں کا ایک نمایاں رکن تھا، اس کے افراد شام کی تجارت سے دلچسپی لیتے رہے، لیکن شاید عبد شمس اور مخزوم قبیلوں کی طرح بڑی تجارت کے حصہ دار نہ تھے، (ص ۳۳) مصنف کا سخن تکیہ شاید اور غالباً ہے، اس کی آڑ لے کر وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں، شاید اور غالباً جیسے الفاظ بھی مورخانہ تحقیق پر دلالت نہیں کرتے۔

مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی تاریخ سنہ ۵۷۰ء لکھی ہے، اس
کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، صرف یہ لکھ دیا ہے کہ عام طور سے یہی خیال کیا جاتا ہے۔
میورنے یہی تاریخ لکھی ہے۔ مارگولیتھ نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، اروِنگ نے سنہ ۵۶۹ء
کی تاریخ لکھی ہے (ص ۲۴) مولانا شبلیؒ نے ولادت کی تاریخ ۹ ربیع الاول روز دوشنبہ
مطابق ۲۰ اپریل سنہ ۵۷۱ء لکھی ہے، اس کی سند میں رقم طراز ہیں کہ مصر کے مشہور ہئیت داں
عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ میں دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۱۱۰)
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے جو واقعات قصے کے طور پر درج
ہیں، ان کے متعلق مصنف کا طرز استدلال وہی ہے، جو عام طور سے ان کی اس کتاب میں
ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شادی سے پہلے کے بہت سے قصے ہیں، جو دینی انداز کے ہیں،
مگر ایک سیکولر مورخ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، یہ اس لیے بھی کہ ان واقعات کا ذکر
محمدؐ کی آیندہ زندگی میں نہیں کیا جاتا، اور نہ ان کی کوئی سند ہے، اس کے بعد اپنی تحریر کا
رخ بدل کر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان کو اہمیت دیتے ہیں، اس لحاظ سے
وہ ان کے لیے سچے ہیں، اور ان کے پیغمبر کی زندگی کے آغاز کا ایک مناسب دیباچہ ہے۔
اور پھر وہ اپنے شاید سے کام لیکر لکھتے ہیں، کہ شاید ان کے بیان کرنے کا طریقہ ایسا ہے کہ
جیسے یہ آنکھوں دیکھا حال ہے، اور مثال میں ابن اسحٰق کی کتاب سے وہ سارے قصے
چار صفحے میں نقل کر دیے گیے ہیں، جو آپ کے ایام رضاعت سے سنِ شعور تک
بیان کیے گیے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ

حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کی رضاعت کے لیے تیار ہو گئیں، تو ان کو اتنا
دودھ ہونے لگا کہ آپ کے ساتھ آپ کا رضاعی بھائی بھی خوب سیر ہو کر

دودھ پینے لگا، اور وہ جب مکہ سے اپنے گھر واپس جانے لگیں، تو ان کی اونٹنی نے راستہ میں خوب دودھ دیا، اور اسی طرح برابر دیتی رہی، اور جس گدھی پر سوار ہوئیں وہ بہت تیز چلنے لگی، اور جس چراگاہ میں ان کی اونٹنی چرنے جاتی، وہ بہت شاداب رہنے لگی، پھر اس میں آپ کے شقِ صدر کی تفصیل بھی ہے، اور یہ بھی ہے کہ خود حضرت آمنہ نے بیان کیا کہ آپؐ جب پیٹ میں تھے، تو ان کے اندر سے ایک نور نکلا جس نے بصرہ کے محل کو منور کر دیا، پھر اس میں حضرت ابو طالب کے ساتھ آپ کے سفرِ شام کا ذکر ہے جہاں عیسائی راہب سے ملاقات ہوئی، اس نے آپ کی نبوت کی بشارت دی اور بہت سی نصیحتیں کیں۔

ابن اسحاق کی یہ تمام روایتیں غیر مستند سمجھی گئی ہیں، حضرت حلیمہ سعدیہ کی رضاعت کے سلسلہ میں جو قصے بیان کیے گیے ہیں، ان کو غیر معتبر سمجھ کر مولانا شبلیؒ نے بالکل رد کر دیا ہے۔ اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کیا ہے، انھوں نے شق صدر کے واقعہ کا بھی حوالہ نہیں دیا۔ سرسید احمد خاں نے اپنے خطبات احمدیہ میں اس کی پرزور تردید کی۔ اور لکھا کہ عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں، وہ اپنے یہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتب تواریخ اور ملوک اور قضاۃ وغیرہ داخل ہیں اور توریت و انجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ بمنزلہ وحی یعنی کلام الٰہی کے برابر سمجھتے ہیں۔ اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں، حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اسطرح انھوں نے خیال کر لیا ہے۔ کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے، اور اس خیال خام سے انھوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں

کو ناقابلِ خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن و تشنیع کی ہے، حالانکہ وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں، کیونکہ مسلمان اپنے یہاں کی روایات واحادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں۔ اور ان کو یوں ہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں، مسلمان اپنے یہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں، جب ان کے لیے کافی ثبوت اور معتمد سند پاتے ہیں۔ ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے، یہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں، صحت سے بہت دور ہیں۔ بعض علمائے اسلام ان کو محض ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ اور بیہودہ افسانے خیال کرتے ہیں، جو محض جہلا کو خوش کرنے کے لیے گھڑے گئے ہیں، پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں بڑی غلطی کی ہے کہ ان نامعتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے۔ (خطبات احمدیہ صفحہ ۶۵ - ۶۶۴)

سرسید نے یہ بات آج سے ۱۲۲ برس پہلے لکھی تھی، مگر یہ مستشرقین جن میں منٹگمری واٹ بھی شامل ہیں، دوسروں کی کب سنتے ہیں، وہ تو اپنی سی کہتا جانتے ہیں، اسی طرح بحیرا کی ملاقات کی روایت کو مولانا شبلیؒ نے بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا، وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

سرولیم میور، ڈریپر اور مارگیولس وغیرہ سب اسی واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں، اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے، اور رجو نکتے اس نے بتا دیے تھے، اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام کے

تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

مولانا شبلیؒ لکھتے ہیں، کہ بحیرا کی ملاقات میں اس کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس ملاقات کی روایت ہی بالکل ناقابل اعتبار ہے، اس کے جس قدر طریقے ہیں۔ سب مرسل ہیں، راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا جو شریک واقعہ تھا۔ (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۸۰)

منٹ گمری واٹ نے ابن اسحٰق کی ان روایتوں کو یکجا کر کے اپنی علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے، تو ان کی یہ تحقیق سعی نامشکور ہے، اور ان کو نقل کر کے ان کی تضحیک کرنا مقصود ہے، تو مسلمان محققین کب ان کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں، جو ان کی تضحیک سے وہ متاثر ہو جائیں گے۔ یا اگر وہ واقعی ان کو اس لیے مستند اور صحیح سمجھتے ہیں کہ یہ ابن اسحٰق کی روایتیں ہیں، تو پھر ابن اسحٰق کی اگر ہر روایت اور ہر رائے صحیح ہے تو ابن ہشام اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کے بھی قائل اور دعوی دار ہیں، پھر منٹ گمری واٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے الہامی کلام ہونے کا قائل اسی طرح ہونا چاہیے۔ جس طرح ابن اسحٰق، ابن ہشام اور واقدی ہیں، یہ دیانت دارانہ تحقیق نہیں کہ انکی جو رائے مصنف کی مطلب برآری کے لیے ہو، تو وہ زوروں سے اچھالی جائے اور جو ان کے لیے قابل قبول نہ ہو اس سے انکار کیا جائے۔ (باقی آئندہ)

علمائے کشمیر کی فقہی خدمات

از

ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امرسنگھ کالج، سرینگر کشمیر

کشمیر میں نمایاں طور پر دو فقہی مکتب رائج ہیں، حنفی اور اثنا عشری، مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ پہلے کشمیر میں ان کی اشاعت کا سرسری جائزہ لیا جائے تاکہ ان کے متبعین کی علمی خدمات کی اہمیت اچھی طرح سمجھنے میں مدد ملے۔

کشمیر کے مسلمان مورخین کی صراحت کے مطابق جو پہلے صوفی مبلغ کشمیر وارد ہوئے، وہ حضرت شیخ شرف الدین عبدالرحمانؒ (عرف بلبل شاہ) تھے، یہ مسلکاً حنفی تھے، انھوں نے حنفی مسلک ہی کے مطابق کشمیر کے نومسلموں میں عبادات و معاملات کی تعلیم و تلقین کی، ان کے انتقال کے تقریباً نصف صدی بعد مبلغ شہیر حضرت میر سید علی بن شہاب الہمدانی (م ۷۸۶ھ) وارد کشمیر ہوئے۔ ان کے بارے میں علماء اور مورخین متفق ہیں کہ مسلکاً شافعی تھے۔ مگر جب انھیں اپنے پیش رو مبلغ سید شرف الدین عبدالرحمان کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے حنفی مسلک کے مطابق کشمیر میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی ہے، تو انھوں نے بھی اسی کے مطابق اپنا مشن آگے بڑھایا، وہ بڑی کامیابی کے ساتھ شافعی مسلک کے مطابق اسلام کی تبلیغ و اشاعت کر سکتے تھے، مگر ان کی غرض و غایت فقہی اختلافات سے بلند و بالا ہو کر اسلام کی بے لوث خدمت تھی۔ اس لئے انھوں نے اختلافات سے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنا دامن بچایا، اور اپنی چھوٹی بڑی

سینکڑوں کتابوں میں ایک جگہ بھی کسی نزاعی مسئلے کو نہیں چھیڑا۔ اس حکمت و فراست کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیر کی سرزمین سالہا سال تک مسلکی نزاعات اور مخاصموں سے محفوظ و مصئون رہی۔ خود لارنس (Walter Lawrance) نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔[۱] تاہم اس کا یہ قول صحیح نہیں ہے، کہ کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ سے تعلق رکھنے والے مشائخ شافعی ہیں۔ حضرت شیخ یعقوب صرفیؒ کشمیر میں سلسلۂ کبرویہ کے مبلغ اور مجدد تھے، مگر وہ حنفی مسلک کے سخت معتقد تھے۔ ممکن ہے تذ بار میں کوئی ایسا بزرگ گزرا ہو جس نے سنت کے کمال اتباع میں چند مسائل میں شافعی مسلک پر بھی عمل کیا ہوگا۔ جیسا کہ ملا عبدالرزاق گوجواری کے بارے میں منقول ہے۔[۲] مگر اس کی مثال شیخ شرف الدین یحییٰ منیری یا شیخ نظام الدین اولیاء جیسے بزرگوں کی ہے، جو مسلکاً حنفی تھے، مگر قرأت خلف الامام پر بھی عامل تھے۔[۳] پروفیسر محب الحسن صاحب نے مولانا جعفر بدخشی (مرید و مجاز حضرت سید علی ہمدانی) کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ پہلے حنفی تھے پھر شافعی مسلک اختیار کیا تاہم اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کو اپنا مسلک ترک نہیں کرنے دیتے تھے۔[۴] اس تبدیل مسلک کی وجہ شاید یہ رہی ہو گی کہ حضرت سید علی ہمدانیؒ کو حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ کی ذات سے والہانہ عقیدت تھی، اور وہ سلسلۂ کبرویہ کے ممتاز مبلغ بھی تھے، حضرت شیخ کبریٰ مسلکاً شافعی تھے۔[۵] اس زمانے میں مرید اپنے مرشد کی پوری پوری متابعت میں ایسا کرتے تھے۔ چنانچہ اسی زمانے میں حضرت چلپی حسام الدینؒ نے بھی جو

---

[۱] The valley of Kashmir p265 [۲] تاریخ حسن۔ مولوی غلام حسین ج۲ ص۲۹۴ [۳] نزہۃ الخواطر ج۲ ص۲۵۰ [۴] Kashmir under The Sultans. P87-58 [۵] حضرت شیخ "خیوت" گاؤں کے رہنے والے تھے اس گاؤں کے سارے باشندے شافعی تھے۔ معجم البلدان۔ یاقوت الحموی الرومی ج۲ عنوان "خیوت" نیز دیکھئے برہان دہلی، راقم کا مضمون شیخ نجم الدین کبریٰ بابت مئی و جون ۱۹۶۹ء

بہاؔ شافعی تھے۔ اپنے مرشد نامدار حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ سے جو حنفی تھے اس مسلک پر ل کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی، مگر مولانا نے انھیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔[۱]

جب حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کشمیر تشریف لائے تو گو اس وقت یہاں اسلام داخل ہو چکا تھا اور پھیل بھی چکا تھا مگر شیخ شرف الدین کے نقوش دھندلے ہو گئے تھے، اور مسلمان صرف نام کے مسلمان ہو گئے تھے، جو تمام غیر شرعی رسوم و عادات پر عمل کرتے تھے اس کا اندازہ اس بات سے ہو گا کہ سلطان قطب الدین جس نے حضرت امیر کبیرؒ کا ان کے ورود کشمیر پر تپاک اور والہانہ استقبال کیا تھا، مسلمان ہونے کے باوجود اس بنیادی مسئلے کی اہمیت تک سے بھی آگاہ نہ تھا کہ اسلام میں ایک ساتھ دو سگی بہنوں کو نکاح میں رکھنا قطعاً حرام ہے۔ ... خود اس حرام کا مرتکب تھا۔

سلطان قطب الدین بسبب قلت رونق احکام شرعی دو خواہر اعیانی را در عقد نکاح خود گرفتہ بود[۲]	سلطان قطب الدین احکام شریعت کی عدم اشاعت کی بنا پر دو سگی بہنیں ایک ساتھ نکاح میں رکھے ہوئے تھا

چنانچہ میر سید علی ہمدانی نے سب سے پہلے یہی اہم اصلاحی کام انجام دیا کہ سلطان کو اسلام کے ازدواجی احکام سے باخبر کیا۔ سلطان نے بھی خوشی خوشی ایک بیوی کو طلاق دیدی۔

نوربخشی (شیعہ) فقہ کی اشاعت ہندوستان میں شیعی علماء اور مبلغین بہت پہلے وارد ہوئے ہیں، باطنیت کے مبلغین، جو شیعہ فرقہ ہی کی ایک شاخ تھی[۳]، اپنے عروج اور ترقی کے ابتدائی دور ہی میں ہندوستان وارد ہوئے تھے، یہاں تک کہ بعض محققین کے نزدیک کشمیر میں بھی میر سید علی ہمدانی وغیرہ

---

[۱] صاحب مثنوی۔ قاضی تلمذ حسین، صاحب، ص ۲۳۰ [۲] بہارستان شاہی (قلمی)
[۳] بہارستان شاہی (قلمی)، اسرار الابرار (قلمی)، داؤد مشکوتی محدث[۴] المذاہب الاسلامیہ، مولفہ پروفیسر محمد ابو زہرہ مصری ملاحظہ کی جائے۔

مبلغین سے طویل عرصہ قبل یہ لوگ پہنچے تھے۔[1] مگر ہندوستان میں شیعہ علمار کو اپنا مسلک پھیلانے کا اچھا موقعہ اُس وقت رہا جب بہمنی دور میں دکن میں خواجہ محمود گاواں منصب وزارت پہ فائز ہوا، اس نے ان علمار کی ہمت افزائی کی۔ اس کے علاوہ بقول علی اصغر حکمت جب اکبر اور ہمایوں کے تعلقات شاہ طہماسپ کے ساتھ مضبوط ہوئے تو اس قربت اور ثقافتی و سفارتی تعلق نے بھی ہند میں شیعہ مذہب کو وسیع پیمانہ پر پھیلانے میں مدد فراہم کی، اسی کے ساتھ سلاطین اودھ نے بھی اس کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا۔[2]

جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے تو جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے یہاں صدہا سال تک صرف حنفی فقہ رائج رہی اور کشمیر کسی دوسرے فقہی مکتب سے مطلق ناآشنا رہا بعض شیعی علمار کا دعویٰ بلا دلیل ہے کہ امیر کبیر سید علی ہمدانی بذات خود شیعہ تھے اور آپ کے رفقا بھی اسی مذہب کے علمبردار تھے۔ ملّا نور اللہ شوستری نے یہ دعویٰ زیادہ پُرجوش طریقہ پر پیش کیا ہے مگر اُن کے دلائل بھی وزن سے خالی ہیں۔[3] وہ مولانا عبدالرحمٰن جامی پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ انھوں نے شیعہ مذہب اور شیعہ علمار سے عناد رکھنے کی بنا پر حضرت سید علی ہمدانی کا تذکرہ شرح و بسط سے نہیں لکھا ہے۔[4] عصر حاضر کے شیعہ اہل قلم حضرات میں علی اصغر حکمت اور آغا بزرگ بھی ملّا شوستری ہی کی تائید کرتے ہیں۔[5] مگر پروفیسر محب الحسن صاحب لکھتے ہیں کہ ملّا شوستری کی خاص عادت یہ ہے کہ جہاں کہیں اسلام میں کسی نامور شخصیت پر ان کی نظر پڑی تو وہ اُسے شیعہ قرار دیتے ہیں۔[6]

---

[1] دعوت اسلام (آرنلڈ) اردو ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی ص ۲۳۴-۲۳۵

[2] سرزمین ہند۔ علی اصغر حکمت ص ۷، [3] اس کے لیے راقم کی تصنیف "کشمیر میں اسلام کی اشاعت" کا ضمیمہ عدد ۲ دیکھا جاسکتا ہے۔ ص ۲۲۳ تا ۲۲۷، [4] مجالس المومنین، مجلس ششم۔ ص ۳۱۱ [5] الذریعۃ الی تصانیف الشیعہ۔ ج ۱۰، ص ۲ و سرزمین ہند۔ ص ۷۶۔

[6] Kashmir Vnder The Sultans-

کشمیر کی مورخین اس پر متفق ہیں کہ سب سے پہلے ۸۹۲ھ میں عراق کا ایک مبلغ میر شمس الدین کشمیر وارد ہوا۔ اسی نے پہلے خفیہ طور پر شیعیت کی یہاں بنیاد ڈالی پھر چک امراء اور سلاطین کی معاونت سے کھل کر میدان میں آیا۔ میر شمس الدین عراقی نے اپنے مذہب و مشرب پر نور بخشیت کا غلاف چڑھایا۔ اس نے اپنے آپ کو سید محمد نور بخش کا خلیفہ اور ان ہی کو میر سید علی ہمدانی کا خلیفہ بتایا مگر میر شمس الدین کے عقائد کے مطالعہ کے بعد یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد نور بخش حضرت سید علی ہمدانی کے خلیفہ رہے ہوں گے کیونکہ میر شمس الدین عراقی نے سید محمد نور بخش کی طرف جو عقائد منسوب کئے ہیں ان میں اور غالی شیعہ لوگوں کے عقائد میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا ہے۔ اسماعیلی خوجوں کی تاریخ تذکرہ نیں میں بھی نور بخشیوں کو اسماعیلی بتایا گیا ہے[1]۔ ڈریو (Fredric K Drew) نے بھی عام شیعوں اور نور بخشیوں کے کچھ اختلافات ذکر کئے ہیں[2]، تاہم بعض قدماء کا یہ بھی خیال تھا کہ سید محمد نور بخش کے عقائد سنیوں کے عقائد تھے، چنانچہ جب میر شمس الدین کی تصنیف احوط، جسے انھوں نے سید محمد نور بخش کے افادات اور فرمودات کا مجموعہ قرار دیا ہے، کا ایک نسخہ ہمایوں کے دربار میں پہنچا تو اس نے علماء سے اس کے بارے میں رائے طلب کی، علماء نے کہا کہ سید محمد نور بخش کے عقائد اہل سنت والجماعت کے عقائد تھے، جو اس کتاب کے مصنف سے کوئی میل نہیں کھاتے ہیں۔ کشمیر کے ایک قدیم مورخ سید علی یہ واقعہ اس طرح لکھتے ہیں:۔

چوں کتاب مذکور پیش ہمایوں بادشاہ رسد	جب یہ کتاب ہمایوں بادشاہ کے سامنے پہنچی
ہمایوں بادشاہ علما و صلحا را جمع کردہ این	تو اس نے علما و صلحا کو جمع کر کے کہا کہ اسے
کتاب را ملاحظہ کردند، دیدند کہ عقائد	ملاحظہ کریں، انھوں نے اسے ملاحظہ کرنے کے
اہل سنت و جماعت سید محمد نور بخش را بود	بعد کہا کہ سید محمد نور بخش اہل سنت و جماعت

[1] آب کوثر ڈاکٹر شیخ محمد اکرام حوم طبع دوم۔ ص ۳۰۵ Jammu And ...

[illegible] بود۔ امّا عقائد ایں صاحب کتاب عقائد رافضی است۔[1]

عقائد پر کاربند اور سنی تھے مگر اس کتاب کے مصنف کے عقائد تمام تر شیعی ہیں۔

بہر کیف میر شمس الدین عراقی کشمیر میں شیعہ فقہ اور عقائد پھیلانے میں کامیاب ہوئے۔ اول اول انہیں علمائے اہل سنت کے ہاتھوں سخت مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر جب چند سرکردہ سیاسی لیڈروں کو شیعہ مذہب قبول کرانے میں انہیں کامیابی حاصل ہوگئی تو انھوں نے اپنے حریفوں کو آسانی سے مغلوب کیا۔ خاص طور پر جب کشمیر کا وزیر اعظم ملک موسیٰ رینہ ان کا غالی معتقد ہوا تو کوئی طاقت ان کے آگے ٹھہر نہ سکی۔ مورخ غلام حسن لکھتے ہیں۔

در متابعت و مطاوعت میر شمس الدین عراقی جان و دل کوشیدہ مذہب شیعہ را رواج داد اعیان اہل سنت را از جبر و قہر نمودہ بعضہا بقتل رسانید و بعضہا از ملک اخراج کنانید تا کہ عموم خلائق از قہر او ترسیدہ بمذہب شیعہ گرویدند۔[2]

وزیر موسیٰ رینہ نے میر شمس الدین عراقی کی کامل پیروی میں شیعہ مذہب کو رواج دینے میں دل و جان سے کوشش کی۔ اس کے لیے اہل سنت کے ممتاز لوگوں پر جبر و قہر کیا گیا بعض کو قتل اور بعض کو ملک بدر کیا گیا تاکہ عام لوگ جبراً و قہراً شیعہ مذہب قبول کریں۔

اس مذہبی جبر و اکراہ میں میر شمس الدین براہ راست شامل تھے، اور اس کی زد میں صرف سنی مسلمان ہی نہ تھے، بلکہ غیر مسلم بھی تھے۔[3] بدقسمتی سے یہ مذہبی منافرت جس سے کشمیر کی سرزمین اس سے

---

[1] تاریخ سید علی (قلمی)، شیعہ مخطوطات فارسی ریسرچ لائبریری کشمیر یونیورسٹی [2] تاریخ حسن ج ۲ ص ۲۲۳ [3] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی۔ ص ۲۱۸۔

قتل کبھی بھی آلودہ ذہن ہوئی تھی، صدہا سال تک جاری رہی، اور بعض اوقات یہ خوفناک دہشت گردی اور بربریت کا باعث بھی بنتی تھی، تاہم جن مورخین نے میر شمس الدین کے ہاتھوں بجبر شیعہ ہونے والے لوگوں کی بڑی اور بھاری تعداد بیان کی ہے۔ ان کا بیان مبالغہ سے خالی نہیں ہے[1]۔ یہ مبالغہ آمیزی کرنے والے زیادہ تر میر صاحب ہی کے معتقد رہ چکے ہیں[2]، اور انھوں نے اپنے پیروں کے کارناموں کو شہرت دینے کے لیے ایسا کیا ہے۔

کشمیر میں شیعی مذہب و مشرب کو پورے ستائیس برس تک (۱۵۶۱ء) تا (۱۵۸۰ء)، سرکاری سرپرستی حاصل رہی، جب چک خاندان برسراقتدار تھا، اور مملکت کے اکثر اعیان نے "نوربخشیت" اختیار کرلی تھی۔ اس مختصر سی مدت میں اس مذہب و مشرب کو وادی کے مختلف مقامات پر جڑ پکڑنے کا اچھا موقع ملا اگر جبر وظلم روا نہیں رکھا جاتا تو اس میں مزید استحکام پیدا ہونے کے امکانات بھی تھے، مگر بالآخر جب یعقوب شاہ چک نے سنیوں کے قاضی القضاۃ مفتی محمد موسیٰ سے اذان کے بعض کلمات بدلنے کے لیے فتویٰ مانگا اور انھوں نے اس سے انکار کردیا۔ تو انھیں بڑی بے دردی سے قتل کردیا گیا۔ یہ حادثۂ فاجعہ نہ صرف نوربخشیت کے لیے سخت دھچکے کا باعث بلکہ خود یعقوب شاہ چک کی موروثی حکومت کے ذلت آمیز اختتام پر بھی منتج ہوا۔ اکبر کی یعقوب اور اس کے باپ یوسف چک سے لڑائی چھڑ گئی، اور اس نے انھیں گرفتار کرکے بقیہ زندگی بہار میں گزارنے کا حکم دیا، بہار میں ان کی قبریں آج بھی موجود ہیں۔ قاضی موسیٰ کی دلدوز شہادت پر ایک شیعہ مؤرخ اعتراف کرتا ہے۔

---

[1] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند۔ مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی رائے بریلوی، ص ۲۱۰ [2] جیسے صاحب بہارستان شاہی اور مصنف تحفۃ الاحباب (قلمی) [3] تاریخ بہارستان شاہی۔ میر شمس الدین عراقی کی مزید تفصیل کے لیے راقم سطور کی تصنیف کشمیر میں اسلام کی اشاعت دیکھی جاسکتی ہے۔

در تو شاہی میں قضیہ درمیان بزرگان و	قاضی موسیٰ کا قتل تمام کشمیری باشندوں اور
اعیان و اہالی ممالک کشمیر واقعہ ہائل و	وہاں کے اکابر و اعیان کے لئے ایک ہولناک
حادث شد کہ بدایت آں حادثہ موجب	صورت میں ظہور پذیر ہوا اور بالآخر اس سے
نقصان بنیان قصر مملکت یعقوب شاہ	یعقوب شاہ کا قصر مملکت ہی ہلا کر رکھ دیا
گشت[1]	

مسلک اہل حدیث | اصل مقصد گفتگو سے قبل کشمیر میں مسلک اہل حدیث کی اشاعت سے تعرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ ابتدائً کشمیر میں صرف فقہ حنفی رائج تھی پھر کافی مدت بعد یہاں نوربخشی فقہ کی اشاعت ہوئی یہ صورت انیسویں صدی کی ابتدا تک برقرار رہی۔

سُنّی مسلمان اصول و فروع میں حنفی مسلک کے مقلد تھے ہی اس کے ساتھ ہی ان کی رگ رگ میں صوفیائے کشمیر کی عقیدت و محبت بھی رچی ہوئی تھی، جو ان کی اسلامی زندگی کا ایک دوسرا نمایاں ترین پہلو رہا ہے، اس طرح محبت اولیا اور تقلید مذہب حنفی ایک ہی حقیقت کے دو نام بن گئے تھے، منقبت خوانی ختمات و اذکار کی معنویت، ذکر بالجہر، زیارت قبور، توسل و شفاعت، نذر و نیاز وغیرہ حنفیت کے اجزاء ترکیبی سمجھے جاتے تھے، جن کا انکار خود حنفی مسلک کے انکار کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔

اپنے اس آبائی مسلک و مشرب کی حفاظت و احترام میں کشمیر کے مسلمان ابتدا ہی سے سخت حساس واقع ہوئے تھے، اور وہ ان میں ادنیٰ اصلاح کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے تھے

---

[1] تاریخ بہارستان شاہی۔ میر شمس الدین عراقی کی مزید تفصیل کے لیے راقم سطور کی تصنیف کشمیر میں اسلام کی اشاعت دیکھی جا سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ کشمیر میں اسلام کا وجود صرف صوفیائے کرام کی مساعیٔ جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اور اس حیثیت سے نہ ان کے فیوض و برکات کا انکار کیا جاسکتا اور نہ کشمیر کے مسلمانوں نے بھی اس کا انکار گوارا کیا تاہم جب عقیدت عبادت کی صورت اختیار کرے تو یہ صوفیائے عظام کی امانت کی غیر شعوری خیانت ہی ہوگی۔ چنانچہ کشمیر کے مسلمانوں میں بھی صوفیہ کی عقیدت و محبت میں غلو پیدا ہونے لگا۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ یہاں علم و فکر کا بازار عرصہ دراز سے سرد پڑا تھا، اور یہ خطۂ زمین دوسرے اسلامی مراکز سے کٹ کر رہ گیا تھا، جو تشنگانِ علم یہاں سے نکل کر دوسرے ممالک کو جاتے تھے وہ بہت کم اپنے وطن واپس آکر اس کی خدمت کرتے تھے، اس طرح یہاں علم کا بازار کافی حد تک بے رونق ہوگیا تھا۔ مزید براں سیاسی بدنظمی، اقتصادی بدحالی، غلامی سے پیدا ہونے والی عام افسردگی، اور جابر و ظالم امراء اور حکام کی لوٹ کھسوٹ جیسے عوامل بھی اس کے پیچھے کارفرما تھے، اس طرح صوفیائے کرام سے یہ عقیدت مندانہ غلو یقیناً کسی مصلح کی اصلاح کا محتاج بن گیا تھا،

یہ خدا کا فضل تھا کہ جب اٹھارہویں صدی میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ، اور حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل دہلویؒ کی اصلاحی تحریک کو فروغ ہوا تو ان کے پیروکاروں میں کشمیر کے کچھ مسلمان بھی شامل ہوئے۔ اس کے ابتر سیاسی اور معاشرتی حالات ان دونوں بزرگوں کی نظر میں تھے، کشمیر ان کی تحریک سے عملاً اس وقت متأثر ہوا جب بالاکوٹ مجاہدین کی سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔ ان ایام میں بالاکوٹ اہل کشمیر کی سیرگاہ تھا۔

مگر یہ بد قسمتی تھی کہ ایک طرف ان دونوں بزرگوں کا سانحۂ شہادت جلد پیش آیا جس کی وجہ سے کشمیر کے مسلمان ان بزرگوں کے فیوض و فوائد اور اصلاح و تجدید سے محروم رہے اور دوسری طرف خود ان بزرگوں کے بعض مجتہدانہ افکار و آراء معرض بحث

بنے ہوئے تھے، اگرچہ ان کی طرف منسوب کی ہوئی بہت ساری باتیں بے بنیاد اور فرنگیوں کی مشتعلانہ افواہوں پر مبنی تھیں تاہم ان کے بعض انفرادات بھی کشمیر میں اصلاح کے بجائے منفی رد عمل کا باعث بنے۔

مشہور مورخ کشمیر مرحوم غلام حسن کھویہامی لکھتے ہیں:

درین اثنا سید احمد خاں کہ از اعاظم ہندوستان بود بہ بہانۂ حج چند سال در بلاد یمن و مسقط و نجد سیر و سیاحت می کرد و مطالعہ کتاب التوحید مذہب وہابیہ قبول ساختہ بہ جانب ہند رجعت نمود در آں جا مولوی محمد اسماعیل دہلوی کہ از اقربائے مولوی عبدالعزیز دہلوی بود اوّلاً مرید او شدہ بہ طفیل او جمع کثیر در حلقۂ متابعت او در آمدند مولوی اسماعیل کتاب تقویۃ الایمان در تائید کتاب التوحید تصنیف کردہ شائع ساخت۔

(تاریخ حسن، ج ا، ص ۲۴)

اسی دوران میں سید احمد خاں (سید احمد شہید رائے بریلوی) جو ہندوستان کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے، حج کے بہانے سے بلاد یمن، مسقط اور نجد میں چند سال تک سیر و سیاحت کی اور کتاب التوحید کا مطالعہ کر کے وہابی مذہب قبول کیا اور ہندوستان لوٹے یہاں مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ کے رشتہ دار تھے، ان کے مرید ہوئے اور ان کی مدد سے اپنے پیروکاروں کی ایک بڑی جماعت تیار کی مولانا اسماعیلؒ نے کتاب التوحید کی تائید میں تقویۃ الایمان لکھ کر شائع کی۔

گو اس مورخ کے بعض خیالات بھی محل نظر ہیں تاہم ان سے رد عمل کا اندازہ ہوتا ہے، غرض ایک طرف تو یہ حضرات اپنی مصروفیتوں اور فوری شہادت کی بنا پر کشمیر کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں کر سکے دوسری طرف بدعات کی تردید اور اصلاح رسوم میں ان کا اپنا خاص

اصلاحی پروگرام بھی تھا، جو کشمیر کے صدہا سال پرانے مذہبی مزاج کے ناموافق تھا۔ یہ اصلاحی پروگرام شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ حرانیؒ اور شیخ محمد بن عبدالوہابؒ سے اگر ماخوذ نہیں تو متاثر ضرور تھا، جب کہ یہاں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ یا حضرت شیخ نظام الدین اولیاءؒ کی اصلاحی سیاست کارگر ہو سکتی تھی۔ خود مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ جو طریقۂ تعلیم و تدریس اور اصلاح و تربیت میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے جانشین تھے، بعض مسائل میں اپنے وطن کا رنگ لئے ہوئے ہیں، حضرت گنگوہیؒ شیخ محمد بن عبدالوہابؒ سے حسن ظن رکھتے تھے، اور ان کی خدمات کے معترف بھی تھے[۱]، جب کہ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ نہ ان کے علم و فکر سے متاثر تھے، اور نہ انکے اصلاحی خدمات سے[۲]

شہدائے بالاکوٹ کے کافی عرصہ بعد جب نواب صدیق حسن خاں مرحوم اور مولانا سید میاں نذیر حسین صاحب محدث نے تصنیف و تدریس کے ذریعہ ہندوستان میں مسلک اہلحدیث کو تقویت پہنچائی تو اس سے کشمیر بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ کشمیر کے بعض طلبہ ان علماء سے اکتساب فیض کر کے وطن واپس لوٹے تو عدم تقلید کی اشاعت شروع کی چنانچہ معاصر مورخ مرحوم غلام حسن لکھتے ہیں۔

خصوصاً فی زماننا سید صدیق حسن خان	اس وقت خصوصی طور پر نواب صدیق حسن
نواب بھوپال کہ از علماء برجستۂ روزگار	خان، جو عصر حاضر کے زود نگار علماء میں ہیں
است در اشاعت این ملت مجتہد وقت	اس مذہب کی اشاعت میں مجتہد ثابت
شدہ۔ در وثوق این ملت و توہین مذاہب	ہوئے، موصوف نے غیر مقلدیت کی توثیق،

---

[۱] موج کوثر۔ ڈاکٹر شیخ محمد اکرام۔ [۲] فتاوی رشیدیہ حصہ اول صفحہ ۸ [۳] فیض الباری علی صحیح البخاری، [۴] حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف اس موقف کے انتساب کی صحت میں شک کرنا ہمارے نزدیک درست نہیں ہے،

اربعہ و تردید مقلدان دفتر ہا نوشتہ است[1] مذاہب اربعہ کی توہین اور مقلدین کی تردید میں کئی دفتر لکھ ڈالے ہیں۔

مورخ مرحوم آگے لکھتے ہیں :۔

"نواب صاحب نے اپنی تصانیف مواخات و مواسات کے بہانے سے کشمیر کے کچھ لوگوں کو بھیجیں جن میں حسین بٹلکو نام کا ایک شخص بھی ہے، اس شخص نے دہلی جاکر میاں نذیر حسین سے استفادہ کیا، پھر وہاں سے عدم تقلید کا مبلغ بن کر کشمیر لوٹا مگر جب شہر (سرینگر) میں اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تو شوپیاں (اننت ناگ) گیا۔ اور اپنے مسلک کی تبلیغ میں مصروف ہوا۔ یہاں فوراً دو سو آدمی اس کے پیرو ہوئے[2]"

نواب صاحب مرحوم کی مسلسل کوششوں اور میاں صاحب محدث کے تلامذہ کی سرگرمیوں سے شوپیان اور اس کے ملحقہ دیہاتوں میں مسلک اہل حدیث سرعت سے پھیلا، مولانا عبدالرشید صاحب شوپیانی نواب صاحب کے دست راست اور خاص علی معاون تھے[3]۔ اسی طرح مشہور عالم اور مناظر مولانا ثناء اللہ امرتسری کا آبائی تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا[4]، تاہم یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جو حضرات یہاں مسلک اہل حدیث کی نمائندگی کرتے تھے، انھوں نے اپنی ساری توجہ چند فروعی مسائل پر مرکوز کی اور اس میں اتنی شدت برتی گئی کہ شیعاً للہ آمین بالجہر، رفع یدین جیسے مسائل پر طرفین نے ایک دوسرے کے خلاف مقدمے دائر کئے اور ان مسائل کے کاغذات غیر مسلم ججوں کی میزوں پر گھومتے تھے، بعض اوقات یہ شدت

---

[1] تاریخ حسن ج ۱ ص ۴۴ [2] ایضاً [3] نزہۃ الخواطر ج ۸ ص ۲۶۱، وطلع الاقاضی بما یجب فی قضاء علی القاضی، نواب صدیق حسن خان، بھوپال ۱۲۹۴ھ ص ۱۶۱ [4] تفسیر ثنائی (مقدمہ)

ہنگاموں کی صورت اختیار کرتی تھی، سر والٹر لارنس اپنے زمانے کے ایسے ہی واقعات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سختی کے ساتھ تحریک وہابیت کچل دی جس سے یہ کچھ وقت کے لیے نیم جان ہو گئی، مگر پانچ سال بعد اب یہ پھر سر نکال رہی ہے چنانچہ اہل اعتقاد مسلمان اور سجادہ نشین عدم تقلید کی اشاعت پر پھر تشویش ظاہر کرنے لگے ہیں"[۱]

لارنس کے اس بیان کی تائید مورخ غلام حسن کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

فی الحقیقت اخگر این ملت در چمن خاطر اکثر با افتادہ است۔ اما بہ خوفِ حاکم نامدار شرر آن در زیر خاکستر نہان است عنقریب شعلۂ آن بزیر فلک خواہد کشید[۲]

سچی بات یہ ہے کہ غیر مقلدیت کا انگارہ بہت سے لوگوں کے دلوں میں پڑ گیا ہے۔ مگر حکومتِ وقت کے خوف سے ابھی یہ پوشیدہ ہی ہے عنقریب اس کا شعلہ آسمان میں اڑنے لگے گا۔

مورخ مرحوم کی یہ پیشگوئی اس حد تک تو ضرور ثابت ہوئی کہ مسلک اہل حدیث مختلف جگہوں میں پھیل کر مقبول ہو گیا، مگر شعلے نہیں اڑے، مادہ پرستی اور آزاد خیالی بڑی تیزی کے ساتھ رسوم و روایات کو زیر و زبر کرتے ہوئے آگے بڑھی، یہاں تک کہ شوپیان میں ہی بہائیت، قادیانیت اور مارکسی اشتراکیت کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔

اس تمہید کے بعد چند علمائے کشمیر کی اہم ترین فقہی تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔ علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کی فقہی خدمات پر ہمارا جداگانہ مستقل مضمون ہوگا۔

ملا احمد علامہ اور رسالۃ الفتاوی الشہابیۃ | ملا احمد رہ صاحب علم بزرگ تھے، جو حضرت امیر سید علی ہمدانیؒ

---

[۱] The Valley of Kashmir P.285 [۲] تاریخ حسن ج ۱ صفحہ ۲۴۲

... حضرت سید شرف الدین (بلبل شاہ) کے کچھ بعد کشمیر وارد ہوئے تھے۔ اور اپنے علم وفضل سے بہت جلد سلطان شہاب الدین شاہمیری کے ممتاز درباری عالم بن گئے اور شیخ الاسلام کا خطاب پایا، یہ شاید کشمیر کے پہلے سرکاری شیخ الاسلام تھے۔ ان کے روحانی مرشد حضرت سید شرف الدین عبدالرحمٰن (بلبل شاہ) تھے۔ جن کے مقبرہ میں وہ دفن بھی ہوئے۔

ملا احمد کئی کتابوں کے مصنف تھے، ان میں الفتاویٰ الشہابیۃ کشمیر میں بڑی مقبول ہوئی یہ کتاب انھوں نے کشمیر کی اسلامی سلطنت میں سلاطین اور حکام کی رہنمائی کے لئے لکھی اور سلطان شہاب الدین کے نام پر معنون کی، پروفیسر صاحبزادہ حسن شاہ صاحب اس کتاب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وَتمَّ فی هذا الزمان تقریباً	تقریباً اسی زمانے میں کشمیر کے لئے
تدوین مجموعة الاولی لقانون	قانون کا ایک مجموعہ بھی مرتب ہوا
کشمیر وسُمِّیتْ بالفتاوی	جس کا نام فتاویٰ شہابیہ رکھا گیا،
الشهابیة وبفضلها کان	اسی کی بدولت کشمیر میں قانون
تنفیذ القانون الاسلامی	اسلامی کا نفاذ عمل میں آیا اور
فی کشمیر واصبح الاسلام سائدًا	اسلام سیاسی اور معاشرتی زندگی
علی حیاتها العامة و	پر غالب آگیا۔
سیاستها۔[1]	

سید احمد سامانی، تحفۃ السراج | ملا احمد علامہ کی مذکورہ تالیف کے بعد کافی عرصہ تک فقہ اسلامی کی

---

[1] دیکھئے مقالہ۔ الارتقاء الثقافی لکشمیر فی عہد السلاطین۔ مجلۃ ثقافۃ الہند دہلی بابت جون ۱۹۶۲ء

کشمیر میں کسی عالم کی کسی کتاب یا شرح کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس کی ضرورت بھی لاحق نہیں ہوئی ہوگی۔ علمائے اسلام بکثرت یہاں وارد ہوتے تھے اور ان کے ساتھ وسط ایشیاء کے جلیل القدر علماء کی تصانیف بھی ہوتی تھیں، ان تصانیف کی موجودگی میں اُس وقت کشمیر میں فقہ کر کوئی نئی چیز پیش کرنے کی انھوں نے ضرورت نہیں محسوس کی یا ممکن ہے کہ انھوں نے کتابیں لکھی ہوں مگر اسوقت تک اس قسم کی کسی کتاب کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔

طویل عرصہ بعد نویں صدی ہجری میں حضرت شیخ احمد سابانی رح نے فرائض ومیراث کے مشہور مختصر رسالہ "سراجی" کی شرح لکھی جو تنویر السراج کے نام سے آج بھی موجود ہے[۱] ریاست جموں وکشمیر کے محکمۂ تحقیقات ونشریات میں اس کا ایک خوشخط نسخہ موجود ہے، شارح مرحوم حضرت سید محمد خاوری رح کے مزار کے متصل مدفون ہیں[۲]۔

قاضی حیدر اور فتاویٰ عالمگیری علمائے کشمیر نے مغل عہد میں فقہ کی اچھی خدمت انجام دی ہے، اور اس دور میں بعض علمائے کشمیر اپنی فقہی بصیرت میں بیرونِ کشمیر بھی مشہور ہوئے اور ہندوستان کے مختلف مقامات میں قاضی، قاضی القضاۃ، میرعدل وغیرہ اہم مناصب پر فائز ہوئے، یہاں تک کہ بعض عورتیں بھی فقہ میں غیر معمولی دلچسپی لینے لگیں، حافظہ خدیجہ بنت عبدالفتاح مشکوٰۃ المصابیح اور حصن حصین کے ساتھ قدوری پر بھی وسیع نظر رکھتی تھیں[۳]۔ اسی عہد کے ایک نامور کشمیری عالم قاضی حیدر بھی تھے۔ جو علمائے ہند میں بڑی قدرومنزلت رکھتے تھے۔

---

[۱] تاریخ حسن ج ۳۔ [۲] فہرست مخطوطات عربی وفارسی، ریسرچ لائبریری سرینگر۔ [۳] کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ پروفیسر عبدالقادر سروری۔ ص ۱۴۲۔

قاضی حیدر قاضی خاں کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔ ان کی وفات ۱۱۲۱ھ میں ہوئی، تعلیم حاصل کرنے کے بعد شاہجہان آباد دہلی آئے جہاں سعادت خاں صدر الصدور کی وساطت سے اورنگ زیب عالمگیر کے دربار میں رسائی حاصل کی، کچھ مدت بعد اپنے علم و فضل کے بدولت دہلی کے قاضی بھی مقرر ہوئے۔[1] وزیر آباد کے امیر سے بھی گہرے تعلقات تھے، اورنگ زیب نے انھیں قاضی خان کا لقب دیا تھا۔[2]

عالمگیری یا الفتاوی الهند یہ اورنگ زیب کا عظیم الشان علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے، جو سینکڑوں علماء پر مشتمل ایک اکیڈمی کی کوششوں سے وجود میں آیا ہے، اس کتاب کے اکثر مرتبین کے اسمار ابھی تک پردۂ خفا ہی میں ہیں، مورخین لکھتے ہیں کہ ان علماء کی تعداد پانچسو تھی، مولانا عبد الحی حسنی صاحب مرحوم نے جن بیس علماء کی نشاندہی کی ہے۔[3] ان میں کشمیر کا کوئی عالم نہیں ہے، مگر مورخین کشمیر کی تصریح کے مطابق قاضی حیدر بھی اس اکیڈمی کے ایک رکن تھے، علاوہ ازیں تاریخی حیثیت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہونچی ہوئی ہے کہ کشمیر کے کئی اہل علم اور ادبار و حکمار کو عالمگیر اور اس کے پیشرو مغل سلاطین کے دربار میں بڑی عزت و قربت حاصل تھی، بعض علمائے کشمیر اور مغلوں میں تعلقات بھی تھے، اور وہ شہزادوں کے استاذ بھی رہ چکے تھے۔ اس لئے اگر فتاوی عالمگیری کی تدوین میں کشمیر کے فضلار نے بھی اپنی خدمت پیش کی ہو تو مستبعد نہیں ہے، مستند مورخ کشمیر

---

[1] تذکرہ علمائے ہند۔ مولوی رحمان علی صاحب۔ ص ۵۵ The Contribution of India to Aralic Literature - By dr. Zubid Ahmed. Introduction - P27

[3] الثقافة الاسلامية في الهند۔ ص ۱۱۰ - ۱۱۱

خواجہ محمد اعظم دیدہ مری نے عالمگیری میں قاضی حیدر کے اشتراک کا اگرچہ صراحت کے ساتھ ذکر نہیں کیا ہے، تاہم ان کے یہ الفاظ اسی حقیقت کے غماز ہیں۔

اکثر در مجالس تحقیق مسائل شرف حضورے داشت[1] — عالمگیر کی تحقیقی مجلسوں میں حاضر رہنے کا شرف بھی حاصل تھا۔

مورخ غلام حسن کھویہامی کی تاریخ میں قاضی صاحب کی فتاوی عالمگیری میں شمولیت کا ذکر صراحت سے موجود ہے[2]۔

قاضی حیدر کا انتقال دکن میں ہوا تھا نعش کشمیر لائی گئی تھی وہ بچھ پورہ سرینگر میں مدفون ہیں۔

ملا عبید اللہ کشمیری، ترجمہ عالمگیری | ملا عبید اللہ کشمیر کے نامور عالم تھے اپنے علم و فضل سے فرخ سیر کے دربار میں مقرب ہوئے اور اسی کے ایماء پر فتاوی عالمگیری کا فارسی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوئے، مگر شہزادے کی قسمت کا آفتاب بہت جلد غروب ہوگیا جس کی وجہ سو ملا عبید اللہ اپنا کام چھوڑ کر اپنے وطن کشمیر لوٹ آئے مورخین لکھتے ہیں کہ فہم و ذکا اور ذہانت و فطانت میں دیگو یہ روزگار تھے ہندوستان اور ایران کے شیعہ علماء سے مناظرے کرتے تھے اور اپنے علم و فراست کا لوہا منواتے تھے، عمر بھر درس و تدریس سے وابستہ رہے اور سینکڑوں طلبہ کو مستفید کیا[3]۔

حاشیہ توضیح و تلویح، حضرت شیخ یعقوب صرفی | حضرت صرفی کشمیر کے جلیل القدر عالم دین اور روحانی پیشوا تھے وہ بیک وقت مفسر و محدث اور فقیہ بھی تھے، اور مقبول ادیب و شاعر بھی، ان کے تلامذہ میں حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی جیسی شخصیتیں بھی شامل ہیں، علامہ فیضی اور مورخ بدایونی انکے علم و فضل کے قائل اور قدرداں تھے[4]۔

حضرت صرفی نے دینی اور ادبی علوم پر عربی و فارسی میں ضخیم کتابیں لکھی ہیں اصولِ فقہ میں ان کا کارنامہ توضیح و تلویح پر عالمانہ حاشیہ ہے یہ حاشیہ آج بھی موجود ہے، وہ غالی حنفی تھے، اس حاشیہ میں بھی انھوں نے اپنا مسلک مؤید کرنے میں پوری دلچسپی لی ہے۔

---

[1] تاریخ اعظمی ص ۲۱۶ [2] تاریخ حسن ج ۳ ص ۲۵۳ [3] تاریخ حسن ج ۳ [4] سواطع الالہام ص ۱۳۹، و منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۴۰، حیات صرفی مولوی محمد شاہ سعادت مرحوم لاہور ۱۹۳۰ء ص ۷۶۔

زبدة الطب

ایک اہم طبی مخطوطہ

از

جناب وسیم احمد اعظمی صاحب ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن نواب منزل پٹنہ،

"زبدة الطب" خدا بخش لائبریری پٹنہ کا ایک اہم طبی مخطوطہ ہے جس کو مشہور ایرانی طبیب سید اسماعیل جرجانی نے سلطان علاء الدین تکش خوارزم شاہ کے لئے عربی زبان میں تالیف کیا تھا۔ اس کے دوسرے اہم طبی کارنامے ذخیرۂ خوارزم شاہی، خفِ علائی اور الاغراض الطبیہ فارسی میں ہیں۔ جرجانی نے اپنی تمام فارسی طبی کتابوں کے برخلاف اس کو عربی زبان میں لکھا ہے، اور جدول کا بھی اہتمام کیا ہے، جرجانی زیادہ تر اپنی فارسی تالیفات سے مشہور ہوا، اسی لئے اس کے عربی طبی کارنامے "زبدة الطب" سے نہ صرف عوام بلکہ خواص کا بھی ایک بڑا طبقہ ناواقف ہے، اور بیشتر تذکرے زبدة الطب کے بارے میں خاموش ہیں، اس وقت اور بھی تعجب ہوتا ہے، جب ڈاکٹر ایڈورڈ جی براؤن جرجانی کی عربی طبی کتابوں کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ذخیرہ خوارزم شاہی کے علاوہ اس مصنف نے دیگر متقابلۃً مختصر طبی کتابیں بھی تالیف کی ہیں، جو تمام فارسی میں ہیں" [1]

اور حکیم سید علی احمد نیر واسطی جیسے محقق اس تحریر پر بلا تبصرہ گذر جاتے ہیں، لیکن جب ہم عربی تذکروں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو "زبدة الطب" کا ذکر جا بجا ملتا ہے۔ الاعلام میں ہے:

اسماعیل بن حسین الحسینی اسماعیل بن حسین حسینی ابو ابراہیم زین الدین

ابو ابراہیم زین الدین الجرجانی جرجانی جرجان کا ایک محقق

طبیب باحث من اهل جرجان	طبیب ہے جو خوارزم میں مقیم رہا اور
اقام فی خوارزم، وبها صنف	وہاں اپنی یہ کتابیں تالیف کیں،
کتب الطب الملوکی والرد	الطب الملوکی، الرد علی الفلاسفہ
علی الفلاسفة وتدبیر یوم	وتدبیر یوم ولیلة اور زبدة الطب
ولیلة وزبدة الطب فی مجلد[۵۲]	ایک جلد میں

صاحب کشف الظنون کے لفظوں میں۔

"زبدة الطب" للخوارزم	خوارزم شاہی کی زبدة الطب میں
شاهی وهو مجلد مشتمل	جدول ہے، اور یہ بدن کے ظاہری
علی حقائق الابدان الظاهرة	حقائق اور اس کے باطنی دقائق پر
ودقائقها الباطنة"[۵۳]	مشتمل ہے۔

زبدة الطب کے ۲ دو اور نسخوں کا اب تک پتہ چل سکا ہے، ایک نسخہ کی نشاندہی مکتبہ شرقیہ دار العلوم اسلامیہ پشاور کی مطبوعہ فہرست میں عدد مسلسل نمبر ۱۶۲ کے تحت محفوظ ہے[۵۴]، دوسرا نسخہ رضا لائبریری رام پور میں اکسیشن نمبر ۵۵۹ کے تحت مندرج ہے[۵۵]۔

نام کتاب | تذکروں میں "زبدة الطب" تحریر ہے۔ جرجانی نے بھی اکثر جگہوں پر "زبدة الطب" ہی لکھا ہے، لیکن مخطوطہ کے ورق نمبر ۳ الف پر "کتاب الزبدة فی الطب" لکھا ہوا ہے، نسخہ رامپور کا بھی یہی نام ہے[۵۶]۔

نام مصنف | جرجانی کے نام کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے

(۱) اسماعیل بن حسین الحسینی ابو ابراهیم زین الدین الجرجانی[۵۷]

(۲) الشریف شرف الدین اسماعیل[۵۸]

(۳) السید الحکیم ابو ابراہیم اسماعیل بن محمد الحسینی۔ (۴) السید الامام زین الدین اسماعیل حسینی۔ (۵) اسماعیل بن حسن حسینی ملقب بزین الدین۔ (۶) زین الدین اسماعیل بن حسین۔

ڈاکٹر عبدالمقتدر خاں نے بھی اسی آخری نام کو درج کیا ہے،

حالات جرجانی کے حالاتِ زندگی بہت کم ملتے ہیں۔ سنہ پیدائش کے بارے میں کوئی مستند روایت نہیں ملتی، الگڈ کے خیال میں ابن ابی صادق کی ضعیفی کے ایام میں ان کا شاگرد ہوا ۔ اس حساب سے دیکھا جائے تو اس کی پیدائش کا زمانہ گیارہویں صدی عیسوی ہے۔

جرجانی نے جس دور میں آنکھیں کھولیں اس دور میں عرب و عجم کی سیاسی کشمکش ایک فیصلہ کن موڑ پر پہنچ گئی تھی، عربوں کا اقتدار دم توڑ رہا تھا، اور عجمیوں میں بیداری کی لہر دوڑ رہی تھی، جس سے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں تغیر و انقلاب رونما ہو رہا تھا، جس کا اثر زبان و بیان پر بھی پڑا، طب کا تمام تر سرمایہ عربی زبان میں تھا، مگر اب یہ عجمی زبانوں میں منتقل ہونے لگا، جرجانی نے وقت کی رفتار سے متاثر ہو کر فارسی کو اظہارِ خیال کا وسیلہ بنایا، اور غالباً وہ پہلا شخص ہے جس نے طب عربی کو باقاعدہ فارسی جامہ پہنایا،

رفتہ رفتہ جرجانی کی شہرت خوارزم شاہ کے دربار تک پہنچی، اس نے جرجانی کو دربار میں بلا کر ملازمت کی پیش کش کی۔ جرجانی ۵۰۴ھ میں خوارزم گیا اور ایک ہزار دینار ماہوار پر شاہ کی ملازمت کرلی، اس طرح جرجانی کو تصنیف و تالیف کے لئے ایک پرسکون اور مناسب ماحول مل گیا، اور وہ بڑی جانفشانی سے طبی خدمات انجام دینے لگا۔

جرجانی کے سنہ وفات کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے اقوال مختلف ہیں، ابن ابی اصیبعہ کے خیال میں اس کا انتقال خوارزم شاہ کے زمانے میں ہوا ۔ الگڈ لکھتا ہے کہ وہ مرو میں

۱۱۳ھ یا ۱۱۳۰ء میں فوت ہوا۔ درۃ الاخبار اور تتمہ صوان الحکمۃ میں ۵۳۱ھ
ابق ۱۱۳۶-۳۷ء میں اُسے سرخس میں دیکھے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ یہ اس کی عمر کے آخری ایام تھے
کٹر عبدالمقتدر خاں نے خدا بخش لائبریری کیٹلاگ جلد ۱۰ صفحہ ۳۴ میں مختلف حوالوں سے
ندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے ہیں :-

- جرجانی نے ایک طویل مدت تک خوارزم میں قیام کیا اور اس کے بعد مرو گیا، جہاں
۵۳۱ھ مطابق ۱۱۳۶-۳۷ء میں اس کا انتقال ہوگیا۔

- حاجی خلیفہ نے جرجانی کا سنہ وفات ایک جگہ ۵۳۰ھ مطابق ۱۱۳۵-۳۶ء
وسری جگہ ۵۳۱ھ مطابق ۱۱۳۶-۳۷ء اور تیسری جگہ ۵۳۵ھ مطابق ۱۱۴۰-۴۱ء درج
یا ہے۔ اس طرح یقینی طور پر جرجانی کے سنہ ولادت و وفات کی تعیین نہیں کی جاسکتی، لیکن
اجی خلیفہ کے دوسرے قول کو بیشتر تذکرہ نگاروں نے تسلیم کیا ہے،

ضخامت اور سائز کی تفصیل اس طرح ہے :-

ورق	ورق کا سائز	لوح کا سائز
ایک سو چھپن	۳۳×۲۸ سینٹی میٹر	۲۲×۱۸ سینٹی میٹر

کتابت: نسخہ قدیم خط نسخ میں ہے، ورق ۱ الف پر اکیس سینٹی میٹر کا ایک خوبصورت
نقش و مذہب دائرہ بنا ہے جس میں پھول نما چالیس زاویئے ہیں، دائرہ میں سنہری حروف
میں مندرجہ ذیل عبارت تحریر ہے۔

"بخزانۃ کتب الملک المعظم العالم العادل المؤید المظفر
المنصور صلۃ الدولۃ والدین سعد الاسلام والمسلمین
اعداد الملوک فی العالمین، سلطان السعداء والنقباء

من بقية الملوك والصدور والفضلاء مهدی بن الحسن بن ...

الحسینی اعز الله انصاره وضاعف اقتداره"

مندرجہ بالا عبارات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نسخہ مہدی بن الحسن الحسینی کے کتب خانہ کی زینت رہ چکا ہے، جس سے اس کی قدامت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی کتابت محمود السمنانی کے ہاتھوں ہوئی ہے، لیکن اوراق کے کرم خوردہ ہونے کے سبب پورا نام نہیں پڑھا جا سکا، عبارت کچھ اس طرح ہے

"د ...... (غیر واضح - کرم خوردہ) فرغ من انتساخه
العبد الضعیف الراجی رحمة ربه .... (غیر واضح
کرم خوردہ) وقت الضحیٰ ...... (غیر واضح کرم خوردہ) الثانی
والعشرون شهر جمادی الاولی من شهور سنة سبعین وستمائة
محمود ...... (غیر واضح کرم خوردہ) السمنانی، الحمد لله
والصلوٰة ...... (غیر واضح کرم خوردہ)

"محمود" کے بعد "ع" واضح ہے، بعد کے حروف کرم خوردہ ہیں، پھر "السمنانی" واضح ہے۔ اس طرح گویا زبدۃ الطب کی کتابت ۲۲ رجادی الاولیٰ ۶۷۰ھ ہجری میں نسخہ قدیم میں محمود السمنانی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوئی۔

نسخہ مذکورہ کے اضافی ورق ۲ پر تین اضافی تحریریں ملتی ہیں جو خاصی قدیم ہیں، ان میں سے اول الذکر دو زبدۃ الطب کے سنہ تالیف، اس کے مصنف اور اس کی کتابت سے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، آخر الذکر کا تعلق مخطوطہ کی شیرازہ بندی سے ہے۔ اضافی تحریر ۲ کے راقم کوئی ابو القاسم ہیں لکھتے ہیں :-

تصنیف زبدہ در سنہ پانصد و نود بوی است۔	زبدہ کی تصنیف سنہ ۵۹۰ھ میں ہوئی۔

وہ لکھتے ہیں :

ایں کتاب هفتاد سال تقریباً بعد از تصنیف نوشتہ شدہ	یہ کتاب زمانہ تصنیف سے تقریباً ستر سال بعد تحریر کی گئی ہے۔

اضافی تحریر نمبر۲ کے مطابق زبدۃ الطب کی تصنیف سنہ ۵۹۰ھ میں ہوئی جو کہ درست ہے، کیونکہ ہم نے مختلف حوالوں سے ابھی ثابت کیا ہے کہ جرجانی کا انتقال ۵۳۱ھ میں اگر ہم اضافی تحریر نمبر ا کو مستند تصور کرتے ہیں تو زبدۃ الطب کا سنہ تالیف جرجانی انتقال کے ۵۹ سال بعد قرار پاتا ہے، اور یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی، اسی طرح اضافی تحریر ۳ کے مطابق یہ نسخہ مولف کے انتقال کے تقریباً ستر سال بعد یعنی سنہ ۶۰۰ھ کے قریب نقل گیا۔ جب کہ اس کے کاتب محمود السمنانی لکھتے ہیں کہ ۲۲ رجادی الاولی سنہ ۵۷۶ھ کو اکی تکمیل ہوئی۔

سید اطہر شیر خدا بخش لائبریری کے عربی مخطوطات کی مطبوعہ فہرست مفتاح الکنوز جلد۲ نوادر الفن میں عربی نوادر کا اجمالی تعارف کراتے ہوئے زبدۃ الطب کے بارے میں لکھتے ہیں :

زبدۃ الطب در فن طب است	زبدۃ الطب فن طب کی کتاب ہے
مولفہ سید اسماعیل الجرجانی	اس کے مولف سید اسماعیل جرجانی
ایں کتاب برائے سلطان خوارزم	ہیں، اور یہ نسخہ سلطان خوارزم شاہ
شاہ در سال سنہ ۵۷۰ھ یعنی چہل سال	کے لئے سنہ ۵۷۰ھ میں یعنی مولف کی
بعد وفات مولف نقل	وفات کے چالیس سال بعد نقل
شدہ بود	ہوا ہے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبدۃ الطب کا نوشتہ جو ہمیں مولف کے انتقال کے چالیس سال[۱] بعد سلطان خوارزم شاہ کے لئے نقل کیا گیا، چند سطور پہلے ہم نے جرجانی کی وفات مستند روایات کے مطابق ۵۳۱ھ قرار دی ہے۔ اس حساب سے یہ نسخہ جرجانی کے انتقال کے تقریباً ایک سو انتالیس[۱۳۹] سال بعد نقل کیا گیا۔

ہمیں مخطوطہ میں کہیں بھی اس طرح کے اشارات نہیں ملتے، جن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ اس کو اضافی تحریر ۲ کے مطابق جرجانی کے انتقال کے تقریباً ستر سال بعد یا سید اطہر شیر کی تحقیق کے مطابق خوارزم کے کسی سلطان کے لئے مولف کی وفات کے چالیس[۴۰] سال بعد نقل کیا گیا ہے۔ اس طرح اضافی تحریر ۱ ۲ نیز سید اطہر شیر کی تحقیق درست نہیں ہوسکتی،

مخطوطہ کی موجودہ حالت | نسخہ آب زدہ اور کرم خوردہ ہے، نیز قدامت کی وجہ سے بعض حروف اڑ گئے ہیں، بعض عبارتیں جلد سازی کی وجہ سے چھپ گئی ہیں۔ اس لئے ابواب ومباحث کی تعیین میں مولف کی بعینہ پیروی نہیں ہوسکتی، اور ان مباحث کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے طور پر ابواب کی تعیین پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعض ورق اپنی اصل ترتیب کے مطابق نہیں ہیں، کہیں کہیں ورق الٹے لگ جانے کی وجہ سے ورق ۱ الف کی جگہ ۱ ب اور ورق ۱ ب کی جگہ ورق ۱ الف ہوگیا ہے۔

آغاز کتاب | کتاب کا آغاز حمد وثنا سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے تقریباً ایک صفحہ میں فن طب اور اس کے مبادیات پر روشنی ڈالی ہے نیز کتاب کے ممدوح شاہِ وقت کی طرف انتساب اور کتاب کا نام وغیرہ تحریر کیا ہے۔

تقسیم مباحث | جرجانی نے کتاب کے آغاز میں اس کے مباحث کا اجمالی ذکر کیا ہے اور ہر بحث کو "کتاب" کا نام دیا ہے، انھوں نے اس میں "جدول" کے انداز میں "حفظ الصحۃ" کے نام

ایک کتاب لکھنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبدۃ الطب کی
ن کے دوران انھیں ابن بطلان[۵۹] کی کتاب تقویم الصحۃ کافی پسند آئی کیونکہ یہ بھی جدول
انداز میں لکھی گئی تھی، اور چونکہ جرجانی کا ارادہ بھی اسی طرح کی کتاب لکھنے کا تھا، اور اسکے
صد کی تکمیل ابن بطلان کی "تقویم الصحۃ" سے بخوبی ہو رہی تھی اس لئے اس نے ایک
یاتی توضیح کے سہارے ابن بطلان کی کتاب "تقویم الصحۃ" کو زبدۃ الطب میں شامل کرنے
رادہ کیا، زبدۃ الطب کے ورق ۲۳۰ الف پر لکھتا ہے

"کتاب کے آغاز میں میں نے وعدہ کیا تھا کہ جدول کے انداز میں "حفظ الصحۃ" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھوں گا، لیکن پھر مناسب تصور کیا کہ الشیخ ابوالحسن ابن البطلان الطبیب البغدادی کی کتاب "تقویم الصحۃ" کو ہی بر سبیل تضمین شامل کر لوں، کیونکہ تضمین کو جب اشعار میں مستحسن خیال کیا تو نثری تصانیف میں قبیح تصور کرنے کا کوئی جواز نہیں ہونا چاہئے، تضمین کی طرف میرا میلان اس لئے بھی ہوا کہ اگر حسب وعدہ بذات خود "حفظ الصحۃ" پر جدول کے انداز میں کوئی کتاب لکھتا تو وہ "تقویم الصحۃ" سے بہتر نہ ہوتی اور غیر معمولی تکلفات بھی ہوتے"[۵۱۵]

مزید لکھتے ہیں۔

"طب تو ایک ہی ہے، ہاں اس قدر ضرور ہے کہ کتابوں کو اسلوب نگارش ندرت انتخاب، بسط و اختصار کی خوبی کے لحاظ سے بلاشبہ مختلف زمروں میں رکھا جا سکتا ہے، لیکن چونکہ تقویم الصحۃ میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں، لہذا اسکی تضمین مستحسن اور اس پر انحصار بہتر ہے"[۵۲۱]

موجودہ صورت میں زبدۃ الطب میں مندرجہ ذیل مباحث یا کتابیات شامل ہیں

۱۔ جزو اول :۔ اس کو "القسم الاول" بھی لکھا گیا ہے۔ اس سے اصل کتاب کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ نو مقالات پر مشتمل ہے۔ اختتام ورق ۲۶ الف پر ہوتا ہے۔

۲۔ کتاب التشریح :۔ اعضاء مفردہ و مرکبہ کی تشریح پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۵۶ الف پر ہوتا ہے۔

۳۔ کتاب الحمیات :۔ سات[۵۲۲] اجزاء پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۶۲ ب پر ہوتا ہے۔

۴۔ کتاب المعالجات :۔ اس کو "القسم الثانی" بھی لکھا گیا ہے، بیس[۲۰] مقالات پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۳۷ ب پر ہوتا ہے۔

۵۔ کتاب البثور و الاورام :۔ پانچ مقالات پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۴۵ الف پر ہوتا ہے۔

۶۔ کتاب الزینۃ :۔ تین اجزاء پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۴۷ الف پر ہوتا ہے۔

۷۔ کتاب فی السموم والادویہ[۵۲۳] :۔ چھ مقالات پر مشتمل ہے، اختتام ورق ۱۵۴ ا پر ہوتا ہے، کتاب کا اختتام بھی اسی بحث پر ہوتا ہے۔ اس طرح زبدۃ الطب میں سات مختلف مباحث یا کتابیات ہیں، لیکن "تقویم الصحۃ" کے نام سے کوئی کتاب نہیں ملتی، مقدمہ یا تمہید میں "کتاب الحمیات" کا ذکر نہیں ہے، لیکن تفصیل میں کتاب الحمیات شامل ہے جس کے اختتام پر جرجانی ابن بطلان کی کتاب "تقویم الصحۃ" کو بطور تضمین زبدۃ الطب میں شامل کرنے کی بات کرتے ہیں، لیکن فوراً جس کتاب کا آغاز ہوتا ہے وہ معالجات سے متعلق ہے، اور عبارت اس طرح ہے :۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ القسم الثانی من کتاب زبدۃ الطب فی المعالجات"[۵۲۴]

اس کا اختتام ورق ۱۳۷ ب پر ہوتا ہے۔ الفاظ مندرجۂ ذیل ہیں :۔

تم کتاب معالجات الاعضاء من الراس الی القدم بحمد اللہ وحسن توفیقہ[۵۲۵]	سر سے پا تک کے اعضاء کی معالجات کی کتاب بحمد اللہ اس کی توفیق سے مکمل ہو گئی۔

... آغاز و اختتام کی عبارتیں واضح طور پر اس بحث کو "کتاب المعالجات" قرار دیتی ہیں، جس سے شبہہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے اس نسخہ میں جرجانی کی کتاب کے باوجود ابن بطلان کی کتاب تقویم الصحة کا انضمام نہ ہو سکا ہے، اگر کتاب الحمیات کو تقویم الصحة قرار دیتے ہیں تو یہ درست نہ ہوگا۔ کیونکہ تقویم الصحة کا ایک قلمی نسخہ حیدر آباد دکن میں موجود ہے جو بڑی تقطیع کے چوراسی صفحات پر مشتمل ہے جس میں ادویہ کے مزاج، افعال و خواص کا ذکر ہے[۸۴] جب کہ کتاب الحمیات مکمل طور پر حمیات سے متعلق ہے، اس طرح یہ شبہہ یقین کی حد کو پہنچتا ہے کہ اس نسخہ میں ابن بطلان کی کتاب تقویم الصحة شامل نہیں ہے،

یہاں یہ ذکر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اصل کتاب کے آغاز سے قبل کی اول الذکر دو نوں اضافی تحریریں یہاں بھی تحقیق کی راہ میں دشواریاں پیدا کرتی ہیں، مثلاً اضافی تحریر سے جس کے راقم ابو القاسم نام کے کوئی بزرگ ہیں لکھتے ہیں

این کتاب زبدة الطب از ابتدا	یہ کتاب زبدة الطب ابتدا سے معالجات
تا شروع معالجات جزدیہ تصنیف	جزدیہ کے شروع تک سید اسماعیل
سید اسماعیل جرجانی است کہ برائے	جرجانی کی تصنیف ہے جو سلطان
سلطان علاء الدین تکش خوارزم	علاء الدین تکش خوارزم شاہ کے لئے
شاہ تصنیف نمودہ، و معالجات	لکھی گئی ہے، اور معالجات جزدیہ
جزدیہ تصنیف ابو الحسن مختار بن	ابو الحسن مختار بن حسن مشہور با ابن
حسن مشہور بہ ابن بطلان است	بطلان کی تصنیف ہے جس کا نام
نامش تقویم الصحة است کہ سید	تقویم الصحة ہے، سید اسماعیل نے اسے
مذکور با کتاب خود تضمین ساختہ[۸۵]	اپنی کتاب میں بطور تضمین شامل کیا ہے،

اضافی تحریر متعلقہ اضافی تحریریں کے بعد کمی ہوئی معلوم ہوتی ہے جس کی عبارت اس طرح ہے۔

"این کتاب ہفتاد سال بعد از تصنیف	یہ کتاب تصنیف کے ستر سال بعد
نوشتہ شدہ مصنف تا آخر معالجات	نقل کی گئی ہے، معالجات کلیہ تک
کلیہ سید اسماعیل جرجانی مصنف	کے مباحث کے مصنف سید اسماعیل
کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی است،	جرجانی ہیں جو ذخیرہ خوارزم شاہی کے
و مصنف معالجات جزویہ است	بھی مصنف ہیں اور معالجات جزویہ
ابن بطلان نصرانی، صاحب کتاب	کے مصنف ابن بطلان نصرانی ہیں جو
تقویم الابدان، ۳۵۵	تقویم الابدان کے مصنف ہیں

اضافی تحریر ۲ میں زبدۃ الطب کا تعارف کرانے کے لئے "مصنف کتاب ذخیرہ خوارزم شاہی" اور "تقویم الصحۃ" کو مزید تعارف کرانے کے لئے "صاحب کتاب تقویم الابدان" تحریر ہے، اس میں شک نہیں کہ "تقویم الصحۃ" کا مولف مختار بن عبدون المتطبب الشہیر بہ ابن بطلان ہے، لیکن "تقویم الابدان" کو اس سے منسوب کر دینا درست نہیں، کیونکہ اس کا مولف مشہور طبیب ابن جزلہ ہے، کشف الظنون میں ہے

تقویم الابدان فی تدبیر الانسان	ابوالحسن علی بن عیسی ابن جزلہ
فی الطب لابی الحسن علی بن	المتطبب البغدادی المتوفی
عیسی ابن جزلہ المتطبب البغدادی	۴۹۳ھ کی تقویم الابدان
المتوفی ۴۹۳ھ ۵۲۹	فی تدبیر الانسان،

خدا بخش لائبریری پٹنہ میں تقویم الابدان کے کئی نسخے موجود ہیں، اور سبھی ابن جزلہ

منسوب ہیں، رضا لائبریری کا نسخہ بھی ابن جزلہ ہی سے منسوب ہے، اس لئے اضافی تحریر[۲] کی یہ اطلاع درست نہیں مانی جاسکتی۔

اضافی تحریر[۱] مرقومہ ابوالقاسم معالجات جزویہ کو تقویم الصحۃ" قرار دیتی ہے، خدا بخش لائبریری کی فہرست کے مرتب بھی ابوالقاسم کی تحریر سے مطمئن ہیں[۵۲]، جب کہ اضافی تحریر[۲] اس بارے میں خاموش ہے، لیکن دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ "معالجات جزویہ" ابن بطلان کی تالیف ہے،

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "معالجات جزویہ ہی "تقویم الصحۃ" ہے یا یہ ابن بطلان کی کوئی علیٰحدہ تصنیف ہے؟ حیدرآباد دکن میں موجود ابن بطلان کی کتاب "تقویم الصحۃ" کا نسخہ موضوع کے لحاظ سے "معالجات جزویہ" سے بالکل مختلف ہے[۵۳]۔ اور ہمارے پاس کوئی ایسا مستند ماخذ نہیں جس کی روشنی میں "معالجات جزویہ" کو ابن بطلان کی کوئی مستقل تالیف قرار دیا جاسکے، اس کے برخلاف زبدۃ الطب کی ابتدائی سطور میں جرجانی نے کتاب المعالجات (معالجات جزویہ) کو اپنی تالیف میں شمار کیا ہے، ایسی صورت میں کوئی جواز نہیں کہ "معالجات جزویہ" کو ابن بطلان کی طرف منسوب کر دیا جائے، اور دونوں اضافی تحریروں اور سید اطہر شیر، فہرست خدا بخش لائبریری پٹنہ کی فہرست کے مرتب کی تحقیق کو درست مان لیا جائے۔

مذکورہ بحث کے بعد یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ خدا بخش لائبریری پٹنہ کا یہ گرانقدر طبی مخطوطہ سید اسماعیل جرجانی کی ہی تالیف ہے جس کی اہمیت ایک قدیم دستاویز ہی کی نہیں ہے، بلکہ موضوعات کے اعتبار اور پیش کش کے انداز سے بھی یہ بے مثال خوبیوں کا حامل ہے، اور ضرورت ہے کہ اس کو مرتب کر کے شائع کرایا جائے !!!

حوالے وکتابیات

۱؎ طب العرب ص ۱۲۹، ترجمہ حکیم سید علی احمد نیر واسطی۔ ۲؎ الاعلام ج ۱ ص ۳۰۸۔ خیر الدین زرکلی۔ ۳؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۵۳۷، حاجی خلیفہ، ۴؎ مطبوعہ فہرست مکتبہ مشرقیہ دار العلوم اسلامیہ پشاور ص ۳۰۳ مرتبہ مولوی عبد الرحیم ۵؎ رضا لائبریری رامپور کیٹلاگ ج ۵ ص ۲۸۳ ۲۸۲، مرتبہ سید امتیاز علی عرشی ۶؎ ایضاً ج ۵ ص ۲۸۳، ۲۸۲، سید امتیاز علی عرشی۔ ۷؎ الاعلام ج ۱ ص ۳۰۸ خیر الدین زرکلی۔ ۸؎ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۳۱، ابن ابی اصیبعہ ۹؎ روضۃ الجنات ص ۳۴۴۔ بحوالہ لغت نامہ ص ۳۱۲، علی اکبر دہخدا، ۱۰؎ درۃ الاخبار ص ۱۰۰، بحوالہ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا۔ ۱۱؎ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا۔ ۱۲؎ کشف الظنون ج ۳ ص ۳۳۰، حاجی خلیفہ ۱۳؎ خدا بخش لائبریری کیٹلاگ ج ۱/۱۰ ص ۴، عبد المقتدر خان۔ ۱۴؎ اے میڈیکل ہسٹری آف پرشیا ص ۲۱۸، الگڈ۔ ۱۵؎ عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۲ ص ۳۲، ابن ابی اصیبعہ۔ ۱۶؎ اے میڈیکل ہسٹری آف پرشیا ص۔ الگڈ ۱۷؎ بحوالہ لغت نامہ ص ۳۱۳، علی اکبر دہخدا۔ ۱۸؎ مفتاح الکنوز ج ۳ ص الف سید احمد شیر۔ ۱۹؎ مفتاح الکنوز ج ۳ ص ۱۹۲، مرتبہ سید احمد شیر میں "بطلان" بالعین تحریر ہے جو غلط ہے۔ ۲۰؎ زبدۃ الطب ورق ۸۳ الف، سید اسماعیل جرجانی ۲۱؎ ایضاً ورق ۸۳ الف۔ ۲۲؎ فہرست میں "وھی خمسۃ اجزاء" تحریر ہے جو درست نہیں۔ ۲۳؎ حروف جلد سازی کی وجہ سے چھپ گئے ہیں۔ ۲۴؎ زبدۃ الطب

ورق ۲۳ الف، سید اسماعیل جرجانی ـ ۵۲۵ ایضاً ورق ۲۳۷ ب۔ ۵۲۶ طب اسلامی ص ۴۷ از مولانا ابن مظہر فاروقی بحوالہ طب العرب ص ۳۱۶ از حکیم نیر واسطی ـ ۵۲۷ زبدۃ الطب اضافی ورق ۲ الف۔ ۵۲۸ ایضاً اضافی ورق ۲ الف، زبدۃ الطب ورق ۱۵۴ الف ـ ۵۲۹ کشف الظنون ج ۲ ص ۳۹۱ حاجی خلیفہ ـ ۵۳۰ مفتاح الکنوز ج ۳ مرتبہ سید اطہر شبیر۔ ۵۳۱ طب اسلامی ص ۴۷، ابن مظہر فاروقی بحوالہ طب العرب ص ۳۱۶ از حکیم سید علی احمد نیر واسطی

بَابُ التَّقرِیظِ وَالاِنتِقَاد

رسائل کے خاص نمبر

نقوش ادبی معرکے نمبر: مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب، متوسط کتابی سائز کاغذ کتابت وطباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۶۳۲ (۱) و ۵۷۶ (۲) مجلد، قیمت عام ایڈیشن ۱۰۰ روپیے (دونوں جلدیں)، لائبریری ایڈیشن ۱۵۰ روپیے، پتہ:-

ادارہ فروغ اردو لاہور (پاکستان)

ضخیم، بلند پایہ اور معیاری خاص نمبروں کی اشاعت نقوش (لاہور) کا طرۂ امتیاز ہے، جس میں اردو کا کوئی رسالہ اس کی ہمسری نہیں کرسکتا، اس کے ابتک درجنوں خاص نمبر شائع ہو چکے ہیں جو سب کے سب اہم اور عظیم الشان ہیں، ادھر برس دو برس کے اندر اسکے کئی خاص نمبر ہم کو ملے ہیں، ان میں رسول نمبر کی دس جلدیں بھی ہیں جن پر آئندہ کسی اشاعت میں تبصرہ شائع ہوگا، پیش نظر نمبر بھی صاحب نقوش کا اہم باشان کارنامہ ہے جو دو جلدوں اور تقریباً تیرہ سو (۱۳۰۰) صفحات پر مشتمل ہے، اسکی پہلی جلد میں زبان وادب اور اسکی تحقیق کے نام پر ہونیوالے معرکوں یعنی اصحاب علم وفن کے مختلف نقطۂ نظر کا خلاصہ مرتب کرکے شائع کیا گیا ہے، دوسری جلد میں مختلف شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کے درمیان ہونیوالی نوک جھونک اور معرکہ آرائی کا ذکر ہے، پہلی جلد کی ابتدا زبان کے نام پر ہونیوالے بعض اختلافات اور معرکوں سے کی گئی ہے، اس سلسلہ کی پہلی بحث اردو زبان کے وجود میں آنے کے اسباب اور اسکے مولد سے متعلق ہے، اسکی ابتدا مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات کے ایک اقتباس سے کی گئی ہے، اس کے بعد مولانا سید سلیمان ندویؒ، حافظ محمود شیرانی، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین، شیخ عبدالقادر اور دوسرے اہل قلم کی کتابوں اور مضامین کے اقتباسات دیے گئے ہیں، پھر ملک کی زبان کیا ہو

ہندی یا ہندوستانی ؟ ملک کی تقسیم کے زمانہ میں یہ اختلاف بالخصوص مولوی عبدالحق صاحب اور گاندھی جی کے درمیان اٹھ کھڑا ہوا تھا جس میں گاندھی جی کے خاص دست راست بابو راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند تھے، ان کے اور مولوی عبدالحق صاحب کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے جن لوگوں کے خیالات اس زمانہ میں نشر ہوئے تھے اُن میں ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں، پنڈت برجوہن دتاتریہ کیفی اور بیرسٹر آصف علی بھی تھے، لائق مرتب نے ان سب کی تقریریں نقل کی ہیں۔ اسی ضمن میں رسم الخط کے مسئلہ پر مولوی صاحب اور گاندھی جی کے علاوہ محمد الیاس برنی، پرشوتم داس ٹنڈن، مولوی عبدالقدوس ہاشمی، پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرے باب میں مختلف صوبوں سے اردو کے تعلق کی نوعیت پر اردو کے مصنفین و محققین کے خیالات کی تلخیص پیش کی ہے، چنانچہ پنجاب (حافظ محمود شیرانی) دکن و مدراس (نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر محی الدین زور) گجرات (مولانا سید سلیمان ندوی) دلی (محمد حسین آزاد و شیرانی) بہار (ڈاکٹر اختر اورینوی) بنگال (سید وقار عظیم) میسور (پروفیسر محمد خاں) اس بحث میں حصہ لینے والوں میں ڈاکٹر عبدالحق، حکیم شمس اللہ قادری، ڈاکٹر چٹرجی، حامد حسن قادری، مسٹر گلگرسٹ، پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ڈاکٹر شوکت سبزواری کے نام بھی قابل ذکر ہیں، اسی حصہ میں دو اہم مضامین "اردو اور دیسی زبان" (از پنڈت برجموہن دتاتریہ) اور قومی زبان (سید ہاشمی فرید آبادی) درج ہیں، تیسرے اور چوتھے باب میں تحقیق اور شعر و ادب کے نام پر معرکوں کا حال بیان ہوا ہے، اس میں پہلے گارساں دتاسی کے تذکرۂ شعرائے اردو، پر مولوی محفوظ الحق اور قاضی عبدالودود کے معرکوں کی تفصیل دی ہے، پھر نواح دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابوں "مثنوی واقعات امامیہ" اور "دیوان مستم تہاروی" پر مندرجۂ ذیل حضرات کے مباحث کا ذکر ہے، ڈاکٹر رشید الدین، نصیر الدین ہاشمی، محمد خلیل تہاروی اور ڈاکٹر نور الحسن

کا یہ حصہ ... کے معارف سے ماخوذ ہے، اس کے بعد مندرجۂ ذیل موضوعات
ادبی و تحقیقی معرکے درج ہیں نقد متروکات" (برج موہن دتاتریہ کیفی، احسن مارہروی اور
نوہر لال زتشی) ترکیب اضافی میں "کی" اور "کے" کا استعمال (مولوی عبدالحق، ڈاکٹر شوکت
سبزواری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور حبیب اللہ غضنفر)، گنجینۂ تحقیق" (سید محمد احمد نجو و مولانا
اور مولوی اقبال احمد سہیل) "فارسی میں یائے معروف و مجہول" (سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی اور شیخ
عبدالقادر)" قواعد اردو از مولوی عبدالحق صاحب (مولوی عبدالغنی، ظفر الملک، قمر احمد، قاضی
محمد عارف اور خواجہ عبدالرؤف) ادب الکاتب (علی حیدر طباطبائی، حامد اللہ افسر، سلیم جعفر اور
نفیس مجتبیٰ صہبا مارہروی) یہ سب مضامین اہم ہیں، اوران سے زبان و ادب کے متعلق مختلف نکتے
اور بہت سی مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، پھر ہجری و عیسوی تاریخوں کی مطابقت کے مسئلہ پر پروفیسر
مہیش پرشاد اور حکیم شمس اللہ قادری کے معرکے درج ہیں، اسی طرح مرزا قتیل کے وطن کے
متعلق بعض محققین کے نقطۂ نظر کا ذکر ہے، پھر نغمہ گانا درست زبان ہے یا نہیں کے بارہ میں مختلف
ادیبوں کی موافق و مخالف رائیں نقل کی گئی ہیں، اسی حصہ میں استفسارات ادبی و شعری کے زیر عنوان
مختلف جواب درج ہیں "تسہیل بلاغت" نام کی ایک کتاب پر تبصرہ بھی ہے، اس میں مرزا محمد سجاد
مرزا اور اثر لکھنوی کی نوک جھونک کا ذکر ہے، ملتان سے لکھنؤ کے زیر عنوان مولانا سید سلیمان ندوی
کی تصنیف خیام پر ڈاکٹر تاثیر کے بعض شکوک" اور سفر افغانستان" کے متعلق جناب اسد ملتانی کے
چند شبہات نقل کر کے ان کے متعلق پہلے سید صاحب کی وضاحت درج ہے اور آخر میں اسد صاحب
کے جواب میں مولانا ابو ظفر ندوی مرحوم کا ایک مضمون بھی دیا گیا ہے، اسی حصہ میں اصلاح سخن"
نام کی ایک کتاب کا ذکر بھی آگیا ہے اس میں شوق سندیلوی کی ستر غزلوں پر بیالیس اساتذہ
کی اصلاح درج ہے، آخر میں اصل موضوع یعنی ادبی معرکے بہ حسب ذیل تین مفید مضامین شامل

گئے ہیں (۱) ادبی معرکوں میں روایت (ڈاکٹر محمد یعقوب) (۲) ادبی معرکوں کی کہانی
ز امیر حسن نورانی) (۳) فارسی شعراء کی معرکہ آرائیاں (از ڈاکٹر عبدالحمید یزدانی)،
سری جلد کے پہلے حصہ میں شخصی معرکوں کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے۔ ان معرکوں کے متعلق
مضامین درج ہیں ان کی مختلف نوعیتیں ہیں جیسے میر، سودا، غالب، ناسخ، عبدالغفور
اغ، ڈاکٹر اقبال، ریاض خیرآبادی اور مولانا ظفر علی خاں کے ان کے مختلف معاصرین
سے جو معرکے ہوئے ان کی تفصیل دی گئی ہے، دوسری نوعیت کے مضامین میں دو اشخاص
، درمیان ہونے والے معرکوں کا حال درج ہے مثلاً مصحفی اور سودا کا معرکہ، انشا اور مصحفی
معرکہ، ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے، انیس و دبیر کے معرکے، شرر و چکبست کے معرکے
لال، تسلیم اور داغ کی معرکہ آرائی، حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک، جلال لکھنوی اور شوق قدوائی
کے معرکے، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے معرکے، چراغ حسن حسرت
ور ڈاکٹر تاثیر کا معرکہ اور جوش و شاہد کا معرکہ، تیسری نوعیت ان مضامین کی ہے جن میں
سی ایک مسئلہ پر مختلف حضرات نے اظہار خیال کیا ہے جیسے اقبال کے ایک شعر پر رشید احمد
صدیقی، مولانا دریابادی، نیاز فتحپوری، ڈاکٹر سید عبداللہ، مہر، سالک، ضیا احمد بدایونی
اور شورش کاشمیری کی رائیں پیش کی گئی ہیں۔ اس جلد کے دوسرے حصہ میں مولوی عبدالباری
آسی کے تذکرہ معرکۂ سخن سے چند ادبی معرکے پیش کئے گئے ہیں، یہ تذکرہ نیاز فتحپوری کا مرتب
کیا ہوا ہے، اس میں جن شعراء کے اشعار پر بعض اہل نظر نے اعتراضات کئے تھے ان کی تفصیل
دی گئی ہے مثلاً آتش کے بعض اشعار پر خود اپنے اعتراضات نقل کئے ہیں، اسی طرح میر درد
پر آزاد اور اصغر پر اثر کے اعتراضات تحریر کئے ہیں، آسی نے جابجا خود بھی اظہار خیال کیا ہے
اور بتایا ہے کہ اعتراضات درست ہیں یا نہیں، آسی کے تذکرہ کا محاکمہ علامہ اطہر ہاپڑوی نے کیا ہے

اس نمبر میں وہ بھی شامل کیا گیا ہے، یہ دونوں چیزیں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے وال
لے نعمت غیر مترقبہ ہیں، اس جلد کی ایک خاص چیز معرکہ آرائی پر امام بخش صہبائی کی
کتاب "قول فیصل" اور "قول فیصل اس کا پس منظر" (از ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام) بھی ہے،
جلد کے شروع میں "شاعرانہ اور معاصرانہ چشمکیں" کے زیر عنوان ایک مبسوط اور دلچسپ
بھی درج ہے، یہ بات کھٹکتی ہے کہ بعض مباحث کے سلسلہ میں مرتب کا رجحان کھل کر
آگیا ہے مثلاً "پنجاب میں اردو" کے سلسلہ میں وہ حافظ شیرانی کے ہمنوا اور اردو ہندی اور ہند
کے مسئلہ میں گاندھی جی کے مخالف نظر آتے ہیں، نزاع کا لفظ مؤنث ہے مرتب نے اسے
مذکر لکھا ہے۔

نقوش کے اور نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی فاضل مرتب کا شاندار کارنامہ ہے، انھو
ادب، زبان اور تحقیق کی ان بحثوں کو از سر نو زندہ کر دیا ہے، جواب فراموش کی جا
اس حیثیت سے یہ نمبر ایک اہم علمی و ادبی دستاویز ہے۔

فارم ۱۷

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڑھ

نام مقام اشاعت :۔	دار المصنفین اعظم گڑھ
نوعیت اشاعت :۔	ماہانہ
نام پرنٹر :۔	اقبال احمد
قومیت :۔	ہندوستانی
پتہ :۔	دار المصنفین اعظم گڑھ
نام پبلشر :۔	"
ایڈیٹر :۔	سید صباح الدین عبد الرحمٰن
قومیت :۔	ہندوستانی
نام و پتہ مالک رسالہ	دار المصنفین اعظم گڑھ

مطبوعات جدیدہ

نواب صدیق حسن خاں :۔ مرتبہ۔ ڈاکٹر رضیہ حامد صاحبہ، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۹۴ مجلد قیمت ۲۵ روپیہ، پتے (۱) اصغر منزل، بدھوارہ، بھوپال ۴۶۲۰۰۱ (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ (۳) سید فرحت علی الفرح C/۲۰۹۔ فیڈرل بی ایریا، بلاک ۲۔ کراچی نمبر ۳۸ پاکستان۔

نواب صدیق حسن خانؒ ذوالریاستین تھے، امارت و ریاست کے ساتھ انھوں نے علم و فن سے بھی مکمل اشتغال رکھا، ان کی تصنیفات سینکڑوں سے متجاوز اور عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہیں، نادر و نایاب علمی و دینی کتب کی اشاعت، دین صحیح اور عقائد حقہ کی ترویج اور شرک و بدعت کے استیصال میں ان کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں اور اس اعتبار سے ہندوستان ہی نہیں پوری دنیائے اسلام میں ان کی شہرت ہے، عرصہ ہوا نواب صاحب کے خلف الرشید نواب علی حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلماء نے مآثر صدیقی کے نام سے اردو میں ان کی مبسوط سوانح عمری لکھی تھی، ادھر عربی میں بھی ان پر تحقیقی مقالہ لکھا گیا ہے، اور اب بھوپال کی ڈاکٹر رضیہ حامد نے یہ تحقیقی مقالہ اردو میں لکھکر بھوپال یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی ہے، یہ نو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہے، اس میں ولی اللہی تحریک کے کارناموں کا خاص طور پر ذکر کرکے اس سے نواب صاحب کے تاثر و تعلق کی وضاحت کی گئی ہے، دوسرے

اب میں نواب صاحب کے خاندان، اس کی مختلف شاخوں اور اس کی اہم شخصیتوں کا تذکرہ ہے
سرے باب میں نواب صاحب کے حالات و واقعات اور سیرت و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی
ہے، چوتھے باب میں بھوپال کی بنا سے نواب صدیق حسن خان کے دور تک کے نوابوں کا ذکر ہے
پانچویں باب میں بھوپال کی علمی، دینی اور ادبی حیثیت واضح کرنے کے لئے نواب صاحب
کے دور تک کے ممتاز اہل علم اور اصحاب کمال کا مختصر تذکرہ قلمبند کیا ہے، چھٹا باب نواب
صاحب کی تصنیفات کے لئے خاص ہے، اور ساتویں باب میں ان کے دینی نقطۂ نظر اور
علمی و سیاسی رجحانات و نظریات پر بحث کی گئی ہے، آٹھویں باب میں نواب صاحب
کے علمی و دینی خدمات کے اثرات و نتائج پر گفتگو کرکے ان کی اہمیت دکھائی ہے، اس میں
بھوپال کی موجودہ علمی سرگرمیوں کا حال بھی تحریر کیا ہے، آخری باب میں نواب صاحب کی شخصیت کی
تشکیل میں حصہ لینے والی اہم شخصیتوں شاہ ولی اللہؒ، مفتی صدرالدین آزردہ، سید احمد شہیدؒ،
امام شوکانیؒ، مدار المہام جمال الدین اور شاہجہاں بیگم کا تذکرہ ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
کا مقدمہ بھی کتاب کی زینت ہے بعض کمی کے باوجود یہ کتاب محنت و سلیقہ سے مرتب کی گئی ہے،
اور اس سے نواب صاحب کے حالات و کمالات کے علاوہ پچھلے دو سو برس کے علمی و سیاسی
حالات و رجحانات اور گذشتہ اور موجودہ بھوپال کی علمی سرگرمیوں کا اندازہ ہوتا ہے، مگر
نواب صاحب کی بعض اہم کتابوں الحطہ وغیرہ کا تعارف نہیں کرایا ہے، زبان و بیان
کی بعض غلطیاں بھی اصلاح طلب ہیں جیسے مندرجہ ذیل جملے غلط یا ناہموار ہیں "اس لئے
دینداری کے معاملہ میں انھیں غیر معمولی صلاحیت حاصل تھی"، (ص ۴۰) "اس طرح ابتدائی
عمر ہی میں آپ کے اندر کافی استعداد تحصیل علوم کی پیدا ہو گئی"، (ص ۴۲) "دونوں قرآن و
حدیث پر براہ راست اجتہاد کو روا رکھتے ہیں"، (ص ۲۹۹) "دونوں قرآن پاک کی تفسیر کے لئے

علمائے سلف کے احوال کو عزت و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں" (ص ۲۹۹) "امام شوکانی کے زمانے میں یمن میں علم حدیث بہت فراوانی اور وسعت سے حاصل کیا جاتا تھا" (ص ۲۵۹) "جن کو اللہ نے اپنے پیغام کے لئے دنیا میں بھیجا ہے" (ص ۲۷) "وہیں دجاد جیسے اہم موضوع پر بھی خامہ فرسائی کی ہے" (ص ۱۰۹) مندرجہ ذیل جملوں میں خط کشیدہ الفاظ زائد ہیں، "والدہ نے انھیں یہ کہکر روک دیا کہ سب ساتھ مل کر چلیں گے" (ص ۱) "شاہ محمد اسحاق سے بھی استفادہ حاصل کیا (ص ۳۲۵) تذکیر و تانیث کی غلطیاں "سلاطین مغلیہ کی دار السلطنت (ص ۵) اس دور کے طالب علمانہ زندگی، (ص ۶) اس کی تابعین (ص ۱۰۶) ترکیب کی غلطیاں "حالت یتیمانہ" (ص ۳) امر و نواہی (ص ۳۵۳) املا کی غلطیاں۔ معمور (ص ۳۵) بجائے مامور فُرق (ص ۳۰) بجائے فرق تبیق (ص ۲۸۲) بجائے تطبیق فخرجین (ص ۲۸۴) بجائے مخرجین اہل تشعیہ (ص ۲۹۹) بجائے اہل تشیع، کتاب کی قیمت بھی زیادہ ہے۔

تنقیدی معروضات :۔ مرتبہ، جناب ظفر احمد صدیقی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۳۔ مجلد مع گرد پوش قیمت بارہ روپیے، پتہ فلاحی بک ڈپو، پیلی کوٹھی، دار السنی۔

یہ کتاب جناب ظفر احمد صدیقی کے سات مضامین کا مجموعہ ہے، ان میں پہلا اور تیسرا مضمون اہم ہے، (۱) قصیدہ، اصل ہئیت اور حدود (۳) شعر العجم اور تنقید شعر العجم، دو مزید مضامین بھی مولانا شبلی کے متعلق ہیں، جن میں ان کے فارسی تغزل اور تنقید نگاری پر گفتگو کی گئی ہے، پہلے مضمون میں اس عام خیال کی تردید کی گئی ہے، کہ قصیدہ اردو اور فارسی کی طرح عربی کی بھی ایک مستقل صنف سخن کا نام ہے، اور بتایا ہے کہ عربی میں اصناف کا تصور اردو و فارسی سے مختلف ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے عربی کے اصناف سخن پر طویل بحث کرکے

دکھایا ہے کہ عربی شعر و ادب کے ماہر ہونے کی حیثیت سے حق قصیدہ کا کوئی ذکر نہیں کیا بلکہ عربی میں تمام اصناف سخن کو قصیدہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر یہ بھی لکھا ہے کہ کبھی قصیدہ و قطعات دونوں کے مقابل استعمال ہوتا ہے، اور کبھی محض قطعات کے معنی میں۔ عہد جاہلیت کی عربی شاعری کی حد تک مقالہ نگار کا خیال درست ہو مگر متاخرین میں متنبی تو قصیدہ نگاری کی حیثیت سے مشہور رہے، اور ابو العلاء معری کے یہاں قصیدوں کا وجود نہیں۔ تیسرے مضمون میں شیرانی صاحب کے شعر العجم پر اعتراضات کو باوزن قرار دیکر لکھا ہے کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندویؒ سے ان کا کوئی جواب نہیں بن پڑا، "تنقید شعر العجم ایک بیش بہا تحفہ اور گرانقدر عطیہ ہے جسے تشکر و امتنان کے ساتھ قبول کرنا علمی و ادبی فریضہ ہے، نیز جس طرح سیرت النبی کی تکمیل سید سلیمان ندویؒ کے لئے باعث افتخار ہے، اسی طرح شعر العجم کی تنقید بھی حافظ شیرانی کے لیے طرۂ امتیاز قرار دی جاسکتی ہے، اور جب اول الذکر کی گرفت نہیں کی جاتی تو ثانی الذکر بھی مورد الزام نہیں ٹھہرائے جاسکتے۔" اس بنا ر فاسد علی الفاسد اور قیاس مع الفارق کے بعد ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ نوجوان مصنف کے خیال میں "شبلی کی بہ نسبت حافظ محمود شیرانی کا علم زیادہ وسیع، نظر زیادہ باریک بیں اور قلم زیادہ حقیقت نگار واقع ہوا ہے"، رہے شبلی تو "وہ اصلاً نہ مورخ تھے نہ سوانح نگار نہ سیرت نویس تھے، نہ محقق و ناقد ...... وہ اصلاً علم کلام کے آدمی تھے"؛ اگر یہ بھی نہ مانا جائے تو کیا بگڑ جائے گا، وہ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی محققین اور ادیبوں کا موضوع بنے ہوئے ہیں، مصنف نے خود اپنا مقالہ اور دوسروں کے لیے بھی انہی پر تحقیقی مقالے لکھے ہیں، تو ایک جوہناہل قلم اور علم و تحقیق کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، انھیں علامہ شبلیؒ و سلیمانؒ پر گھسے پٹے اعتراضات

جو اپنے کو ملات تلاش و تحقیق کے دوسرے میدان کا رخ کرنا چاہئے ورنہ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ۔

زرد پتوں کی بہار (سفرنامہ پاکستان) مرتبہ۔ جناب رام لعل صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت تحریر نہیں، پتہ اترپردیش اردو اکاڈمی۔ ۲۱۔ آر۔ کے ٹنڈن روڈ، قیصر باغ، لکھنؤ۔

اردو کے مشہور افسانہ نگار جناب رام لعل کا آبائی وطن میانوالی (مغربی پنجاب) تھا، ملک کی تقسیم کے بعد انھیں ہندوستان آنا پڑا اور اب برسوں سے انھوں نے لکھنؤ میں مستقل بود وباش اختیار کرلی ہے، تینتیس (۳۳) برس بعد انھیں سنہ ۱۹۸۰ء میں پھر پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تو وہ لاہور، ملتان اور کراچی کے علاوہ میانوالی بھی گئے، یہ کتاب اسی یادگار سفر کی دین اور سوغات ہے، پاکستان میں جس محبت، گرم جوشی اور خلوص سے ان کا خیر مقدم ہوا اس کے تاثرات اور دوسرے احساسات کا اظہار ایسی واقعیت، خلوص اور صداقت سے کیا گیا ہے، جو قارئین پر اپنا گہرا نقش بھی چھوڑ جاتے ہیں، اور انھیں لطف وانبساط کی طرح درد وحسرت کی کیفیت سے بھی دوچار کر دیتے ہیں، انھوں نے اپنے قدیم وطن میں مہمان بن کر جانے اور اپنے گھر میں اجازت لیکر داخل ہونے کا جس پُر اثر انداز سے ذکر کیا ہے اس سے دل پر رقت طاری ہوجاتی ہے، سفرنامہ میں جن جگہوں کا ذکر آگیا ہے، ان کے بارہ میں معلومات بھی تحریر کئے ہیں، جو براہ راست واقفیت کا نتیجہ ہیں، رام لعل صاحب اردو کے اچھے اہل قلم اور بلند پایہ افسانہ نگار ہیں، اسی لئے پاکستان میں ان کے شب وروز وہاں کی نئی اور پرانی نسل کے ارباب قلم شاعروں ادیبوں اور افسانہ نگاروں کے درمیان گذرے، اس سفرنامہ میں ان سب کا ذکر بھی ہے۔

اور ان کی علمی و ادبی کاوشوں کی نشاندہی اور ان کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے جس سے ہندوستان والوں کو پاکستان کے افسانوی ادب کی رفتار کا خاص طور پر اندازہ ہوتا ہے، پھر جابجا انھوں نے ادبی جلسوں اور احباب کی مجلسوں میں ادب اور ادبی مسائل کے بارہ میں دلچسپ تبصرے بھی کئے ہیں ان سے ان کے اچھے ادبی ذوق کا پتہ چلتا ہے، انھیں زبان وبیان پر پوری قدرت ہے، اس لئے انھوں نے اپنے محسوسات ومشاہدات کو جس انداز سے پیش کیا ہے، اس کی وجہ سے پڑھنے والے کو اس میں ناول وافسانہ جیسا مزہ ملتا ہے گذشتہ چند برسوں میں اترپردیش اردو اکادمی نے اردو کی متعدد مفید، معیاری اور بلند پایہ کتابیں شائع کی ہیں جس کے لئے وہ مستحق تبریک ہے، مگر افسوس کہ اکثر کتابیں غیر ذمہ داری اور بے پروائی سے شائع کی گئی ہیں اس کتاب میں بھی ڈاکٹر محمود الٰہی سابق چیرمین کے دیباچے کے شروع کے صفحے غائب اور فہرست کا صفحہ مکرر ہوگیا ہے اور ص۱۹ کے بعد کا مضمون بھی شامل نہیں ہے، ص۹۹ پر ۱۹۵۹ء غلط ہے، صحیح ۱۹۴۹ء ہے ایک جگہ "دنیا کے بیشتر قومیں" لکھا ہے۔ (ص۱۰۸)

الابیات المقدسہ: مترجمہ مولانا حافظ محمد یوسف کوکن صاحب تقطیع متوسط کاغذ بہتر کتابت سائیکلو اسٹائل صفحات ۱۰۰ قیمت پندرہ روپیہ، دار حافظ، ۱۳ اکھاڑہ میلاپور، مدراس ۱۴۔

زیر نظر کتاب تقریباً دو صدی قبل مسیح کے تامل ناڈو کے ایک عظیم عبقری ترودلوور کی شعری تصنیف تروکرل کا عربی ترجمہ ہے جو تامل زبان میں تھی اور اس کے مختلف ملکی وغیر ملکی زبانوں میں ترجمے کئے جا چکے ہیں، یہ شعری مجموعہ مندرجہ ذیل تین حصوں پر مشتمل ہے، (۱) دین وتمدن (۲) دولت وحکومت، (۳) وصل ومحبت اور دوستی، ہر حصہ میں کئی کئی ابواب ہیں اور ہر باب میں متعدد

فصلیں ہیں، ہر فصل دس دس اشعار پر مشتمل ہے، اس طرح پوری کتاب ۱۳۳ فصلوں اور ۱۳۳۰ اشعار کا مجموعہ ہے، پہلے دونوں حصے پند و موعظت کا گنجینہ ہیں، اور ان میں بڑے حکیمانہ خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، حصہ اول میں زہد و حسن عمل کی تلقین کی ہے اور سوء عمل و رذائل سے بچنے کی ترغیب دلائی ہے، اور حصہ دوم میں سلطنت و ارکانِ حکومت کے بارہ میں دانشمندی کی باتیں درج ہیں، آخری حصہ میں جذباتِ الفت و محبت کی ترجمانی کی ہے، مصنف چونکہ قدیم العہد ہیں، اس لئے ان کے حالاتِ زندگی کا پتہ نہیں چلتا تاہم ان کے متعلق تامل ناڈو میں جو دلچسپ باتیں اور روایتیں مشہور ہیں لائق مترجم نے مقدمہ میں انھیں قلمبند کیا ہے، اور آزادی کے بعد خصوصاً تامل ناڈو کی علاقائی پارٹی ڈی۔ ایم۔ کے کے دورِ حکومت میں تامل زبان کی ترقی اور اس عظیم شاعر کے خدمات اور کارناموں کو نمایاں کرنے کے لئے جو اقدامات ہوئے ہیں انھیں بھی تحریر کیا ہے، کتاب کے آخر میں اپنی علمی، تعلیمی اور تصنیفی سرگرمیوں کا حال بیان کیا ہے۔

(۱) فرمودات ختم الرسل | مرتبہ جناب محمد واصل عثمانی صاحب متوسط تقطیع،
(۲) شبلی بلاد اسلامیہ میں | کاغذ و طباعت عمدہ، کتابت قدرے بہتر، صفحات ۴۲، و ۶۴، شائع کردہ ایجوکیشنل پریس، کراچی۔

پہلی کتاب پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے حدیث کی خدمت کے جذبہ سے شائع کی گئی ہے، یہ چالیس منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، لائق مرتب نے ان کا معنی خیز اردو ترجمہ کیا ہے، اور بعض تشریح طلب حدیثوں کی مختصر مگر نہایت دلنشین تشریح کی ہے، دیباچہ بھی بہت فکر انگیز ہے، اس میں مسلمانوں کو دامنِ مصطفےٰ میں پناہ لینے اور اتباعِ سنت کی موثر انداز میں تلقین کی ہے، اور حدیث کی اہمیت، اس کی تدوین کی مختصر تاریخ اور ائمہ کے حالات بھی دئے ہیں، غالباً کتابت

طباعت کی غلطی سے بعض فقروں کے ٹکڑے چھوٹ گئے ہیں، دوسرے اور صفحات سے کم دو اصل روز سے اور صحت لکھا ہے، دوسری کتاب میں بلاد اسلامیہ میں مولانا شبلی کی سیر و سیاحت کا ذکر ہے، اس میں دراصل ان کے سفرنامہ مصر و شام کی خوبیاں اور خصوصیات دکھائی ہیں اور دوسرے سفرناموں سے اس کا فرق بھی واضح کیا ہے، پھر مولانا کے سفر کا مقصد، ان کی انفرادیت، نظریہ تاریخ، طریقہ تعلیم، کتبخانوں، علم و علما سے دلچسپی، حق گوئی، اور مسلمانوں اور عربوں کے بارہ میں مستشرقین کے تحقیر آمیز رویہ پر مولانا کے درد و اضطراب کا ذکر کیا ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا شبلی کی شخصیت کا مطالعہ دقت نظر سے کیا ہے، اور ان کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے اس میں توازن ہے، مولانا نے جن ملکوں کا سفر کیا تھا، سفرنامہ میں ان کے سیاسی حالات نہ لکھنے کی جو وجہ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھی ہے اس پر شیخ عطاء اللہ نے سرسید کی محبت میں غلو کی بنا پر کچھ ناروا اعتراضات کئے ہیں، لائق مرتب نے ان کا اچھا جواب دیا ہے آخر میں انھوں نے سفرنامہ کی جن خامیوں کی نشاندہی کی ہے ان کا جواب خود سفرنامہ کے دیباچہ میں موجود ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے پیش نظر سفرنامہ کا کوئی پاکستانی اڈیشن ہے، جو زیادہ غلط چھپا ہے، انھوں نے جن ادبی غلطیوں کا ذکر کیا ہے، ان میں بعض تو سرے سے غلطی نہیں ہیں، اور بعض طباعت کی غلطی ہیں، جیسے "سلطان سے میرے پہلے تمغہ مجیدی ادا ہونے کی درخواست کی" مصنف کو ادا کے لفظ پر بجا اعتراض ہے، مگر ہمارے پیش نظر نسخہ میں عطا ہے، جس کے بعد اعتراض کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔

ارمغان رخصتی :- از مولوی عبد المعبود ثنا داں بستوی، تقطیع خورد، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۳۲۔ قیمت دو روپیے۔ پتہ :- سہیل بکڈپو سمریانواں بازار ضلع بستی یوپی

یہ شادی میں بچیوں کی رخصتی کے موقع پر کہی گئی نظموں کا مجموعہ ہے، اس میں انھیں شوہر کی خدمت و اطاعت [illegible] اسلامی طرز زندگی اختیار کرنے کی تاکید اور غلط رسم و رواج اور غیر اسلامی وضع قطع ترک کرنے کی تلقین

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ملکی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں، خود ہندوستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے، کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدانِ جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی کٹھن موضوع دیا جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کر کے پیش کر دی، اس میں عہدِ وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلاتِ حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدانِ جنگ، قلعے، چھاؤنیاں، کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت:- ۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"

حجۃ الاسلام مولانا شبلیؒ کی بعض اہم تصنیفات

سیرۃ النبی حصہ اول: اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات و غزوات کی تفصیل اور اس پر تبصرہ، قیمت: ۲۹ روپیہ،

سیرۃ النبی حصہ دوم اقامت امن تاسیس خلافت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات و شمائل کا مفصل بیان قیمت:۔ ۲۰ روپیہ

الفاروق حضرت عمر فاروقؓ کی مفصل سوانحعمری اور ان کے مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل مولانا شبلی کے قلم کی شاہکار کتاب، جس پر مصنف کو بھی ناز تھا، قیمت: ۲۲ روپیہ

الغزالی حجۃ الاسلام امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور ان کے علمی کارناموں کی تفصیل ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ، قیمت ۱۱ روپیہ،

المامون خلیفہ مامون الرشید کی سوانح و حالات کے علاوہ اس کے عہد حکومت کے سیاسی علمی مذہبی اخلاقی تمدنی حالات جن سے دولت عباسیہ بغداد کے عروج و کمال کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے

قیمت: ۱۱ روپیہ،

سیرۃ النعمان، امام ابو حنیفہؒ کی سوانح عمری، ان کے اجتہادات اور استنباطات اور مسائل اور فقہ حنفی کی خصوصیات (زیر طبع)

سوانح مولانا روم: مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانحعمری اور ان کی شاہکار تصنیف مثنوی شریف پر مبسوط تبصرہ، (زیر طبع)

موازنہ انیس و دبیر، مشہور مرثیہ نگار میر انیس کی شاعری پر ریویو، اور مرزا دبیر سے ان کا موازنہ زیر طبع

کلیات فارسی، مولانا کے فارسی کلام کا مجموعہ قیمت ۱۱ روپیہ،

کلیات اردو: مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جو انھوں نے مسجد کانپور، جنگ طرابلس، غزوۂ بلقان، مسلم لیگ اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھیں، قیمت: ۶ روپیہ،

مکاتیب شبلی: مولانا کے دوستوں عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ حصہ اول، حصہ دوم ۱۶ روپیہ، ۱۲ روپیہ

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۰۲۰

مئی سنہ ۱۹۸۴ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد (پن [illegible])

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک تین کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اول

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:- ۸ روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:- ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

.... [illegible] ....

[illegible]

جلد ۱۳۳ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۸۴ء عدد ۵

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

۱۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو کراچی سے عزیزی افضال حسین فیجنگ ڈائرکٹر آدم جی مل کے ساتھ پشاور اور اسلام آباد ایک خوشگوار اور پرکیف سفر ایک ہفتہ کے لئے ہوا،

اس سفر کا اصل مقصد حضرت مولانا محمد اشرف صدر شعبۂ عربی پشاور یونیورسٹی سے شرف ملاقات حاصل کرنا تھا جو استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بڑے محبوب خلیفہ بھی ہیں، ان کی بلند پایہ تصنیف سلوک سلیمانی کی دو جلدوں کا ذکر معارف کے شذرات میں آچکا ہے، ان کے اس علمی کارنامے سے راقم کی گردن ندامت سے جھکی رہتی ہے کہ جو کام دار المصنفین کے اندر ہونا چاہئے تھا، وہ پشاور کے ایک عزلت خانہ میں ہوا، اسی کے ساتھ امتنان و تشکر کا جذبہ بھی غالب رہتا ہے کہ ان کی اشاعت سے ایک بہت ہی اہم کام انجام پاگیا، ان ملی جلی کیفیات کے ساتھ حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری ہوئی تو ایسا معلوم ہوا کہ اپنے ایک سگے بھائی کی محبت اور صحیح معنوں میں ایک اہل اللہ کی صحبت کی دولت مل گئی، شرمندگی بھی تھی کہ یہ حاضری تو بہت پہلے ہونی چاہئے تھی، بہت تاخیر سے ہوئی، وہ حضرت سید صاحبؒ کی غایت محبت میں اعظم گڈھ بھی تشریف لائے تھے، ان کی ایک ایک چیز کا دیدار بڑے والہانہ انداز سے کیا تھا، یہ راقم اس موقع پر اعظم گڈھ سے باہر تھا، یہاں نہ ملنے کا بھی قلق تھا جو پشاور پہنچ کر کچھ حد تک دور ہوا،

اللہ تبارک و تعالیٰ کی مصلحت سے حضرت مولانا چلنے پھرنے سے بالکل مجبور ہیں، اپنے جاں نثار مریدوں کے سہارے اٹھتے بیٹھتے ہیں، وہی ان کو اپنی پیٹھ پر لاد کر ایک پہیہ دار کرسی یا کسی موٹر پر بٹھا دیتے ہیں، تو کہیں آتے جاتے ہیں، اسی طرح ریل اور ہوائی جہاز کا بھی سفر کرتے رہتے ہیں، اس مجبوری کے باوجود ان کی عارفانہ بصیرت، عالمانہ فکر، حکیمانہ نکتہ پروری، واعظانہ خطابت اور قلمی سرگرمیاں برابر جاری و ساری ہیں، تین دفعہ کے دن

مجلسوں میں بیٹھنے کا موقع ملا، اپنی ہر بات پر حضرت سید صاحبؒ کا کوئی ملفوظ یا شعر سنا کر اپنے ساتھ اہل مجلس کو بھی سرشار کر دیتے، ندامت ہوتی رہی کہ حضرت سید صاحبؒ کا ایک قابل رشک شیدائی دارالمصنفین کے بجائے پشاور میں ہے،

وہ سلوک سلیمانی کی تیسری جلد بھی مرتب کر رہے ہیں جس میں حضرت سید صاحبؒ کے ملفوظات اور شذرات کے سلسلہ میں خطوط کے جوابات ہوں گے، ایک علحدہ جلد میں وہ ان تمام مضامین کو بھی جمع کر رہے ہیں جو مختلف لوگوں نے حضرت سید صاحبؒ پر اب تک قلمبند کئے ہیں، انھوں نے سلیمان اکیڈمی بھی قائم کرلی ہے اس کی طرف سے ایک ماہانہ رسالہ البیان بھی نکالتے ہیں جس میں حضرت سید صاحبؒ کی فکر و نظر کی ترویج کے لئے ان کے خاص خاص مضامین بھی شائع کرتے رہتے ہیں

ان کو اردو کے علاوہ فارسی اور عربی لکھنے میں بھی بڑی قدرت ہے، حضرت مولانا زکریا سہارن پوری قدس سرہ العزیز کی مشہور ضخیم کتاب فضائل درود شریف کا ترجمہ فارسی میں کرکے اس کو بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع کیا ہے، اس کی ایک جلد پاکر اس کا آنکھوں سے لگایا، عربی میں بھی ان کے کچھ رسالے ہیں، وہ منبر پر بیٹھ کر کوئی خطبہ دیتے ہیں تو اپنی پُر اثر خطابت سے ایمان و یقین کے موتی اپنے سامعین پر نچھاور کرتے رہتے ہیں، ان کے عقیدت مندوں کا بڑا وسیع حلقہ ہے جس میں رشد و ہدایت کے طالبوں، عالموں اور دانشوروں کے علاوہ بڑے بڑے سرکاری عہدیدار بھی شامل ہیں،

انہی کے حسن وساطت سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مشہور خلیفہ مولانا فقیر محمد کی خدمت میں باریابی کی سعادت حاصل ہوئی، ان کی صحبت میں جو ساعتیں گذریں وہ کیا عجب کہ توشۂ آخرت بن جائیں، کتابوں میں دیدۂ گریاں اور دلِ بریاں کا حال تو بہت کچھ پڑھا تھا، مگر اس کا عملی نمونہ حضرت

مولانا کو مجرو کی رفت سوزاں میں پایا، بات بات میں وہ گریہ طاری ہوجاتا، وہ اپنے تصنیف مدارسے تنسو لی کو پوچھتے رہتے اُن کا مستقل قیام مدینہ منورہ میں رہتا ہے، ان دنوں پشاور ہی میں تشریف فرما تھے اور مدینہ منورہ کے لئے رخت سفر باندھے ہوئے تھے، ان سے دعاؤں کا طلب گار رہا،

ایک روز حضرت مولانا محمد اشرف کی معیت میں مدرسہ امداد العلوم کی سالانہ دستار بندی کے جلسہ میں شریک ہونے کی عزت حاصل ہوئی، وہاں متشرع اور دیندار حاضرین کا بہت بڑا مجمع تھا جن کو دیکھکر ایسا محسوس ہوا کہ قرون اولیٰ میں مجاہدین کی جماعت ایسی ہی رہی ہوگی، اس کے صدر مدرس اور محدث مولانا حسن جان ہیں جن کے جذبۂ ایثار و خدمت سے حضرت مولانا اشرف کی سرپرستی میں یہ بڑا فروغ پا رہا ہے، اسی کے ساتھ فیصل مسجد کے نام سے ایک مسجد بھی تعمیر ہوگی، جس میں ایک کروڑ سے زیادہ رقم خرچ کرنے کا تخمینہ ہے،

پشاور کی وہ مسجد بھی دیکھی جہاں آکر حضرت سید احمد شہید بریلویؒ نے جہاد کے سلسلہ میں اپنے مجاہدین کے ساتھ قیام کیا تھا، اس جہاد کی پوری تصویر سامنے آگئی، اور وہ تصانیف بھی جو ان پر اب تک لکھی گئی ہیں شہر کے قلب میں مسجد مہابت خاں ہے، اس کو جہانگیر کے مشہور منصبدار نے بنایا تھا، مگر سکھوں کے زمانہ میں اس کا سارا حسن ان کی غارتگری کی وجہ سے جاتا رہا تھا، اسّی برس کے بعد یہ واگذاشت ہوئی تو اس کی تزئین و آرائش پھر سے کی گئی، اس کی محرابیں، ڈیوڑھیاں، تین صدر دروازے، گنبد دار ماذنے، وسیع صحن، مختلف حجرے، چھتوں پر چھوٹے چھوٹے گنبد، نماز کی دالان میں خوبصورت آرائشی محرابیں، ان میں نفیس مناعی اور کندہ کاری کے نمونے، دالان میں داخل ہونے کے لئے پانچ کشادہ چوبی دروازے، اونچے اونچے منارے مغل طرز تعمیر کی یاد دلاتے ہیں، مگر اس میں شاہجہانی مسجد کا حسن و جمال نظر نہیں آیا،

ایک روز حضرت مولانا اشرف کے ایما سے ان کے ایک مرید نے لنڈی کوتل اور درۂ خیبر کی

ہر کرائی، راستے میں پہاڑیوں، وادیوں اور چشموں کے خوبصورت مناظر دیکھنے میں آئے، پہاڑیوں کے اوپر
مشکل گذار راستوں پر ان کمین گاہوں پر بھی نظر پڑی جن میں چھپ کر قبائلی انگریزوں سے برابر لڑتے رہے تھے
دوسرے دن حضرت مولانا نے خود افغان مہاجرین کے کیمپ دکھانے کی زحمت گوارا کی، ان کی بہت بڑی
تعداد جھونپڑوں اور مٹی کے مکانوں میں زندگی گزار رہی ہے، ان کو دیکھ کر کلام پاک کی یہ آیتیں
یاد آئیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی
کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج
میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں (الممتحنہ رکوع-۲)

ایک رات پروفیسر پریشان خٹک نے یہاں مدعو کیا جس میں یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ اور شہر کے
معززین بھی تھے، اس وقت وہ پشاور یونیورسٹی میں پشتو کے شعبے کے صدر ہیں، اس کے وائس چانسلر بھی
رہ چکے ہیں، قد آور گورے پٹھانوں میں جو خوبصورتی ہوتی ہے، اسی کی وہ نمایندگی کرتے ہیں، اردو کے بڑے
پرزور مقرر ہیں، بولتے وقت اپنے دلچسپ انداز بیان اور مطائبات سے سامعین کو محظوظ کرتے رہتے ہیں،
ان کی مجلس میں نوائے وقت کے مدیر جناب عبدالمجید نظامی بھی تھوڑی دیر تک شریک رہے، پشاور یونیورسٹی
کے شعبۂ نفسیات کے صدر پروفیسر عبدالمغنی بھی وہاں مدعو تھے، ان کی وجہ سے مختلف موضوعات پر گفتگو
کرتے وقت ہر موضوع کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی دعوت دی جاتی تھی، اس دعوت میں حضرت مولانا بھی آخر میں
تشریف لے آئے تھے، جس سے اس کا وقار اور بھی بڑھ گیا،

جا بجا دعوتیں ہوئیں تو پٹھانوں کی میزبانی اور خاطرداری کی جو روایتیں سننے میں آئی تھیں وہ آنکھوں
سے دیکھنے میں آئیں، دسترخوان انواع و اقسام کے کھانوں سے پُر رہتا، روٹیاں، مرغ اور گوشت کی بوٹیاں
وہاں کے لوگوں کے قد و قامت کے مطابق ہوتیں،

اپنی میزبانی کی روایت کے مطابق حضرت مولانا اپنے مریدوں کے ساتھ اور پروفیسر پریشان خٹک

ہمارا ڈیرہ پہلے کو تشریف لائے تھے، اور پھر رخصت کرنے کے لئے بھی ہوائی اڈے تک آنے کی زحمت گوارا کی، ان کو الوداع کہتے وقت محسوس ہوا کہ یہاں اخلاص و محبت کے جو لمحات گذرے وہ زندگی کا سرمایہ بن کر رہیں گے، پروفیسر پریشان خٹک نے بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا، حضرت مولانا نے ایک جانماز اور تسبیح دی، اُن سے اشکبار آنکھوں کے ساتھ دعاؤں کا طلب گار ہوا، پنڈی میں دعاؤں کی بڑی اہمیت ہر بات پر سب کے ہاتھ دعاؤں کے لئے اٹھ جاتے ہیں،

اسلام آباد میں بھی تین روز عزیزی افضال مبین کے ایک عزیز کے یہاں قیام رہا، وہاں زیادہ تر وقت اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں گذرا، اس کے ڈائرکٹر جنرل اب جناب ڈاکٹر محمد زماں صاحب ہیں جنھوں نے اپنی غایت اخلاق تواضع اور سادی خاطرداری سے ہر طرح ممنون کیا، اسٹاف کے بہت سے لوگوں کو اپنے کمرہ میں جمع کیا، ان سے دیر تک اسلام اور مستشرقین پر گفتگو ہوتی رہی، اس موضوع پر اعظم گڈھ کے بعد دوسرا سمینار ویسٹ ایشین اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے دسمبر میں کراچی میں ہونے والا ہے، ڈاکٹر محمد زماں نے اپنی عنایت سے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو اس سمینار کا شریک داعی بنا لیا ہے، امید ہے کہ اب ان دونوں اداروں کے تعاون سے سمینار کا اجلاس با وزن اور باوقار طریقہ سے ہوگا،

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اب وہاں ہے، جہاں شاہ فیصل کی مسجد بن رہی ہے، یہ جب مکمل ہو جائے گی تو شاید دنیا کی بڑی مسجدوں میں شمار ہوگی، اسی کے ساتھ انسٹی ٹیوٹ کی جو عمارت ہے وہ اپنی وسعت اور شوکت کے لحاظ سے اسلامی ممالک کے بہت بڑے علمی اور تحقیقی اداروں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے، خدا کرے جن آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کی خاطر یہ ادارہ قائم کیا گیا ہے وہ اس کے دانشوروں کے ذریعہ سے پوری ہوں، آمین

اس کے کتب خانہ میں اب تک ۲۵ ہزار کتابیں جمع ہو چکی ہیں، اس کے سرگرم لائبریرین جناب احمد خاں صاحب ہیں، میرا ایک مضمون، اسلامک کلچر حیدرآباد دکن میں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں

کے فنون جنگ پر [illegible] ء میں کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا، یہ میرے پاس نہ تھا، جناب محمد خان صاحب نے گویا آنکھ جھپکتے اس کی ایک کاپی فوٹو سٹیٹ کرا کے میرے حوالے کر دی، اس کے لئے ادارہ ان کا بہت ممنون ہوا،

اسلام آباد میں سپریم کورٹ کے جج جناب شفیع الرحمن صاحب سے بھی ملاقات ہوئی، وہ پہلے بنارس کے رہنے والے تھے، اعظم گڈھ میں ان کی رشتہ داری ہے، اسی تعلق سے وہ بڑی محبت سے ملے، اور دیر تک اسلامی قوانین پر گفتگو کرتے رہے،

نیشنل بک فونڈیشن کے دفتر بھی گیا، جس سے پاکستان میں دارالمصنفین کی مطبوعات کے حق اشاعت کا معاہدہ [illegible] ء میں ہوا تھا، اور گذشتہ فروری میں سیرۃ النبی جلد ہفتم کی اشاعت کا حق بھی پچیس ہزار پاکستانی سکے کے معاوضہ میں اس کو دیا گیا ہے جس کی ادائگی کا وعدہ جون [illegible] ء میں کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ اب تک دارالمصنفین کی صرف پچیس کتابیں شائع کر سکا ہے، اس تاخیر سے پاکستان کے اہل علم مطمئن نہیں ہیں، اور وہ دارالمصنفین کی کتابیں خریدنے کے لئے بے چین نظر آتے ہیں،

جناب نبی بخش بلوچ پاکستان کی دو یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر رہ چکے ہیں، سندھی، اردو اور انگریزی زبانوں کے بڑے ممتاز مصنف ہیں، وہ حکومت کے ہر مشکل کام کو بڑی خوش سلیقگی سے انجام دینے کے لئے مشہور ہیں، ان کی علم دوستی، پاکیزگی نفس اور ضرورت کے وقت دست گیری کے حسن اخلاق سے عرصہ سے متاثر ہوں، وہ دارالمصنفین کے محسنوں میں سے ہیں، انھوں نے بھی ایک شام چند دوستوں کے ساتھ اپنے یہاں مدعو کیا، ان کی یہ دعوت علم و ادب کی بزم بن گئی، رخصت کرتے وقت چچ نامہ کا انگریزی ترجمہ اور اسلام آباد میں جو سائنس کانگرس ہوئی تھی، اس میں پیش کئے جانے والے مقالات کی کئی ضخیم جلدیں پیش کیں،

ایک رات اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ریڈر جناب حافظ محمد غازی نے اپنے یہاں کئی دوستوں کے ساتھ مدعو کیا، وہ اپنے چھوٹے بھائی حافظ محمد غزالی کے ساتھ برابر جیسے بڑے بھائی کی طرح ۱۹۷۵ء

سے ملتے رہے ہیں ان کے والد بزرگ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے بیعت ہم زلف ہیں، سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو کر یاد الٰہی میں مشغول رہتے ہیں، یہ دعوت کا ہے کہ تھی ایک پردیسی کی آمد پر عزیزانہ اخلاق کی عطر پاشی ہر طرف ہو رہی تھی، یہیں پر وقیہ حامد سے بھی ملاقات ہوئی تھی، جو انگریزی اور اردو کی کئی کتابوں کے مصنف ہو چکے ہیں، وہ پہلے کامل طرانی کالج میں انگریزی کے استاذ تھے،

اس سفر سے واپس کراچی آیا تو ایک رات برادر عزیز مولانا غلام محمد اپنی ایک امانہ مجلس میں ساتھ لے گئے جس میں ان کے پچیس تیس مریدین اور معتقدین شریک تھے، جب روشنی گل کر کے اس میں ذکر جلی شروع ہوا تو کیا ایک بڑی کیفیت محسوس کی بعض شرکاء پر گریہ بھی طاری تھا، خیال ہوا کہ ایسی روحانی مجلسوں ہی کی بدولت پاکستان رحمت الٰہی کی بارش سے سیراب ہوتا ہو گا، مولانا غلام محمد سے معارف کے ناظرین واقف ہوں گے، وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفہ اور تذکرہ سلیمان کے مصنف بھی ہیں،

کراچی کے قیام میں لیاقت علی ڈگری کالج کے پرنسپل جناب سید فخر الحسن صاحب سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، ان کو بہت ہی خلیق، ملنسار، علم دوست کے علاوہ ہر کام کو مستعدی سے انجام دینے میں متحرک پایا، ان کو استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندویؒ سے بڑی عقیدت اور محبت ہے، ان کی سیاسی سرگرمیوں پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے جو جلد ہی شائع ہوگی آیندہ دسمبر میں وہ حضرت سید صاحبؒ کی صد سالہ سالگرہ منانے کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کر رہے ہیں، اس کے لئے وہ مولانا ابوالحسن علی ندوی، ندوۃ العلماء اور دار المصنفین سے خصوصاً علمی تعاون چاہتے ہیں، جو انشاء اللہ حاصل ہوگا،

مقالات

منٹگمری واٹ کی کتاب
محمدؐ ایٹ مکہ پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی، جب کہ آپ پچیس برس کے تھے، مصنف نے یہ لکھ کر نکتہ زنی کی ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی عمر بتانے میں شاید مبالغہ کیا گیا ہے، شاید یہ لکھ کر اپنے ظنیات کا ثبوت تو ضرور دیدیا ہے، اور اس طرح وہ اپنی ذمہ داری سے بھی ماہرانہ طور پر برأت کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ عمر بتانے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، تو اس کی کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے آٹھ اولاد ہوئی اور اگر ہر سال ہوتی رہی تو آخری اولاد ان کے ۴۸ ویں سن میں ہوئی، لکھتے ہیں کہ یہ ناممکن بات نہیں، لیکن اس پر کافی رائے زنی ہو سکتی ہے، ممکن ہے کہ اس کو اعجاز پر محمول کیا گیا ہو، لیکن ابن ہشام، ابن سعد اور طبری میں اس پر کوئی حاشیہ آرائے زنی نہیں، پھر ہمارے مصنف کو رائے زنی کرکے چھیڑ خانی کی کیا ضرورت تھی،

اسی طرح محض قیاس کر کے یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی، کہ خدیجہؓ اتنی دولت مند نہیں رہی ہونگی، جتنی کہ کہا جاتا ہے۔ اور پھر ان کے قیاسات پر مبنی ان کے استدلال کا یہ رنگ ہے کہ خیال ہے کہ محمدؐ کے پاس بھی کافی سرمایہ ہو گیا ہوگا، کیونکہ وہ تجارت میں معتدلانہ انداز میں حصہ لیتے رہے۔ اس کی کوئی سند نہیں ہے کہ وہ شام پھر نہیں گئے، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ شام نہیں گئے یا یہ ممکن ہے کہ اپنی تجارت کی نگرانی دوسروں کے ذمہ کر دی ہو گی، اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ وہ تاجروں کے اندرونی حلقہ اور اس سود مند کاروبار سے بدر کر دیے گئے۔ لیکن یہ بھی سمجھنا صحیح نہیں کہ وہ بالکل بدر کر دیے گئے تھے، کیونکہ انھوں نے اپنی لڑکی زینبؓ کی شادی عبد شمس کے قبیلہ کے ایک رکن سے کی، جو خدیجہؓ کے بھتیجے تھے ان کی دو لڑکیاں ابولہب کے لڑکوں سے منسوب تھیں، یہ اس لیے کہ ابولہب کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ شاید وہ بنو ہاشم کے مستقبل کا آدمی ہو، اس سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے، کہ محمدؐ کو بھی قبیلہ کے ہونہار نوجوانوں میں تصور کیا جانے لگا تھا، ان قیاسات اور ظنیات کے مجموعوں سے مصنف کے تحقیقی رنگ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی اس کے متعلق بھی مصنف نے عجیب وغریب بحث چھیڑ دی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی سے متعلق مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے۔ وہ بخاری شریف کی اس حدیث سے ظاہر ہوگا کہ عبد اللہ بن یوسف، مالک، ہشام بن عروہ کی ام المومنین سے، روایت ہے کہ حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی میرے پاس گھنٹے کی آواز کی ... طرح آتی ہے، اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، اور جب میں اسے یاد کر لیتا ہوں جو اس نے کہا تو وہ حالت مجھ سے دور ہو جاتی ہے،

کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے پاس آتا ہے، اور مجھ سے کلام کرتا ہے، اور جو وہ
کہتا ہے، اسے میں یاد کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ میں نے سخت سردی کے دن
میں آپؐ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر جب وحی موقوف ہو جاتی تو آپ کی پیشانی
سے پسینہ بہنے لگتا۔ (کتاب الوحی باب ۱)
اسی کے بعد اس پہلی وحی کا ذکر ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی اس پوری
حدیث کا اردو ترجمہ یہ ہے
"یحیٰی بن بکیر، لیث، عقیل ابن شہاب، عروہ بن زبیر، ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت
کرتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ سب سے پہلے وحی جو رسول اللہ علیہ وسلم پر اترنا شروع
ہوئی وہ، اچھے خواب تھے، جو بحالت خواب آپ دیکھتے تھے، چنانچہ جب بھی آپ خواب دیکھتے تو
وہ صبح کی روشنی کی طرح ظاہر ہو جاتا، پھر تنہائی سے آپ کو محبت ہونے لگی، اور غار حرا میں تنہا
رہنے لگے، اور قبل اس کے کہ گھر والوں کے ہاں آنے کا شوق ہو، وہاں تحنث کیا کرتے،
تحنث سے مراد کئی رات عبادت کرنی ہے اور اس کے لیے توشہ لیتے۔ یہانتک کہ جب وہ
غار حرا میں تھے، حق آیا، چنانچہ ان کے پاس فرشتہ آیا، اور کہا پڑھ، آپ نے فرمایا کہ میں
پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ بیان کرتے ہیں کہ مجھے فرشتہ نے پکڑا اور مجھے زور سے دبایا،
یہانتک کہ مجھے تکلیف محسوس ہوئی، پھر مجھکو چھوڑ دیا۔ اور کہا پڑھ، میں نے کہا کہ میں پڑھا ہوا
نہیں ہوں، آپ فرماتے ہیں کہ پھر تیسری بار پکڑ کر مجھے زور سے دبایا، پھر چھوڑ دیا، اور
کہا پڑھ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دہرایا۔ اس حال میں کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا،
چنانچہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے پاس آئے اور دوبارہ فرمایا کہ مجھے کمبل اوڑھا دو، تو لوگوں نے

گھبراہٹ جاتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا، حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کر کے
فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے، حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ تعالے
آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں،
محتاجوں کے لیے کماتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور حق کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں،
پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالعزیٰ کے پاس گئیں جو حضرت
خدیجہؓ کے چچازاد بھائی تھے، ایام جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے، اور عبرانی کتاب لکھا کرتے
تھے، چنانچہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، جس قدر اللہ چاہتا۔ وہ نابینا اور بوڑھے
ہو گئے تھے، ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا اے میرے چچازاد بھائی اپنے بھتیجے کی بات سنو،
آپ سے ورقہ نے کہا اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو، تو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے دیکھا تھا، بیان کر دیا، ورقہ نے آپ سے کہا کہ یہی وہ ناموس ہے جو اللہ تعالے نے
حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمایا تھا، کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ
رہتا، جب تمہاری قوم تمہیں نکال دیگی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وہ مجھے
نکال دیں گے، ورقہ نے فرمایا ہاں جو چیز تو لے کر آیا ہے، اس طرح کی چیز جو بھی لے کر آیا
اس سے دشمنی کی گئی، اگر میں تیرا زمانہ پاؤں تو میں تیری پوری مدد کروں گا، پھر زیادہ
زمانہ نہیں گذرا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کا آنا کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا"

"ابن شہاب نے کہا مجھ سے ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن نے بیان کیا کہ جابر بن عبداللہ انصاریؓ
وحی کے رکنے کی حدیث بیان کر رہے تھے، تو اس حدیث میں بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم بیان فرما رہے تھے کہ ایک بار میں جا رہا تھا، تو آسمان سے ایک آواز سنی،
نظر اٹھا کر دیکھا، تو وہی فرشتہ تھا، جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان

کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، مجھ پہ رعب طاری ہو گیا، اور واپس لوٹ کر میں نے کہا مجھے کمبل اڑھا دو،
مجھے کمبل اڑھا دو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (مدثر - ۱ تا ۵)

اے (محمد) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو، اٹھو اور ہدایت کرو اور اپنے پروردگار کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو۔

پھر وحی کا سلسلہ گرم ہو گیا، اور لگاتار آنے لگی (بخاری شریف باب اوّل)

بخاری شریف کے اس باب میں یہ حدیث یہاں پر ختم ہو جاتی ہے۔ دوسری جگہ کتاب التعبیر میں بھی یہی حدیث نقل کی ہے، جس کے آخر میں کچھ فرق و اضافہ ہے،

اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو۔

"پھر زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کا سلسلہ کچھ دنوں کے لئے منقطع ہو گیا، (امام زہری فرماتے ہیں، جیسا کہ حدیثوں سے ہم کو معلوم ہوا ہے، وحی کا سلسلہ رک جانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غمگین اور رنجیدہ ہوئے کہ کئی مرتبہ آپ صبح کو اس ارادہ سے پہاڑوں پہ گئے کہ اپنے آپ کو ان کی چوٹی سے گرا دیں، جب آپ کسی چوٹی پہ پہنچتے تاکہ اپنے آپ کو نیچے گرائیں تو حضرت جبرئیلؑ ظاہر ہوتے، اور فرماتے اے محمد بلاشبہ آپ خدا کے برحق رسول ہیں، یہ سن کر آپ کا قلق و اضطراب ختم ہو جاتا اور دل مطمئن ہو جاتا اور آپ واپس تشریف لاتے (بخاری کتاب التعبیر جلد دوم ص ۱۰۳۴ مطبوعہ کرزن پریس دہلی)

اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں، جو اس لیے سمجھ میں نہ آئے کہ یہ گنجلک ہے، خشکی دانے

ں حدیث کا سہارا لے کر بڑی گنجلک بحث چھیڑ دی ہے ۔ مگر یہ حدیث بخاری شریف سے
نہیں لی ، بلکہ طبری سے لی ہے ، یہ اس لیے کہ طبری میں ان کی مطلب برآری اور چند زیادہ
ے یہ کچھ باتیں مل گئی ہیں ، طبری نے ابن زہری ہی کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے ، مگر
س کے لکھنے میں بخاری شریف کی حدیث سے جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے ،
وہ پڑھنے کے بعد ہی ظاہر ہو گا ، مصنف نے اس کا جو انگریزی ترجمہ دیا ہے اس کا
اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ، مصنف نے اپنی بحث کی خاطر اس کو علحدہ علحدہ
خانوں میں لکھا ہے ۔

(۱) نعمان بن راشد زہری سے روایت کرتے ہیں ، وہ عروہ سے اور عروہ حضرت
عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں ، کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ وحی سب سے
پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رویائے صادقہ سے شروع ہوئی ، جو صبح صادق
کے مانند ہوا کرتے تھے ۔

(ب) اس کے بعد آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی ، آپ غار حرا میں چلے جاتے اور
وہاں تحنث میں کئی راتوں تک مشغول ہو جاتے ، قبل اس کے کہ اپنے گھر والوں
کے پاس واپس آتے ، وہ ان کے پاس آتے اور سامان لے کر اسی طرح
واپس ہو جاتے ، یہاں تک کہ خلاف امید آپ کے پاس حق آیا ، اور کہا کہ
اے محمد آپ اللہ کے رسول ہیں ۔

(ج) انھوں نے یعنی محمد نے فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا ، کہ میں اپنے کو پہاڑ کی
چوٹی سے گرا دوں ، جب ایسا سوچ رہا تھا ، تو وہ میرے سامنے نمودار ہوا
اور کہا اے محمد میں جبرئیل ہوں ، اور آپ اللہ کے رسول ہیں ۔

(د) تب اوس نے کہا پڑھ، میں نے کہا کہ میں پڑھ نہیں سکتا ہوں محمد نے کہا تب اوس نے مجھے پکڑا، اور تین بار بڑے زور سے دبوچا، یہاں تک کہ میں بے جان ہو گیا، تب اوس نے کہا کہ پڑھ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ...... اور میں نے پڑھا۔

(س) پھر میں خدیجہ کے پاس آیا، اور کہا مجھے اپنی جان کا اندیشہ ہے، پھر اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا، خوش خبری ہو، خدا کی قسم اللہ آپ کو پریشانی میں نہ ڈالے گا، آپ رشتہ داروں کے لیے بھلائی کرتے ہیں، آپ سچ بولتے ہیں، آپ امانت کو واپس کرتے ہیں، آپ تکان برداشت کرتے ہیں، آپ مہمان نواز ہیں، اور حق کے حامیوں کی مدد کرتے ہیں۔

(ص) پھر وہ مجھے ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لے گئیں، اور ان سے کہا کہ اپنے بھائی کے لڑکے ... کی سنیے، انھوں نے پوچھا تو میں نے اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا کہ یہ وہی ناموس ہے، جو موسیٰ بن عمران پر نازل ہوا، کاش میں جوان ہوتا، اور اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کا قبیلہ آپ کو نکالے گا، میں نے کہا کہ کیا وہ مجھے نکال دے گا انھوں نے کہا جب کوئی آدمی ایسا پیام لایا، جیسا آپ لائے ہیں، تو وہ اپنے دشمنوں سے ستائے بغیر نہیں رہا، اگر آپ کا وہ دن میرے سامنے آیا، تو میں آپ کی مدد پورے طور پر پورے زور سے کروں گا۔

(ع) اقرأ کے بعد قرآن کا جو پہلا حصہ میرے اوپر نازل ہوا، وہ یہ تھا۔
نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ن، قلم کی اور جو اہل قلم لکھتے ہیں

نٓ وَالْقَلَمِ ... مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ	اس کی قسم پاک (اے محمد) تم اپنے
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ	پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں
وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ	ہو، اور تمہارے لیے بے انتہا اجر ہے
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۔	اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں
(قلم ۱ تا ۵)	سو عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور یہ
	(کافر) بھی دیکھ لیں گے ۔

(ط) زہری بیان کرتے ہیں، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا کچھ عرصہ کیلئے بند ہو گیا تب بہت غمگین تھے، آپ پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر چڑھنے لگے تاکہ وہاں سے گرا دیں لیکن جب وہ ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے تو جبرئیلؑ نمودار ہوئے، اور کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اس سے آپ کی بے چینی دور ہو جاتی اور اپنے آپ میں ہو جاتے ۔

(ف) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں بیان کرتے اور کہا کہ میں ایک روز ٹہل رہا تھا کہ میں نے اس فرشتہ کو دیکھا، جو میرے پاس حرا میں آتا تھا وہ ایک کرسی پر تھا، جو آسمان اور زمین کے بیچ میں تھی، میں خوف زدہ ہوا، اور خدیجہؓ کے پاس آیا اور کہا مجھکو ڈھانک دو ۔

(ق) ہم نے آپ کو ڈھانک دیا یعنی آپ کے اوپر چادر ڈال دیا، خدا نے اس کے بعد یہ آیت اتاری ۔ يٰۤاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۔ (اے اوڑھ کر لیٹنے والے اٹھ، خبردار کر، اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ)

(گ) الزہری کا بیان ہے، آپ پر جو آیتیں پہلے اتریں وہ ... منسوخ

ربک الذی خلق خلق الانسان من علق، اقرأ وربک

الاکرم الذی علم بالقلم، علم الانسان مالم یعلم،

منٹگمری واٹ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں، الزہری نے جو ابن شہاب

کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری

نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے رک جانے کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب

میں ٹہل رہا تھا ...... یہاں تک لکھنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں، کہ اس روایت میں راوی

کے بدلے ہوئے نام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اور یہ کہا گیا کہ مجھے ڈھانکو اور دیا اڑھا دیا گیا

یہاں پر مصنف نے پوری روایت نقل نہیں کی، پوری روایت یہ ہے،

میں چہل قدمی کر رہا تھا، میں نے آسمان سے ایک آواز سنی میں نے اپنا سر اٹھایا،

تو وہی فرشتہ تھا، جو میرے پاس حرا میں آیا تھا، وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، جو زمین اور

آسمان کے درمیان تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، میں اس سے ڈرا،

میں گھر آیا، اور کہا مجھے ڈھانکو، مجھے ڈھانکو، تو لوگوں نے مجھے چادر اڑھائی، پھر اللہ نے

یہ آیت نازل فرمائی۔

یا ایها المدثر قم فانذر	اے (محمدؐ) جو کپڑا لپیٹے پڑے ہو اٹھو
وربک فکبر وثیابک	اور ہدایت کرو اور اپنے پروردگار
فطهر (مدثر ۱تا۴)	کی بڑائی کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو

آپ فرماتے ہیں، کہ پھر وحی مسلسل آنے لگی۔

اتنا کچھ حذف کرنے کے بعد مصنف کا بیان ہے کہ جابر کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے

کہ سورہ المدثر پہلی وحی ہے، (ص ۱۴ - ۲۰)

اب سوال یہ ہے کہ مصنف نے بخاری شریف کی روایت کے بجائے طبری کا سہارا کیوں لیا بخاری شریف کی حدیثیں طبری کی منقولہ حدیثوں سے زیادہ معتبر اور مستند ہیں بخاری شریف اور طبری دونوں کی روایتوں سے ظاہر ہے کہ پہلے اقرأ والی آیتیں نازل ہوئیں۔ پھر کچھ دنوں وحی کا آنا رک گیا، پھر جب آئی تو پہلے المدثر کی آیتیں نازل ہوئیں۔

اس کے بعد وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ محمدؐ کی نبوت کا آغاز رویائے صادقہ سے ہوا۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ خواب اور رویائے صادقہ میں فرق ہے، اور وہ سورۂ النجم کا سہارا لیتے ہیں، جس کے انگریزی ترجمہ سے وہ خود گمراہ ہوئے ہیں، اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا۔ اس سورہ میں رویائے صادقہ کا مطلق ذکر نہیں بلکہ وحی کا لفظ آیا ہے۔ اس سورہ کی جن آیتوں کا انگریزی ترجمہ ہے ان کو ذیل میں نقل کرکے ہم اپنے ناظرین کے لیے اردو ترجمہ بھی دے رہے ہیں، جو مولانا مودودی کا کیا ہوا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ	قسم ہے تارے کی جب کہ وہ غروب
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَ	ہوا تمھارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے
مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى	وہ اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا،
اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ	یہ تو ایک وحی ہے، جو اس پر نازل
الْقُوٰى، ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى	کیجاتی ہے، زبردست قوت والے
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى، ثُمَّ	نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت
دَنَا فَتَدَلّٰى، فَكَانَ قَابَ	ہے، وہ سامنے آکھڑا ہوا جب کہ
قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى فَاَوْحٰى	وہ بالائی افق پر تھا، پھر قریب آیا،

۴ مَا اَوْحیٰ، مَا کَذَبَ	اور اوپر معلق ہو گیا، یہاں تک کہ
مَا رَاٰی اَفَتُمٰرُوْ	دو کمانوں کے برابر، یا اس سے
لیٰ مَا یَریٰ وَلَقَدْ	کچھ کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے
رٰہُ نَزْلَۃً اُخْرٰی عِنْدَ	اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی
ۃِ الْمُنْتَھٰی، عِنْدَھَا	بھی اسے پہنچانی تھی، نظر نے جو کچھ
الْمَاْوٰی، اِذْ یَغْشَی	دیکھا دل نے اس میں جھوٹ نہیں
رَۃَ مَا یَغْشٰی مَا زَاغَ	ملایا۔ اب کیا تم اس چیز پر اس سے
رُ وَمَا طَغٰی لَقَدْ رَاٰی	جھگڑتے ہو۔ جسے وہ آنکھوں سے
یٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی	دیکھتا ہے، اور ایک مرتبہ پھر اس
۵۳ - رکوع ۱)	نے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس اس کو
	اترتے دیکھا، جہاں پاس ہی جنت
	الماوی ہے، اس وقت سدرۃ المنتہیٰ
	پر چھا رہا تھا، جو کچھ چھا رہا تھا نگاہ
	چندھیائی، نہ حد سے متجاوز ہوئی اور
	اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں"

...ں نے جو انگریزی ترجمہ نقل کیا ہے، اس میں "مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی
...ۃ وَحْیٌ یُّوْحٰی" کا کس قدر تعجب انگیز ترجمہ دیا ہے۔

It is nothing but a Suggestion...

-- *Sugges...*

لیکن جارج سیل نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے،

Neither doth he speak of his own will. It is no other than a revelation which has been revealed unto him.

دونوں ترجموں میں کتنا فرق ہے منٹگمری کے ترجمے میں اور باتیں حذف کر دی گئی ہیں ترجمہ کی آخری سطریں یہ ہیں،

He saw him too at a second descent by the Sidra tree at the boundary, near which is the garden of abode. When the Sidra tree was strangely enveloped, the eye turned not aside, nor passed its limits. Verily he saw one of the greatest signs of his Lord.

ہمارے ناظرین کے سامنے اوپر قرآن مجید کی آیتیں ہیں، وہ دیکھ لیں کہ اوپر کا انگریزی ترجمہ کہاں تک صحیح ہے، جارج سیل کا ترجمہ یہ ہے،

One mighty in power, endued with understanding taught it him and he appeared in the highest parts of the horizon. Afterwards he approached the prophet, until he w

was at a distance of two length or get
nearer and he revealed unto his servant
that which he revealed. The heart of Moh-
ammad did not falsely represent that which
he saw. Will ye therefore dispute with
him concerning that which he saw ? He also
saw him another time by the late tree
beyond which there is no passing near it
is the garden of eternal abode. When the
late tree covered that which it covered,
his eyesight turned not aside, neither
did it wander, and he really beheld some
of the greatest signs of the Lord.

. . . .

. . . .

منٹگمری نے بیچ کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے جس میں یہ ہے کہ اس نے اللہ کے بندے
کو وحی پہونچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی، وہ وحی کے [illegible] کو اس لئے نظر انداز کرنا
چاہتے تھے کہ پھر یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کلام پاک وحی کے ذریعہ نازل
ہوا اس کے بعد vision, true vision اور dream کی بحث نہیں،

چل سکتی تھی۔ وہ اپنی بحث میں جو کچھ کہتے ان کو کہنے کا حق تھا مگر قرآن کی آیتوں کا سہارا لیکر اپنے دعویٰ کو مستحکم کرنے کی فکر میں انھوں نے فریب اور تدلیس سے کام لیا اور ایک ایسا ترجمہ پیش کیا جس میں "وحی" کا ترجمہ ہی نہیں آنے پایا ہے، اگر انھوں نے نیک نیتی سے ترجمہ پر بھروسہ کیا ہے تو ترجمہ کی نوعیت زیر بحث آجاتی ہے، جارج سیل نے کلام پاک کا ترجمہ کرتے وقت اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ یورپ کے زیادہ تر ترجمے قابل اعتبار نہیں ہیں

منٹگمری واٹ نے قرآن مجید کا ایک غلط ترجمہ پیش کرکے یہ بحث بھی چھیڑ دی ہے کہ پیغمبر اسلام نے اس وقت اللہ کو یا جبرئیل کو دیکھا، وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اسکے مفسرین یہی کہتے ہیں کہ اس وقت جبرئیل نمودار ہوتے تھے جارج سیل نے بھی اپنے ترجمہ کے نوٹ میں لکھا ہے، لیکن منٹگمری واٹ کہتے ہیں کہ یہ خیال کرنے کے وجوہ ہیں، خود محمدؐ نے شروع میں یہی خیال کیا کہ وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ جبرئیلؑ کا ذکر مدنی سورتوں سے پہلے نہیں آیا ہے، الی عبدہ کے معنی تو اللہ کا بندہ ہونا چاہئے۔ لیکن یہ ترکیب بھدی A w K w a r d سی ہو جاتی ہے، جب تک فعل کے فاعل میں خدا سمجھا جائے، پھر حدیث میں جو ذکر ہے کہ حق آیا، اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، تو یہ حق سے خدا ہی مراد ہے، منٹگمری واٹ یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن انھوں نے جو عبارت نقل کی ہے اس کا پورا جملہ یہ ہے کہ حق آیا اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں اگر حق سے مراد خدا ہے، تو پھر یہ ہونا چاہیے کہ حق آیا اور کہا اے محمد! آپ ہمارے رسول ہیں۔ اور پھر جابر کی تفسیر کا سہارا لے کر آگے جو کچھ کہتے ہیں، وہ اس قدر گنجلک ہو گیا ہے، کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں، کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں، انھوں نے سورہ والنجم کی ایک آیت کے معنی بھی بدلنے کی کوشش کی ہے، مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى

کے معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھیں، مگر ان کا خیال ہے، کہ اسکے
معنی یہ بھی لیے جا سکتے ہیں کہ محمد نے جو کچھ دیکھا، وہ خدا کے جمال اور عظمت کی نشانی تھی ان کے
مذکورہ بالا ترجمہ میں اس آیت مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى کا ترجمہ نہیں ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ نظر نے جو کچھ دیکھا
دل نے اس میں جھوٹ نہیں ملایا، مگر وہ یہ کہتے ہیں، کہ یہ آیت شاید بعد میں بڑھا دی گئی، وہ شاید لکھنے میں
بڑے ماہر ہیں، یہاں بھی اس مہارت سے فائدہ اٹھایا ہے یہ لکھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اس بات کی طرف
ذہن منتقل ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا تھا، اس کو ان کے دل نے اشاری
صورت symbolic form میں دیکھا، مصنف نے معلوم نہیں یہ کہاں سے معلوم کر لیا، کہ
محمدؐ کا یہ خیال تھا، کہ انھوں نے شروع میں خدا کو دیکھا، اس پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں
کہ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تو نہ تھا، لیکن ایسا خیال کرنے میں انھوں نے غلطی بھی نہیں کی ہے۔
ان کا خیال ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ ہونا چاہیے، ان کے دل نے اس کو سمجھنے میں غلطی نہیں
کی، جو انھوں نے دیکھا۔ ان کو اصرار ہے، کہ محمدؐ نے جبرئیلؑ کو نہیں دیکھا تھا، بلکہ خدا ہی
کو دیکھا تھا، اگرچہ حضرت عائشہؓ کی اس روایت کا بھی حوالہ دیتے ہیں، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے
خدا کو نہیں دیکھا تھا، اس روایت کے بعد مصنف کا یہ ثابت کرنا کہ محمدؐ نے خدا کو دیکھا
کہاں تک صحیح ہے، بات یہ ہے کہ مصنف شروع سے آخر تک اپنی تحریروں کے ذریعہ
سے پُر فریب انداز میں دکھانا چاہتے ہیں کہ کلام پاک کلام الٰہی نہیں ہے، نہ یہ الہامی
ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی رہی، اس لیے سورۂ والنجم کی مذکورہ
بالا آیتوں میں وحی کا لفظ جو دو بار آیا ہے، اس کو نظر انداز کر کے مصنف نے ایسے
ترجمہ کو ترجیح دیا جس میں وحی کا ترجمہ کرنے سے انحراف کیا گیا، اور ایسے Vision -
Divine eruption کر اور آگے چل کر dream true vision

وغیرہ کی اصطلاحات کی گنجلک بحث کرکے اپنے ناظرین کے ذہن کو گنجلک بنانے کی کوشش کی، مورخانہ اور دیانت دارانہ تجزیہ تو یہ تھا کہ وہ صاف صاف لکھتے کہ محمدؐ کے پیروؤں کا خیال ہے، کہ قرآن مجید کلام الہٰی ہے، جو وحی کے ذریعہ سے محمدؐ پر نازل ہوا، مگر اس کو یہودی اور عیسائی تسلیم نہیں کرتے، بات یہاں پر ختم ہو جاتی، پھر ان کو اسلام کا مورخانہ، ناقدانہ اور عاقلانہ مطالعہ کرکے اپنی تحریروں کا پشتارہ لگانے کی ضرورت نہ ہوتی گزشتہ ۱۲ سو سال سے عیسائی مصنفین نے اسلام اور اس کے پیغمبر کے خلاف کتابوں پر کتابیں لکھ کر انبار لگا دیا ہے، مگر ان کے منشا کے مطابق مسلمان ان تحریروں سے متاثر ہو کر جوق در جوق اسلام سے منحرف تو نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ دنیا میں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اور کیا عجب کہ کسی زمانہ میں عیسائیوں سے زیادہ ان کی تعداد بڑھ جائے۔ اور اگر یہ کتابیں عیسائیوں کے لیے لکھی گئی ہیں، تو ان کے لیے ایسی کتابیں لکھی جائیں یا نہیں، وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر اسلام کے منکر اور مخالف بہرحال رہیں گے۔

غار حرا اور تحنث کی بحث آتی ہے، تو مصنف ایک بار اپنے قیاسات بروئے کار لاتے ہیں۔ ایک صفحہ کی بحث میں might be, must have been, hypothetically, probably, evidently, may have, apparently, presumably, seem to have been. جیسے الفاظ کے سہارے اپنی مورخانہ تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے۔ پوری کتاب میں ایسے الفاظ کی بھرمار ہے، اور جتنی بار ان کا استعمال ہوا ہے، ان کو ایک ساتھ جمع کر دیا جائے،

تو معلوم نہیں کتنے اوراق سیاہ کرنے پڑیں، وہ اسی قیاس آرائیوں کے ساتھ لکھتے ہیں
کہ محمد غار حرا میں کہ کی گرمی سے بچنے کے لیے جاتے ہوں، یا یہودیوں اور عیسائیوں کے
راہبوں سے متاثر ہو کر تنہائی کی تلاش میں گئے ہوں، یا وہاں عبادت کر کے اپنے گناہوں
کی تلافی کرتے ہوں، پھر لکھتے ہیں کہ روایاتی طور پر اس طرف ذہن کو منتقل کر لیا جاتا ہو کہ اس عزلت نشینی
میں vizion ظاہر ہوا، لیکن محمد کی پکار کی تاریخیں غیر متعین ہیں، کبھی یہ خلاف
امید ظاہر ہوتی، کبھی خدیجہ اس موقع پر ان سے زیادہ دور نہ ہوتیں، اب اس تحریر سے
اندازہ ہوگا، کہ مصنف نے غار حرا کے تحنث کی اہمیت کس طرح کم کرنے کی کوشش کی ہے۔
اس کے بعد "آپ خدا کے رسول ہیں" کے عنوان پر ڈیڑھ صفحہ کی بحث ہے جس میں
حسب معمول Perhaps کا دوبار، probable کا استعمال تین بار اور پھر
must have, it would be natural to suppose,
might be taken, presumably.
وغیرہ کے الفاظ اور فقروں کا سہارا پھر لیا گیا ہے، لکھتے ہیں کہ۔

یہ اغلب ہے کہ یہ الفاظ "آپ خدا کے رسول ہیں"، ظاہری نہ تھے۔
ممکن ہے کہ یہ خیالی بھی نہ رہے ہوں، بلکہ ذہنی رہے ہوں، یعنی یہ الفاظ
انھوں نے کانوں سے نہیں سنے اور نہ یہ خیال کیا، کہ وہ سن رہے ہیں، بلکہ یہ
الفاظ ابلاغ کا ذریعہ تھے جو ان کے پاس الفاظ کے بغیر پہنچے، الفاظ کی
شکل رویا کے بعد دیدی گئی ہو۔ (ص ۴۴)

یہ قیاس صرف اس لیے ہے، کہ یہ ثابت کیا جائے، کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعہ سے
نازل نہیں ہوا، قرآن کے الفاظ کو Exterior locution اور نہ

Intellectual یا imaginative locution

Divine irruption یا dream یا vision یا محض locution

intuition of creative (creative irruption,

imagination, وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا لے کر ناظرین کو گمراہ کیا گیا ہے ۔ نئے نئے الفاظ اور اصطلاحات کے ذریعے مصنف چاہے جس قسم کی بحث کریں، لیکن یہ کوئی نئی بحث نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی اس قسم کی بحث چھیڑی گئی تھی، قرآن مجید میں ہے۔

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو خود ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ، اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو، مدد کے لئے بلا لو، اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی، اور جس کا مآل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انھوں نے (خواہ مخواہ اٹکل پچو) جھٹلا دیا، اسی طرح تو ان سے پہلے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا، ان میں کچھ لوگ ایمان لائیں گے اور اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ (ریفتدرون- یونس - ۳۸/۴۰)

یہی بات تکرار کے ساتھ کہی گئی، سورہ ہود میں ہے۔

کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے، کہو اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں تم بنا لاؤ، اور اللہ کے سوا اور جو جو تمہارے معبود ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو اگر تم (انھیں معبود سمجھنے میں) سچے ہو، اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا

کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، پھر کیا تم اس امر حق کے آگے، سر تسلیم خم کرتے ہو؟ (ماخوذ از ترجمہ مولانا

ہود ۱۲۔ ہود ۱۱ رکوع ۲)

خود قرآن مجید میں ہے، جب کہ حضرت موسیٰ کو کتاب دی گئی، تو اس پر بھی اسی قسم کا اعتراض ہوا۔

ہم اس سے پہلے موسیٰ کو بھی کتاب دے چکے ہیں، اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا، جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے جو تمہیں دی گئی ہے، اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا، یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلجان میں پڑے ہوئے ہیں اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تیرا رب انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے کر رہے گا، یقیناً وہ ان کی سب حرکتوں سے باخبر ہے۔ پس اے نبی تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر، بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں، ٹھیک ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو۔ (ہود ۔ ۱۱۔ رکوع ۹)

مصنف نے وحی کی قسم کی بحث چھیڑ کر یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے کہ دنیا میں کسی ایسی کتاب کا وجود نہیں جو وحی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے، کہ فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے آتا ہے، اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے، اس کو وحی کہتے ہیں، قرآن پاک کا نزول اسی طریقہ سے ہوا ہے، وحی کی اور قسمیں بھی ہیں، جیسا کہ سورہ شوریٰ ۵۔ میں ہے کہ کسی آدمی کی یہ تاب نہیں، کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے

یا کسی قاصد کو بھیجے، تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے، اس کو وحی کر دیتا ہے۔

(سیرۃ النبی جلد چہارم ص ۶۲)

یہ مسلمانوں کا کھلا ہوا عقیدہ ہے، جس میں "شاید اغلب ہے، خیال ہے، ایسا ہو رہا ہوگا" وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، اور منٹگمری واٹ جیسے مصنف کو حق نہیں ہے، کہ مسلمانوں کو مجبور کریں، کہ وہ ایسے عقیدہ کے قائل نہ ہوں، وہ ایک عیسائی یا عیسائیت کے ایک مبلغ ہونے کی حیثیت سے اسلام یا اور دوسرے مذاہب کے خلاف جتنا بھی چاہیں زہر اگلیں، ان کو کوئی روک نہیں سکتا لیکن اپنی تحریر کو مورخانہ یا معروضی کہہ کر گمراہ نہ کریں، ورنہ ان کی طرف سے کھلی ہوئی دعوت ہوگی، کہ مسلمان ان ہی دلائل اور ان ہی الفاظ کے ساتھ عیسائیت کو بھی اسی طرح داغدار کریں جس طرح وہ اسلام کو کرنا چاہتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے نہیں سمجھے جاتے ہیں، تو پھر وہ قرآن کی برتری کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، اسی لئے اپنی پُر فریب تحریروں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ خود رسول کے ہیں، مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ توریت، زبور اور انجیل سب وحی کے ذریعہ سے نازل کی گئیں، اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے، قرآن میں ہے :۔

ہم نے اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کا ذریعۂ ہدایت بنایا تھا۔

ہم ہی نے داؤدؑ کو زبور دی تھی۔

ہم نے اسکو یعنی حضرت عیسیٰ کو انجیل عطا کی جس میں روشنائی اور روشنی تھی (المائدہ ۵-)

پھر ایک عمومی بات اس طرح کی گئی ہے کہ

اے نبی تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا جن پر ہم
وحی کیا کرتے تھے، تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو (الانبیاء-۲۱)
مستشرقین آج قرآن مجید کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خود رسول اللہؐ کے زمانے
میں بھی کہا گیا ۔ قرآن مجید میں ہے۔

رسولوں کو ہم نے اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لئے نہیں بھیجا کہ وہ
بشارت اور تنبیہ کی خدمت انجام دیں۔ مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ
وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور
انھوں نے میری آیات کو اور ان تنبیہات کو جو انھیں کی گئیں، مذاق
بنالیا ہے، اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب
کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے، اور وہ ان سے منہ پھیرے اور اس کے
بڑے انجام کو بھول جائے، جس کا سروسامان اس نے اپنے لئے خود اپنے
ہاتھوں کیا ہے، (جن لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر
ہم نے غلاف چڑھادئے ہیں، جو انھیں قرآن کی بات سمجھنے نہیں دیتے
اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی ہے، تم انھیں ہدایت
کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے
(سبحان الذی۔ ۱۵۔) باقی

علمائے کشمیر کی فقہی خدمات

از
ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری، شعبۂ عربی امر سنگھ کالج سرینگر کشمیر

(۲)

مولانا معین الدین بن خواجہ خاوند محمود اور الفتادی النقشبندیہ

مولانا معین الدین، خواجہ خاوند محمود نقشبندی کے فرزند تھے، خواجہ صاحب کو جہانگیر اور شاہجہاں کے دربار میں اتنا قرب حاصل تھا کہ بلا جھجک حرم خانہ میں داخل ہوتے تھے، وہ نامور روحانی پیشوا اور مصلح تھے، اُن کا مقبرہ لاہور میں تاریخی حیثیت رکھتا ہے[۵۱]

مولانا معین الدین صاحبؒ کی ولادت کشمیر میں ہوئی تھی، علوم کی تحصیل پہلے اپنے نامور والد سے کی، پھر دہلی آئے اور یہاں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے سلسلہ درس میں داخل ہوئے، ان سے فقہ اور حدیث کا درس لیا اور فراغت کے بعد کشمیر لوٹے، یہاں درس و تدریس، وعظ و تبلیغ، ارشاد و تربیت اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہوئے۔ ۲ محرم ۱۰۸۵ھ میں انتقال کیا[۵۲]۔ خواجہ بازار سرینگر میں آرام فرما ہیں، ان کی قبر مرجع خلائق ہے۔

شیخ معین الدین صاحب بھی حنفی المسلک اور نقشبندی المشرب تھے اور بدعات

---

۵۱ نقوش، لاہور نمبر ص ۳۱۹ تا ۳۲۳، حدائق حنفیہ، نول کشور ۱۹۰۶ء: ص ۴۲۱

۵۲ نزہتہ الخواطر: ج ۵، ص ۴۰۷

در سوم کے خلاف جہاد میں بلا شغول رہتے تھے، مولوی غلام سرور لاہوری مرحوم نے صحیح لکھا ہے

در زہد و تقویٰ و اتباع شریعت — زہد و تقویٰ، شریعت کی
و ترویج سنت و ترفیع بدعت — پیروی، سنت کی ترویج اور بدعت
ثانی نداشت[1] — کے خاتمہ میں بے مثال تھے۔

حضرت شیخؒ بلند پایہ مصنف[2] تھے، تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف پر عربی و فارسی میں متعدد ضخیم کتابیں لکھی ہیں، ان کی حسب ذیل کتابیں آج بھی موجود ہیں جن سے اہل علم استفادہ کرتے ہیں۔

(۱) زبدۃ التفاسیر (عربی) (۲) شرح القرآن (فارسی) (۳) الفتاویٰ النقشبندیہ (عربی) (۴) کنز السعادۃ (فقہ بزبانِ فارسی) (۵) الرضوانی (تصوف) (۶) ردّ الملاحدۃ (علم کلام بزبان عربی)

عہد مغلیہ میں کشمیر کے علمائے فقہ اور اصولِ فقہ پر جو کتابیں لکھی ہیں ان میں الفتاویٰ النقشبندیہ خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کتاب کی ترتیب و تدوین کے لئے حضرت شیخؒ نے کشمیر کے پانچ سربرآوردہ علماء اور قضاۃ کی ایک انجمن قائم کی تھی جن کے نام یہ تھے:

(۱) ملّا محمد طاہر: یہ مشہور محدث شیخ حیدر شیلو کشمیری کے فرزند تھے۔ الفتاویٰ میں کتاب الصلوٰۃ سے کتاب البیوع تک انھوں نے ہی مواد جمع کیا ہے۔

(۲) مولانا ابو الفتح کلو: یہ بھی شیخ حیدر کے تلمیذ رشید تھے، فقہ، اصول اور عربی زبان و ادب میں وسیع نظر رکھتے تھے، خصوصاً فقہی مسائل کے استنباط و استخراج میں بڑی مہارت رکھتے تھے، درسی کتابوں پر شروح کے علاوہ کئی مستقل کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں سیف اللسان اپنے وقت میں بڑی مقبول ہوئی تھی، یہ کتاب ردّ شیعیت میں ہے، مولانا کا انتقال ۱۱۰۲ھ

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۴۲ [2] ان کی تصانیف کے تعارف کے لئے حکیم محمد عمران خاں صاحب کا مضمون "معین بن محمود کشمیری اور ان کی تصانیف"، ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، معارف بابت اکتوبر ۱۹۶۶ء

[illegible] سرینگر میں مقبرہ سلطان زین العابدین میں آسودۂ خاک ہیں[1]

(۳) مولانا محمد یوسف : یہ خواجہ خاوند محمود (والد شیخ معین الدین صاحب) کے محب صادق تھے، فقہ کے اصول و فروع میں استحضار کے ساتھ معانی اور منطق کے فاضل جلیل بھی تھے۔ اپنے ہم عصر کشمیری علماء مولانا فاضل اور مولانا عبد الرزاق سے مناظرے میں بھی بڑی شہرت رکھتے تھے اور اُن پر اکثر غالب آتے تھے، درس و تدریس کے مشغلے سے ہمیشہ وابستہ رہے اسی وجہ سے مدرس بھی کہلاتے تھے[2]

مولانا غلام نبی اور مفتی شیخ احمد کے حالات کسی تذکرہ نگار نے قلمبند نہیں کئے ہیں،

اس کتاب کی تالیف میں مرتبین نے فقہ کی جو اہم کتابیں پیش نظر رکھی ہیں ان میں سے چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں :

(۱) کتاب الخلاصہ : (افتخار الدین طاہر بن احمد بن عبد الرشید البخاری)۔ (۲) خزانۃ المفتیین : (حسین بن محمد السمعانی) (۳) الفتاوی الظہیریہ : (ظہیر الدین ابوبکر محمد بن احمد القاضی المحتسب م ۶۱۹ھ) (۴) فصول الاشتروشنی : (محمد بن محمد الاشتروشنی حنفی م ۶۳۲ھ) (۵) الفتاوی السراجیۃ : (علی بن عثمان الاوشی الفرغانی) (۶) قاضی خاں : (فخر الدین حسن بن منصور الاوزجندی م ۵۹۲ھ) (۷) منیۃ المصلی (شیخ سدید الدین الکاشغری) (۸) الفتاوی الحمادیۃ : (ابوالفتح رکن بن حسام الدین المفتی الناگوری) (۹) خزانۃ الروایات : (قاضی جکن الہندی م ۹۲۰ھ) (۱۰) فتاوی ابراہیم شاہیہ : (شہاب الدین احمد بن محمد معروف بہ نظام الجیلانی) (۱۱) جامع الرموز : (شمس الدین محمد الخراسانی القہستانی م ۹۱۶ھ) (۱۲) تحفۃ الفقہاء : (علاء الدین محمد بن احمد السمرقندی) (۱۳) دستور القضاۃ : صدر بن رشید بن صدر

---

[1] تذکرۂ علمائے ہند : ص ۶، حدائق حنفیہ : ص ۲۵۴، خزینۃ الاصفیاء ج ۲، ص ۳۵۸

[2] تاریخ اعظمی : ص ۱۴۸ و نزہۃ الخواطر ج ۵ ص ۴۴۲

ی معروف بہ قاضی خواجہ) (۱۴) حسب المفتی : (قاضی ابوالمعالی بن خواجہ البخاری)
ان اہم فقہی کتابوں کے علاوہ ہدایہ، کافیہ، غنیہ، شرح وقایہ، فتاوی تاتارخانیہ
و مشہور و متداول کتابوں سے بھی جگہ جگہ استفادہ کیا گیا ہے۔

شیخ معین الدین صاحب سلطان اورنگ زیب کی مذہبی حمیت سے بہت متاثر تھے انھوں
نے شاندار تالیف عالمگیر کے نام معنون کی ہے، اس سے پہلے اپنی تفسیر بھی اسی کے نام معنون کی تھی۔

ملا محسن کشمیری: حاشیہ علی الہدایہ | بارہویں صدی ہجری کے عالم اور مصنف تھے، فقہ اور کلام
ون پر کتابیں لکھی ہیں، مذکورہ حاشیہ کے بارے میں ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے لکھا ہے کہ یہ دہلی
میں موجود ہے[1]

مفتی ابوالوفا کشمیری: کتاب الفقہ | مفتی صاحب صاحب اقتدار بزرگ تھے، مولانا محمد اشرف چرخی اور
ملا امان اللہ کے تلمیذ رشید تھے، مولانا اکبر خاں کی سفارش پر بادشاہ وقت کے مقرب ہو کر معزز
دینی منصب پر فائز ہوئے، فقہ میں ان کی مشہور تصنیف کتاب الفقہ ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ ریاستی
ریسرچ لائبریری (سرینگر) میں موجود ہے، کتاب میں بڑی بے ترتیبی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقہ
سے متعلق افادات اور حواشی کا مجموعہ ہے جو مفتی صاحب نے مختلف وقتوں میں یادداشت کے طور
پر نوٹ کئے تھے، ۹ محرم ۱۱۰۹ھ میں انتقال کیا اور مزار شعراء میں دفن کئے گئے[2]

ملا نور محمد کشمیری: حاشیہ علی حاشیۃ السیالکوتی علی التلویح | ملا صاحب فقہ اور کلام کے متبحر عالم تھے، مذکورہ
حاشیہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے حاشیہ توضیح و تلویح کی تحلیل و تشریح ہے۔ ڈاکٹر زبید احمد لکھتے ہیں
کہ اس حاشیہ (حاشیہ نور محمد کشمیری) کا ایک نسخہ رامپور میں موجود ہے[3]

---

[1] عربی لٹریچر ہندوستان میں (انگریزی): ص ۲۷۹ [2] الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند: مولانا عبدالحی
حسنی: ص ۱۰۹، تاریخ حسن ج ۳ ص ۳۷۴۔ [3] ڈاکٹر زبید احمد کی انگریزی تصنیف: ص ۲۸۴

...ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا محمد امین گاڈ کشمیری: حاشیہ علی شرح تہذیب | یہ کشمیر کے جلیل القدر علماء میں شمار ہوتے تھے، فقہ ان کا خاص موضوع تھا۔ فرائض پر نظم و نثر میں رسالے لکھے ہیں مولانا عنایت اللہ شال جیسے عالم انہی کے شاگرد تھے۔

مولانا محمد امین نے علم و فضل کے باوجود بڑی عسرت کی زندگی گزاری۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ ان کی چار بیٹیاں تھیں جن کا نکاح کرنے میں جہیز کی وسعت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑا، تلاش معاش کے لئے ایک مرتبہ دہلی کا سفر کیا مگر پر اُن کی دو بیٹیاں بیمار ہوئیں اور اچانک دوا کے بدلے زہر کھا گئیں۔ دہلی ہی میں مولانا نے خواب دیکھا کہ کوئی یہ بشارت دے رہا ہے کہ ہم نے تمہاری ضرورت پوری کر دی، کشمیر لوٹ کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کرو، وہ وطن لوٹے اور خواب کی عملی تعبیر دیکھ لی، یہ آپ کے زاہد و عابد ہونے کی بھی زندہ علامت ہے۔ سنہ ۱۱۹۰ھ میں شب قدر میں انتقال کیا۔ شرح تہذیب پر آپ کا حاشیہ تاحال مفقود ہے۔

تعلیقات ابو ابراہیم رفیقی کشمیری | ابو ابراہیم مشہور بزرگ یحییٰ بن معین الدین رفیقی کے فرزند تھے، ۱۲ رذی الحجہ سنہ ۱۱۹۳ھ میں تولد ہوئے، اپنے دادا معین الدین سے قرآن حکیم پڑھا، پھر درسی کتابوں کی تعلیم اپنے والد سے پائی اور تا آخر تک انہی کے دامن علم و تربیت سے وابستہ رہے، خود بھی علوم متداولہ کے ماہر ہوئے، فقہ کی دو عظیم کتابوں پر ان کی تعلیقات ہیں جو ان کا بڑا کارنامہ ہے، یہ دو کتابیں امام محمد بن حسن شیبانی کی الجامع الصغیر اور علامہ ابن نجیم کی الاشباہ والنظائر ہیں۔ شیخ ابو ابراہیم سے جن ممتاز اہل علم نے استفادہ کیا ہے اُن میں مفتی قوام الدین مفتی عنایت اللہ

۱؎ خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۱۳۵۹، حدائق حنفیہ: ص ۲۳۰، تذکرہ علمائے ہند: ص ۱۸۲
۲؎ نزہۃ الخواطر ج ۵، ص ۳۲۰

سید کمال الدین اندرابی اور مولانا محب اللہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ۱۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔[۱]

ملا حیدر ریشلو: نور السراج | مشہور عالم مولانا جمال الدین کے فرزند تھے، روحانی تربیت اپنے نانا سید حیات خاں سے پائی۔ ایک اور بزرگ شیخ اکبر حادی سے بھی فیض حاصل کیا تھا۔ مؤرخ حسن اپنے زمانے کے علمائے کشمیر کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تقریباً سبھی سب اُن کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ ۲۱ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ میں انتقال ہوا اور اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ نور السراج کے نام سے سراجی کی شرح لکھی۔ طلبہ کی سہولت کے لئے سراجی کا منظوم فارسی ترجمہ بھی کیا، اس کے علاوہ فقہ میں ان کی ایک اور تصنیف غرائب الرغائب کا نام بھی ملتا ہے۔[۲]

مولانا کریم اللہ اور ان کی فقہی خدمات | مولانا کریم اللہ بن خلیل اللہ کشمیری کے بارے میں کشمیر کی تاریخیں اور تذکرے خاموش ہیں، انھوں نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے فتاویٰ کے ایک مجموعہ کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیا۔ یہ مجموعہ ایک ضخیم جلد پر مشتمل ہے۔ جس میں مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڑھانوی اور شاہ محمد اسماعیل شہید صاحب دہلویؒ کے فتاویٰ بھی ہیں۔ مولانا کریم اللہ نے یہ خدمت ۱۲۵۳ھ میں انجام دی (الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند، ص ۱۰۹-۱۱۰)

مولانا صدر الدین آزردہ: الدر المنضود | صدر الصدور مفتی صدر الدین آزردہ کشمیری دہلوی جیسی سربرآوردہ علمی شخصیت پر یہاں کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کی زندگی اور علمی کمالات پر مفصل مضامین اور مقالات لکھے جا چکے ہیں۔[۳] فقہ میں اُن کا رسالہ الدر المنضود فی حکم امرأۃ المفقود ان کے علم و تفقہ کا ثبوت ہے جس میں مفقود الخبر مرد کی بیوی کے شرعی حکم

[۱] روضۃ الابرار (قلمی) [۲] تاریخ حسن: ج ۳ تذکرہ ملا حیدر [۳] مشاہیر کشمیر: محمد الدین فوق ص ۱ تا ۷ آثار الصنادید: سر سید احمد خاں ص ۵۲۲ ۔ نزہۃ الخواطر ج ۷، ص ۲۰۱ حدائق حنفیہ ص ۴۸۱ - ۴۸۲ تذکرہ علمائے ہند: ص ۹۳، گلشن بے خار: ص ۱۰ - ۱۱ اتحاف النبلاء: نواب صدیق حسن خاں ص ۳۰۳۔

کی وضاحت کی گئی ہے، اور ائمہ مختلفہ کے درمیان اس مسئلہ میں جو اختلافات ہیں ان کا
شدر حال پر بھی ان کا ایک رسالہ ہے جس کا براہ راست تعلق تصوف سے ہے مگر اس سے
صاحب کی فقہی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا آزردہ نے مفتی اور صدر الصدور کی حیثیت سے بکثرت فتوے دیئے
علمی ذخیرہ ابھی تک پردہ خفا ہی میں ہے، میرے استاذ محترم ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب آ
شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) مفتی صاحب کے فتاویٰ اور دوسری تحریروں کی
میں لگے ہوئے ہیں، اگر یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا تو اہل علم کے ہاتھوں میں ایک بے بہا چیز آ جا
شیعہ فرقہ سے تعلق رکھنے والے علمائے کشمیر کی چند اہم فقہی تصانیف کا تعارف پیش کیا جاتا
سنیوں کی فقہی تصانیف کا اجمالی تذکرہ تھا، ذیل میں بعض کشمیری الاصل علمائے شیعہ کا
شہرت ہندوستان سے گذر کر عراق اور ایران میں بھی پہنچ چکا ہے، اس کا اندازہ آغا بز
الذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ اور العاملی کی اعیان الشیعہ سے بھی ہوتا ہے، یہ علماء جب قم
شیراز، نجف وغیرہ تحصیل علم کے لئے وارد ہوئے تو درس و تدریس اور تصنیف و تالیف
کسی سے پیچھے نہ رہے، اسی طرح ہندوستان میں ان کا مرکز و محور لکھنؤ تھا، یہاں وہ
کرتے تھے اور علم کے ہر میدان میں حصہ لیتے تھے۔

۱۔ **احوط:** نوربخشی فقہ پر یہ پہلی کتاب ہے جو کشمیر میں لکھی گئی، اس کے مصنف میر شمس ا
اپنے کو نوربخشیت کے مبلغ کی حیثیت سے ظاہر کرتے تھے، اور احکام و عقائد کی تکمیل
تھے، اس لئے انھوں نے اپنی کتاب کا نام احوط (Most Comprehensive
..... رکھا، مصنف نے اسے شیعہ حکومت کی پشت پناہی سے کشمیر کا قانون مملکت
کی کوشش کی اور اس کے نفاذ میں سخت جبر و اکراہ سے کام لیا، اس سے پوری مملکت میں

بن اور بغض ونفرت کی کیفیت پیدا ہوئی تھی۔ اس کیفیت سے مرزا حیدر دوغلات نے فائدہ
اٹھایا اور اپنی فوج کے ساتھ کشمیر وارد ہو کر حکومت وسیاست پر عملاً قابض ہو گیا، اس نے نوربخشی
کومت مبلغین اور ان کے جبر وظلم سے نپٹنے کے لئے سب سے پہلے احوط کا ایک نسخہ ہندوستان کے
مقتدر علماء کے پاس بھیجا، اور اُن سے مصنف اور تصنیف کی شرعی حیثیت واضح کرنے کی درخواست
کی، علمائے ہند نے جو خیالات ظاہر کئے، انھیں مرزا حیدر دوغلات نے اپنی تصنیف تاریخ رشیدی
میں درج کیا ہے، علماء نے صراحۃً اس کتاب کو قرآن وسنت کے خلاف قرار دیا اور لکھا کہ اس میں ایسی
باتیں بیان کی گئی ہیں جو اسلامی فرقوں میں کسی بھی فرقے میں پائی نہیں جاتیں۔ انھوں نے مرزا حیدر
کو مشورہ دیا کہ لوگوں کو اس کتاب کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لئے ہر طرح کا بندوبست کرنا چاہئے
اور جس نے یہ عقائد قبول کئے ہوں اُسے پہلے قید وبند کے ذریعہ انکار کرانے کی کوشش کرنی چاہئے اور
اس کے بعد بھی جو ان پر مصر رہیں انھیں موت کی سزا دینی چاہئے[1] مرزا حیدر نسلاً پٹھان اور ایک
سخت گیر مذہبی حکمران تھا، اس نے اس فتویٰ پر بڑی سختی سے عمل کیا اور نوربخشیوں پر بڑے ظلم ڈھائے
اور اس کتاب کے نسخے جمع کرا کر جلوا دیئے وہ خود فخر کے ساتھ لکھتا ہے:

"اب کشمیر میں ایسا ایک شخص بھی دکھائی نہیں دیتا ہے جو اس نے مذہب پر عمل کرتا ہو"[2] مگر یہ
مرزا حیدر کی خوش فہمی تھی۔ نوربخشیوں نے بڑی کامیابی کے ساتھ باطنیت کے قدیم راستے
کو اختیار کیا، مرزا حیدر کی انتقام گیری سے اُن کے عقائد میں نہ صرف صلابت آگئی بلکہ بہت
جلد مرزا صاحب اور اُن کی حکومت کے خلاف ایک خوفناک جال بھی بنا گیا جس میں وہ
یقیناً الجھ گیا۔ اور نہ صرف اُس کی امارت وحکومت کا خاتمہ ہو گیا بلکہ اُس کو جان سے بھی مارا
گیا۔ حالانکہ یہ ایک مسلّمہ تاریخی حقیقت ہے کہ مرزا حیدر کی دینداری، اصلاحی خدمات،
اقتصادی اصلاحات، علماء وصوفیہ کی مرتبہ شناسی اور علم وادب کی حوصلہ افزائی نے کشمیر

---

[1] تاریخ رشیدی (انگریزی ترجمہ) مطبوعہ ۱۹۷۳ء ص ۴۳۵ [2] تاریخ رشیدی: مرزا حیدر دوغلات

کو جس کے مختصر دورِ حکومت میں بے شمار فائدے بھی پہنچے، اس کی موت کے بعد پھر نوربخشیوں کا ندر بڑھا اور ... . حکومت کی باگ ڈور مکمل اور پھر ان کے قبضہ میں آگئی۔

مرزا حیدر نے احوط کے سارے نسخے بھی تلف کرنے کی کوشش کی مگر اس کے باوجود اس کتاب کے نسخے کہیں کہیں محفوظ رہے۔

اس وقت سراج الاسلام نام کی مبسوط عربی کتاب کہیں کہیں موجود ہے، پروفیسر مولوی محمد شفیع مرحوم و مغفور کا خیال تھا کہ یہی شیعہ فقہ کی مشہور کتاب احوط ہے۔ ان کے دلائل دو ہیں، اوّل یہ کہ لداخ کی ایک روایت کے مطابق سراج الاسلام ہی احوط ہے، دوم یہ کہ سراج الاسلام کی تمہیدی سطور بالکل وہی ہیں جو مرزا حیدر نے اپنی تاریخ کے اس استفتاء میں درج کی ہیں جو اس نے احوط کی شرعی حیثیت جاننے کے سلسلے میں علمائے ہند کو بھیجا تھا،[1]

سراج الاسلام ۵۱ ابواب پر مشتمل ضخیم کتاب ہے، ۱۳۳۳ھ میں سب سے پہلے متھرا سے شائع ہوئی۔ صفحات کی مجموعی تعداد ۶۲۰ ہے۔

محمد بن عنایت اور ان کی تحقیقات | کشمیری الاصل شیعہ علماء میں مرزا محمد بن عنایت احمد خاں اور علامہ تفضل حسین اس قابل ہیں کہ ان پر مستقل کتابیں لکھی جائیں، اسی زمانے میں دہلی اور لکھنؤ میں ان کی عظمت و احترام کا چرچا تھا۔

مولانا کے والد کشمیر سے دہلی وارد ہوئے اور یہیں ان کی ولادت ہوئی بچپن ہی سے علم حاصل کرنے کا شوق دامنگیر تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے درسی کتابیں پڑھیں، پھر دہلی کے ایک شیعی عالم سید رحم علی سے فقہ کی تحصیل کی اور حکمت حکیم شریف بن اکمل دہلوی سے پڑھی، بحث و مناظرہ اور شیعہ مذہب کی مدافعت مقصد زندگی تھا، اس کے نتیجے میں اپنے

[1] ملاحظہ ہو اورنٹل کالج میگزین، فروری و مئی ۱۹۲۵ء: مقالہ "فرقۂ نوربخشی"

استاد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی بھی سخت مخالفت کرتے تھے بلکہ ان کی تصنیف تحفۂ اثنا عشریہ کی تردید میں ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام النزھۃ الاثنیٰ عشریہ فی رد التحفۃ الاثنیٰ عشریۃ تھا، اس حیثیت سے شیعہ فرقہ میں بڑی مقبول ہوئی، اور شیعہ علماء بھی ان کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ سلطان العلماء سید محمد تراب نے ان کے القاب میں یہ الفاظ بھی لکھے ہیں

حافظ ثغور الملۃ القویمۃ	ملت جعفریہ کی سرحدوں کے محافظ
الجعفریۃ قالع قلاع البدعۃ	اور ماتریدیہ واشاعرہ کی بدعتوں کا
المحدثۃ للماتریدیۃ والاشعریۃ[۵]	قلع قمع کرنے والے تھے۔

یہ عجیب حسن اتفاق ہے کہ کشمیر کے اس نامور شیعہ عالم کے سب سے بڑے حریف وہیں کے سب سے نامور سنی عالم اور متکلم مولانا رشید الدین خاں کشمیری دہلوی تھے، مولانا محمد بن عنایت کا انتقال ...ھ میں ہوا۔ ان کی تصانیف معدوم ہیں، فقہ میں درج ذیل تین مشہور کتابوں کی انھوں نے کاپی بھی کی تھی[۲]: عالمگیری - کافی - ہدایۃ

جامع الرضویۃ: ملا عبد الغنی کشمیری والد کا نام ملا طالب تھا اور وہ بھی صاحب علم شخص تھے، یہ بارہویں صدی کے علمائے شیعہ میں تھے، جو ہندوستان سے زیادہ بیرونی ممالک میں مشہور ہوئے، ملا عبد الغنی نے شیعہ فقہ کی مشہور و متداول کتاب شرائع الاسلام کا فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کی شرح بھی لکھی، جو ہند، ایران اور عراق میں مقبول ہوئی، اور مدارس میں داخل نصاب بھی کی گئی، اس شرح و ترجمہ کا نام جامع الرضویہ ہے، خود لکھتے ہیں

شکر للہ کہ زیں عروج دیں	یافت تالیف ایں خجستہ کتاب
ایں چنیں یادگار دو عالم	دیدہ کم دیدہ اولوالالباب

---

[۱] نجوم السماء: مرزا محمد علی، مطبع جعفری لکھنؤ ۱۳۰۲ھ: ص ۳۵۲ [۲] ایضاً ص ۳۶۱ و نزہۃ

ملا صاحب کا انتقال ... میں ہوا اور اپنے آبائی مقبرہ میں سپرد خاک ہوئے۔

رسائل محمد باقر رضوی | محمد باقر بن محمد بن علی بن صفدر بن صالح الرضوی القمی الکشمیری ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۹ء میں تولد ہوئے اور ۱۳۴۶ھ مطابق ۱۹۲۸ء میں کربلا میں انتقال کیا۔ عمر رضا کحالہ ان کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

فقیہ، اصولی، أدیب، شاعر — وہ فقیہ، اصولی، ادیب، شاعر

مشارک فی بعض العلوم[۱] — اور بعض علوم میں دستگاہ رکھتے تھے۔

عقلی علوم ریاضی، ہیئت، منطق اور فلسفہ کی تحصیل لکھنؤ میں علامہ تفضل حسین خاں اور ملا حیدر علی سے کی، پھر عراق کا سفر کیا۔ یہاں نجف میں شیخ کاظم خراسانی، حسن مامقانی اور ملا حیدر علی سے دینی علوم کی تحصیل کی، کچھ مدت سامرا میں رہ کر کربلا آئے، اس کے بعد لکھنؤ واپس ہوئے اور اپنے والد کے مدرسہ سلطان المدارس میں درس دینے لگے، بڑے بڑے علمائے شیعہ کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا، پھر دوبارہ کربلا گئے اور وہیں ۶۰ سال کی عمر میں رحلت کی، فقہ میں ان کے درج ذیل تین رسائل یادگار ہیں اور طبع ہو چکے ہیں۔[۲]

(۱) الروضۃ الغنا فی حرمۃ الغنا (۲) القول المصون فی فسخ نکاح المجنون (۳) اسداء الرغائب

محمد رضوی: نجاسۃ الماء القلیل | محمد بن علی بن صفدر بن صالح رضوی قمی کشمیری۔ لکھنؤ میں ولادت ہوئی تھی اور کربلا میں ۴ محرم ۱۳۱۳ھ کو انتقال کیا، ان کے والد محمد باقر تھے جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، یہ حدیث، فقہ، کلام اور فقہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، فقہ میں ماء راکد سے متعلق نجاسۃ الماء القلیل کے نام سے ایک رسالے کا ذکر ملتا ہے۔[۳]

---

[۱] معجم المؤلفین: ج ۳ ص ۹۴ مطبعۃ الترقی بدمشق ۱۹۵۷ء [۲] اعلام الشیعۃ آغا بزرگ طہرانی ج ۱ ص ۱۹۲، ۱۹۳، بروکلمن: ۱۱: ۸۶۳ [۳] معجم المؤلفین: ج ۱۱ ص ۱۸

التمرینیۃ : مہدی کشمیری | مولانا مہدی بن حیدر الصفوی مشہور نامی عالم گزرے ہیں، فقہ میں ان کی تصنیف التمرینیۃ العزویۃ فی فروع الفقہ کے نام سے موسوم ہے، انھوں نے نجف میں اپنے قیام کے دوران اس کا مواد جمع کیا، پھر کشمیر لوٹے اور یہاں اسکی ترتیب و تہذیب کا کام مکمل کیا، جیسا کہ علامہ خیر الدین الزرکلی نے لکھا ہے :

فرغ منه فی النجف وهذبه	اسکی تصنیف سے نجف ہی میں فارغ
فی کشمیر۔[۵۱]	ہو چکے تھے مگر ترتیب و تہذیب کشمیر میں کی"

مولانا مہدی نے ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں انتقال کیا۔

ترجمہ شرائع الاسلام : سید محمد صادق کشمیری | سید محمد صادق بن محمد باقر الرضوی الکشمیری کے حالات نہیں ملتے، شرائع الاسلام کا اردو ترجمہ روائع الاحکام کے نام سے کیا تھا اور اسی کی بدولت شہرت پائی۔ مولانا عبد الحی حسنی صاحب نے اپنی تصنیف الثقافۃ میں کُتُبُ الفقہ فی مذھب الشیعۃ کے تحت اس کا ذکر کیا ہے۔[۵۲]

اقامۃ البرھان : سید ابو الحسن | مولانا سید ابو الحسن بن نقی شاہ کشمیری لکھنوی نامور علمائے ہند میں شمار کئے جاتے ہیں، فقہ میں رسالہ اقامۃ البرھان فی حلیۃ القہوۃ والغلیان اور اصول فقہ میں اسعاف المامول شرح زبدۃ الاصول ان کی علمی یادگار ہیں۔[۵۳]

سید علی شاہ کشمیری | سید علی شاہ ہجرت کرکے عراق چلے گئے تھے مگر پورے بارہ سال کے بعد حکیم مہدی علی خاں کشمیری نے انھیں فرخ آباد بلا کر امامت کا منصب سپرد کیا، جب مہدی علی فرخ آباد سے لکھنؤ آئے تو سید علی شاہ ان کے ہمراہ تھے، بالآخر یہیں ۲۵ ربیع الاول ۱۲۶۹ھ میں انتقال کیا،

---

۵۱ الاعلام : ج ۸ ص ۲۵۷ ۵۲ الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند ص ۱۲۲،
۵۳ ایضاً ،

وہ شیعہ علماء میں متبحر فقیہ کی حیثیت سے بڑی عزت و احترام کے مالک تھے، حکیم اکبر شاہ انکے بارے میں لکھتے ہیں:

کان عالمًا فاضلًا طویل الباع	وہ عالم و فاضل اور فقہ و اصول
فی الفقه والاصول لاباس	میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ اگر میں
بان اقول انه کان ملك	انھیں فقہاء کا بادشاہ کہوں تو
المتفقهین۔[۱]	یہ نامناسب نہیں ہوگا

ملا علی بادشاہ کشمیری | مولانا عبدالحکیم راست گو کے شاگرد تھے، کشمیر میں تولد ہوئے اور یہیں نشو و نما پائی۔ پھر فیض آباد آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی، انھوں نے نماز پنجگانہ اور جمعہ کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے لئے فیض آباد کے شیعوں کو ترغیب دلائی، اور اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے، انھوں نے باجماعت نماز ادا کرنے کی فضیلت میں ایک رسالہ بھی لکھا ہے جس میں احادیث اور شرعی دلائل کی روشنی میں اپنا موقف پیش کیا ہے، نواب آصف الدولہ اور اس کے وزیر سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں سے ان کے اچھے تعلقات تھے، ان دونوں نے نماز باجماعت کی تحریک و ترغیب میں ملا صاحب کی بڑی مدد کی، مذکورۂ بالا رسالہ کے علاوہ انھوں نے کئی اور رسالے بھی لکھے تھے مگر وہ تلف ہوگئے،[۲] تبلیغ دین کے ساتھ درس و تدریس کا شغل بھی رکھتے تھے۔ حکیم سید اکبر لکھتے ہیں:

کان یشیع مسائل الحلال	وہ حلال و حرام مسائل کی اشاعت اور
والحرام ویرشد الانام باصول	دین کے اصول و فروع کو سمجھانے میں
الدین وفروعه شاغلاً بترویج	لوگوں کی ہدایت کرتے تھے، شریعت کے
الاحکام الشرعیة وتدریس	احکام پھیلانے اور اصول و فروع مسائل
المسائل الاصلیة والفرعیة۔[۳]	سکھانے میں مشغول رہتے تھے۔

---

[۱] سبیکۃ الذھب: ص ۴۸، مطبع اثنا عشری ۱۳۱۲ھ [۲] نجوم السماء: مولوی مرزا علی کشمیری

مرأۃ الاسرار کا ایک جائزہ

از جناب معین احمد صاحب علوی، کاکوری، لکھنؤ

(۲)

"اس مضمون کی پہلی قسط جولائی ۱۹۸۳ء کے معارف میں شایع ہوئی تھی، اسکے بعد بعض ضروری مضامین کی وجہ سے اسکی گنجایش نہیں نکل سکی اور غیر معمولی تاخیر ہوگئی جس کیلئے ہم کو مضمون نگار سے شرمندگی ہے" م

طبقۂ نہم (نواں طبقہ) مجملے از احوال خواجہ علو دینوریؒ و ذکر خواجہ جنید بغدادیؒ وغیرہ (صفحہ ۸۰ سے ۸۶۲ تک) اس طبقہ میں دس بزرگوں کے حالات ہیں،

حضرت خواجہ علو دینوریؒ، ذکر حضرت خواجہ جنید بغدادیؒ، ذکر حضرت خواجہ ممشاد دینوریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو سعید خرازؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو عثمان حیریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو العباس احمد بن محمد مسروقؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو محمد رویمؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو الحسن نوریؒ، ذکر حضرت خواجہ حمدون قصارؒ، ذکر حضرت خواجہ عمرو عثمان مکیؒ،

طبقۂ دہم (دسواں طبقہ) از احوال مجملی ابو اسحٰق چشتیؒ و ذکر خواجہ ابو بکر شبلیؒ وغیرہ (صفحہ ۸۶۲ سے صفحہ ۹۳۳ تک) اس میں دس بزرگوں کے حالات ہیں:

ذکر حضرت خواجہ ابو اسحٰق چشتیؒ، ذکر حضرت ابو بکر شبلیؒ، ذکر حضرت خواجہ حسین بن منصور حلاجؒ، ذکر حضرت خواجہ فارس بن عیسیٰ بغدادیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو العباس بن عطارؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو محمد جریریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو بکر بن طاہر الابہریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو بکر کتانیؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن منازلؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو علی رودباریؒ،

طبقۂ یازدہم (گیارہواں طبقہ) (صفحہ ۹۳۳ سے صفحہ ۹۹۰ تک) مجملی از احوال خواجہ ابو محمد چشتیؒ و ذکر خواجہ ابو یعقوب نہر جوریؒ وغیرہ، اس میں گیارہ بزرگوں کے حالات ہیں،

ذکر حضرت خواجہ ابو احمد چشتیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو یعقوب النہر جوریؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ بن مرتعشؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ عفیفؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو النظیر حماد قطعؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ سعدیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو عثمان مغربیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو القاسم رازیؒ، ذکر حضرت شیخ ابو العباس سیاریؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو القاسم حکیم سمرقندیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو القاسم نصر آبادیؒ،

طبقۂ دوازدہم (بارہواں طبقہ)، مجملی از احوال خواجہ ابو محمد چشتیؒ و ذکر خواجہ ابو العباس نہاوندیؒ وغیرہ (سنہ ۹۹۱ سے سنہ ۱۱۲۱ تک)، اس طبقہ میں نو بزرگوں اور خوارزم کا حال ہے،

ذکر حضرت خواجہ ابو محمد چشتیؒ مع احوال اول فتح سند و لشکر سلطان محمود غزنوی، ذکر خواجہ ابو نصر سراجؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو الفضل بن حسینؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو القاسم بشر یاسینؒ، ذکر حضرت شیخ لقمان سرخسیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو علی دقاقؒ، ذکر خواجہ ابو علی سیاہؒ، ذکر حضرت شیخ عبدالرحمٰن سلمیؒ، ذکر حضرت سلطان الشہداء امیر مسعودؒ،

طبقۂ سیزدہم (تیرہواں طبقہ) (سنہ ۱۱۲۲ سے سنہ ۱۲۲۳ تک) مجملی از احوال خواجہ ناصر الدین یوسف چشتیؒ و ذکر خواجہ ابو العباس قصابؒ وغیرہ، کل گیارہ بزرگوں کے حالات ہیں:

ذکر حضرت خواجہ ناصر الدین ابو یوسف چشتیؒ مع ابتدائی حالات سلجوقیان، ذکر حضرت شیخ ابو العباس قصابؒ، ذکر حضرت شیخ ابو سعید ابو الخیرؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو الحسن خرقانیؒ، ذکر حضرت خواجہ عبداللہ دستانیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو القاسم گرگانیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو العباس اشقانیؒ، ذکر حضرت شیخ ابو الفضل محمد بن حسینؒ، ذکر حضرت شیخ علی بن عثمان بن علیؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد برادر حضرت خواجہ اسمٰعیل چشتیؒ، ذکر حضرت خواجہ اسمٰعیل عبداللہ بن منصور محمد انصاریؒ، ذکر حضرت شیخ احمد جامی المعروف بہ ژندہ پیلؒ۔

طبقۂ چہاردہم (چودہواں طبقہ) (سنہ ۱۲۲۴ سے سنہ ۱۳۶۴ تک) مجملی از احوال خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ و ذکر حضرت خواجہ احمد بن مودود چشتیؒ وغیرہ، اس طبقہ میں نو بزرگوں کے حالات ہیں،

ذکر حضرت خواجہ قطب الدین مودود چشتیؒ، ذکر حضرت خواجہ احمد بن مودود بن یوسف چشتیؒ، ذکر حضرت بابا ہمام کردؒ، ذکر حضرت شیخ ابو علی فارمدیؒ، ذکر حضرت شیخ ابوبکر بن عبداللہ طوسی النساجؒ، ذکر حضرت امام محمد بن محمد غزالیؒ،

ذکر حضرت عین القضاۃ ہمدانیؒ، ذکر حضرت خواجہ ابو نصر جعفر بن ابی اسحٰق الحویؒ، ذکر حضرت سلطان مجد الدینؒ،

طبقۂ پانزدہم (پندرھواں) در بیان مجملے از احوال خواجہ شریف زندنیؒ، و ذکر خواجہ یوسف ہمدانیؒ وغیرہ
اس میں بارہ ۱۲ بزرگوں کا حال ہے، (ص ۱۳۵۵ سے ص ۱۳۸۵ تک)

(۱) ذکر حضرت خواجہ حاجی شریف زندنیؒ (۲) ذکر حضرت خواجہ یوسف ہمدانیؒ (۳) ذکر حضرت خواجہ احمد یسویؒ
(۴) ذکر حضرت خواجہ عبد الخالق غجدوانیؒ (۵) ذکر حضرت شیخ ضیاء الدین ابو النجیب ابو القاہر عبد اللہ سہروردیؒ (۶) ذکر
حضرت شیخ ابو محمد بن عبد اللہ البصریؒ (۷) ذکر حضرت سیدی احمد بن ابو الحسن الرفاعیؒ (۸) ذکر حضرت شیخ ابو محمد عبد اللہ
صومعیؒ (۹) ذکر حضرت شیخ محمد حماد دباسؒ (۱۰) ذکر حضرت شیخ ابو عبد اللہ قضیب البیان الموصلیؒ (۱۱) ذکر حضرت
شیخ ابو العباس بن عریف الاندلسیؒ (۱۲) ذکر حضرت خواجہ حکیم سنائی الغزنویؒ،

طبقۂ شانزدہم (سولھواں) در بیان مجملے از احوال خواجہ عثمان ہارونیؒ و ذکر حضرت شیخ محی الدین عبد القادر
جیلانیؒ وغیرہ، اس میں چودہ ۱۴ بزرگوں کا حال ہے (ص ۱۳۸۶ سے ص ۱۵۱۲ تک)

(۱) ذکر حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ (۲) ذکر حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ (۳) ذکر حضرت شیخ
ابو مدین مغربیؒ (۴) ذکر حضرت شیخ صدقہ بغدادیؒ (۵) ذکر حضرت شیخ ابو محمد عبد الرحمٰن طفسونجیؒ (۶) ذکر حضرت
شیخ محمد الدوانیؒ (۷) ذکر حضرت شیخ ابو السعود بن شبلیؒ (۸) ذکر حضرت شیخ عدی بن مسافر الشامیؒ (۹) ذکر حضرت شیخ حیوۃ
بن قیس حرانیؒ (۱۰) ذکر حضرت شیخ ابو اسحٰق بن الظریفؒ (۱۱) ذکر حضرت شیخ جاگیرؒ (۱۲) ذکر حضرت شیخ ابو عبد اللہ
محمد بن ابراہیم ہاشمیؒ (۱۳) ذکر حضرت شیخ عمر فارض بجمدیؒ (۱۴) ذکر حضرت شیخ موسیٰ سدرانیؒ،

طبقۂ ہفدہم (سترھواں) (ص ۱۵۱۳) در بیان مجملے از احوال خواجہ معین الدین چشتیؒ و ذکر شیخ نجم الدین کبریٰؒ وغیرہ،

(۱) ذکر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ (۲) ذکر حضرت شیخ نجم الدین کبریٰؒ (۳) ذکر حضرت شیخ شہاب الدین
سہروردیؒ (۴) ذکر حضرت شیخ محی الدین محمد بن العربیؒ (۵) ذکر حضرت شیخ روزبہان بقلی شیرازیؒ (۶) ذکر حضرت شیخ
بہاء الدین ولدؒ (۷) ذکر حضرت سید برہان الدین محققؒ (۸) ذکر حضرت شیخ مجد الدین شیرازی بغدادیؒ (۹) ذکر حضرت

شیخ [illegible] (۱۰)، ذکر حضرت شیخ سیف الدین باخرزی (۱۱)، ذکر حضرت شیخ رضی الدین علی لالا غزنوی (۱۲)، ذکر حضرت بابا کمال جندی (۱۳)، ذکر حضرت خواجہ شمس الدین بن محمود علی (۱۴)، ذکر حضرت شیخ شہاب الدین مقتول (۱۵)، ذکر حضرت شیخ فرید الدین عطار، ذکر شیخ محمد ترک نارنولی ص۱۶۵، ذکر میر سید حسین مشہدی معروف بخنگ سوار ص۱۶۶، اس جگہ اپنے تاثرات اس طرح لکھتے ہیں کہ یہ کاتب حروف ۴ رمضان ۱۰۵۳ھ میں زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا یہاں مجھ کو وقت بست ہوئی، آنحضرت صلعم کی روح سے حضوری حاصل ہوئی، حجاب عنصری درمیان سے ہٹ گیا، اور روحانیت سید سالار مسعود غازیؒ بھی آموجود ہوئی جس سے عجیب حال اور اسرار محسوس ہوئے جن کو میں لکھ نہیں سکتا میرے دل بے آرام کو تسکین حاصل ہوئی۔" ذکر شیخ نور الدین مبارک غزنوی (ص۱۶۷)، ذکر سلطان التارکین شیخ حمید الدین صوفی السوالی (ص۱۶۸) معہ تذکرے احوال سلطان غیاث الدین بلبن (ص۱۶۹)

طبقۂ سیزدہم (اٹھارہواں) در بیان مجملی از احوال خواجہ قطب الدین بختیار کاکی و شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ وغیرہ (ص۱۶۹۔)

ذکر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ معہ احوال شمس الدین و فرزندان او (ص۱۷۹)، ذکر حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانی (ص۱۸۳) ذکر مولانا جلال الدین محمد بلخی بن مولانا بہاء الدین ولد (ص۱۸۶) ذکر حضرت شیخ صدر الدین محمد بن اسحٰق قونوی (ص۱۸۸) ذکر حضرت اوحد الدین حامد کرمانی (ص۱۸۹) معہ حاشیہ چہارم در تصرفات اولیاء اللہ (ص۱۸۹) ذکر شیخ نجیب الدین علی بن بزغش شیرازی (ص۱۹۰) ذکر شیخ ابو القاسم جلال الدین تبریزی (ص۱۹۱) ذکر قاضی حمید الدین ناگوری (محمد بن عطاء اللہ محمود البخاری) (ص۱۹۳) ذکر حضرت شیخ شرف الدین بن مصلح الدین سعدی شیرازی (ص۱۹۴) ذکر حضرت شیخ فخر الدین عراقی (ص۱۹۵) ذکر حضرت شیخ صلاح الدین فریدون القونوی المعروف بزرکوب (ص۱۹۶) ذکر سلطان ولد بن مولانا روم (ص۱۹۷) ذکر حضرت شیخ نظام الدین ابو المؤید (ص۱۹۸) ذکر حضرت شاہ خضر رومی (ص۱۹۹) ذکر حضرت شیخ بدر الدین غزنوی (ص۱۹۹)

ذکرحضرت خواجہ کردیز ملتانی ص ۲۰۰۲ ، ذکرحضرت شیخ عبداللہ بلیالی ملقب بہ اوحدالدین از فرزندان

حضرت ابوعلی ابودقاق ص ۲۰۰۶ ۔

طبقۂ نوزدہم (انیسواں) (ص ۲۰۱۹) دربیان مجملی از احوال حضرت شیخ فریدالدین شکر گنج رح

مسعود اجودھنی معہ احوال فرزندان وے وذکرحضرت سلطان المشائخ رح وغیرہ۔

ذکرحضرت شیخ فریدالدین گنج شکر رح ، ذکرسلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رح مع احوال

ہفت سلاطین جو آپ کے معاصر تھے ، ص ۲۰۹۳ ، ذکرحضرت شیخ نجیب الدین متوکل رح ص ۲۱۴۷ ،

ذکرحضرت شیخ بدرالدین اسحٰق رح معہ فرزندان ص ۲۱۸۰ ، ذکرحضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رح

ص ۲۱۹۰ ، ذکرحضرت شیخ عارف سیستانی رح ص ۲۲۰۲ ، ذکرحضرت شیخ داؤد بن محمود رح ص ۲۲۰۶

ذکرحضرت سید محمد بن محمود کرمانی رح ص ۲۲۱۵ ، ذکرحضرت شیخ صدرالدین بن بہاء الدین زکریا رح ص ۲۲۳۱

مولانا حسام الدین ملتانی ص ۲۲۳۸ ، ذکرحضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین رح ص ۲۲۴۶ ، ذکرحضرت

میر سید صدرالدین المعروف بسید حسینی رح ص ۲۲۶۵ ، ذکرحضرت شیخ صلاح سہروردی رح ص ۲۲۷۷ ،

ذکرحضرت شیخ احمد نہروالی رح ص ۲۲۸۹ ، حضرت عین الدین قصاب رح ص ۲۲۹۲ ، شیخ محمود توتیہ

دوز ص ۲۲۹۳ ، شیخ حسن رسن تاب رح ، شیخ بدرالدین موئے تاب ۔ ذکرحضرت شیخ بدرالدین سمرقندی رح

ص ۲۳۱۴ ، ذکرحضرت شیخ صوفی بدھنی رح ص ۲۳۲۱ ، سیدی مولہ رح وقاضی منہاج جرجانی ص ۲۳۲۷ ،

ذکرحضرت شیخ جمال الدین جوزقانی رح ص ۲۳۳۶ ، شیخ نورالدین عبدالرحمٰن اعرابی ص ۲۳۴۳ ، ذکر

حضرت شیخ سعیدالدین فرقانی رح ص ۲۳۴۵ ۔ ذکرحضرت شیخ عزیز بن محمد نسفی رح ص ۲۳۵۳ ۔

طبقۂ بستم (بیسواں) مجملی از احوال شیخ علی صابر و ذکر شیخ نصیرالدین محمود اودھی رح وغیرہ

(ص ۲۳۶۴)

ذکرحضرت شیخ علاؤالدین علی احمد صابر رح ص ۲۳۶۴ ، ذکرحضرت خواجہ نصیرالدین محمود رح

شیخ [illegible] ۱۰) ذکر حضرت شیخ سیف الدین باخرزیؒ (۱۱) ذکر حضرت شیخ رضی الدین علی لالا غزنویؒ (۱۲) ذکر حضرت بابا کمال جندیؒ (۱۳) ذکر حضرت خواجہ شمس الدین بن محمد بن علیؒ (۱۴) ذکر حضرت شیخ شہاب الدین مقتولؒ (۱۵) ذکر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ، ذکر شیخ محمد ترک نارنولی ص ۱۶۷۸، ذکر میر سید حسین مشہدی معروف بہ جنگ سوار ص ۱۶۶۱، اس جگہ اپنے تاثرات اس طرح لکھتے ہیں کہ "یہ کاتب حروف ۴ ارمضان ۱۰۵۳ھ میں زیارت کے لیے حاضر ہوا تھا یہاں مجھ کو رقت بہت ہوئی کہ آنحضرت صلعم کی روح سے حضوری حاصل ہوئی، حجاب عنصری درمیان سے ہٹ گیا، اور روحانیت سید سالار مسعود غازیؒ بھی آموجود ہوئی جس سے عجیب حال اور اسرار محسوس ہوئے جن کو میں لکھ نہیں سکتا میرے دل بے آرام کو تسکین حاصل ہوئی"، ذکر شیخ نور الدین مبارک غزنویؒ ص ۱۶۷۷، ذکر سلطان التارکین شیخ حمید الدین صوفی السوالی ص ۱۶۸۴ معہ جزدے احوال سلطان غیاث الدین بلبن ص ۱۶۹۸)

طبقۂ سیزدہم (اٹھارہواں) در بیان مجملی از احوال خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ و شیخ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ وغیرہ ص ۱۶۹۸)

ذکر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ معہ احوال شمس الدین و فرزندان او ص ۱۶۹۹، ذکر حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا ملتانیؒ ص ۱۸۲۶) ذکر مولانا جلال الدین محمد بلخی بن مولانا بہاء الدین ولد ص ۱۸۶۰) ذکر حضرت شیخ صدرالدین محمد بن اسحٰق قونویؒ ص ۱۸۸۱) ذکر حضرت اوحدالدین حامد کرمانیؒ ص ۱۸۹۱ معہ حاشیہ چہارم در تصرفات اولیاء اللہ ص ۱۸۹۹) ذکر شیخ نجیب الدین علی بن بزغش شیرازیؒ ص ۱۹۰۳) ذکر شیخ ابو القاسم جلال الدین تبریزیؒ ص ۱۹۱۵) ذکر قاضی حمیدالدین ناگوری احمد بن عطاء اللہ محمود البخاری ص ۱۹۳۲) ذکر حضرت شیخ شرف الدین مصلح الدین سعدی شیرازیؒ ص ۱۹۴۶) ذکر حضرت شیخ فخر الدین عراقیؒ ص ۱۹۵۳) ذکر حضرت شیخ صلاح الدین فریدون القونوی المعروف بہ زرکوب ص ۱۹۶۶، ذکر سلطان ولد بن مولانا روم ص ۱۹۸۲) ذکر حضرت شیخ نظام الدین ابو المویدؒ ص ۱۹۸۶) ذکر حضرت شاہ خضر رومیؒ ص ۱۹۹۱) ذکر حضرت شیخ بدر الدین غزنویؒ ص ۱۹۹۴)

ذکر حضرت خواجہ کردیز ملتانی ص ۲۰۰۲، ذکر حضرت شیخ عبداللہ لبیالی ملقب بہ اوحد الدین انغانون حضرت ابو علی ابو دقاق ص ۲۰۰۶۔

طبقۂ نوزدہم (انیسواں) (ص ۲۰۱۹) دربیان مجلی از احوال حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج مسعود اجودھنی معہ احوال فرزندان و ذکر حضرت سلطان المشائخ وغیرہ۔

ذکر حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رح، ذکر سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء احوال ہفت سلاطین جو آپ کے معاصر تھے، ص ۲۰۹۳، ذکر حضرت شیخ نجیب الدین متوکل ص ۲۱۴۷، ذکر حضرت شیخ بدر الدین اسحٰق رح معہ فرزندان ص ۲۱۸۰، ذکر حضرت شیخ جمال الدین ہانسوی رح ص ۲۱۹۰، ذکر حضرت شیخ عارف شیستانی رح ص ۲۲۰۲، ذکر حضرت شیخ داؤد بن محمود ص ۲۲۰۶ ذکر حضرت سید محمد بن محمود کرمانی رح ص ۲۲۱۵، ذکر حضرت شیخ صدر الدین بن بہاء الدین زکریا ص ۲۲۳ مولانا حسام الدین ملتانی ص ۲۲۳۸، ذکر حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین رح ص ۲۲۴۶، ذکر حضرت میر سید صدر الدین المعروف بسید حسینی رح ص ۲۲۶۵، ذکر حضرت شیخ صلاح سہروردی ص ۲۲۷۷، ذکر حضرت شیخ احمد نہروالی ص ۲۲۸۹، حضرت عین الدین قصاب ص ۲۲۹۲، شیخ محمود توتیہ دوز ص ۲۲۹۳، شیخ حسن رسن تاب، شیخ بدر الدین موئے تاب۔ ذکر حضرت شیخ بدر الدین سمرقندی ص ۲۳۱۴، ذکر حضرت شیخ صوفی بدھنی رح ص ۲۳۲۱، سیدی مولہ و قاضی منہاج جوزجانی ص ۲۳۲۷، ذکر حضرت شیخ جمال الدین جوزقانی رح ص ۲۳۳۶، شیخ نور الدین عبد الرحمن اعرابی ص ۲۳۴۳، ذکر حضرت شیخ سعید الدین فرقانی رح ص ۲۳۴۵۔ ذکر حضرت شیخ عزیز بن محمد نسفی رح ص ۲۳۵۳۔

طبقۂ البستم (بیسواں) مجلی از احوال شیخ علی صابر و ذکر شیخ نصیر الدین محمود اودھی وغیرہ (ص ۲۳۶۴)

ذکر حضرت شیخ علاء الدین علی احمد صابر ص ۲۳۶۴، ذکر حضرت خواجہ نصیر الدین محمود رح

ذکرحضرت شیخ قطب الدین منورؒ (ص ۲۴۱۶) ذکرحضرت شیخ شمس الدین بن یحییٰؒ (ص ۲۴۲۳)
ذکرحضرت شیخ فخر الدین زرادیؒ (ص ۲۴۳۴) ذکرحضرت شیخ حسام الدین ملتانیؒ (ص ۲۴۳۵)
ذکرحضرت شیخ برہان الدین غریبؒ (ص ۲۴۴۶) ذکرحضرت شیخ علاء الدین نیلیؒ (ص ۲۴۶۰)
ذکرحضرت شیخ شہاب الدین امامؒ (ص ۲۴۶۵) ذکرحضرت شیخ وجیہ الدین یوسف ثانیؒ (ص ۲۴۷۶)
ذکرحضرت شیخ سراج الدین عثمانؒ (ص ۲۴۹۰) ذکر یاران حضرت سلطان المشائخؒ (ص ۲۵۰۳)

یاران اعلیحضرت سلطان المشائخ شیخ نظام الدین اولیاءؒ کا تذکرہ "سیر الاولیاءؒ" کے حوالے سے حسب ذیل وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

بعضے یاران اعلیٰ جو شرف ارادت سے مشرف تھے، لیکن ان کو خلافت نہیں عطا ہوئی، پھر بھی حضرت سلطان المشائخ کی عزت اور شفقت سے ان کی خدمت میں خصوصیت حاصل تھی

(۱) خواجہ ابوبکر مانڈویؒ ص ۲۵۰۴ (۲) قاضی محی الدین کاشانیؒ ص ۲۵۰۶ (۳) مولانا وجیہ الدین پائلیؒ ص ۲۵۰۹ (۴) مولانا فخر الدین مروزیؒ ص ۲۵۱۲ (۵) مولانا فصیح الملت والدین ص ۲۵۱۵ (۶) مولانا جمال الدینؒ ص ۲۵۱۹ (۷) مولانا جلال الدین اودھیؒ ص ۲۵۲۰ (۸) خواجہ کریم الدین سمرقندیؒ ص ۲۵۲۲ (۹) قاضی شرف الدینؒ ص ۲۵۲۵ (۱۰) مولانا بہاء الدین ادھمیؒ ص ۲۵۲۷ (۱۱) مولانا شیخ مبارک گوپامئویؒ ص ۲۵۲۷ (۱۲) خواجہ مؤید الدین ساکن کڑہ ص ۲۵۳۰ (۱۳) خواجہ تاج الدینؒ ص ۲۵۳۲ (۱۴) خواجہ ضیاء الملت والدین برنیؒ (ص ۲۵۳۳) (۱۵) خواجہ مؤید الدین انصاریؒ ص ۲۵۳۷ (۱۶) خواجہ شمس الدین خواہرزادہ امیر خسروؒ ص ۲۵۳۸ (۱۷) مولانا نظام الدین شیرازیؒ ص ۲۵۳۹ (۱۸) خواجہ سالارؒ ص ۲۵۴۰ (۱۹) مولانا فخر الدین میرٹھی (۲۰) مولانا نوحؒ ص ۲۵۴۰ (۲۱) مولانا علاء الدینؒ ص ۲۵۴۲ (۲۲) مولانا شہاب الدین کنتوری ص ۲۵۴۲ (۲۳) مولانا حجۃ الملتانیؒ ص ۲۵۴۳ (۲۴) مولانا بدر الدین تولکؒ ص ۲۵۴۳،

...ین الدین بن ... ذکر شیخ ... نیان ... (ق ٢٩٠٣) ... بنگ ... کے ... ہی ... سے
اپنے خاندان کا پورا شجرہ، حالات تفصیل سے لکھے ہیں، جو تذکرہ سے پہلے بیان ہو چکا ہے، ذکر شیخ ...
والدین بنگالیؒ (ق ٢٩٠٢) مع حالات سلاطین بنگالہ، ذکر خواجہ مسعود بک (ق ٢٩٠٢)، ذکر سید تاج الدین ...
(ق ٢٩١٠)، ذکر شیخ مظفر بن شمس الدین بلخیؒ (ق ٢٩١٣)، ذکر میر سید علی بن شہاب الدین ہمدانیؒ
(ق ٢٩٢٧)، مع مفصل حالات و تاریخ بادشاہان کشمیر،

طبقہ بست و دوم (بائیسواں)، درمیان مجملی از احوال شیخ جلال الحق والدین پانی پتیؒ و ذکر
میر سید اشرف جہانگیر سمنانی (ق ١٩٤٤ سے ... تک)، مع احوال امیر تیمورؒ صاحبقران۔ اس طبقہ
میں ..... بزرگوں کا حال اور ایک حاشیہ حالات بادشاہ شاہجہاں ہے،
ذکر حضرت شیخ جلال الحق والدین قدس سرہ (ق ٢٩٤٤)، ذکر میر سید اشرف جہانگیر قدس سرہ
(ق ٢٩٦٦ الف، حاشیہ ضمیمہ در حالات بادشاہ شاہجہاں (ق ٣٠٠٠) میں لکھتے ہیں کہ:
چونکہ یہ کتاب مرآۃ الاسرار شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں لکھنا شروع ہوئی، اور اسی کی
حیات میں ختم ہوئی، اس لیے اس کی ولادت سے لیکر زمانۂ وفات تک کے حالات اس حاشیہ
میں جمع کر دیے ہیں، اور سند کے لیے لکھتے ہیں کہ

"از کتب تواریخ دقت و ہم از مردان معتبر بہ تحقیق پیوست"

اس کے بعد اسی زمرہ میں شاہان شرقی جونپور کا تذکرہ مجمل طور پر کر دیا ہے،

ذکر خواجہ علاء الدین عطارؒ (ق ٣٠٤٢)، ذکر خواجہ حسن عطار بن علاء الدین عطارؒ، ذکر خواجہ یوسف
عطار بن حسن عطارؒ، ذکر خواجہ محمد پارساؒ (ق ٣٠٥٥)، ذکر خواجہ ابو نصر پارسا بن خواجہ محمد پارساؒ، ذکر
خواجہ یعقوب چرخیؒ (ق ٣٠٦٦)، ذکر خواجہ نظام الدین خاموشؒ (ق ٣٠٦٢)، ذکر مولانا سعد الدین کاشغریؒ
(ق ٣٠٦٥)، ذکر شیخ زین الدین ابوبکر خوافیؒ (ق ٣٠٦٦)، ذکر مولانا زین الدین ابوبکرؒ (ق ٣٠٩٣)،

طبقۂ بست وسیوم (تیئسواں) در بیان مجملی از احوال مخدوم شیخ احمد عبد الحق ردولوی معہ فرزندان او، ذکر شیخ نور قطب عالم بنگالی وغیرہ (ص ۳۲۲۰ سے ص ۳۴۸۵ تک) اس میں انیس بزرگوں کا حال ہے،

[illegible] ذکر مخدوم شیخ کبیر ص [illegible] ذکر حضرت [illegible]

ذکر شاہ مینا جیو قطب ولایت ص ۳۴۳۰۲ مع احوال سلطان الہ داد ، ذکر شیخ عبد [illegible]

وشیخ قطب [illegible] ص ۳۴۶ ، ذکر شیخ شاہ داؤد دوست خلیفہ شیخ شاہ نور ص ۳۳۳۴ ذکر مخدوم

شیخ جمال اولیا اودھی ص ۳۴۳۰۸ ، ذکر شیخ حسین مغربی بلخی بہاری ص ۳۳۳۴ ، ذکر میر سید علیم الدین

ملائیں ص ۳۴۳۵ ، ذکر حضرت مخدوم شیخ حسام الدین مانکپوری ص ۳۴۳۵۵ ، شیخ معروف جونپوری و

بندگی شیخ نظام الدین امیٹھی ص ۳۴۳۰۸ ،

راجی سید حامد شاہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ

۱۰۶۰ھ میں جب بزرگان دہلی کی زیارت کے لئے گیا تو حضرت نظام الدین اولیاؒ

کے دربار سے حکم ہوا کہ پہلے شیخ حسام الدین مانکپوری کی زیارت کرنا اس کے بعد گھر جانا

چنانچہ واپسی میں میں نے ایسا ہی کیا، اس مرتبہ حاضری میں عجیب ذوق وحالات کا انکشاف

ہوا۔ بڑی نعمتیں اس خاکسار کو عطا ہوئیں ۔

اتنا لکھنے کے بعد یکایک آمدم برسر مطلب لکھ کر لکھتے ہیں کہ میں نے کتاب کے شروع میں لکھا ہے

کہ اس کتاب کے ۲۹ طبقے میں نے قائم کئے ہیں ، جب میں تیئسویں طبقہ میں احوال مرشدی معنوی حضرت

مخدوم شیخ احمد عبد الحقؒ کے خاتمہ پر پہونچا تو ہمت نے جواب دے دیا " دست یاری نمی داد " مجبوراً

خواجہ عمر حسام قدس سرہٗ کی ذیل کی رباعی پڑھ کر خاموش ہوگیا ۔

ایں ہستی تو ہستی دگر است	ایں مستی تو مستی دگر است
رو بگریبان تفکر در کش	ایں دست تو آستین دست دگر است

لیکن کئی سال تک متفکر، حیران و منتظر امر باطنی رہا ۔ بارہ سال کے بعد اتفاق حسنہ سے سنہ

یکہزار شصت و پنج ہجری میں زیارت حضرت پیر دستگیر خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت سے مشرف

ہوا تھا حضرت پیارے صاحب کے حکم باطنی سے اس کتاب کو شروع کیا تھا، اب اس سے بھی اور تفحص کی حالت کے متعلق کچھ ارشاد ہو، آپ نے از راہ مہربانی و شفقت باطنی حکم فرمایا کہ یہ کتاب حضرت احمد عبدالحقؒ تک بھی کافی ہے۔ اس طبقہ کو شیخ حسام الدین مانکپوری کے حالات پر ختم کردو۔ اس کے بعد فرمایا کہ تجھے چار صاحبانِ ولایت اور صاحبانِ تصرف کے درمیان پہونچا دیا، یہ چاروں بزرگ اپنے مزار میں بیٹھے زندوں کی طرح ہمیشہ تیرے مددگار و معاون ہوں گے۔

پورب میں سید اشرف جہانگیرؒ (کچھوچھہ شریف) پچھم میں شیخ بدیع الدین ملقب بہ شاہ مدارؒ (مکن پور) شمال میں سید سالار مسعود غازیؒ (بہرائچ) جنوب میں شیخ حسام الدین مانکپوریؒ اور سب سے اوپر شیخ احمد عبدالحقؒ ہیں جنھوں نے مجھ کو اپنی فرزندی میں لیا ہے۔

ان عنایات بے بہا پر شکر بجا لایا ؎

آفتاب اندر بدخشاں لعل سازد سنگ را   جز بخاموشی چہ گوید لعلِ شکر آفتاب

اس لئے میں نے یہ کتاب سنہ ۱۰۶۵ھ (ایک ہزار شصت و پنج) میں اجمیر شریف سے گھر پہونچ کر ۲۷ شوال کو ختم کی۔

مخدوم حسام الدین مانکپوری کے حالات میں لکھتے ہیں کہ "یہ فقیر کاتب حروف عبدالرحمٰن چشتی بارہا مخدوم حسام الدین شیخ حامد راجی سے مشرف ہوا اور سعادت و ذوق سے مالامال ہوا۔ سنہ ۱۰۲۰ھ میں جب بزرگان دہلی کی زیارت کے لئے گیا، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے دربار سے حکم (در معاملہ) فرمود کہ پہلے شیخ نظام الدینؒ کی زیارت کر تا تب گھر جانا، اس لئے خاکسار حسب الحکم واپسی میں ان دونوں بزرگوں کے فیض سے مشرف ہوا، اس مرتبہ حاضری میں عجیب ذوق اور حالات کا اندازہ ہوا، بڑی بخششیں اس خاکسار کو عطا ہوئیں جو تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔"

کتاب کے آخر میں یہ تین قطعاتِ تاریخ کسی نے لکھے ہیں:

شیخ عبدالرحمٰن جو اس کتاب کے مصنف نے ۸ رشعبان [illegible] روز یکشنبہ کو وفات پائی

آیت رحمٰن حقیقی کاشف اسرار حال | عارف اللہ بود واے پیر بے تمثیل و مثال
آنکہ تاریخ وفاتش خواستم از عقل گفت | ہفتم از شعبان سفر شد شیخ کامل با کمال
شیخ رحمٰن چوں ازیں دار فنا | بر فراز عرشِ رحمٰن کرد جا
از پے تاریخ آں غوثِ زماں | جستجو کرد ز دل لاریب ما

گفت الرحمٰن علی العرش الذی
جملہ اعداد الرحمہ علی العرش استوی

تاریخ تولد آنحضرت دخلہ فی عالم الدنیا وھو حبیب
تاریخ وصال خرج عن الدنیا وھو محبوب

اس طرح ۳۲۸۸ صفحات پر یہ کتاب ختم ہوگئی۔

صغانی کی عربی شاعری

از

ڈاکٹر حامد علی خاں ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد اور عربی علوم و فنون کی اشاعت لازم و ملزوم ہے، مگر تاریخ نگاری کی طرف زیادہ توجہ نہ کئے جانے کی وجہ سے گذشتہ تیرہ صدیوں کے ہندوستانی علماء اور عربی زبان و ادب کے فضلاء کی بڑی تعداد کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں ہیں، البتہ قدیم بیرونی اور متاخرین مقامی تذکرہ نویسوں نے جن ہزاروں ہندوستانی علماء و فضلاء کا ذکر کیا ہے، ان کے علمی و روحانی کمالات سے ہندوستان کے علاوہ مسلم ممالک کے باشندوں اور عربوں نے بھی خوب فیض اٹھایا، علم کے شیدائیوں اور قدیم و برگزیدہ علماء کے عقیدتمندوں کا فرض ہے کہ وہ ان کے مفصل حالات کی جستجو کریں، ان کے کارناموں پر سیر حاصل بحث کریں، اور ان پر مستقل تصانیف لکھ کر ایک طرف اسلاف شناسی کا ثبوت دیں، اور دوسری طرف اپنے ملک کا نام سر بلند کریں، ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں خصوصیت کے ساتھ عربی، اسلامی اسٹڈیز اور تاریخ وغیرہ کے شعبوں کو بھی اس کی جانب اعتنا کرنا چاہیے، اگر اس طرح کی ممتاز ہستیوں پر یونیورسٹیوں کے اساتذہ طلبہ سے علمی و تحقیقی کام کرائیں، تو ہندوستانی علماء کے کارناموں کی اہمیت اور ان کی واقعی حیثیت دنیا کے سامنے واضح ہو سکیگی،

ہندوستان کے باعث صد افتخار، جامع کمالات اور ممتاز ترین علماء میں حسن صغانی[1]

---

[1] قصبۂ صغانیاں، ترمذ کے قریب واقع تھا، یہاں ایک قلعہ بھی تھا، اس قصبہ کے اندر (باقی اگلے صفحہ پر)

لاہوری کا نام آتا ہے، مولانا عبدالکریم چشتی فاضل دیوبند نے ان کے علمی کمالات، عادات واخلاق، تصنیفات، فضل وکمال اور تلامذہ کے مستقل عنوانات کے علاوہ ولادت سے وفات تک کے مفصل سوانح حیات بڑی تلاش کے بعد لکھے ہیں، انھوں نے امکان بھر محنت وکاوش میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے، بلکہ صغانی کے بارے میں مضمون نگاروں کے بعض بیانات کے تضاد کو مکمل بحث تحقیق کے بعد رفع بھی کیا ہے، اور حواشی میں بعض ضروری معلومات کا اضافہ بھی کیا ہے، چشتی صاحب کا طویل مقالہ موقر ماہنامہ "معارف" جلد ۸۳ و ۸۴ (بابت ۱۹۵۹ء) کی تین اقساط میں شائع ہو چکا ہے[1]، جو ماہنامہ مذکور کے ایک سو ترپن صفحات پر حاوی ہے، تفصیل کے طالبین کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقالہ بالا کے علاوہ دوسرے تحریر شدہ مآخذ کی طرف بھی رجوع کریں، ذیل میں صرف "علامہ صغانی کی عربی شاعری کے متعلق بحث وگفتگو کرنا مقصود ہے، شروع میں تمہید کے طور پر اختصار کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳) عمدہ قسم کے بازار تھے، یہاں روٹی بہت ارزاں تھی اور گوشت بہت زیادہ مقدار میں فروخت ہوتا تھا، بازاروں کے وسط میں ایک مسجد تھی جس کے چاروں طرف پکی اینٹ کا پشتہ تھا اور محرابیں نہ تھیں، صغانیان کی یہ مسجد بارہویں صدی تک بہت مشہور تھی، ہر گھر میں پانی کی پہنچانے کا انتظام تھا اور قصبہ کے گرد ونواح میں آبپاشی کے لئے پانی کی بہتات کی وجہ سے ترکاریاں اگائی جاتی تھیں، موسم سرما میں یہاں گھاس اتنی اونچی ہو جاتی تھی کہ گھوڑا اس کے اندر چھپ جاتا تھا، اسی لئے اس موسم میں پرندے وغیرہ پکڑے جاتے تھے، یہاں کے باشندے راسخ الاعتقادی اور مہمان نوازی میں ممتاز تھے، اس آبادی میں متعدد علماء بھی ہوئے، مگر انہیں کوئی فقیہ نہیں تھا

Turkistan down to the Mongol Invasions by Barthold (London, 1928) 2nd edition.page 73

[1] معارف: صغانی کے حالات اور ان کی تصانیف پر معارف میں چند اور مضامین بھی شائع ہوئے ہیں

صاحب صغانی کے حالات زندگی بھی قدیم و جدید مراجع کی مدد سے سپرد قلم کیے جاتے ہیں۔

حسن بن محمد بن حسن بن حیدر بن اسماعیل قریشی عَدَوی عمری حنفی صغانی کی ولادت پنجشنبہ ۱۰ صفر ۵۷۷ھ کو لاہور میں ہوئی۔ ان کی کنیت "ابو الفضائل" اور لقب "رضی الدین" تھا۔ انھوں نے خود اپنے کو "الملتجی الی حرم اللہ" (یعنی اللہ کے حرم سے پناہ پکڑنے والا) کے نام سے موسوم کیا ہے۔ صغانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں سے تھے، اور حضرت عمرؓ اور ان کے دادا عدی بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر کی جانب منسوب ہونے کی وجہ سے عدوی و عمری کہلاتے تھے۔ ان کے اسلاف میں سے کوئی صغان سے ہجرت کر کے ہندوستان آیا، اور لاہور میں متوطن ہوا۔ ان کے والد ماجد اپنے عہد کے علامۂ اجل، ادب و لغت کے ماہر، بلند پایہ محقق اور علوم ظاہری و باطنی میں کامل تھے۔ اسی لیے صغانی نے ان سے تعلیم پا کر جملہ علوم و فنون میں مہارت پیدا کی۔ گو انھوں نے مشہور اور فاضل محدثین کی بڑی تعداد سے استفادہ کیا ہے، مگر صراحت و تحقیق کے ساتھ صرف حسب ذیل اساتذہ کا نام معلوم ہو سکا ہے۔

ہندوستان میں قاضی سعد الدین[1] بن محمد الحنابادی اور النظام محمد بن الحسن المرغینانی کے علاوہ ابو الفتوح الحصری[2]، قاضی ابراہیم قریظی اور ابو منصور بن الرزاز سعید بن محمد بغدادی سے

---

[1] قاضی سعد الدین کردی شریعت کے بڑے متبع اور بلند پایہ محدث تھے، تدریس میں یدِ طولیٰ حاصل تھا اسی لیے سلطان شمس الدین التتمش کے عہد میں ہندوستان کے سب سے بڑے قاضی تھے۔ [2] برہان الدین ابو الفتوح نصر بن ابو الفرج محمد بن علی بغدادی حنبلی بغداد میں پیدا ہوئے مگر بعد میں مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی، اور یہیں حدیث کا درس دیا، اسی لیے "امام الحرم" اور "امام الحطیم" کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کی یادداشت نہایت قوی تھی، اور ذہانت و ذکاوت میں بے مثال تھے، وہ فقہ حدیث، تجت اور دین کے بلند ترین علما میں بھی تھے۔ اور بڑے مرتاض اور، (باقی اگلے صفحہ)

سماعت حدیث کی، اور بخارا فن فقہاء سے فقہ کی تعلیم حاصل کی، جن میں سر فہرست شیخ الاسلام نظام الدین عمر بن علی مرغینانیؒ کا اسم گرامی ہے،

علامہ صغانی نادرۂ روزگار اور ممتاز ترین شخص تھے، اسی لیے تذکرہ نگار ان کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہیں، صاحبان تذکرہ کا اتفاق ہے، کہ وہ اپنے دور کے جلیل القدر امام، جملہ علوم و فنون کے عالم و فاضل، نحو اور لغت کے امام مفسر و محدث تھے، نیز فن حدیث کے ناقد، اخبار و انساب کے ماہر، علم الرجال اور سیرت کے واقف کار، حنفی فقہ کے اعلیٰ فقیہ، محقق و مورخ، شاعر و ادیب تھے، نہایت صادق و امین، پیکر علم و تقویٰ اور صالح بزرگ تھے، فضول گفتگو سے کنارہ کش رہتے تھے، وہ سیر و سیاحت کے شائق بھی تھے، چنانچہ علامہ نے اپنی تصنیف "العباب الزاخر" میں تصریح کی ہے کہ "میں ہندوستان اور سندھ کے مشرق و مغرب میں چالیس[۴۰] سال سے زیادہ گھوما ہوں" تحقیق و جستجو کا انہیں فطری

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۲۷) شب زندہ دار بزرگ تھے ۶۱۹ھ میں انتقال ہوا، علامہ صغانی نے مکہ معظمہ میں ان سے حدیث کی سماعت کی، ؎ قاضی ابو اسحاق ابراہیم بن احمد بن عبد اللہ بن محمد بن سالم قرنطی شافعی عظیم الشان محقق، فقیہ اور محدث تھے، اور "خطیب عدن" کے لقب سے مشہور تھے، ساتویں صدی ہجری کی ابتداء میں وفات ہوئی، ؎ ابو منصور بغدادی فن حدیث میں یکتائے روزگار تھے، علامہ صغانی نے ابن العماد حنبلی کی صراحت کے مطابق بغداد میں ان سے "مسلسلات" کا سماع کیا، اور ۶۱۶ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا (حاشیہ صفحہ ہذا) ؎ مرغینانی ان فقہاء میں تھے جنہیں نزاع، خصومات اور مناقشات طے کرنے میں ید طولیٰ حاصل تھا، اپنے والد بزرگوار صاحب ہدایہ کی مانند "شیخ الاسلام" کے لقب سے مشہور ہوئے، فتاویٰ میں انکا ارشاد حرف آخر سمجھا جاتا تھا، فقہ میں متعدد کتابیں یادگار چھوڑیں، اور ۶۰۰ھ کے بعد عالم فانی سے عالم آخرت کے لیے رخت سفر باندھا،

فوق تھا غرض وہ علمی حیثیت سے جس قدر ممتاز تھے، اسی طرح اخلاقی حیثیت سے بھی ممتاز تھے، تمسک المزاج، حلیم الطبع، صادق القول، وسیع القلب اور کثیر المطالعہ تھے۔

امام صغانی تصنیف تالیف اور درس و تدریس میں بھی ممتاز تھے، اور یہ شغل انہوں نے دم واپسیں تک نہ چھوڑا، سفر و حضر میں بھی ان کے درس و تدریس کا سلسلہ جاری رہتا آخر عمر تک اس میں کوئی فرق نہیں آیا، اسی لیے ان کے تلامذہ کی فہرست طویل ہے، یمنی و عدنی علماء و فضلاء کی بڑی تعداد نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم کی تحصیل کی تھی، تلامذہ میں شیخ شرف الدین دمیاطی[1]، امام بطال بن احمد[2]، سلیمان بن الفقیہ بطال[3] شیخ منصور بن حسن[4]،

---

[1] شیخ ابو محمد شرف الدین عبد المومن بن خلف بن ابو الحسن بن شرف بن الخضر بن موسیٰ دمیاطی شافعی (متوفی ۷۰۵ھ / ۱۳۰۶ء) خوش اخلاق، خوش گفتار، فصیح، نحوی، مقری، بلند حوصلہ، عالی ہمت، امام وقت، حافظ حدیث، ثقہ اور متعدد علوم و فنون کے ماہر تھے، اپنے عہد کے فضلا سے مختلف شہروں اور ملکوں میں جاکر کسب علم کیا، اور بے شمار طلبہ نے ان سے سماع حدیث کیا، چند اہم تصانیف بھی یادگار چھوڑیں۔ [2] محدث محمد بن احمد بطال علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں یگانۂ روزگار تھے، ارباب کمال سے کسب کمال کیا، ابن ابی مخرمہ کی تصریح کے مطابق یمن میں ان کا اور علامہ صغانی کا کچھ عرصہ ساتھ رہا، اور ایک نے دوسرے سے استفادہ کیا [3] ابو الربیع سلیمان بن الفقیہ بطال محمد بن احمد حسین رکبی خوشخط، فقیہ، نہایت دیندار اور عارف کامل تھے، ان پر علم حدیث ادب اور علم دین کا غلبہ تھا علم کی تحصیل زیادہ تر اپنے والد اور علامہ صغانی سے کی تھی، دونوں میں باہم دوستی اور مودت اسی وقت سے قائم تھی جب علامہ صغانی کا قیام انکے والد کے یہاں تھا اور وہ اسوقت زیر تعلیم تھے، انکی شرافت و ذکاوت سے بہت متاثر تھے [4] شیخ منصور متوفی ۶۷۰ھ / ۱۲۷۱ء یمن کے نامور ادیب اور ادبیات میں بے نظیر تھے، "جمال قوی الحافظہ اور "دولت مظفریہ و صدر المؤیدیہ" کے اعلیٰ کاتبوں میں سے تھے۔

فقیہ احمد بن علی مُحرّدی، سعد بن مسعود[1]، عز الدین ابن الوزیر الحلبی، نظام الدین محمود بن عمر ہروی، علی الدین ابو البقا صالح بن عبد اللہ بن جعفر بن علی بن صالح اسدی کوفی معروف بہ ابن الصبّاغ اور شیخ برہان الدین محمود بن ابو الخیر اسعد بلخی شارح "آثار النیرین فی اخبار الطیبین" کے اسماء خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ خلیفۂ وقت المستنصر باللہ نے صغانی سے حدیث پڑھ کر سند لی تھی، اور مستنصر سے پہلے خلیفہ الناصر لدین اللہ نے بھی ان سے حدیث کی سماعت کی تھی۔

سلطان قطب الدین ایبک نے علامہ صغانی کی ذہانت اور تبحر علمی کی بنا پر لاہور کا قاضی مقرر کرنا چاہا، مگر صغانی نے اپنی درویشانہ طبیعت کے پیشِ نظر یہ عہدہ مسترد کر دیا، اور لاہور سے کول (علی گڑھ) چلے آئے، اور یہاں نائب مُشرف مقرر کیے گیے، جس کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے، لیکن ایک مرتبہ مشرف سے نازیبا حرکت صادر ہوئی تو ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد حاکمِ کول حسام الدین اوغلبک نے سو ٹنکوں پر اپنے فرزندوں کی تعلیم کے لیے انہیں اتالیق مقرر کیا، اور وہ اسی قلیل آمدنی پر گذر بسر کرتے رہے۔ کول میں قیام کے درمیان درس و تدریس کے فرائض بھی برابر انجام دیئے۔ پھر ۵۹۹ھ میں حج کے لیے روانہ ہوئے اور طویل عرصے تک حجاز میں مقیم رہ کر متعدد بار فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے، اور وہاں کے فاضل محدثین سے حدیث کی سماعت کی۔ ۶۰۵ھ میں عدن تشریف لے گیے، اور وہاں بھی حدیث کی سماعت کی، ۶۰۶ھ میں ہندوستان کو مراجعت کی، اور تین[3] سال تک ہندوستان کی سیاحت کی۔ اپنی تصانیف میں انھوں نے جن مقامات کا بھی ذکر کیا ہے، وہ حقیقت اور مشاہدہ پر مبنی ہیں۔ ۶۱۰ھ میں پھر حج کیا۔[1]

---

[1] ابو محمد سعد بن مسعود البنوی تلمیذ قاضی ابراہیم قرنطی سے "خطب نباتیہ" پڑھتے تھے۔ اس کی سند انہیں علامہ صغانی سے عدن میں حاصل ہوئی تھی۔

کا معظمہ سے عدن آ گئے، ۶۱۳ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہو کر ہندوستان تشریف
لائے، بعد ازاں ۶۱۴ھ میں فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد ۶۱۵ھ میں بغداد تشریف لے
گئے اور وہاں "مسلسلات" کا سماع کیا،

۶۱۵ھ میں بغداد میں احتساب کا محکمہ سپرد ہوا، علامہ صغانی نے اس فرض کی انجام
دہی کے ساتھ درس و تدریس اور وعظ و تقریر کا سلسلہ بھی جاری رکھا، خلیفۂ وقت الناصرلدین اللہ
عباسی نے جب ان سے حدیث پڑھی، تو ان کے فضل و کمال، زہد و تقویٰ اور فراست و ذہانت
سے اتنا متاثر ہوا، کہ خلعت عطا کی، اور ۶۱۶ھ میں سلطان التتمش کے دربار میں اپنا سفیر بنا کر
بھیجا، اس زمانہ میں انھوں نے ہندوستان کی سیاحت بھی کی، خلیفہ مستنصر باللہ متوفی ۶۴۰ھ
۱۲۴۳ء نے تخت نشین ہونے کے بعد علامہ صغانی کو بغداد طلب کیا، وہ ۶۲۴ھ میں
بغداد پہنچے، اور اسی سال ایک وفد کی سرکردگی میں نہیں پھر دہلی واپس بھیجا گیا، یہ وفد
۶۲۵ھ میں ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا، اور دہلی پہنچا، یہاں وفد کا شاندار
استقبال کیا گیا، اس مرتبہ بھی صغانی کا قیام ایک جگہ نہیں رہا، مگر جہاں بھی رہے درس و
تدریس کا شغل برابر جاری رکھا، تشنگان علوم کی جماعت سفر و حضر میں ان کے ساتھ رہتی
تھی، انکے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنیوالوں میں ملوک و سلاطین بھی تھے اور فقراء و مساکین بھی
علامہ صغانی کی سیر و سیاحت اسلامی مملکت تک ہی محدود نہیں تھی، بلکہ دارالحرب میں
بھی ان کی آمد و رفت رہتی تھی، جہاں انہیں عبادت و ریاضت کا زیادہ موقع
ملتا تھا،

بتاریخ ۲۰ رشعبان ۶۳۳ھ ۱۲۳۶ء سلطان التتمش کا انتقال ہوا، اور اس کا مجھلا
بیٹا رکن الدین تخت سلطنت پر متمکن ہوا، ۶۳۴ھ میں زمام کار ملکہ رضیہ کے ہاتھ میں آگئی،

اور یہاں کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی، تو غالباً صغانی حج کی اجازت سے کر حرمین شریفین گئے اور فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد ماہ صفر ۶۳۵ھ تک حجاز مقدس میں اقامت گزیں رہے چونکہ علماء نے ملکہ رضیہ کی حکمرانی کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا، اسی لیے صغانی کو بھی ہندوستان میں قیام پسند نہ تھا، چنانچہ انھوں نے یہاں سے رستگاری کی تدبیریں شروع کیں، لیکن ملکہ رضیہ نے برسر اقتدار ہونے کے بعد خلافت بغداد سے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا تھا، لہذا خواہش کے باوجود عباسی خلیفہ نے انہیں بغداد واپس بلانا خلاف مصلحت سمجھا، مگر ان کی مساعی برابر جاری رہیں، یہاں تک کہ ۶۳۷ھ میں بغداد واپس گئے،

علامہ صغانی نے قیام ہندوستان کے زمانہ میں تصوف میں جو بلند درجہ حاصل کیا اس کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ جب وہ بغداد پہنچے تو خلیفہ مستنصر نے انہیں رباط المرزبانیۃ[1] کا صدر مقرر کیا، چونکہ شیخ سہروردی شافعی المذہب تھے، اور انھوں نے غالباً وقف کے وقت خلیفہ ناصر سے یہ شرط کرالی تھی کہ اسکا صدر ہمیشہ شافعی المذہب ہو گا، صغانی کو اس شرط کا علم نہ تھا، لہذا پانچ سال تک صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے، مگر جب کسی ضرورت سے وقف نامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، تو خلیفہ مستعصم باللہ کے عہد میں ۶۴۲ھ میں فوراً صدارت سے دست بردار ہو گئے، پھر مستعصم نے انہیں اضاف کے قائم کردہ

---

[1] خلیفہ الناصر لدین اللہ شیخ شہاب الدین سہروردی متوفی ۶۳۲ھ کا عقیدتمند تھا، انکے فضل وکمال اور زہد وورع سے وہ اس قدر متاثر تھا کہ مسلم بادشاہوں کے دربار میں انکو سفیر بنا کر بھیجتا تھا، شیخ ان کی رہائش کے لیے بغداد کی سرسبز وشاداب "مرزبانیہ" نامی بستی میں ایک نہایت کشادہ اور عالی شان مکان تعمیر کرایا، اس میں حمام بنوایا اور باغ لگوایا، نیز ایک سرائے اور خانقاہ تعمیر کرا کے فقراء اور اہل اللہ کے لیے وقف کر دی تھی، یہی سرائے "رباط المرزبانیۃ" کے نام سے مشہور ہوئی۔

مدرسہ تتشفیہ[1] نامی درسگاہ میں مدرس مقرر کردیا، اور خلعت خاص سے سرفراز کیا،
ب پہلی مرتبہ اس دانشگاہ میں آئے، تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا، اور تدریس سے فارغ ہو کر
جستہ چند اشعار پڑھے، خلیفہ مستعصم کا وزیر موید الدین محمد بن احمد علقمی غالی شیعہ ہونے
کے باوجود صغانی کی قدر و منزلت کرتا، بڑے احترام سے پیش آتا، ہر طرح سے دل جوئی کرتا
اور ان کی خدمت کو سعادت سمجھتا تھا، اس نے اپنے فرزند عزالدین ابوالفضل علقمی کی تعلیم و تربیت
کے لیے جہاں اور نادرۂ روزگار فضلا کو مامور کیا تھا، وہاں ادب و لغت کی تعلیم کے لیے صغانی کی
خدمات حاصل کی تھیں، چنانچہ وہ ابن العلقمی کے محل میں تشریف لے جاتے تھے،

علامہ صغانی کثیر التصانیف تھے، جن کے نام اور بعض کتابوں کا مختصر تعارف درج
ذیل کیا جاتا ہے:

۱۔ مشارق الانوار: حاجی خلیفہ نے اس کتاب کی اہمیت، مباحث کی تفصیل اور شائقین

---

[1] سلطان الپ ارسلان کے فرزند ارجمند تاج الدولہ ابو سعید تتش سلجوقی متوفی ۴۸۸ھ کا ایک غلام خمار
تگین بن تاشتکین نامی تھا، اس نے اپنی وفاداری، فرض شناسی، غیر معمولی شجاعت اور قابلیت کی وجہ
سے اپنے آقا تاج الدولہ کی نگاہ میں خاص اعتماد پیدا کر لیا تھا، اس کے انتقال کے بعد محمد بن ملک شاہ
سلجوقی متوفی ۵۱۱ھ کے دربار میں خمارتگین کو بڑی قدر و منزلت حاصل ہو گئی تھی، اور دربار میں اس
کا طوطی بولتا تھا، اس کے پاس مال و دولت کی بڑی فراوانی تھی، اس نے رفاہ عام کے کام بڑے
نمایاں انجام دیئے، حاجیوں اور مسافروں کے لیے "رے" اور "سمنان" میں نہایت عالیشان
سرائیں تعمیر کرائیں، بغداد میں مسجدیں اور سڑکیں بنوائیں، شفاخانے اور مدرسے کھولے، مگر اس وفادار
اور حق شناس خادم نے ان سب کو اپنے نام سے منسوب کرنے کے بجائے اپنے آقا کے نام ہی سے منسوب کرنے
کو باعث فخر سمجھا، خمارتگین کا انتقال ۵۰۸ھ میں ہوا،

کے اسمار کی وضاحت کی ہے، صغانی نے "مقدمہ مشارق الانوار" میں خود صراحت کی ہے کہ "
اس کتاب کو صحت، درستگی، استحکام اور متانت کے اعتبار سے اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان حجت
اور وسیلہ سمجھتے۔ اور اسے اپنی زندگی کا انیس اور عقبیٰ کے لیے موجب نجات قرار دیتے تھے۔"[1]
اس کتاب میں صغانی نے "صحیح بخاری و صحیح مسلم" کا انتخاب کیا ہے، اس کتاب کے ایک شارح
گازرونی کے بیان کے مطابق اس مجموعے میں احادیث کی کل تعداد دو ہزار دو سو چھیالیس ہے
اس کتاب میں بارہ[12] ابواب ہیں۔ "خا" سے مراد بخاری "میم" سے مسلم اور "ق" سے متفق علیہ ہے۔
صغانی نے یہ کتاب خلیفہ مستنصر باللہ کے لیے تصنیف کی تھی، اور اس میں اپنی چار کتابوں مصباح[1]
الشمس المنیرہ[2]، کتاب الشبہات[3]، کتاب النجم کو یکجا کر دیا تھا، گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے
اس کتاب کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، اور آج تک یہ فن حدیث کی بلند پایہ کتابوں میں شمار
ہوتی ہے۔ علمائے حدیث نے اس کی بڑی قدر کی۔ ہندوستان کے مروجہ عربی نصاب میں یہ کتاب
داخل درس رہی، اور عرصۂ دراز تک حدیث کی انتہائی تعلیم کا دارومدار اسی کتاب پر رہا، یہ کتاب
بیرون ہند کے علاوہ ہندوستان میں دسیوں بار طبع ہوئی ہے، اس کتاب کا فارسی زبان میں
ترجمہ ہوا اور حواشی لکھے گئے، اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کتاب کا پورا نام
"مشارق الانوار النبویہ من صحاح الاخبار المصطفویہ" ہے۔

۲۔ مصباح الدجیٰ من صحاح حدیث المصطفیٰ:۔ فن حدیث کی کتاب ہے۔

۳۔ الشمس المنیرہ من الصحاح الماثورہ:۔ فن حدیث کی کتاب ہے۔

۴۔ شرح صحیح البخاری:۔ اس میں علامہ صغانی نے صحیح بخاری کی مختصر شرح لکھی ہے، جو
ایک جلد پر مشتمل ہے۔

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ ص ۱۶۸۸۔

۵۔ کتاب فی الضعفاء والمتروکین فی رواۃ الحدیث: کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ یہ فن اسماء الرجال کی کتاب ہے،

۶۔ الملتقط فی تبیین الغلط: علم روایت حدیث کے بارے میں قضاعی نے اپنی کتاب "الشہاب" اور الشیشی نے اپنی کتاب "النجم" میں جو کچھ ذکر کیا ہے، علامہ صغانی نے اس کو جمع کر کے صحیح و غلط کی نشاندہی کی ہے،

۷۔ رسالہ فی الاحادیث الموضوعۃ: شیخ محمد ابوالحسن القاوقجی کی کتاب "اللؤلؤ المرصوع فیما لا اصل له او باصله موضوع" کے آخر میں علامہ صغانی کا یہ رسالہ بھی شامل ہے، جو جدریہ کے المطبعۃ البارونیہ سے طبع ہو چکا ہے، اور چھوٹے سائز کے بارہ صفحات پر حاوی ہے، اس رسالہ کا ایک مخطوطہ نسخہ تیموریہ لائبریری میں محفوظ ہے،

۸۔ کشف الحجاب عن احادیث الشہاب: صغانی نے قضاعی کی تالیف "الشہاب" کی موضوع احادیث کو بیان کیا ہے،

۹۔ کتاب النجم: فن حدیث کی کتاب ہے۔

۱۰۔ مجمع البحرین: علامہ صغانی نے اس نام کی دو کتابیں لکھیں، ایک فن حدیث میں اور دوسری لغت میں، جس کا تعارف آگے کرایا جائے گا،

۱۱۔ درّ السحابہ فی بیان مواضع وفیات الصحابہ: علامہ صغانی نے اس میں اپنی ایک مختصر کتاب "مختصر الوفیات" اور اس کے ذیل کو جس میں صحابہؓ کی وفات کی جگہوں کا بیان تھا، بہ ترتیب حروف تہجی یکجا کر دیا تھا، اس کا ایک نسخہ مکتبہ خدیویہ قاہرہ میں محفوظ ہے،

۱۲۔ کتاب المناسکین، (۱۳) مناسک الحج یا مناسک الصغانی، (۱۴) کتاب الفرائض یا فرائض الصغانی۔

۱۵۔ التکملۃ علی الصحاح یا التکملۃ والذیل والصلۃ: ابو نصر اسماعیل بن حماد جوہری متوفی ۳۹۳ھ کی مشہور تصنیف "الصحاح" پر علامہ صغانی نے اس کی ترتیب کے مطابق چھ جلدوں میں "التکملۃ" کی تالیف کی اور اس میں وہ چیزیں بھی شامل کی ہیں، جنہیں جوہری نے چھوڑ دیا تھا اس لیے اس کا یہ حجم "الصحاح" سے بھی زیادہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ دار الکتب المصریہ میں اور دوسرا نسخہ استنبول کے مکتبہ سلیمانیہ میں محفوظ ہے، ایک اور قدیم مخطوطہ ٹیونس میں ہے، اور کتاب کی جلد اول برٹش میوزیم میں بھی موجود ہے،

۱۶۔ مجمع البحرین: لغت کی یہ کتاب بارہ جلدوں میں ہے، صغانی نے اس میں جوہری کی "الصحاح" اور اپنی تالیف "التکملۃ" کو جمع کیا ہے، اس میں پہلے صحاح کیلئے "ص" کی علامت مقرر کی ہے، اس کے بعد التکملۃ میں تحریر شدہ مواد درج کیا ہے، اور اس کے لیے "ت" کی علامت مقرر کی ہے، کتاب کا ایک قلمی نسخہ دس جلدوں میں "دار الکتب المصریۃ" میں محفوظ ہے، علاوہ ازیں استنبول کے مکتبہ کوپرلی، ٹیونس کے "الخزانۃ الخصوصیہ" پیرس کی نیشنل لائبریری، ہمبرگ یونیورسٹی اور بوخارسٹ کی "معہد الدراسات الشرقیہ" میں بھی ایک ایک مخطوطہ موجود ہے،

۱۷۔ العباب الزاخر واللباب الفاخر: امام لغت صغانی کی یہ کتاب فن لغت میں خاص امتیاز رکھتی ہے، صغانی نے "الصحاح" اور "لسان العرب" کے طریقہ پر کلمات کے اواخر کے اعتبار سے اس کو علقمی کے بیٹے کے لیے مرتب کیا تھا، اور کبار ائمہ لغت کے سوانح حیات کا اضافہ بھی کیا ہے، جلال الدین سیوطی کا بیان ہے کہ جوہری کی "الصحاح" کے بعد ابن سیدہ ابو الحسن علی بن اسماعیل[1] نے لغت میں "کتاب المحکم والمحیط الاعظم" کے نام

---

[1] ابن سیدہ مشہور فاضل لغت تھے جو نابینا تھے، مگر ذہانت و حافظہ میں یکتا تھے، (باقی اگلے صفحہ پر)

سے ایک عظیم کتاب تالیف کی۔ اس کے بعد صغانی نے یہ عظیم الشان کتاب لغت میں تالیف کی جو نامکمل ہے، صغانی باب المیم کی فصل الباء تک پہنچے تھے، اور اپنے قلم سے "بکم" لکھا تھا کہ اچانک روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس سانحۂ رحلت سے متاثر ہو کر کسی شاعر نے کہا تھا:

ان الصغانی الذی حاز العلوم والحکم

(بے شک صغانی جس کی ذات مختلف علوم اور حکمتوں کی جامع تھی)

کان قصاری امرہ ان انتہی الی بکم

(ان کا بھی سارا زور لفظ "بکم" (گونگا پن) تک پہنچ کر ختم ہو گیا، اور کتاب ناقص رہ گئی)

مگر "القاموس" کے مصنف امام مجد الدین فیروز آبادی کے بیان سے مترشح ہوتا ہے، کہ کتاب مکمل ہو گئی تھی، ممکن ہے کہ کتاب کی آخری جلدیں تلف ہو گئی ہوں، اور حاجی خلیفہ کی نظر سے مکمل کتاب نہ گزری ہو، فیروز آبادی متوفی ۸۱۶ھ / ۱۴۱۳ء نے بھی طالبین کے اصرار سے مجبور ہو کر عربی لغت میں ایک ضخیم کتاب ساٹھ جلدوں میں لکھی تھی، جو زیادہ تر ابن سیدہ کی "کتاب المحکم" اور صغانی کی "العباب الزاخر" پر مبنی تھی، اس کا نام "اللامع المعلم العجاب الجامع بین المحکم والعباب" تھا، ان کی کتاب "القاموس" کی دونوں جلدیں اسی کا خلاصہ ہیں، مصنف دیباچے میں لکھتے ہیں کہ "المحکم" اور "العباب" لغت میں بہترین کتابیں ہیں، آج "اللامع" اور "العباب" دونوں ناپید ہیں، البتہ "العباب" کی صرف چار جلدیں آستانہ کی "ایا صوفیا" اور "کوبرلی" نامی دو لائبریریوں میں موجود ہیں، اور ایک جلد "دار الکتب المصریہ" میں محفوظ ہے، اس کتاب کا ایک حصہ (حرف ہمزہ) شیخ محمد حسن

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۸۲) ان کے والد بھی نابینا اور لغت کے بڑے عالم تھے۔ مزید حالات کیلئے ملاحظہ ہو: طبقات الامم لصاعد الاندلسی، وفیات الاعیان لابن خلکان مطبوعہ مصر ۱۳۱۰ھ ۱:۳۴۳، بغیۃ الوعاۃ: ۳۲۷، معجم الادباء ۶:۳۴، دائرۃ المعارف الاسلامیہ، کشف الظنون: ۱۴۱۸ و ۱۴۱۹ -

...یسین کی تحقیق کے ساتھ بغداد سے ۱۹۶۰ء میں شایع ہو چکا ہے،

۱۸۔ الشوارد فی اللغۃ۔ علامہ صغانی نے اس میں ایسے عربی الفاظ کو جمع کیا ہے جن میں بعض ائمۂ لغت منفرد ہیں، اسکا ایک قلمی نسخہ استنبول کے کتبۂ "داماد زادہ" میں محفوظ ہے، [۳۳]

۱۹۔ الاضداد فی اللغۃ۔ یہ رسالہ عربی کے لغات اضداد میں ہے صغانی نے اس میں تین سو پچیس لغات اضداد کے معنی بیان کیے ہیں، اسکی ترتیب حروف تہجی کے مطابق ہے اور یہ ان تمام لغات اضداد کا مجموعہ ہے جو محمد بن المستنیر قطرب متوفی ۲۰۶ھ کے عہد سے لیکر عباسی خلیفہ مستنصر باللہ کے وقت تک مختلف مصنفوں نے لکھے ہیں، ڈاکٹر ہفنر کی مساعی سے ابن السکیت کی "کتاب الاضداد" کے ساتھ یہ رسالہ بھی ۱۹۱۳ء میں بیروت سے شایع ہو چکا ہے، جو اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے، اس کا ایک ایک مخطوطہ برلن اور کتبۂ داماد زادہ میں محفوظ ہے،

۲۰۔ اسماء الغادہ فی اللغۃ۔ اسکا ایک قلمی نسخہ کتبۂ داماد زادہ میں ہے اور دوسرا نسخہ کتبۂ خدیویہ میں ہے،

۲۱۔ اسماء الذئب فی اللغۃ۔ خلیفہ مستعصم باللہ کی قدردانی اور اس کے وزیر ابن العلقمی کی عزت افزائی نے صغانی کو انکے ہمعصروں کی نظر میں محسود بنا دیا تھا، بعض حاسدوں نے انہیں طرح طرح سے تنگ کیا، مگر وہ خاموشی کے ساتھ ان کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے جب انکی آتش حسد کسی طرح ٹھنڈی نہ ہوئی تو صغانی نے ان کے وہ خصائل جو ان میں اور بھیڑیوں میں مشترک تھے، ایک رسالے میں جمع کر دیے، اور اسکا نام "کتاب الذئب" رکھا، یہ رسالہ ۱۳۲۰ھ میں مطبعۂ احمد کامل سے طبع ہو چکا ہے،

۲۲۔ اسماء الاسد فی اللغۃ۔ اس کا ایک قلمی نسخہ کتبۂ خدیویہ تیموریہ میں محفوظ ہے،

۲۳۔ نوادر اللغۃ، (۲۴)، کتاب الافعال (۲۵)، التجرید ذیل الصغانی،

۲۶۔ خلق الانسان فی اللغۃ۔ مکتبۂ داماد زادہ میں ایک مخطوطہ موجود ہے۔

۲۷۔ کتاب الانفعال فی اللغۃ۔ مکتبۂ داماد زادہ میں اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔

۲۸۔ کتاب یفعول فی اللغۃ۔ مکتبہ داماد زادہ اور دارالکتب المصریہ میں ایک ایک قلمی نسخہ موجود ہے، علامہ سیوطی نے بطور نمونہ چند الفاظ مثلاً "یسروع، یعسوب، یعفور" وغیرہ (المزہر: ۱۵۱؍۲ ۔ ۱۵۲ میں) نقل کرکے صغانی کی تالیف کا تعارف کرایا ہے، علامہ حسن حسنی عبدالوہاب نے اس کو ایڈٹ کرکے ۱۹۲۵ء میں ٹیونس سے شایع کیا ہے۔

۲۹۔ نقعۃ الصدیان فیما جاء علیٰ وزن فعلان۔ مکتبہ داماد زادہ اور دارالکتب المصریہ میں اس کا ایک ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔

۳۰۔ کتاب المفعول (۳۱) کتاب الانفعال۔

۳۲۔ ما بنتہ العرب علیٰ فعال۔ ڈاکٹر عزت حسن کی تحقیق کے ساتھ "مجلۃ المجمع العلمی العربی" ۳۹ ؍ ۲۹۵، ۳۱۲، ۴۷۹، ۴۸۶، ۶۴۵ کل ترپن صفحات میں تقریباً نصف کتاب تین قسطوں میں شایع ہو چکی ہے، اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب کو مکمل کتاب شایع ہونے کا علم ہوا، تو تحقیق کا یہ سلسلہ بند کر دیا، اس کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ صغانی کی یہ تالیف حروف معجم کے اعتبار سے مرتب ہے، صغانی نے ثلاثی سے استعمال ہونے والے ایک سو تیس الفاظ اس طرح درج کیے ہیں، "بلاء، شراء، نقاء، ایلب، صحاب...... ہمام، ہبان" پھر رباعی سے استعمال ہونے والے "بجباج، مجاج، ہرعار، قرقار، دہداع، حمحام، ہمہام" سات الفاظ درج کیے ہیں، بعد ازاں اجمال کی تفصیل کرتے ہوئے "الہمزہ، الباء" وغیرہ کے تحت ترتیب وار تحقیق کی، صغانی نے تفصیل میں ہر ایک لفظ کے معنی بتائے اور ثبوت و تائید کے طور پر عربوں کے مشہور اقوال، امثال اور اشعار نقل کیے ہیں، ڈاکٹر عزت حسن نے حرف شین "شناش" تک بہتر الفاظ کی تحقیق کی ہے، اس کی اجمالی فہرست میں درج

۳۳۔ نفا، شعاب ... دونوں کی تحقیق تحصیل میں صحیح نہیں ہے، تفصیل مذکور نہیں، شعاب کی تحقیق کا نسخہ

۳۳۔ تعزیۃ الحریری کا مکتبۂ داماد زادہ میں ایک قلمی نسخہ موجود ہے،

۳۴۔ شرح قلادۃ السمطیہ فی توشیح السدیدیہ، ۳۵۔ شرح ابیات المفصل، ۳۶۔ کتاب تکملۃ الحریری،

۳۷۔ کتاب سمات السعادۃ، ۳۸۔ کتاب فعول، ۳۹۔ کتاب فی العروض۔

۴۰۔ المختصر فی العروض، اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبۂ داماد زادہ میں محفوظ ہے[1]،

علامہ صغانی نے بغداد میں تہتر[73] سال کی عمر میں بتاریخ ۱۹ شعبان ۶۵۰ھ عالم آخرت کیلئے رخت سفر باندھا، انھوں نے اپنے فرزندوں کو وصیت کی تھی کہ میری لاش مکہ مکرمہ لیجاکر حضرت فضیل بن عیاضؒ متوفی ۱۸۷ھ کی قبر کے متصل دفن کرنا، پہلے حریم طاہری میں دفن کیے گئے جہاں آپکا قیام تھا، چند دن بعد مکہ معظمہ لیجایا گیا اور حرم مکہ میں "جنۃ المعلاۃ"[2] کے اندر حسب وصیت حضرت فضیل بن عیاض کی قبر کے پاس جسد خاکی کو سپرد خاک کیا گیا، صغانی کے بعض شاگردوں نے مرثیے لکھے، علامہ زمخشری نے اپنے استاذ ابومضر کی وفات پر دردانگیز اشعار کہے تھے اسی انداز پر علی بن حسن بن محمد بن عمر بن اسماعیل الشہزوری کے چچا احمد بن محمد نے مرثیہ لکھا، اسکے دو[2] شعر درج ذیل ہیں۔

ابا الفضائل قد زودتنی اسفا ‫ ‫ اضعاف ما زدت قدری فی الوری شرفا

(رحلت کے وقت جب اشک تیزی سے رواں تھے تو میں کہہ رہا تھا) اے ابو الفضل آپ نے علمی کمالات دیکر دنیا میں جس قدر میری منزلت بڑھائی تھی اس سے کئی گنا زیادہ مجھے رنج واندوہ کا توشہ دیا،

قد کنت تودع سمعی الدر منتظما ‫ ‫ فغدا من جفن عینی الآن منتثرا

(آپنے میرے کانوں میں پروکر سلک مروارید کو امانت رکھا تھا، اب انہی موتیوں کو میری شرگاں سے پراگندہ حالت میں لیجئے)

اس کے علاوہ بھی متعدد مرثیے کہے گیے جن کو قلم انداز کیا جاتا ہے۔ (باقی)

---

[1] علامہ صغانی کی مذکورہ بالا تصانیف کا مختلف تذکرہ نویسوں نے ذکر کیا ہے، مگر انکے علاوہ بھی آپکی تصانیف رہی ہونگی،

[2] المعلاۃ، مکہ کرمہ اور بدر کے درمیان واقع ہے یہاں کا قبرستان "جنۃ المعلاۃ" کے نام سے مشہور ہے۔[3] تاریخ نفرست ۱۵۵

ادبیات

تجدید پیماں کا سفر

اقبال عالمی کانگرس پاکستان میں شرکت کے بعد ہندوستان واپس پہنچنے پر

(۱)

از پروفیسر جگن ناتھ آزاد جمّوں

کیا بتائیں کس خیاباں کے سفر سے آئے ہیں
زندگی، ہم چاکِ داماں کے سفر سے آئے ہیں

اہتزاز روح سے محسوس ہوتا ہے کہ ہم
اک عجب سرشاریِ جاں کے سفر سے آئے ہیں

دل میں کیوں تازہ ہے پھر جی سے گزر جانے کا خو
شاید اک تجدید پیماں کے سفر سے آئے ہیں

دوستوں کی وہ محبت، وہ توجہ، وہ تپاک
کتنی دلکش بزم یاراں کے سفر سے آئے ہیں

کیوں ہماری مسکراہٹ میں ہیں اشکوں کا گزر
کس دیارِ وصل و ہجراں کے سفر سے آئے ہیں

ہم کبھی عمر گذشتہ چھوڑ آئے تھے جہاں
آج اسی اپنے شبستاں کے سفر سے آئے ہیں

ہر نفس پر ہو رہا ہے موجِ نکہت کا گماں
زندگی ہم کس گلستاں کے سفر سے آئے ہیں

ذکر اک محبوب کا تھا اور بیاں عشاق کا
ہائے کیسی بزمِ جاناں کے سفر سے آئے ہیں

رو برو یوں محفلِ اقبال ہے اے دل کہ ہم
جیسے لمحات گریزاں کے سفر سے آئے ہیں

اللہ اللہ کس قدر اپنی نظر میں ہیں بلند
کس مقامِ اوجِ انساں کے سفر سے آئے ہیں

شہر اقبال اور شہر مرقدِ اقبال بھی
ہائے کس کیفیت جاں کے سفر سے آئے ہیں

غزل

از ڈاکٹر محمود الرحمٰن اسلام آباد (پاکستان)

یہ دل کا دیپک عجیب سا ہے، کبھی بجھ رہا ہے کبھی جل رہا ہے
کبھی سکوں میں دھواں دھواں ہے، کبھی آندھیوں میں سنبھل رہا ہے

تپش کچھ ایسی یہ وقت کے اس رواں دواں آفتاب میں ہے
پگھل پگھل کے ہر آدمی اب نرالے سانچے میں ڈھل رہا ہے

ہماری آنکھوں نے جو بھی دیکھا فضائے عالم میں مدتوں سے
مشاہدہ اب قلم کی بھٹی سے شعر بن کر نکل رہا ہے

ہمارے آبا نے جو خزانے دبا کے رکھے تھے صدیوں پہلے
زمیں کا خطہ وہی دفینہ ہمارے آگے اگل رہا ہے

کبھی لبوں پر ہے مسکراہٹ، کبھی ہے آنکھوں میں اک نمی سی
نظام یہ زندگی کا روزِ ازل سے ایسا ہی چل رہا ہے

شعور کو زنگ لگا تھا لیکن شعور مردہ نہیں ہوا تھا
جسے سمجھتے تھے نیم جاں تم، سنو وہ کروٹ بدل رہا ہے[1]

بزعمِ عقل و خرد تغیر نظامِ شمسی میں لانے والو!
خدا کا قانون کس نے بدلا کہ یہ ہمیشہ اٹل رہا ہے

بلادِ مشرق کے رہنے والو، پناہ گاہوں سے اب تو نکلو
اٹھا تھا مغرب کی وادیوں سے جو ایک طوفان ٹل رہا ہے

ملے وہ محمود بعد مدت تو ہنس کے پوچھا کہو ہو کیسے
غموں کا مارا یہ دل عجب ہے اسی بات سے اب بہل رہا ہے

---

[1] تیسری دنیا کی تحریک احیاء۔

مطبوعات جدیدہ

آئینۂ ملفوظات : از جناب مولانا اخلاق حسین دہلوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۰، قیمت ۲۵ روپیے، مجلد مع گرد پوش۔

پتے : (۱) کتب خانہ انجمن ترقی اردو، ۱۹۳ جامع مسجد، اردو بازار، دہلی (۲) فضل برادرز، مرکزی کتاب گھر، بستی نظام الدین اولیاءؒ نئی دہلی

مولانا اخلاق حسین دہلوی کو صوفیائے کرام سے والہانہ عقیدت ہے اور کتب تصوف کا مطالعہ و تحقیق ان کا محبوب مشغلہ ہے، اس سلسلہ میں صوفیہ اور تصوف پر کئے جانے والے غیر ذمہ دارانہ اعتراضات کا جواب بھی وہ برابر دیتے رہے ہیں، کئی برس پہلے بعض حضرات نے ہندوستان کے چشتی سلسلہ کے اکابر صوفیہ کے بعض مجموعہ ملفوظات کے جعلی ہونے کا دعویٰ کیا، تو سب سے پہلے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دار المصنفین نے ایک مبسوط محققانہ مقالہ سپرد قلم کیا جو معارف میں بالاقساط چھپا، مولانا اخلاق حسین صاحب نے بھی تصوف سے اشتغال و تعلق اور صوفیائے کرام سے عقیدت و محبت کی بنا پر اس مہم میں سرگرم حصہ لیا اور معارف کے کئی نمبروں میں طویل مضامین لکھے جن میں ملفوظات کو جعلی قرار دینے والوں کا مدلل جواب دیا، یہ کتاب ان کے انہی مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں تصوف کی تین اہم کتابوں، فوائد السالکین، اسرار الاولیاء اور راحت القلوب کے متعلق اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج قلمبند کرکے ان کو جعلی ہونے پر زور تردید کی ہے، شروع میں بطور مقدمہ ملفوظات کے مطالعہ و تحقیق کے ضروری اصول اور بنیادی امور بیان کئے ہیں، اس میں پہلے ملفوظات کی تعریف، ان کی اہمیت و مقبولیت اور کتب ملفوظات کی ترتیب و تدوین کے سلسلہ کی ضروری اور مفید باتیں لکھی ہیں، پھر ان کے مندرجات کی روشنی میں ان کے مطالعہ کے ضابطے بتائے ہیں، اس کے بعد خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعہ ملفوظات فوائد السالکین کا مفصل جائزہ لیا ہے، جس کو بابا فرید مسعود

ما ہنامہ معارف میں شائع ہوا تھا، اس میں فوائد السالکین کے مطبوعہ قلمی نسخوں اور اردو ترجموں کا ذکر کیا ہے اور
اس کی مجالس کی تعداد بتائی ہے پھر اس کی قدامت عہد تدوین اور تاریخی اندراجات پر بحث و گفتگو
کی ہے اور اس کے اسلوب بیان اور موضوع و مضمون کی وضاحت کی ہے، مصنف نے فوائد السالکین
کی متعدد ایسی روایتیں نقل کر کے جو زیادہ بعید از قیاس باتوں اور خوارق سے تعلق رکھتی ہیں، ان پر کئے
جانے والے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، اور ان کے استبعاد کو دور کیا ہے، اسی طریقہ سے انھوں نے
اسرار الاولیاء، اور راحت القلوب کے متعلق بھی اپنے مطالعہ و تحقیق کے نتائج بیان کئے ہیں، اور جن روایتوں
پر اعتراضات کئے جاتے ہیں اور انھیں محال اور ناممکن سمجھا جاتا ہے ان کو ذکر کر کے ان کی وضاحت کی ہے،
کہیں کہیں خود فاضل مصنف نے بھی ان کتابوں کے بعض مندرجات کو مشکوک قرار دیا ہے، جیسے ص۱۰۱ اور ۱۰۲
پر فوائد السالکین کے تاریخی اندراجات میں الحاق وجعل اور غلط اندراج کا اعتراف کیا ہے اور جب کتب
حدیث اور جاہلی عربی شعراء کا کلام بھی الحاق وجعل سے خالی نہیں ہے تو ملفوظات میں بھی الحاق ممکن الوقوع
ہے لیکن اس کی وجہ سے ملفوظات کے سارے ذخیرے یا کسی خاص مجموعہ کو تمام تر الحاقی سمجھنا یقیناً نا انصافی
ہے، البتہ مصنف نے ان کتابوں کی بعض روایتوں پر جو بحث و گفتگو کی ہے، اس سے انہی لوگوں کو کچھ
تشفی ہوگی جو تصوف کا مذاق اور اس کے مبادی و اصول سے واقفیت رکھتے، اور بقول مصنف
"بصیرت باطنی سے مالا مال ہوں ورنہ عام اور ظاہر بیں طبقہ کو اب بھی بہت کچھ لیت ولعل ہو سکتا ہے"
حضرت یوسفؑ اور زلیخا کے تعلق سے جس اسرائیلی روایت کو دو جگہ نقل کیا ہے اور اسے صحیح اور حقائق
پر مبنی قرار دینے کی کوشش کی ہے وہ محل نظر ہے، ص۱۷۵ و ۱۷۹ پر ایک روایت کے عجوبہ پن کو دور کرنے
کے لئے انھوں نے حضرت عمرؓ کے خطبہ جمعہ میں یاساریۃ الجبل کہنے کے واقعہ سے جو استدلال کیا ہے، اگر
دوسری روایتوں کے استبعاد کو رفع کرنے کے لئے بھی اسی طرح صحابہ کرامؓ کے عمل اور احادیث سے شواہد
پیش کئے جاتے تو زیادہ مفید ہوتا، صوفیائے کرام کی تعلیم کی سب سے اہم خصوصیت نرمی، لینت اور شفقت

ت ہے، شدید ترین مخالفین کے لئے بھی ان کے آئینۂ دل پر بغض وکدورت کا زنگ نہیں ہوتا،

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

ناکو بھی انہی مردان حق آگاہ کے طریقہ کے مطابق مخالفین کے لئے سخت لب ولہجہ اور غیر معتدل انداز

ں اختیار کرنا چاہئے تھا، تاہم انھوں نے صوفیہ کے خلاف چلائی گئی مہم کا جس جذبہ سے جواب دیا ہے

ہ بہت قابل قدر ہے،

اسماعیلی عقائد پر ایک نظر مرتبہ جناب اصغر علی صاحب انجینیر، تقطیع متوسط کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۲۲۲، قیمت ۲۵ روپیے، ناشر اسمٰعیل عطر والا، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، آمرین کاٹیج، سکنڈ فلور فورتھ روڈ، سانتا کروز الیسٹ بمبئی۔

اردو میں اسماعیلی مذہب اور فاطمین مصر کی تاریخ پر ڈاکٹر زاہد علی کی کتاب زیادہ مشہور اور مستند خیال کی جاتی ہے، اس کے علاوہ اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ اس پایہ کی نہیں ہیں مگر خود اسماعیلی اور فاطمی فرقہ کے لوگوں کی کوئی کتاب موجود نہیں تھی، زیر نظر کتاب اسی کمی کو پورا کرنے اور اسماعیلی عقائد کے متعلق عام طور پر پھیلی ہوئی غلطیوں کے ازالہ کے لئے لکھی گئی ہے، اس کے فاضل مصنف کے خیال میں ڈاکٹر زاہد علی کی کتاب ایک خاص مقصد کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے جس سے اسماعیلی مذہب کی حقیقت مسخ ہوگئی ہے، ان کے بیان کے مطابق انھوں نے اسماعیلی اور فاطمی عقائد کو پوری ایمانداری اور معروضیت کے ساتھ اس شکل میں پیش کیا ہے جیسا کہ اسماعیلی اور فاطمی خود سمجھتے ہیں، یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں اسماعیلی فرقے کی اجمالی تاریخ قلمبند کی گئی ہے، اس میں اس کے بارہ میں غلط فہمی کے اسباب ووجوہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، دوسرے باب میں اسماعیلی تحریک کے آغاز، اس کے ابتدائی مراحل اور عقائد کا ذکر ہے، اس کے بعد اسماعیلی وفاطمی عقائد کے تین دور قائم کرکے ہر دور کے عقائد ومسائل کی تشریح کی ہے، اس ضمن میں شیعہ، قرامطہ، اسماعیلی اور فاطمی

کا فرق [illegible] ہے، مصنف نے فاطمی مذہب وعقیدہ کو اس کی کتابوں کی مدد سے بے کم و کاست پیش کرنے کا دعویٰ کیا ہے، لیکن اس ضمن میں انھوں نے بحث، تجزیہ اور استدلال کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اور جس طرح نتائج وغیرہ کا استنباط کیا ہے، ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسروں کے لئے بھی تشفی بخش ہو، وہ خود اس مذہب کے بارہ میں لکھتے ہیں :

"شروع ہی سے اسماعیلی تحریک روپوش تحریک تھی، اور اسماعیلی ائمہ ایسے نام اختیار کرتے تھے جس سے مخالفین میں ذہنی کنفیوژن پیدا ہو... روپوش تحریک کی صحیح تاریخ لکھنا "کارے دارد" (ص۳) خفیہ تحریک کے کئی گوشے اکثر تاریک رہ جاتے ہیں جن پر قطعی رائے دینا یا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے... خود اسماعیلی کتب اس معاملے میں ہماری کوئی قطعی طور پر راہ نمائی نہیں کرتیں (ص۶)"

کیا اس کے بعد ڈاکٹر زاہد علی وغیرہ سے مصنف کی یہ شکایت بجا ہو سکتی ہے کہ انھوں نے ان کے مذہب کی صحیح تصویر نہیں پیش کی، علاوہ ازیں خود مصنف نے اپنے مذہب اور اس کے عقائد کو معروضیت کے ساتھ بے کم و کاست پیش کرنے کا جو دعویٰ کیا ہے، اس کے صحیح اور درست ہونے کا یقین کس طرح کر لیا جائے، اس کتاب میں آیات واحادیث اور مسائل کی جو عجیب وغریب تاویلیں کی گئی ہے اور ان کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کی جس طرح وضاحت کی گئی ہے اس کے بعد یہ مذہب بالکل گورکھ دھندا معلوم ہوتا ہے، کسی بھی مذہب پر خواہ کتنے ہی دور گزر جائیں اس کے عقائد میں رد و بدل نہیں ہوتا مگر مصنف نے ہر ہر دور کے جو عقائد بیان کئے ہیں، ان میں فرق واختلاف ہے، اور بعض جگہ عقائد اور فقہی مسائل ایک دوسرے سے گڈمڈ کر دیئے ہیں، انھوں نے متعدد جگہ یہ واضح کیا ہے کہ ظاہری شرعی اعمال اور اس سے متعلق دیگر پہلوؤں کے بارہ میں اسلام کے دوسرے فرقوں سے اسماعیلی فرقہ کا کوئی اختلاف نہیں (ص۱۱۰) مگر دوسری جگہ اس کے برعکس یہ لکھا ہے کہ "عام فقہاء نے اسلام کے پانچ ستون بتائے ہیں، صلوٰۃ، صوم

[illegible] اور جلد لیکن سیدنا قاضی النعمان و عائم الاسلام میں ان میں دو اور شامل کرتے ہیں ولایت ووراثت جو انھوں نے امامت و وصایت اور انکے مسئلہ میں جن پہلوؤں کا ذکر کیا گیا ان میں سے کوئی چیز بھی جمہور مسلمانوں کے عقائد کے مطابق ہے، اس مختصر تبصرہ میں کتاب کے مندرجات اور باطنی تاویلات پر مفصل نقد و تبصرہ کی گنجائش نہیں، دراصل مصنف ہی کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کے مذہب کا اصلی خط و خال نمایاں ہونا اور اس کے بارہ میں کنفیوژن کا دور ہونا مشکل ہے، اس کتاب کے بعد بھی اس کی یہی صورت ہے۔

اسماء الصحابۃ الرواۃ وما لکل واحد من العدد از علامہ ابن حزم اندلسی مع تعلیق مولانا ابو سلمہ شفیع احمد صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۱۰، قیمت درج نہیں، پتہ ادارۂ ترجمہ و تالیف ۲۸، پھول بگان روڈ، کلکتہ ۱۴

یہ عربی رسالہ صاحب الملل والنحل علامہ ابن حزمؒ ظاہری اندلسی متوفی ۴۵۶ھ کی تصنیف ہے جسے کلکتہ کے ایک صاحب علم اور ادارۂ ترجمہ و تالیف کے ناظم مولانا ابو سلمہ شفیع احمد صاحب نے اپنی تعلیقات کے ساتھ شائع کیا ہے، رسالہ میں راویانِ حدیث صحابہ کے نام اور ان کی مرویات کی تعداد درج ہے، مصنف علام نے مرویات کے لحاظ سے ان صحابہ کے مختلف طبقے قائم کئے ہیں پہلے طبقہ صاحب الالوف میں صرف حضرت ابوہریرہؓ کا اسم مبارک درج ہے جن کی مرویات کی تعداد ۵۳۷۴ بتائی ہے، اس کے بعد دو ہزار سے زیادہ پھر ایک ہزار اور اس سے زیادہ، پھر ایک ہزار سے کم اور تین سو سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والے صحابہ کے نام لکھے ہیں، اس کے بعد دو سو سے زیادہ پھر ایک سو سے زیادہ اور پھر ایک سو سے کم اور بیس سے زیادہ احادیث کے راوی صحابہ کے نام تحریر ہیں، آخر میں بیس تا ایک کے عدد سے درج ہیں، اور جس صحابی نے جتنی تعداد میں حدیث روایت کی ہے اس کا نام

اسی مسند کے تحت دیا ہے، مولانا ابو سلمہ کی تعلیقات کے دو حصے ہیں، پہلے میں صحابی کی تعریف صحابہ کے مناقب اور مراتب کے لحاظ سے افضل صحابہ کا ذکر ہے، دوسرے حصہ میں ان سب صحابہ کرام کا مختصر ترجمہ دیا ہے جن کے نام اور مرویات کی تعداد علامہ ابن حزمؒ نے لکھی تھی، بعض بعض صحابہ کے تذکرہ میں اس کی صراحت بھی ہے کہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ دونوں نے یا ان میں سے ایک نے ان سے کس قدر روایتیں کی ہیں، رسالہ کو ترتیب، تحقیق اور تحشیہ کے جدید طریقوں کے مطابق مرتب کرنے کی ضرورت تھی، اس کے شروع یا آخر میں مباحث و مندرجات کی کوئی فہرست نہیں دی ہے، ابتدا میں علامہ ابن حزمؒ کا ترجمہ دیا ہے، مگر یہ بہت مختصر اور ناکافی ہے، ان کے زیر نظر رسالہ کا عام فہارس میں کوئی ذکر نہیں ملتا، اس لئے ایک مفصل مقدمہ میں رسالہ کے مطبوعہ و مخطوطہ نسخوں اور موجودہ متن کی بنیاد کے علاوہ دوسرے ضروری معلومات قلمبند کرنا ضروری تھا، یہ رسالہ اپنی نوعیت میں منفرد ہے، اور اس کی اشاعت ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے۔

مثنویات غالب مترجم جناب ظ۔ انصاری صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۸۴، مجلد مع مصور و خوبصورت گرد پوش، قیمت ساٹھ روپئے

پتہ: غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوان غالب مارگ، نئی دہلی ۲۔

جناب ظ۔ انصاری مشہور اہل قلم ہیں، دوسرے موضوعات سے قطع نظر غالب بھی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے، ان کی کتاب "غالب شناسی" کا شہرہ ہے، مرزا غالب کی اردو شاعری کی شہرت چاہے جس قدر بھی ہو مگر وہ اسے "بے رنگِ من ست" ہی کہتے تھے اور اس کے مقابلہ میں اپنی فارسی شاعری پر زیادہ فخر و ناز کرتے تھے، اس لئے جناب ظ۔ انصاری نے غالب سے غیر معمولی دلچسپی اور فارسی کلام کی اہمیت کی بنا پر اس کا اردو ترجمہ کیا ہے تاکہ فارسی سے ناواقف لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں، زیر نظر کتاب میں فارسی مثنویوں کا رواں اردو ترجمہ مع فارسی متن شائع کیا گیا ہے، غالب کے دیوان

ہے گی گیا ہے مثنویاں ہیں جن کے آخر میں مناجات، نعت، منقبت، مغنی نامہ اور ساقی نامہ بھی شامل ہے، مترجم نے ان سب کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے، جو ان کے خیال میں غالب کی شاعری کا مزاج اور نقطۂ عروج ہیں اور غالب کو خود بھی ان کی اہمیت کا احساس تھا اور مثنویوں کے بارہ میں مترجم کا بیان ہے کہ غزلوں کے منتشر اور بکھرے خیالات ان میں موجود ہیں اور ان سے ان کی مکمل اور سجل شخصیت کا پورا تعارف ہوگا اور غالب شناسی ایک قدم آگے بڑھے گی، صنف مثنوی اور غالب کی مثنویوں کی خصوصیات پر مترجم سنے جو مقدمہ لکھا ہے اسے طوالت کی بنا پر اس میں شامل نہیں کیا گیا ہے، وہ آئندہ کتابی صورت میں طبع ہوگا مگر فٹ نوٹ میں ہر مثنوی کی مختصر وضاحت اور ضروری باتیں تحریر ہونی چاہئے تھیں، صرف فہرست میں کتابت کی دو غلطیاں نظر آئیں، "نبووت بجائے نبوت" اور "منقت بجائے منقبت"، غالب انسٹی ٹیوٹ اس کی اشاعت پر قابل مبارکباد ہے،

نصیحتیں اور وصیتیں مرتبہ مولانا عبد المجید اصلاحی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۶، مجلد، قیمت دس روپے، ناشر: انجمن دار التعلیم و الصنعت، جاجمو، کانپور۔

کانپور کے معمر اور دیندار تاجر حاجی منت اللہ صاحب نے سلف صالحین کے دستور کے مطابق اپنی اولاد کو جو نصیحتیں اور وصیتیں کی ہیں، انھیں اس مجموعہ میں عام فائدے کے لئے شائع کیا گیا ہے، اس کے مرتب مولانا عبد المجید اصلاحی نے حاجی صاحب کے علاوہ اور لوگوں کی وصیتیں بھی اس میں جمع کر دی ہیں جس کی وجہ سے یہ مجموعہ زیادہ بہتر اور مفید ہوگیا ہے، اس سلسلہ میں سرفہرست قرآنی وصیتیں درج ہیں، ان میں بعض تو اللہ تعالیٰ کی بندوں کے نام ہیں اور بعض خود بندوں کی بندوں کے نام ہیں، لائق مرتب کو عربی زبان اور ادب کا اچھا ذوق ہے اس لئے انھوں نے اس مجموعہ میں ادب و محاضرات کی کتابوں سے جہاں رسول اکرمؐ صحابہ کرام، تابعین عظام، اموی اور عباسی دور کے ممتاز امراء، وحکماء کے وصایا و نصائح قلمبند کئے ہیں،

دنیا کے نامور بین الاقوامی شہرت کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور خطیبوں و علماء کی وصیتیں بھی قبر کی جیسی تقدیریں تحاً فرانس کے وین نم، برطانوی شاعر کپلنگ، مصر کے احمد امین اور عزیز اباظہ اور ہندوستان کے مولانا محی الدین فراہی اور ڈاکٹر اقبال کی وصیتیں اور نصیحتیں درج ہیں، اس مجموعہ میں جن لوگوں کی وصیتیں جمع کی گئی ہیں ان سب کے مختصر حالات بھی سلیقہ سے دیئے گئے ہیں، البتہ حاجی صاحب کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے ہیں اس کی وجہ سے بھی اس مجموعہ کی قدر و قیمت بڑھ گئی ہے، مگر خلفائے ثلاثہ، اکابر صحابہ اور امت کے متعدد صلحاء و اخیار کی وصیتیں اس میں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں،

بدایوں کے چند ادباء و شعراء مرتبہ جناب مبشر علی صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۶۸، قیمت مجلد بارہ و غیر مجلد دس روپے، پتہ: سلیم مبشر اردو سوسائٹی، گلی وحید بخش، محلہ سوتھہ بدایوں۔

جناب مبشر علی صدیقی کا نام ناظرین معارف کے لئے نامانوس نہیں ہے، وہ معمر و مشاق اہل قلم اور اردو زبان کے پرانے بے لوث خدمت گذار ہیں، ان کا وطن بدایوں علمی حیثیت سے ہمیشہ ممتاز رہا ہے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور ملا عبد القادر بدایونی اسی سرزمین کے لعل و گہر تھے، مبشر صاحب نے اس کتاب میں اپنے دور کے بدایونی شاعروں، ادیبوں اور نقادوں کے بارہ میں اپنے مفید تاثرات اور معلومات درج کئے ہیں، اور ان کی ادبی و علمی خدمات پر بحث و گفتگو کی ہے، ان لوگوں میں اب بجز دو کے سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، مگر مبشر صاحب کی ان سب سے براہِ راست واقفیت رہ چکی ہے، اس لئے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی حیثیت دیدہ کی ہے، اس میں ایک طرف آنی، فانی، قمر، شکیل، سرور اور دلاور فگار جیسے ممتاز لوگوں کا تذکرہ ہے تو دوسری طرف ان سے نسبتہً کم معروف اور بعض گمنام حضرات کا بھی ذکر ہے، مصنف نے اس میں بدایوں سے تعلق رکھنے والے بعض اشخاص کی تصنیفات اور وہاں سے شائع ہونے والے دو رسالوں کا بھی مختصراً ان میں تعارف کرایا ہے، گویہ مصنف کی پرانی کتاب ہے مگر اب مزید اضافہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ "ض"

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت تیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سلیم اللہ

مجلسِ ادارت

مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری

تاریخ ہندوستان کا سلسلہ اب تک بیس کتابوں تک پہنچ چکا ہے، اسی کے ضمن میں ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی مذہبی رواداری کا بھی ایک سلسلہ شروع کیا گیا ہے، جس کی اب تک تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں

جلد اوّل

اس میں مغل دور سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کے دلچسپ واقعات مستند ماخذوں کی مدد سے پیش کئے گئے ہیں، قیمت:۔ ۸ روپے،

جلد دوم

اس میں مغل فرمانروا بابر، ہمایوں، سوری خاندان کے شیر شاہ اور اسلام شاہ، پھر مغل شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، انسان دوستی کے سبق آموز واقعات لکھے گئے ہیں، قیمت:۔ ۱۰ روپے،

جلد سوم

اس میں اورنگزیب عالمگیر، اور اس کے بعد کے مغل بادشاہوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی اور انسان دوستی کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں، زیر طبع

......مرتبہ......

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

جلد ۱۳۳ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۸۴ء عدد ۶

مضامین

مقالات

شذرات

۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو ہندوستان کے نامور عالم مولانا مفتی عتیق الرحمن فالج کے موذی مرض میں ایک طویل مدت تک مبتلا رہ کر ۸۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رحلت گرائے عالم جاودانی ہوئے اُن کے اس مرض کی ابتدا کی دارالمصنفین سے بھی بڑی حد تک وابستہ ہے، اس لئے اس ادارہ کے خدام ان کی وفات حسرت آیات سے بہت سوگوار ہیں، فروری ۱۹۸۲ء میں یہاں اسلام اور مستشرقین پر جو سیمینار ہوا تھا اس میں وہ شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، تین روز یہاں بہت ہنسی خوشی سے گذارے، اس کے ایک اجلاس کی صدارت بھی کی، خوش خوش یہاں سے اندشر کا کے ساتھ روانہ ہوئے تو ریل ہی میں بارہ بنکی کے پاس اُن پر فالج کا سخت حملہ ہوا، ان کے ہم سفر مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور مولانا سجاد حسین نے ان کو کسی طرح لکھنؤ کے ہسپتال میں داخل کیا، ان کی طبیعت کچھ سنبھلی تو پھر دلی لے جائے گئے، اس وقت سے اپنی وفات تک تقریباً سوا دو سال تک بستر ہی پر رہے، خیال ہوتا ہو کہ وہ دارالمصنفین کا سفر کرتے تو اس موذی مرض میں مبتلا نہ ہوتے، مگر مشیت ایزدی یہی تھی، راقم ان کی عیادت کے لئے کئی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کا جسم تو بیکار ہو چکا تھا، مگر دماغ بیدار رہا، گفتگو میں وہی زندہ دلی اور شیرینی ہوتی جو اُن کی طبیعت کا مخصوص رنگ تھا، ہر قسم کے مسائل پر گفتگو کرتے، مگر زیادہ تر دارالعلوم دیوبند کے قضیۂ نامرضیہ پر اظہار خیال کرتے، ایسا معلوم ہوتا کہ وہاں کا المیہ پیش نہ آتا تو اس مرض میں مبتلا نہ ہوتے اور ہوتے بھی تو اتنے دنوں تک بستر علالت پر پڑے نہ رہتے، دارالعلوم دیوبند سے ان کا لگاؤ فطری تھا، کیونکہ ان کے جد امجد مولانا فضل الرحمنؒ اس کے بانیوں میں سے تھے، ان کی زندگی ان کے گوناگوں مشاغل سے معمور رہی، دارالعلوم دیوبند کے ان علما میں شمار کئے جاتے جن پر بجا طور سے اس کو فخر ہو سکتا ہے، دیوبند اور ڈابھیل کے مدرسوں میں کچھ دنوں درس د

افتاء کی خدمت انجام دی، پھر کلکتہ کی کولوٹولا اسٹریٹ کی بڑی مسجد کے خطیب رہے، جہاں انھوں نے قرآن سے بھی لوگوں کو مستفیض کیا، وہاں سے دہلی آکر ندوۃ المصنفین قائم کیا اور اسی کو حرز جاں بنا کر اپنی پوری زندگی گزار دی، سیاست میں بھی برابر حصہ لیتے رہے، بڑے خوش بیان مقرر تھے، ہندوستان کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے انڈین نیشنل کانگریس کے جانباز سپاہی بنے تو اپنی وضعداری میں آخر وقت تک اس کے ساتھ رہے، مگر وہ ان کانگریسی مسلمان رہنماؤں میں نہ تھے جو ہندوؤں اور حکومت میں تو بہت محبوب سمجھے جاتے ہیں لیکن اپنے ہم مذہبوں میں معتوب ہوتے ہیں، اُن کا سیاسی ذہن بہت صاف تھا، اس لئے غیر کانگریسی رہناؤں سے بھی ان کا میل ملاپ رہا، ان سے اپنے تعلقات کے آبگینے میں کسی قسم کی ٹھیس لگنے کو پسند نہ کرتے، اونچے خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لئے خاندانی وراثت میں جو اوصاف پائے تھے، ان کو اپنی سیاسی زندگی میں بھی برقرار رکھا، اپنے معاصرین سے بہت ہی محبانہ طور پر ملتے، خواہ ان کا سیاسی مسلک کچھ بھی ہوتا، اپنے چھوٹوں سے مربیانہ انداز کی گفتگو کر کے ان کے دلوں کو موہ لیتے، اپنے ناقدوں بلکہ مخالفوں سے بھی شریفانہ برتاؤ رکھتے، ان کی ان خوبیوں کی وجہ سے مجلس مشاورت کے ارباب حل و عقد نے ان کو اس کا صدر بنایا، تو آخر وقت تک وہ اس منصب پر قائم رہے، مگر ۱۹۴۷ء کے بعد مسلمان کچھ ایسے غیر متحرک ہو گئے ہیں کہ ان کا جمود ختم ہوتا نظر نہیں آتا، اس لئے مجلس مشاورت میں بھی وہ حرکت پیدا نہ ہو سکی جس کی توقع کی جا سکتی تھی، اس کا افسوس عام مسلمانوں کے ساتھ خود مولانائے مرحوم کو بھی رہا،

ان پر جہاں عام مسلمانوں کو اپنے ملی معاملات میں اعتماد رہا، وہاں حکومت ہند کو بھی ان کے وطنی جذبہ پر پورا بھروسہ رہا، ملک کے دینی مدرسوں، علمی انجمنوں اور علمی تحریکوں میں ان کی رکنیت اور شمولیت باعث فخر سمجھی جاتی، اسی طرح حکومت کی بعض اہم کمیٹیوں کے بھی رکن رہے اور کبھی بیرونی وفود میں حکومت کی نمایندگی بھی کی، دینی، علمی اور سیاسی مجلسوں میں اپنی خطیبانہ شان سے اثر انداز ہوتے، اور ان کے مخلصانہ مشوروں کی قدر کی جاتی،

ان کا زندہ جاوید کارنامہ ندوۃ المصنفین ہے جس کی اساس انھوں نے ملک کے مشکل حالات اور اردو زبان کے صبر آزما ماحول میں ۱۹۳۸ء میں رکھی، اس وقت سے اب تک اس کی طرف سے تقریباً دو سو کتابیں مذہب، تفسیر، حدیث، تاریخ، سیاست،

اور دوسرے علوم و فنون پر دیدہ زیب کتابت، طباعت بڑی اچھی جلد اور گرد پوش سے شائع ہو چکی ہیں، ان سے اردو لٹریچر میں بڑا وزن اور وقار پیدا ہو گیا ہے، نشر و اشاعت کا ادارہ قائم کرنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھ کر مقبول عوام و خواص بنانا صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر لانا ہے مگر مولانا مرحوم نے اس جوئے شیر کو رواں رکھنے میں اپنی پوری زندگی گزار دی، اردو کے علم و فن کی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا،

وہ خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہیں ہیں، انھوں نے شروع میں علامہ ابن تیمیہ کی الکلم الطیب کی تشریح و نوٹ لکھے اور علامہ ابن جوزی کی صید الخاطر کا ترجمہ بھی اردو میں کیا، قرآن مجید کی مختصر تفسیر دو جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے لیکن لکھ نہ سکے، ان کی ریڈیائی تقریروں کا ایک مجموعہ منارۂ صفا کے نام سے شائع ہوا ہے، وہ جیسی میٹھی گفتگو کرتے ویسی ہی میٹھی تحریر بھی لکھتے، اپنے سیاسی مشاغل اور ندوۃ المصنفین کے اہتمام کے خرخشوں کی وجہ سے خود تو بہت سی کتابوں کے مصنف نہ بن سکے لیکن مصنف گر ضرور ہوئے، ان کے ادارہ کی وجہ سے بہتیرے اہل قلم مصنف بن گئے اور ان کی دبی صلاحیتیں ابھریں ورنہ دبی رہ جاتیں تو علوم و فنون کا کتنا بڑا نقصان ہوتا،

ندوۃ المصنفین کا ترجمان مجلہ برہان ہے جو جولائی ۱۹۳۸ء سے اب تک ہر مہینہ بڑی پابندی سے نکل رہا ہے، اس کی قلمی کاوشوں، ادبی زمزمہ سنجیوں، مذہبی موشگافیوں، علمی نکتہ آفرینیوں اور اس کے مختلف مضامین کی مشاطہ گری کی کاوشوں کا زریں سہرا تو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے سر رہا ہے لیکن اس کی کتابت، طباعت ٹھیک وقت پر اشاعت اور اس کے مالی ذرائع کی کمی کو پورا کرنے کی محنت و ریاضت کا جو نمونہ مولانا مرحوم کے ذریعہ سے عمل میں آیا وہ علمی اور تعمیری سرگرمیوں کی ایک قابل تقلید مثال ہے،

وہ اب وہاں ہیں جہاں ایک روز سب کو جانا ہے مگر جن لوگوں کو ان کے ساتھ کام کرنے، یا ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا ہو، وہ ان کی ملنساری، مرنجاں مرنج انداز طبع، اختلاف کے موقع پر شریفانہ برتاؤ، مسلمانوں کی سیاسی مصیبتوں کے وقت ان کے اندرونی مضطربانہ جذبات اور ان کے سیاسی مستقبل کو سنوارنے کی خاطر ان کے فکری رجحانات کو یاد کر کے دل سے دعائیں کریں گے، کہ ان کی زندگی کے روشن کارنامے ان کے لئے توشۂ آخرت بنیں، اور وہ بارگاہ ایزدی میں کہہ رہے ہوں رب اغفر وارحم وانت خیر الراحمین،

مقالات

مطالعۂ سیرت اور مستشرقین

از
جناب ڈاکٹر نثار احمد، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اسلامی تاریخ، کراچی یونیورسٹی

تمہید | ہمارے یہاں کے علمی اور دینی حلقوں میں مستشرقین کا نام اور ان کا کام اب خاصا مشہور و متعارف ہوچکا ہے، اور فی زمانہ ایسے بالغ نظر علماء کی کمی نہیں ہے، جو مستشرقین کی علمی مساعی ان کے تحقیقی کارناموں اور ان کے مالۂ و ماعلیہ سے واقف نہ ہوں، تاہم اسلامی علوم کے حوالہ سے بالعموم اور مطالعۂ سیرت کے حوالہ سے بالخصوص مستشرقین کے کام کی نوعیت، ان کے رویہ اور سلوک اور ان کی کیفیت و کمیت سے عام طور پر بے خبری پائی جاتی ہے اور وقت کی ضرورت ہے کہ اردو داں طبقہ کے سامنے خاص طور پر پورے مسئلہ کا ایک مفصل علمی جائزہ پیش کر دیا جائے۔

تعارف | واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین کے بارہ میں صورت حال اب پہلے سے بہت مختلف ہوچکی ہے، ایک زمانہ تھا کہ اسلام، پیغمبر اسلام اور اہل اسلام کے لئے مستشرقین کا تعصب و تظلم اپنی انتہا پر تھا، اور ان کی تحریروں میں بے باکی و گستاخی، فحاشی کی حد تک پائی جاتی تھی، جس سے بعضوں کو خود شرم آئی، لیکن پھر رفتہ رفتہ بحیثیت مجموعی، مختلف عوامل کے نتیجہ میں شدت کم ہوتی چلی گئی، مختلف مکاتب فکر وجود میں آئے اور انکشافِ حقیقت کے ساتھ ساتھ خود مستشرقین کے گروہ میں کچھ معتدل قسم کے مصنفین بھی شامل ہوگئے، یہاں تک کہ عہد جدید میں استشراق اور مستشرقین، مسلم اور غیر مسلم دونوں کی تنقید کا نشانہ بنے ہوئے ہیں کہ انھوں نے اسلام اور دنیائے اسلام کو بہت غلط طور پر پیش کیا ہے

تو شدت یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ جو کچھ نظریات پہلے قائم کئے گئے تھے، ان کو بالکل بدلنا ممکن نہ ہو تو ان پر نظر ثانی بہر حال کی جانی چاہئے، شاید یہی وجہ ہے کہ اب بعض مستشرقین نے اپنے نظریات واقعۃً تبدیل کر لیے ہیں، اور بعض حلقہ بگوش اسلام بھی ہو گئے ہیں۔

آغاز کار | دنیا کی مختلف زبانوں میں بالعموم اور انگریزی و عربی میں بالخصوص مستشرقین کے بارہ میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مستشرقین کے علم و تحقیق کی نوعیت و حقیقت اپنے اور پرائے سب پر کھلتی جا رہی ہے، بلکہ پچھلے دو ایک عشروں میں تو انگریزی زبان میں بعض کتابوں کی اشاعت نے خود مغربی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا ہے، اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی حالات دنیا کے ہر حصہ میں بہت کچھ بدل رہے ہیں، علم و تحقیق کی بہت سی نئی راہیں دریافت ہو چکی ہیں اور بوڑھوں کے مقابلہ میں نوجوان نسل فکر و نظر کی نئی تبدیلیوں کی نقیب بنتی جا رہی ہے، انگریزی کے علاوہ عربی زبان میں بھی مستشرقین کے حوالے سے بعض اہم کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں، مثلاً (۱) العقیقی، نجیب، المستشرقون، دار المعارف، مصر سنہ ۱۹۶۵ء (ج ۱ تا ۳) (۲) احمد ابراہیم خلیل، المستشرقون والمبشرون فی العالم الاسلامی، قاہرہ سنہ ۱۹۶۳ء (۳) زکریا، ہاشم زکریا، المستشرقون والاسلام، لجنۃ التعریف بالاسلام، مصر سنہ ۱۹۶۵ء (۴) المراغی، حسین، المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ للشئون الاسلامیہ سنہ ۱۹۶۵ء (۵) البہی، محمد، المستشرقون فی موقفہم من الاسلام، الازہر، طبع جدید (۶) الدسوقی، محمد، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ سنہ ۱۹۷۲ء (۷) شلبی، عبد الجلیل، الاسلام والمستشرقون، قاہرہ سنہ ۱۹۶۸ء (۸) صبرہ، دکتور عفاف، المستشرقون ومشکلات الحضارۃ، دار النہضۃ العربیہ، قاہرہ سنہ ۱۹۸۰ء، ان میں سے اول الذکر کتاب اہم ترین اور مفصل ترین ہے، جو سر نامہ کے عین مطابق اس موضوع پر واقعی ایک انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے، پوری کتاب تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے (تقریباً ۱۲۰۰ صفحات) العقیقی نے بڑی جامعیت کے ساتھ دنیائے مغرب کے تمام اہم علاقوں (فرانس، اٹلی، برطانیہ، اندلس، پرتگال

ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سوئٹزرلینڈ، سوئیڈن، روس، امریکہ وغیرہ کے تمام قابل ذکر مستشرقین (اگرچہ بعض کا ذکر چھوٹ گیا ہے مثلاً فان کریمر وغیرہ) کے احوال و آثار کو جمع کر دیا ہے۔

جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو تاریخی اعتبار سے جس طرح سیرت نگاری کے حقیقی دور کا آغاز سرسید احمد خاں م ۱۸۹۸ء اور ان کے رفقاء سے ہوا، اسی طرح مستشرقین کے حوالہ سے بھی مطالعۂ سیرت کا علمی محاذ بھی سب سے پہلے دراصل سرسید احمد خاں نے ہی کھولا، اور اس حقیقت کے باوجود کہ سرسید کے دینی افکار میں تجدد کا رنگ غالب تھا اور راسخ العقیدہ علماء کو ان سے حد درجہ اختلاف تھا اور ہے، سرسید نے جذبۂ ایمانی اور خالص جرأتِ رندانہ سے کام لے کر اپنے ہمعصر مستشرق سر ولیم میور کی دلآزار تصنیف دی لائف آف محمدؐ (حیات محمدؐ) کی اشاعت پر خاموشی کو گناہ کے برابر خیال کیا، اور ذرائع کی کمی کے باوجود، اہانت رسول کا خاموش بدلہ لینے کے لئے اپنا تن من دھن سب لگا دیا اور خالص علمی سطح پر میور کی کتاب پر تنقید و محاکمہ کر کے، مناظرانہ رنگ سے پاک، تاریخی حقائق و اسناد پر مبنی، ایک جوابی کتاب "الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرۃ المحمدیہ" لکھی اور یوں انیسویں صدی کے اواخر سے گویا مستشرقین کے مقابلہ میں ایک جوابی علمی تحریک کا آغاز ہوگیا، یہ بڑا اہم دور تھا، یہی وہ زمانہ تھا جب مستشرقینِ یورپ فی الواقع سیرتِ رسولؐ کے اصل عربی مآخذ سے علمی طور پر واقف ہوئے، اور پھر ان ہی کی منظم کوششوں سے بہت سے مآخذ زیور طبع سے آراستہ ہو کر مسلمانوں تک پہونچے، اسی دور میں مستشرقین نے اسلام اور پیغمبر اسلام پر اپنے شدید حملے جاری رکھے اور تلاش کر کر کے مجروح اور ناقابل اعتماد روایتوں کو بطور سلاح استعمال کیا، تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے سیرتِ رسولؐ کا اعتبار اٹھ جائے اور پھر اس کے نتیجہ میں آپ کا لایا ہوا دین بھی بے اعتبار و بے وقعت ٹھہرے۔

ابتدائی جائزہ | سرسید کی مخلصانہ کوششوں سے تحریک استشراق کے بالمقابل جس علمی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسے بعد میں مزید توسیع و ترقی حاصل ہوئی، اس سلسلہ میں اگرچہ مختلف بزرگوں نے قلم اٹھایا،

اور سیرت پر متعدد کتابیں لکھی گئیں، لیکن جو شہرت اور بقائے دوام علامہ شبلی کو حاصل ہوئی، وہ کسی کے حصہ میں نہیں آئی، علامہ شبلی کو یہ تقدم بھی حاصل ہے کہ انھوں نے محض چند مستشرقین کی انفرادی کوششوں کو ہی نشانہ تنقید نہیں بنایا بلکہ انھوں نے پورے گروہ مستشرقین کو اپنے سامنے رکھا جو اسلام اور علوم اسلامی پر بالعموم اور سیرت رسول پر بالخصوص طبع آزمائی کر رہا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ تحریک استشراق کے جواب میں علمی و تحقیقی کام کا ایسا نقشہ مرتب کیا کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی اور وہ اس کو عملی جامہ پہنا سکتے تو سیرۃ النبیؐ مستشرقین کے اعتراضات و مطاعن کا بھی یادگار جواب بن جاتی، بہر حال مطبوعہ سیرۃ النبیؐ کے آغاز میں ہی اور باتوں کے علاوہ علامہ شبلی نے "یورپین تصنیفات" کے عنوان سے مستشرقین کی تصنیفات ان کے اسباب و محرکات، ان کے اصول مشترکہ اور ان کی مساعی کا عہد بہ عہد جائزہ لیا اور پھر مشہور مستشرقین کی ایک مختصر فہرست بھی شامل کتاب کر دی، یہ تمام کام اپنے ابتدائی درجہ میں تنقیح طلب ہونے کے باوجود نہایت وقیع ہیں۔

علاوہ ازیں، علامہ شبلیؒ چونکہ اپنی کتاب سیرۃ النبیؐ کو در اصل ایک دائرۃ المعارف بنانا چاہتے تھے، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ مستشرقین کے مطالعہ سیرت کو معیار تنقید پر نہ پرکھتے اور نہ زیر بحث لاتے، بلکہ مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات کا پردہ چاک کرنا اور سیرت کے حوالہ سے ان کی غلط بیانیوں پر تنقید و تعقب تو گویا انتہائے مقصود تھا، اور ان کی زندگی کی آخری خواہش تھی غالباً اسی لئے انھوں نے سیرۃ النبیؐ کے مجوزہ خاکہ میں پانچواں حصہ خاص یورپین تصنیفات کے متعلق شامل کیا تھا، جو اگرچہ پورا نہ ہو سکا، تاہم آنے والوں کے لئے روشنی چھوڑ گیا اور یہ ثابت کر گیا کہ خود مولانا شبلیؒ مسئلہ مستشرقین کی گہرائی اور گیرائی کا بہ حد غایت ادراک رکھتے تھے۔

افسوس کہ علامہ شبلیؒ کے بعد مستشرقین کے حوالہ سے سیرت رسولؐ کے مطالعہ و تحقیق کا کوئی بڑا اور منظم کام سامنے نہیں آیا اور نہ ہمارے ہاں کے سیرت نگاروں نے اس مسئلہ سے تعرض کو قرار واقعی

اہمیت دی، البتہ یہ ضرور ہے کہ اکا دکا، انفرادی و اجتماعی کوششیں کی جاتی رہی ہیں اور اب بھی مقالات ومضامین اور کتابچوں میں اس جانب کچھ نہ کچھ پیش رفت بہر حال ہو رہی ہے مثلاً ایک مسلمان مصنف محمد حسین ہیکل کی کتاب "حیات محمد" کا تذکرہ بے محل نہیں معلوم ہوتا، جو اگرچہ عربی زبان میں ہے لیکن اردو ترجمہ کے بعد گویا وہ اردو ادب کا ہی سرمایہ بن گئی ہے، ہیکل نے اپنے بیان کے مطابق نہ صرف یہ کہ "جامدین من المسلمین" کے جمود آمیز خیالات کا رد کیا، بلکہ مستشرقین کی ہرزہ سرائیوں کا مثبت انداز سے جواب دینے کے لئے بھی کتاب لکھی، ہیکل نے متن کتاب کے علاوہ اپنے طویل مقدمہ میں اور پھر بعد میں "المستشرقون والحضارة الاسلامیة" کے تحت مستشرقین کی معاندانہ سرگرمیوں اور ان کے علم و تحقیق کا سنجیدہ علمی تجزیہ کیا ہے اور مختلف عنوانات (مثلاً اسلام اور مسیحیت کی کشمکش، مسیحی مصنفین کی نظر میں آنحضرتؐ کا مقام، مسلمان مصنفین اور مغربی افترا پرداز مستشرقین وغیرہ) کے تحت اصل حقائق کو نمایاں کیا ہے اور جرأت و قوت کے ساتھ مسیحی سوانح نگاروں کے اعتراضات کا جواب دینے کی سعی کی گئی۔

<u>نوعیت مسئلہ</u>: یہ جائزہ اگرچہ مختصر ہے لیکن یہ واضح کرنے کے لئے کافی ہے کہ مستشرقین کی برپا کی ہوئی تحریک استشراق کا قرار واقعی جواب اردو زبان و ادب میں اب تک نہیں دیا گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے جس جوابی علمی تحریک کا آغاز کیا تھا اور جسے مولانا شبلی نے منظم و موثر بنانے کی کوشش کی تھی، اس کا رنگ آہستہ آہستہ پھیکا اور اس کا آہنگ روز بروز مدھم ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ اب سرگرمی نہ ہونے کے برابر ہے، اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ادھر مغربی اور یورپی مستشرقین کی سرگرمیاں تو لب و لہجہ کے فرق کے ساتھ تاحال جاری و ساری ہیں اور ان کے عزائم و مقاصد میں بھی سر مو فرق نہیں آیا ہے، لیکن ادھر ہماری طرف سے انتظام و اہتمام صفر ہے، مولانا شبلی وغیرہ نے مستشرقین کی علمی تحقیقات اور ان کے معیار کی جو نشان دہی کی تھی اور ان کی تصانیف کو جس طرح کذب و افترا کا دفتر قرار دیا تھا، اس کا تقاضا تھا کہ مستشرقین کی کتابوں کو کھنگالا جاتا اور تمام علوم

اسلامیہ میں بالعموم اور سیرت رسول ﷺ کے باب میں بالخصوص، واقفیت تامہ حاصل کرکے، ان کی غلطیاں، بد دیانتی اور تلبیس وتحقیق کا پردہ چاک کیا جاتا، اور اس سلسلہ میں بڑے پیمانہ پر ایک منظم کام کا نقشہ بنایا جاتا، مگر ایسا نہیں ہوسکا، بلکہ المیہ یہ ہوا کہ اس مسئلہ کی اہمیت وشدت کو محسوس ہی نہیں کیا گیا، نہ ایسے ادارے وجود میں آئے جو اعلی سطح پر علم وتحقیق کی سرپرستی کرسکیں اور ان کوششوں کو متحد و منظم کرسکیں جو انفرادی و اجتماعی اور نجی و سرکاری، مختلف پیمانوں پر کی جاتی ہیں، ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں اس معیار کی علمی وفنی تیاری نہیں پائی جاتی جو مستشرقین کا طرۂ امتیاز ہے، مستشرقین کے حملوں کا دفاع محض عبارت آرائی یا جوابی الزام تراشی سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے لئے اسی تیاری کی ضرورت ہے، جس قسم کی تیاری خود مستشرقین نے کی تھی (مثلاً علم وتحقیق کے اداروں کا قیام، مختلف زبانوں کی تحصیل، تجسس و تفحص کے آداب، فنی مہارت اور جدید تکنیک سے واقفیت، ادب وثقافت کا گہرا مطالعہ، ضروری علوم وفنون سے دلچسپی، مشنری جذبہ، متعین مقاصد اور انتھک محنت وریاضت وغیرہ)

مستزاد یہ کہ مستشرقین کی تحریک کو ایک گونہ تقویت خود ان مسلمان محققین وعلماء کے رویہ سے مل رہی ہے جو دنیائے مغرب کے مختلف اداروں میں حصول تعلیم وتحقیق کے لئے جاتے ہیں تو وہاں کے احوال ومناظر سے اس درجہ متاثر ومرعوب ہوجاتے ہیں کہ انہی کے ہم آواز ہوجاتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ جوابی علمی تحریک کو نئے سرے سے منظم کیا جائے اور مرحلۂ اول میں مسئلۂ مستشرقین کی نوعیت وحقیقت کو سمجھ لیا جائے اور یہ جائزہ لے لیا جائے کہ استشراق ومستشرقین کی تحریک، اس کے مقاصد، اسباب ومحرکات عہد بہ عہد ارتقاء اور اعلام ومشاہیر کی عام صورت کیا ہے، زیر نظر مقالہ کا مدعا یہی ہے،

استشراق مستشرق | استشراق اور صاحبانِ استشراق (مستشرقین) کی پوری تاریخ پر ایک عمومی نظر

ڈالی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک استشراق، اپنی حقیقت و ماہیت میں چونکہ اسلام کے خلاف ہے اور ہر دور کے (غیر مسلم) مستشرقین کی تمام سرگرمیاں اپنے علمی تنوع کے باوجود، چونکہ اسلام، پیغمبر اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم و فنون کے حوالہ سے بہر حال معاندانہ رہی ہیں اور چونکہ مستشرقین کی پوری جماعت میں شامل افراد اپنی اصل و نسل میں یہودی ہیں یا عیسائی، اس لئے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اسلام اور یہودیت و عیسائیت کے مابین آویزش کے ساتھ ہی استشراقی جذبہ و فکر کی نمو ہوگئی تھی، تاہم اپنے مخصوص فنی و اصطلاحی معنوں میں اور اطلاقات کے لحاظ سے دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ تحریک استشراق کا باقاعدہ آغاز اور مستشرقین کی علمی و تحقیقی سرگرمیاں بہت بعد میں شروع ہوئیں، شاید یہی وجہ ہے کہ :-

(۱) استشراق اور مستشرق کی اصطلاحیں لغوی اعتبار سے بہت زیادہ قدیم العہد نہیں ہیں، بلکہ انگریزی زبان و ادب میں ان کا استعمال اپنے مخصوص اصطلاحی معنوں میں اٹھارہویں صدی کے اواخر میں شروع ہوا، چنانچہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری کی تصریحات کے مطابق مذکورۂ بالا دونوں الفاظ اورینٹ سے مشتق ہیں جس کے معنی ہیں شرق یا مشرقی سمت، جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے، پھر اسی سے اورنٹیل ہے یعنی مشرقی، جو تمام معنوں میں مغربی (OCCIDENTAL) کا ضد ہے، مشرقی کے مفہوم میں وہ متوطن بھی ہے جو مشرق یعنی ایشیا یا ان ممالک کا باشندہ ہو جو بحر روم متوسط اور قدیم رومی سلطنت کے مشرق میں واقع ہیں، جبکہ اورینٹلزم یعنی مشرقیت یا استشراق کے معنی ہوں گے، مشرقیت، مشرقی خصوصیات، مشرقی طرز و ادا، اقدار، علوم و آداب اور فنون و ثقافت وغیرہ سے واقفیت اور مہارت وغیرہ، نیز اس کے تحت اورینٹل اسکالرشپ کا مطلب ہوگا، مشرقی زبانوں سے واقفیت اور پھر اس سے بنا ہے اورینٹلسٹ (مستشرق) اس سے مراد وہ شخص ہوگا جو مشرقی زبانوں، علوم و فنون اور تہذیب و تمدن وغیرہ پر عبور رکھتا ہو یا بقول مولوی عبدالحق ماہر مشرقیات ہو،

(ب) موید الفاظ اور اردو کی قدیم لغات میں استشراق کا اصل مادہ یعنی ش، ر، ق تو موجود ہے، لیکن زیر بحث الفاظ یعنی باب استفعال میں اس کے معنی و مفہوم یا بطور فعل ان لغات سے بحث نہیں پائی جاتی (البتہ جدید لغات میں ان کا ذکر موجود ہے) عربی قواعد کی رو سے استشراق، ثلاثی مزید کا باب استفعال ہے، جس کا مادہ ش، ر، ق (شرق) ہے اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس باب کے جملہ خصائص ولوازم یعنی اتخاذ وطلب، وجدان وحسبان اور تحول وتکلف وغیرہ کی جلوہ نمائی، صاحبانِ استشراق کے احوال وشخصیات سے اور ان کی تحقیقات وتخلیقات میں بہت نمایاں نظر آتی ہے، گویا الفاظ کا پیکر، بجائے خود اس بات کا مظہر ہے کہ مستشرقین کا تمام تر علم اکتسابی ہے، جسے انھوں نے شبانہ محنت وریاضت سے طلب وجستجو کرکے حاصل کیا، اس کی خاطر سفر وحضر، تمکن وتوطن اختیار کیا اور پھر اپنی تحقیقات کو دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ ان میں تخمین وظن اور تخیل سے زیادہ کام لیا گیا ہے،" مختصر یہ کہ عربی میں استشراق کے لغوی معنی ہوں گے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کا مطلب ہوگا وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا ہو۔ اردو لغت وادب میں بھی کم وبیش یہی مفہوم ہے یعنی مستشرق کا مطلب ہوگا "وہ فرنگی جو مشرقی زبانوں اور علوم کا ماہر ہو یا وہ فرنگی یا امریکی جو مشرقی زبان یا علوم کا ماہر ہو،

زبان ولغت کی مندرجہ بالا بحث سے استشراق اور مستشرق کا مفہوم اگرچہ کسی قدر واضح ہوجاتا ہے اور مستشرق کی نوعیت وماہیت بھی بڑی حد تک سمجھی جاسکتی ہے تاہم استشراق کی اصل حقیقت اس وقت سامنے آتی جبکہ استشراق، السنۂ مشرقیہ کی واقفیت اور اسلامی علوم وآداب کے یک رخی مطالعہ تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ آگے بڑھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض وعناد، اس کا جزو لازم ٹھہرا، پھر یہی بغض وعناد، پہلے پہل تو مشنری جذباتیت کا آئینہ دار رہا، لیکن کچھ عرصہ بعد اس نے متعین مقاصد کے تحت، علمیت کا لبادہ اوڑھ لیا، گویا اس دوسرے مرحلہ میں استشراق نے ایک تحریک بلکہ

مستقل رویہ اور سلوک کی شکل اختیار کر لی اور اسی رویہ و سلوک کے احاطہ میں رہتے ہوئے تمام مزدری مباحث کو موضوع سخن بنایا گیا، مثلاً اسلام اور اس کی تعلیمات کو مجبوراً یا تکلفاً غلط طور پر پیش کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ زمانہ کے عہد بہ عہد ارتقاء کے ساتھ وہ تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتیں، قدیم تہذیبوں، قدیم زبانوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لئے مصر، عراق، شمالی افریقہ اور دوسرے علاقوں میں سرگرمیوں کو منظم کیا گیا تاکہ یہ تہذیبیں، اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے چیلنج بن سکیں، عربی زبان کے لئے کہا گیا کہ قرآنی عربی، عہد جدید کی ضروریات و حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکتی، اس لئے مقامی زبانیں اور مردہ لغات کو آگے بڑھانا چاہئے بلکہ عربی رسم الخط کو رومی رسم الخط سے تبدیل کر دینا چاہئے، پیغمبر اسلامؐ کی سیرت و کردار کے بارہ میں ان نکات کو اچھالا گیا، جن سے عام ذہن کے لوگ بھی اچھا اثر نہ لے سکیں اور ان کے لائے ہوئے مشن کو ناقابل التفات گردانا جائے، اسلامی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و ترکیب میں بیرونی عناصر کی کارفرمائی ثابت کی جائے تاکہ اسلامی ثقافت مجموعۂ خرافات ٹھہرے وغیرہ وغیرہ، ان تمام مطالعات کا ہدف بہرحال مستشرقین کے نزدیک اپنے عزائم کی تکمیل کے سوا کچھ نہ تھا، ہاں یہ ضرور ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ حکمتِ عملی تبدیل ہوتی رہی اور وقت گزرنے کے ساتھ مستشرقین جذباتیت کے تنگ دائرہ سے نکل کر عقلیت، علمیت اور استدلال کے اوزان و پیمانے استعمال کرنے لگے، اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے متعلق اپنے رویہ پر خود انھوں نے نظر ثانی کی اور بدنیتی کے باوجود مخالفت و صحت کا اظہار رفتہ رفتہ سلیقہ سے کیا جانے لگا اور اسلام کے مقابلہ میں تعصب و تنگ نظری کا پھیلاؤ بھی نسبتاً کم ہوتا گیا۔

مختصر یہ کہ مستشرقین کا رویہ ہر زمانہ میں یکساں نہیں رہا اسی لئے ان کے ہاں علم، تجربہ، انداز استدلال مذہبی حیثیت اور وابستگی کے مختلف نمونے نظر آتے ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے فکر و فن اور تحقیق و تالیف کا معیار بھی جدا جدا ہے۔

لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لئے اس اجمال کی کچھ تفصیل، آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبہ و فکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ و تحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ و سلوک کیا رہا۔

<u>تحریک استشراق کا آغاز</u> تحریک استشراق کو اگر خلاف اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہور اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہل مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبر اسلام کے خلاف بالخصوص، بغض و عداوت کا اظہار موقع بہ موقع، تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور دو قومی جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر و تصنیف اور وقائع و اشعار کے قالب میں منطبق رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایۂ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہور اسلام کے بعد کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانیٔ اسلام کے حوالے سے ان کی مخالفت و مخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے۔ اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب، ان کے دلی جذبات کے علاوہ، یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لئے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انھیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں۔ اس پر مستزاد تصادم و کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دہرائے گئے، خاص طور پر آنے والے زمانہ میں صلیبی محاربات کا سلسلۂ دشمنی و عداوت کا ایسا نشان پر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا۔ صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی و فکری

محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے، اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لئے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آبادکار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم و معلومات رکھتے تھے وہ کتنی ہی ناکارہ و خام سہی، ان کے لئے بہر حال مفید مطلب تھیں جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جا سکتی تھی، اور سیرت ختم الرسل کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی، پیغمبر اسلام کے بارہ میں مغرب کے پاس معلومات انتہائی مبہم اور ناقص تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا، اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرتؐ کے واقعات سیرت کو بگاڑ کر خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد و اختراع اور کذب و افترا سے عبارت تھا۔ اس عہد میں آنحضرتؐ کے لئے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے، مثلاً (نقل کفر، کفر نہ باشد) آپؐ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو، اور بہروپیا کہا گیا اور بد عقلوں اس حد تک گر گئے کہ آپؐ کے لئے لفظ محمدؐ استعمال کرنے کے بجائے ((MAHOUND)) سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں "شہزادۂ ظلمات" پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتش عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضورؐ کے لئے BAFUM اور BAPHONET, MAPHONET کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور آپؐ کی سیرت و سوانح کے بارہ میں مہمل کہانیاں، دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے اور ان کا مرکز پرستش محمدؐ کا بت تھا، پھر ایک سے زائد تین بتوں کی پرستش کا فسانہ تراشا گیا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ آنحضرتؐ تو دراصل خود پیرو دین عیسوی تھے، لیکن پوپ منتخب نہ ہو سکے تو انتقاماً رومی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام

لیکن یہ اجمالی گفتگو کسی ذہنی اشکال کا سبب ہو، اس لئے اس اجمال کی کچھ تفصیل آئندہ صفحات میں عرض کی جائے گی، تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ استشراق جذبہ و فکر سے آگے بڑھ کر تحریک کیسے بنا اور مطالعہ و تحقیق کے مختلف دائروں میں مستشرقین کا رویہ و سلوک کیا رہا۔

تحریک استشراق کا آغاز تحریک استشراق کو اگر خلافِ اسلام سرگرمیوں کی علامت مانا جائے تو یہ امر واقعہ ہے کہ اس قسم کی سرگرمیوں کا آغاز دراصل ظہورِ اسلام کے ساتھ ہی ہو گیا تھا اور باقاعدہ ایک تحریک کی شکل اختیار کرنے سے پہلے بھی، اہلِ مغرب کی طرف سے اسلام کے خلاف بالعموم اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف بالخصوص، بغض و عداوت کا اظہار موقع بہ موقع، تاریخ کے مختلف ادوار میں ہوتا رہا، اور وفورِ جذبات سے سرشار رومی، بازنطینی، لاطینی، مسیحی اور یہودی روایتیں صدیوں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہیں، افواہوں کے دوش پر سفر کرتی رہیں اور کبھی کبھار تحریر و تصنیف اور وقائع و اشعار کے قالب میں بھی ڈھلتی رہیں اور ان کی اپنی آئندہ نسلوں کا سرمایۂ افتخار قرار پائیں، چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد سے کوئی چار ساڑھے چار سو سال تک اسلام اور بانیٔ اسلام کے حوالے سے ان کی مخالفت و مخاصمت کا عام انداز یہی رہا، اور اس تمام عرصہ میں بلکہ اس کے بعد بھی مغربی دنیا اس قابل نہ ہو سکی کہ حقائق و واقعات کا صحیح ادراک کر سکے اور مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کو علم کی روشنی میں جان سکے، اس صورت حال کا ایک بظاہر سبب، ان کے دلی جذبات کے علاوہ، یہ تھا کہ صحیح معلومات کے لئے اصل اسلامی مآخذ تک رسائی ممکن نہ تھی، پھر تعصب، سنی سنائی باتوں، غلط فہمیوں اور خود ساختہ مفروضات نے انھیں اس قابل ہی نہ رکھا کہ وہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقیقی تصویر دیکھ سکیں، اس پر مستزاد تصادم و کشمکش کے وہ واقعات تھے جو تاریخ میں بار بار دہرائے گئے، خاص طور پر آنے والے زمانہ میں صلیبی محاربات کا سلسلۂ دشمنی و عداوت کا ایسا نشان بن کر طاری ہوا جو آج تک نہیں اترا، صلیبی جنگوں کے طویل محاربات میں دنیائے مغرب کی ناکامی سے نہ صرف یہ کہ یورپ کی مشترکہ عسکری قوت پاش پاش ہو گئی بلکہ یہی شکست اس بات کا زبردست محرک بن گئی کہ جنگی محاذ پر پسپا ہونے کے بعد ذہنی و فکری

محاذ پر اسلام اور دنیائے اسلام کو زک پہنچائی جائے، اس کی تدبیر اس سے بہتر کوئی اور نہ تھی کہ اسلام، اسلامی عقائد، پیغمبر اسلام اور اسلامی معاشرہ کو ہدف تنقید بنایا جائے، چنانچہ اس کام کے لئے جذباتی طوفان پہلے سے موجود تھا، پھر لاطینی آباد کار اور مسلم علاقوں سے آئے ہوئے عیسائی اور یہودی، اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ علم و معلومات رکھتے تھے وہ کتنی ہی ناکارہ و خام سہی، ان کے لئے بہرحال مفید مطلب تھیں جن کی مدد سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی (خاکم بدہن) ایک نفرت انگیز کریہہ المنظر اور بھیانک تصویر پیش کی جا سکتی تھی، اور سیرت ختم الرسل کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیالی اور قیاسی انداز سے پیش کیا جا سکتا تھا، مختصر یہ کہ اس پورے عرصہ میں بحیثیت مجموعی، پیغمبر اسلام کے بارہ میں مغرب کے پاس معلومات انتہائی مبہم اور ناقص تھیں اور اس خلا کو افسانہ طرازی اور دیومالائی کہانیوں سے پر کیا گیا، اس افسانوی مواد کے بھی دو حصے تھے، ایک حصہ تو وہ تھا جس کے تحت آنحضرتؐ کے واقعات سیرت کو پیکر خیال میں پیش کیا گیا، اور دوسرا حصہ وہ تھا جس کی اپنی اصل اور حقیقت نہ تھی بلکہ وہ مغربی ذہن کی ایجاد و اختراع اور کذب و افترا سے عبارت تھا۔ اس ضمن میں آنحضرتؐ کے لئے حد درجہ اہانت آمیز الفاظ استعمال کئے گئے، مثلاً (نقل کفر، کفر نہ باشد) آپؐ کو نبی کاذب، مخالف مسیح، موجد مذہب نو، اور بہروپیا کہا گیا اور بعض تو اس حد تک گر گئے کہ آپؐ کے لئے لفظ محمدؐ استعمال کرنے کے بجائے (MAHOMD) سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی ہیں "شہزادۂ ظلمات" پھر جب صلیبی جنگوں کی ناکامی نے ان کی آتش عداوت اور بھڑکا دی تو وہ حضورؐ کے لئے BAPHOMET, MAPHOMET اور BAFUM کے الفاظ استعمال کرنے لگے اور آپؐ کی سیرت و سوانح کے بارہ میں مہمل کہانیاں، دیومالائی قصے اور بے سروپا باتیں مشہور کی گئیں، ایک خیال یہ پھیلایا گیا کہ مسلمان دراصل کچھ زیادہ ہی بت پرست تھے اور ان کا مرکز پرستش محمدؐ کا بت تھا، پھر ایک سے زائد تین بتوں کی پرستش کا افسانہ تراشا گیا اور یہ انکشاف کیا گیا کہ آنحضرتؐ تو دراصل خود پیرو دین عیسوی تھے، لیکن پوپ منتخب نہ ہو سکے تو اسقفا آرومی چرچ سے بغاوت کر کے اسلام

ایجاد کیا" وحی و تنزیل کے حوالے سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمدؐ نے ایک سفید کبوتر فاختہ یا قمری کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھ کر ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علما، مستشرقین، صدیوں کیسی شدید نا واقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علما سیرت و سوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے،

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں، لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضورؐ کی ذات اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کردی اس نے حضورؐ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویر رسول کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات و اتہامات عائد کئے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم و بیش یکساں تھے اسی لئے جب بھی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسلؐ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار

اور شیطان کا چیلا زار دیتا ہو کر راستہ میں صلیبی جنگوں کو طویل سلسلہ (جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہو گئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انھوں نے کمال عیاری سے اسباب وسائل اور تدبیر و حکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لئے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کئے جائیں اور گرم جنگ نہ سہی "سرد جنگ" میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم و تحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لئے ریمنڈ لل (RAYMOND LULL) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک پرامن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں"

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق و مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات واتہامات اور تشکیک و تذبذب کے بیج بو کر، خرافات کا ایسا جنگل اُگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آباء و اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں علوم و فنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے اخذ و استفادہ کے لئے اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمع عرفان و حقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولہویں صدی

ایجاد کیا، موری دشمنوں کے حوالے سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمدؐ نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھا، ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء و مستشرقین، صدیوں کیسی شدید نا واقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء سیرت و سوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے،

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضورؐ کی ذات اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کر دی اس نے حضورؐ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویر رسول کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات واتہامات عائد کئے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم و بیش یکساں تھے اسی لئے جب بھی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرتِ ختم الرسلؐ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہورِ اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی یہ نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار

اور ضیاع کا پیمانہ لبریز دیکھ کر راستہ میں صلیبی جنگوں کو طول مسلسل فی جلتی آگ پر تیل کا کام کیا صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہوگئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انہوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انھوں نے کمال عیاری سے اسباب وسائل اور تدبیر وحکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لئے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کئے جائیں اور گرم جنگ نہ سہی "سرد جنگ" میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم وتحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لئے ریمنڈ لل (RAYMOND LULL) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک پُر امن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں۔"

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق ومغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزمات واتہامات اور تشکیک وتذبذب کے بیج بو کر، خرافات کا ایسا جنگل اُگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم وفن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم وفنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آباء واجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں علوم وفنون اور آداب ومعارف کے اسلامی مراکز سے اخذ واستفادہ کے لئے اور اندلس وصقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمع عرفان وحقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم وفنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولہویں صدی

ایجاد کیا۔ وحی و سریق کے حوالے سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ محمدؐ نے ایک سفید کبوتر، فاختہ یا قمری کو سدھا رکھا تھا جو اڑ کے کندھے پر بیٹھا، ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علماء و مستشرقین، صدیوں کیسی شدید نافہمی کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علماء سیرت و سوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرتؐ کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمدؐ کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مستشرق تھا، جس نے حضورؐ کی ذات اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کردی اس نے حضورؐ کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرتؐ کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویر رسولؐ کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات و اتہامات عائد کئے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم و بیش یکساں تھے اسی لئے جب بھی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسلؐ کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال و قیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی یہی نفرت و عداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرتؐ کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار

اور شیطان کا چیلا قرار دیتی ہو کہ اتنے میں صلیبی جنگوں کے طویل سلسلہ نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہوگئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا اور انھوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انھوں نے کمال عیاری سے اسباب و وسائل اور تدبیر و حکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لئے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کئے جائیں اور "گرم جنگ" نہ سہی "سرد جنگ" میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم و تحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لئے ریمنڈ لُلّ (RAYMOND LULL) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ایک پُر امن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں"

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق و مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا اور گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزمات و اتہامات اور تشکیک و تذبذب کے بیج بوکر، خرافات کا ایسا جنگل اُگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، برسہا برس کے پروپیگنڈے نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آبار و اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا. علاوہ ازیں علوم و فنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے اخذ و استفادہ کے لئے اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمعِ عرفان و حقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولھویں صدی

دیا۔ دکھایا۔ ورل ڈیورنٹ کے حوالے سے یہ افسانہ تراشا گیا کہ حضور نے ایک سفید کبوتر تاختہ یا آخری کو سدھا رکھا تھا جو ان کے کندھے پر بیٹھ کر ان کے کان سے دانہ چگا کرتا تھا جس سے ان کے خیال میں یہ آتا تھا کہ فرشتہ ان سے باتیں کرتا ہے اور دوسروں کو یہ تاثر دیتے تھے کہ ان پر وحی نازل ہو رہی ہے۔

ان مثالوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مغربی علما، مستشرقین، صدیوں کیسی شدید نا واقفیت کا شکار رہے، کیسی خرافات روایات کو ان کے بڑے بڑے علما سیرت وسوانح کے نام پر پھیلاتے رہے اور اسلام اور پیغمبر اسلام کی کیسی نفرت انگیز تصویر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے،

اس قسم کی تصویر کشی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، ان کے نام تو بہت ہیں لیکن یہاں تفصیل کا موقع نہیں، البتہ ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر جان آف دمشق ہے، جان کو بازنطینی روایات کا بانی سمجھا جاتا ہے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کی آگ پہلے اسی نے بھڑکائی، جان اور اس کے پیروؤں نے (نعوذ باللہ) آنحضرت کو بے دین اور جھوٹا نبی قرار دیا، اس کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ اسلام میں محمد کی پوجا کی جاتی تھی، نیز جان ہی وہ پہلا مشنری تھا، جس نے حضور کی ذات اقدس پر جنسی و شہوانی الزامات کی بھرمار کر دی اس نے حضور کو نبی کی حیثیت دینے کے بجائے بنیادی طور پر ملحد، بدعتی، اور گمراہ قرار دیا (نعوذ باللہ) اور اسلام کا تعارف ایک نبی کاذب کے بت پرستانہ مذہب کی حیثیت سے کرایا اور یہ نکتہ پیش کیا کہ آنحضرت کے پاس اللہ کا فرستادہ ہونے کی کوئی سند نہیں تھی، جان کے بعد آنے والے قرون وسطیٰ کے تمام مصنفین نے بھی جان کا تتبع کرتے ہوئے تصویر رسول کو خوب بگاڑا، گھسے پٹے الزامات واتہامات عائد کئے اور چبائے ہوئے نوالوں کو پھر سے چبایا، اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے ماخذ کم وبیش یکساں تھے، اسی لئے جب بھی انھوں نے سیرت پر قلم اٹھایا تو نظم ہو یا نثر، دونوں میں سیرت ختم الرسل کو افراط و تفریط کے سانچوں میں ڈھال کر محض خیال وقیاس کے سہارے پیش کیا، اس تفصیل کا مدعا یہ ہے کہ ظہور اسلام کے بعد کئی صدیوں تک بھی مسیحی نفرت وعداوت کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اور اہل مغرب آنحضرت کو بدستور جھوٹا، بہروپیا، دھوکہ باز، مکار

اور شعبان کا پھیلاؤ کر دیا تو بجز اس کے کہ امت میں صلیبی جنگوں کا طویل سلسلہ اور جلتی آگ پر تیل کا کام کیا، صلیبی جنگوں میں صلیب سرنگوں ہو گئی اور تمام تیاریوں کے باوجود دنیائے اسلام کو زک پہنچانے کا منصوبہ ناکام ہوا، اور انھوں نے دیکھ لیا کہ میدان جنگ میں رسد، کمک اور سامان جنگ کی فراوانی کے باوجود وہ مسلمانوں کا زیادہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے تو پھر انھوں نے کمال عیاری سے اسباب و وسائل اور تدبیر و حکمت عملی کو یکسر بدل ڈالا اور گویا یہ فیصلہ کر لیا کہ جنگ جیتنے کے لئے نیا ترکش، نئے تیر استعمال کئے جائیں اور گرم جنگ نہ سہی "سرد جنگ" میں مسلمانوں کو زیر کیا جائے، اور یہ سرد جنگ مادی ہتھیاروں سے نہیں علم و تحقیق کے معنوی اسلحہ سے لڑی جائے، شاید اسی لئے ریمنڈ لل (RAYMOND LULL) نے اہل مغرب کو سب سے پہلے مشرقی علوم کی تحصیل پر آمادہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک پُر امن صلیبی جنگ جاری کی جائے جس کے اسلحہ خالص روحانی ہوں [۲]

اس سلسلہ میں اہل مغرب کو دو قسم کی سہولتیں حاصل تھیں، ایک طرف تو یہ کہ ان کے اسلاف نے مشرق و مغرب دونوں جگہ ذہنی پس منظر تو پہلے سے تیار کر رکھا تھا، گذشتہ کئی صدیوں میں اسلام، پیغمبر اسلام اور دنیائے اسلام کے بارہ میں مہمل خیالات، بے سروپا قصے کہانیوں، بیہودہ الزامات و اتہامات اور تشکیک و تذبذب کے بیج بو کر، خرافات کا ایسا جنگل اُگا دیا تھا جسے کاٹنا آسان نہ تھا، بر سہا برس کے پروپیگنڈہ نے مغربی ذہن کو اسلام دشمنی کے معاملہ میں ویسے ہی راسخ کر دیا تھا، دوسری طرف انھیں یہ سہولت بھی حاصل تھی کہ اس زمانہ میں مسلمان علم و فن کے دائروں میں جو ترقیاں کر رہے تھے، اس کے سبب یونانی علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں ترجمہ کے ذریعہ عربی میں منتقل ہو چکی تھیں، اور یوں ان کے آباء و اجداد کا وہ علمی ورثہ جس سے وہ خود بھی زیادہ واقف نہ تھے، عربی میں محفوظ ہو چکا تھا۔ علاوہ ازیں علوم و فنون اور آداب و معارف کے اسلامی مراکز سے اخذ و استفادہ کے لئے اور اندلس و صقلیہ میں مسلمانوں کی روشن کی ہوئی شمع عرفان و حقیقت کی روشنی سے اپنے آپ کو منور کرنے کے لئے بھی عربی زبان میں مہارت اور اسلامی علوم و فنون سے واقفیت بالکل ناگزیر تھی، چنانچہ سولہویں صدی

عیسوی میں یہ لاوا خروج مرحلہ گیا جبکہ ایک طرف تو عیسائیوں کے مختلف فرقوں کا اتحاد ہوا اور سبھی نے
اسلام کو اپنا واحد مشترکہ دشمن قرار دیا اور ایک متحدہ رومن کیتھولک چرچ کی بنیاد رکھی گئی اور دوسری
طرف یہ طے کیا گیا کہ اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف جس محاذ پر پہلے صرف عیسائی، یہودی، راہب،
پادری، قصہ گو، مناظر، شاعر وغیرہ ڈٹے ہوئے تھے، اب ان کی جگہ مغربی دنیا کے وہ محقق و فضلا بیٹھیں گے
جو کلاہ علم سے آراستہ ہوں گے اور درس و تدریس کی مسندوں پر فائز ہو کر داد تحقیق دیں گے تاکہ
ادھر ان کے ان دیکھے جذبات نفرت و عداوت بھی تسکین پائیں اور ادھر علم و تحقیق کے حوالے سے ان کا
رعب و دبدبہ قائم ہو جائے، چنانچہ یہی ضرورتیں گیام پوسٹل کو (G. POSTEL) کو سامنے لائیں
جو عام طور پر مستشرقین یورپ کا باوا آدم شمار ہوتا ہے، وہ پہلا اصولی مستشرق تھا جس نے تحریک استشراق
کو منظم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا اور بطور خاص لغت و لسانیات کے حوالے سے اہم خدمات انجام
دیں، پوسٹل ہی کے لئے ۱۵۳۹ء میں کلیۂ فرانس قائم کیا گیا اور وہ عربی کی پہلی کرسی صدارت پر
فائز ہوا، گیام پوسٹل کے کام کو لغت و لسانیات کے ہی محور حوالے سے اس کے لائق و فائق شاگرد
جوزف اسکالیجر نے آگے بڑھایا۔ بہرحال کم و بیش پینتالیس سال کی تیاری کے بعد ۱۵۸۴ء میں عربی
مطبوعات کا سلسلہ یورپ میں شروع ہوا جس کا سہرا اٹلی کے ڈیوک آف ٹسکانی (TUSCANY)
کے سر ہے،

اوپر کی تفصیل سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آتی ہیں یعنی :۔

(ا) یہ کہ سولہویں صدی عیسوی کو ہم باقاعدہ طور پر تحریک استشراق کا نقطہ آغاز قرار دے سکتے ہیں
۔ یہی وہ دور ہے جبکہ مستشرقین یورپ نے کام کا مربوط و منظم نقشہ مرتب کیا۔

(ب) اس تحریک کی شروعات خالص مسیحی مشنری اور عیسائی پس منظر میں ہوئی جس کا اثر
تاریخ مابعد پر جاری و ساری رہا، کیونکہ مستشرقین کا خانوادہ چرچ (کلیسا) کا پروردہ تھا۔

تحریک کا ارتقاء: تحریک استشراق کے حوالے سے سترہویں اور اٹھارہویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہ زمانہ تحریک کے ارتقاء، اس کے پھلنے پھولنے کا عہد ثابت ہوا جہاں تک سترہویں صدی عیسوی کا تعلق ہے، بقول مولانا شبلیؒ یہ صدی یورپ کے عصر جدید کا مطلع ہے، اور یورپ کی جدو جہد سعی و کوشش اور حریت و آزادی کا دور اسی عہد سے شروع ہوتا ہے، پھر یہ عروج استعمار کی صدی ہے، جس کے پنجۂ استبداد میں رفتہ رفتہ عالم اسلام آتا چلا گیا، یورپی شہزادوں کی سرپرستی میں اسلامی مطبوعات کے بارہ میں معلومات جمع کی جانے لگیں، عربی زبان کی اہمیت و خاصیت کو سمجھنے کی کوششیں ہونے لگیں، یہاں تک کہ اربی نیس (ERPENIUS, 1584-1626) نے پہلی عربی کی قواعد شائع کی، جو لغوی اصولوں پر مرتب کی گئی تھی، پھر اس کے اتباع میں اس کے شاگرد جیکب جولیس (JACOB GOLIUS, 1595-1667) نے بھی قابل قدر خدمات انجام دیں، اور پھر ۱۶۳۶ء میں ایڈورڈ پوکاک (E. POCOCKE, 1604-1691) پہلا انگریز مستشرق تھا، جسے آکسفورڈ میں شعبہ عربی کا صدر نشین بنایا گیا، مزید برآں عربی زبان کی قواعد اور لغت کی ترتیب کا کام آسٹریا کے میزنسکی (E. MEURNSKI ت) نے بھی ۱۶۸۰ء میں انجام دیا، اس کے علاوہ اسلامی علوم اور تہذیب و تمدن کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک ادارہ ڈی ہربلوٹ (D' HERBELOT) کی سرکردگی میں قائم کیا گیا، اس ادارہ نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اس وقت تک جس قدر بھی مشرقی علوم پہ کتابیں شائع ہوئی تھیں ان کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے شائع کر دی جو پُر از معلومات تھی، اسی ادارہ کے تحت آنحضرتؐ پر ایک کتابچہ بھی شائع کیا گیا،

سترہویں صدی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ بقول مولانا شبلیؒ "ئے نئے عامیانہ خیالات کے بجائے کسی قدر تاریخ اسلام و سیرت پیغمبرؐ کی بنیاد عربی زبان کی تصانیف پر قائم کی گئی مگر موقع

بہ موقع، معلومات سابقہ کے سلسلے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا، اس صدی میں مستشرقین کے رویے اور سلوک میں اس تبدیلی اور فرق کی اصل وجہ گویا ان کے ماخذ کے بدل جانے میں مضمر تھی، ازمنۂ وسطیٰ کے روایتی لاطینی اور بازنطینی مواد کی سیاہیوں میں اسلامی اور عربی مصادر نے روشنی پیدا کی اور انھوں نے اس تضاد کو بھی سمجھ لیا جو سیاحوں کے سفرناموں کے اندراجات، ان کے تصورات اور اصل حقائق کے مابین پایا جاتا تھا، اس عہد میں بھی حسب سابق مطبوعات اور تصنیفات بہت کم ہیں البتہ جو مستشرقین، مطالعۂ سیرت رسولؐ کے حوالے سے سامنے آئے، ان میں مندرجۂ ذیل قابل ذکر ہیں،

(۱) ولیم بیڈول (W. BEDWELL.) انگریز مستشرق تھا، جس کا زمانہ ۱۵۶۱ء تا ۱۶۳۲ء ہے، اس کے آثار و باقیات میں دو کتابیں قابل ذکر ہیں، ایک عربی لغت جو سات جلدوں میں ہے اور ۱۶۱۰ء سے پہلے شائع ہوئی، اور دوسرے سیرت رسولؐ پر کتاب جو لندن سے ۱۶۱۵ء میں شائع ہوئی، سیرت کی کتاب نہایت گستاخانہ ہے اور نہایت بے باکی سے کام لیتے ہوئے اس کا نام ہی "محمد کاذب" رکھا گیا ہے (نعوذ باللہ) (۲) وایٹر (VATTIER, P) فرانسیسی مستشرق تھا، اس کا زمانہ ۱۶۱۳ء تا ۱۶۶۷ء ہے، اس نے عربی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بڑی کثرت سے فرانسیسی میں ترجمہ کیا، (۳) ہاٹنجر (HOTTINGER, J. H) سوئٹزرلینڈ کا ایک مستشرق (۱۶۲۰ء تا ۱۶۶۷ء) اس کے باقیات میں مشرقی تصانیف کی ایک فہرست (مطبوعہ ہائیڈلبرگ ۱۶۵۸ء) قابل ذکر ہے، (۴) ڈاکٹر ہنری اسٹب (DR. HENRY STUBBE) سترہویں صدی کا مشہور مستشرق بہ زمانہ (۱۶۳۱ء تا ۱۶۷۶ء) اس کی مشہور کتاب (جو پہلے پہل لندن سے ۱۹۱۱ء میں شائع ہوئی) کا نام ہے (AN ACCOUNT OF THE RISE AND PROGRESS OF MOHAMETANISM) کہا جاتا ہے کہ اگر اس کی کتاب کی کچھ تاریخی غلطیاں نظرانداز کر دی جائیں تو اسے سیرت رسولؐ کی ایک معقول و معتدل تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے

"اور جیسا کہ اس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے، یہ کتاب گویا مغرب کی جانب سے سیرت رسولؐ کے بارہ میں اولین اعتذار ہے، اس کتاب میں مصنف نے نہ صرف یہ کہ اس رویہ کا جائزہ لیا ہے جو پیغمبر اسلام کے ساتھ مسیحی مصنفین نے پہلے اختیار کر رکھا تھا، جبکہ ان مصنفین کی تصویر کو اس نے مکروہ قرار دیا ہے جو انھوں نے اخلاق و کردار نبویؐ کی کھینچی تھی، اور انتہائی عالمانہ شان سے یہ اقرار کیا ہے کہ اس آسمان کے نیچے سوائے محمدؐ کے کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو تمام دنیائے انسانیت کی مرکز توجہ بنی ہو کہ اپنے تو اس پر عقیدت کے پھول نچھاور کریں اور غیر اسے نگاہ آتشیں سے دیکھیں، مشرق میں اسے سراہا گیا، لیکن مغرب نے التفات نہ کیا۔ (ص ۲۱۱)

دوسرے مستشرقین میں سے جین بررڈ (GENE BRARD) کا زمانہ اگرچہ ۱۵۳۷ء تا ۱۵۹۷ء تھا، لیکن اس کا موقف تقریباً سترہویں صدی میں عام ہوا، وہ ایک مشہور کیتھولک مناظرہ باز تھا، جین بررڈ کو سب سے بڑا اعتراض اس پر تھا کہ حضورؐ نے قرآن کو عربی زبان میں کیوں لکھا؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے کہ قرآن کو عبرانی، یونانی اور لاطینی جیسی خالص مہذب زبانوں میں کیوں نہیں لکھا گیا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ اس لئے کہ محمدؐ (خاکم بدہن) خود ایک حیوان (جانور چوپایہ) تھے اور صرف ایک ہی حیوانی (وحشیانہ) زبان (عربی) جانتے تھے، جو ان کے مخصوص وحشیانہ ماحول سے عین مطابقت رکھتی تھی، اس لئے اس کے نقطۂ نظر کے مطابق، قرآن، عربی جیسی وحشی زبان میں لکھا گیا (عامر ص ۴۰-۴۱)

۱۶۵۳ء میں الیکزنڈر روس نے (ALEXANDER ROSS) نے اپنی کتاب (RONDEBLI) شائع کی، وہ اگرچہ تقابل ادیان کے حوالہ سے سامنے آئی، لیکن اس کے ایک حصہ میں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارہ میں کچھ بہتر مواد پایا جاتا ہے حالانکہ اس کی پہلی کتاب حیات محمدؐ کا مخفف قرون وسطیٰ کے روایتی خرافاتی مواد، قصے کہانیوں اور زہریلے معاندانہ مواد پر مشتمل تھی، لینسلوٹ ایڈیسن (LANCELOT ADDISON) نے ۱۶۷۸ء میں سیرت پر ایک کتاب شائع کی

اگلے سال ہی کتاب نے [illegible] [illegible] کا ماحصل سب معمول (یعنی) خرافات تھے، آنحضرتؐ کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اپنی کتاب قرآن کو اپنی زندگی میں شائع نہیں کیا تھا، ایک اور مستشرق ہمفرے پرائی ڈیکس (PRIDEAUX) HUMPHREY) نے حضورؐ کی سوانح لکھی، لیکن اپنے دامن کو وہ بھی خرافات سے نہ بچا سکا، اور دوسروں کی طرح آپ کو خدانخواستہ مدعی کاذب، مکار، فریبی قرار دیا، اس پر تماشہ یہ ہے کہ اس کی کتاب ایک صدی تک دوسروں کے لئے "معیاری کتب حوالہ" بنی رہی، ایک ہی سال (۱۶۹۷) میں دو اشاعتیں عمل میں آئیں اور فرانسیسی ترجمہ بھی ۱۶۹۸ء میں ہوگیا، اس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستشرقین کے حلقوں میں عام مذاق کیا تھا اور کس قسم کے مواد کو ان کے بڑے بڑے علماء استعمال کرتے تھے۔

اٹھارویں صدی کے دوران بھی تحریک استشراق، منازل ارتقاء طے کرتی رہی، البتہ سفر جیسے جیسے آگے بڑھتا رہا، رخت سفر، کم و بیش ہوتا رہا اور اپنے تمام تر مذہبی، مشنری، سیاسی اور استعماری عزائم کے علی الرغم، مستشرقین کے رویہ میں کچھ لچک اور نرمی بھی پیدا ہوگئی، اس نرمی اور لچک کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان میں سے چند کا رویہ، رنگ و آہنگ اور آواز و انداز بدلا اور نسبتاً انصاف پسندی سے کام لیا، بلکہ دل و نگاہ میں گنجائش پیدا کر کے اثبات و معروضیت سے آگے بڑھ کر توصیف و مدح اسلام و پیغمبرؐ اسلام میں بھی بخل سے کام نہیں لیا، ورنہ پرانے خیالات اور ان کے متقدمین کے قائم کئے ہوئے نظریات بہرحال گرم سفر رہے اور مقبولیت بھی انہی کو حاصل رہی، تاہم اتنا ضرور ہوا کہ متشددانہ و متعصبانہ رویہ کے شانہ بشانہ معقولیت و انصاف پسندی کا رجحان بھی جاری و ساری ہوگیا، اور اس رجحانِ نو کا ساز غالباً اس صدی میں سب سے پہلے ولندیزی مستشرق ریلان (H. RELANT) نے ۱۷۰۵ء میں (DE RELIGIONE MOHAMA DICA) لکھ کر چھیڑا، اور اپنے ہم مشربوں سے مطالبہ کیا کہ "ہم مشرق کو اس کے اپنے اصل مآخذ کے ذریعہ ہی سمجھ سکتے ہیں" اور برملا

کہ تاریخی انصاف کے تقاضوں کو ہمیں اسلام کو بھی تولنا چاہیے، پھر اس نے نوازی میں پیری بائل اور بلین ویبرز وغیرہ بھی شامل ہوگئے،

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں مغرب نے اسلام، پیغمبرِ اسلام اور مسلمانوں کی طرف بنظرِ شفقت دیکھا اور افہام و تفہیم کی جانب پیش قدمی کی،

اس صدی میں مستشرقین کی ذاتی و انفرادی کوششوں کے علاوہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی سرگرمیاں منظم کی گئیں، خصوصاً اس صدی کے اواخر میں ان رجحانات نے زیادہ زور پکڑا، بقول مولانا شبلی "یہ وہ زمانہ ہے، جب یورپ کی قوت سیاسی، اسلامی ممالک میں پھیلنی شروع ہوگئی، جس نے اور مستشرقین کی ایک کثیر التعداد جماعت پیدا کردی، جنھوں نے حکومت کے اشارہ سے السنۂ مشرقیہ کے مدارس کھولے مشرقی کتب خانوں کی بنیادیں ڈالیں، ایشیاٹک سوسائٹیاں قائم کیں، مشرقی تصنیفات کی طبع و اشاعت کے سامان پیدا کیے، اورینٹل تصنیفات کا ترجمہ شروع کیا" اور آخرکار ان مدارس اور سوسائٹیوں کی تقلید سے تمام ممالک یورپ میں اس قسم کی درسگاہیں اور انجمنیں جاری ہوگئیں، عام یونیورسٹیوں میں عربی زبان کے پروفیسروں اور کتب خانوں کا وجود لازمی سمجھا جانے لگا" السنۂ مشرقیہ کے علاوہ مسلمانوں کے سائنسی علوم پر علمی و تحقیقی کام کی غرض سے پیرس میں ۱۷۹۵ء میں ایک اور ادارہ قائم کیا گیا، اس کے تحت اضافی طور پر مشرقی زبانوں کے بارہ میں بھی معلومات اکٹھا کی گئیں،

اٹھارہویں صدی کی ایک خصوصیت اس تحریک کے حوالے سے یہ بھی ہے کہ استشراق اور مستشرق کی اصطلاحوں کا رواج اسی زمانہ میں شروع ہوا، چنانچہ انگلستان میں ۱۷۷۹ء کے لگ بھگ اور فرانس میں ۱۷۹۹ء کے قریب مستشرق کی اصطلاح رائج ہوئی اور پھر جلد ہی استشراق نے بھی رواج پایا، اور اس کے ساتھ ایک مخصوص تصور اور مخصوص سلوک اور رویہ نے بھی جنم لیا، اس صدی کے مشاہیر علمائے مستشرقین میں سے چند قابل ذکر یہ ہیں (۱) سائمن اوکلے (OCKLEY.S) انگریز

مستشرق جس کا زمانہ [illegible] تھا، اس کی کتاب [illegible] شائع ہوئی، یہ تین جلدوں میں تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا جبکہ مستشرقین کے کام کو عام لوگوں کی رسائی کے قابل بنایا گیا (۲) ایڈورڈ پوکاک، انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۰۴ء تا ۱۶۹۱ء تھا، اس کا اہم نام ایک مستشرق سترہویں صدی میں گذر چکا ہے (۳) جارج سیل انگریز مستشرق جس کا زمانہ ۱۶۹۷ء تا ۱۷۳۶ء تھا، اس نے ۱۷۳۴ء میں قرآن کا ترجمہ شائع کیا اور بعض مستشرقین کے کلماتِ خیر کے ردِ عمل میں آنحضرت ؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو فاسد مذہب قرار دیا (۴) جین گیگنیر (GAGNIER. J) انگریز مستشرق، جس کا زمانہ ۱۶۷۰ء تا ۱۷۴۰ء تک کا تھا، اس نے دو کتابیں شائع کیں، ان دونوں کتابوں کا مقصد بولین ویر کی تالیف کی تاثیر کو کم کرنا تھا۔ بلکہ بولین ویر کے مقابلہ میں اس نے ایک نئی تالیف پیش کی جو ۱۷۳۲ء میں امسٹرڈم سے نمودار ہوئی (۵) رسک (REISKE, J.J) جرمن مستشرق، جس کا زمانہ ۱۷۱۶ء سے ۱۷۷۴ء تک تھا، وہ جرمنی کا کلاسیکی لغوی اور عربی اسکالر تھا، اور یونانی زبان و ادب پر سند مانا جاتا تھا (۶) ایڈورڈ گبن، انگریز مورخ، زمانہ (۱۷۳۷ء تا ۱۷۹۴ء) اپنی کتاب تاریخ زوال روما کے لئے خاصی شہرت کا حامل، اس نے ۱۷۸۵ء میں کتاب مذکور کے پچاسویں باب میں اسلام اور آنحضرت ؐ کے بارہ میں نہایت دل آزار رائے کا اظہار کیا اور رواداری کے دعوی کے باوجود آنحضرت ؐ کو نبی کاذب کا خطاب دیتے ہوئے لکھا کہ آنحضرت ؐ آخری ایام میں شہوت، لالچ، جاہ طلبی اور بوالہوسی میں مبتلا ہوگئے تھے (نعوذ باللہ) (۷) والٹیر (VOLTAIRE, FR) فرانسیسی مصنف زمانہ ۱۶۹۴ء تا ۱۷۷۸ء، اس نے پیغمبر اسلام ؐ کے بارہ میں اپنا مشہور ڈرامہ تحریر کیا، یہ ڈرامہ اگر تاریخی لحاظ سے بے بنیاد تھا، تاہم یہ امر ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ اس وقت تک مستشرقین شریعت اسلامی کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوئے تھے، یہ ڈرامہ ۱۷۴۲ء میں

متکلم بنایا، اس نے نہ صرف اسلام کے خلاف نفرت وحقارت کا اظہار کیا بلکہ یورپ کے ان تمام مستشرقین کی شدت کے ساتھ مذمت کی جنھوں نے اسلام اور آنحضرت ؐ کی جانب نرمی کا رویہ اختیار کیا یا انصاف کا مطالبہ کیا، اس نے آنحضرت ؐ کو نبی کاذب اور اسلام کو وحشی اور فاسد مذہب سے موسوم کیا، اس نے ڈرامہ کو پوپ پانزدہم کے نام منسوب کیا اور اس کے مقدمہ میں اسلام کے خلاف خوب زہر اگلا، پھر اپنے مقالات کے مجموعہ (۱۷۵۶ء) میں بھی والٹیر نے آنحضرت ؐ اور اسلام کے خلاف سخت نفرت کا مظاہرہ کیا، والٹیر کی شخصیت اور تالیفات کا گہرا اثر دوسرے مستشرقین پر بھی پڑا چنانچہ ڈیڈی روٹ (DIDEROT) اس رخش نگاری پر بھی اُتر آیا کہ "محمد ؐ دنیا میں سب سے بڑھ کر عورتوں کے دوست اور سنجیدگی ومعقولیت کے دشمن تھے" (نعوذ باللہ)

تحریک استشراق کا عروج انیسویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کے ربع اول تک کا زمانہ مسلمانوں اور مستشرقین دونوں کے لئے متعدد اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے، پچھلی صدیوں میں عالم اسلام کو دنیا کے مختلف حصوں میں سقوط وانحطاط کی جن منزلوں سے گزرنا پڑا تھا، ایک تو ان کے سبب ہی مسلمانوں کی حاکمانہ حیثیت ختم ہوئی، اس پر مستزاد یہ کہ ان کے پرانے حریف "مغرب" کو زمانہ بیداری کے بعد سے سیاسی، عسکری، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ہر میدان میں مسلسل تفوق وبالادستی حاصل ہوتی چلی جارہی تھی، اور اسکی سامراجی گرفت عہد بہ عہد مضبوط ہوتی جارہی تھی، یہانتک کہ انیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ادھر عالم اسلام خستہ وخوار ہوا اور ادھر مغرب کا پرچم استعمار اور بلند ہوا، یہ صورتحال مسلمانوں کیلئے کیسی ہی اذیتناک کیوں نہ ہو، اقوام مغرب کیلئے بہرحال خوش آیند تھی اور اسکا برابر کا فائدہ مستشرقین نے بھی اٹھایا چنانچہ زیر نظر دور (۱۸۰۰ تا ۱۹۲۵) تحریک استشراق کے عروج وکمال کا دور ہے، اس عہد میں تحریک استشراق کو بھرپور فروغ حاصل ہوا، مستشرقین کے انداز واطوار اگرچہ بدل گئے تاہم کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے انکے اخلاف اپنے اسلاف پر بازی لے گئے، چنانچہ:

(۱) کمیت کا اندازہ تو اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ زیر بحث دور میں مستشرقین کی ایک بہت بڑی تعداد سامنے آئی۔ اس میں ہر قسم کے مستشرقین شامل تھے، جو خاموش صلیبی جنگ

کے اس محاذ پر یورپ کے تقریباً تمام ملکوں کی نمائندگی کرنے والے تھے مثلاً [illegible]
اسپین، پرتگال، آسٹریا، ہالینڈ، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، سوئٹزرلینڈ، ہنگری، روس، بلجیم، [illegible]
فن لینڈ وغیرہ اور امریکہ والے بھی شریک ہو گئے۔

(ب) کیفیت کے اعتبار سے مستشرقین نے تصنیفات کے ڈھیر لگا دیئے، ان کے مطالعہ اور تحقیق و تدقیق کا دائرہ بھی محدود نہ رہا بلکہ عقائد اسلام، قرآن، حدیث، سنت، فقہ، اجتہاد، عرب، اہل عرب اور احوال عرب، ترکوں اور عربوں کے تعلقات، اسلام کی اصلیت، اسلامی تہذیب و تمدن اور پیغمبر اسلام کی سیرت و سوانح وغیرہ پر کثرت سے لکھا گیا، اس دور میں مستشرقین کا معیار تحقیق و استدلال بھی بلند ہوا اور تحقیق و جستجو اور تفتیش و تفحص میں انھوں نے ایسا کمال دکھایا، جو آج بھی باعث حیرت ہے، قدیم عربی مآخذ کی تلاش، مخطوطات اور قلمی نسخوں کی دریافت، آثار و اکتشافات قدیم کا مطالعہ، کتابوں کی تصحیح و اشاعت، اسلامی تاریخی مآخذ کی ترتیب و تدوین، فہرستوں، اشاریوں اور تبویب وغیرہ کی تیاری اور اسی طرح کی دوسری سرگرمیاں، ان کی محنت و ریاضت، علم شناسی اور مشرق نوازی کی روشن دلیل ہیں، بلکہ یہ ان کا مسلمانوں پر احسان ہے کہ ان ہی کی کوششوں کے طفیل بہت سی نادر اور مفقود الخبر کتابیں مسلمانوں تک پھر سے پہونچیں اور مشہور و متعارف ہوئیں،

(ج) مستشرقین کے گروہ میں حسب سابق دونوں قسم کے افراد نے تصنیف و تالیف میں حصہ لیا، ایک طرف اگر روایتی قسم کے متشدد اور متعصب علمائے استشراق تھے تو دوسری طرف حقیقت بیں، انصاف پسند، نرم رو اور معتدل قسم کے مصنفین بھی تھے، مثلاً گاڈفرے ہگنز، کاسن دی پرسیوال، دیل، ارینالڈ، گوئٹے، شول، کارلائل اور درنگھم وغیرہ۔

(د) مستشرقین کے سلوک اور رویہ میں نکھار پیدا ہوا، اور بحیثیت مجموعی اس دور میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے ساتھ ان کا رویہ پہلے جیسا نہ رہا، بلکہ مختلف عوامل کے نتیجہ میں نرم، حقیقت پسندانہ

اور معقول ہوتا چلا گیا، اس کی بظاہر وجہ ایک تو مشرقی مصادر تک ان کی رسائی، عربی اور دوسری مشرقی زبانوں سے واقفیت تھی کہ جس کے نتیجہ میں محض تخمین وظن کے بجائے وہ عقل واستدلال اور علم کی روشنی میں بات کرنے لگے، مشرقی ممالک کے مشاہدات واسفار نے ان کے اپنے اسلاف کی لغویت ثابت کردی اور بیان وواقعہ کا تضاد سامنے آگیا، دوسری بڑی وجہ خود یورپ کی بدلتی ہوئی فضا تھی، نیز جدت پسندی سائنسی ایجادات واختراعات، تعصب اور تقشف کے خلاف بے چینی، رومانی تحریک کلاسیکی نظریات کے خلاف بغاوت، تاریخی تنقید کی تحریک وغیرہ بھی موثر عوامل ثابت ہوئے، ان باتوں کی روشنی میں گویا یہ کہنا درست ہوگا کہ مستشرقین کی اس فکری تبدیلی کی تہہ میں نہ تو اخلاص جلوہ گر تھا اور نہ کدورت ونفرت پر محبت ومودت کے جذبات غالب آگئے تھے، بلکہ درحقیقت حالات کی ستم ظریفی نے انھیں نقطۂ نظر بدلنے پر مجبور کر دیا تھا، ورنہ ان کے اصل مقاصد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، بہرحال اصل وجہ ہم کسی کو قرار دیں، واقعہ عملاً یہ پیش آیا کہ :۔

(i) اس دور میں ان کے یہاں لغویات کم ہوگئیں اور الزامات واتہامات کا دائرہ سمٹ کر محدود ہوگیا، نیز (ii) صورت حالات نے کلیسا کا طلسم توڑ کر ایسے مستشرقین بھی پیدا کر دیئے، جنھوں نے جرأت سے کام لیکر اپنے پیشرو مصنفین کی تغلیط کی، اور ان کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا۔

(ہ) اپنی سرگرمیوں کو منظم ومرتب کرنے کے ضمن میں مستشرقین نے اس دور میں متعدد تحقیقی ادارے قائم کئے مثلاً سوسائٹی ایشیاٹک آف پیرس ۱۸۲۲ء، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ، ۱۸۲۳ء اور امریکن اورنٹیل سوسائٹی ۱۸۴۲ء وغیرہ ان تمام اداروں نے جلد ہی اپنے اپنے جریدے نکالنا شروع کر دیئے جن سے ان کی تحریک کو بے پناہ تقویت حاصل ہوئی، لوگوں کے اذہان وقلوب کو متاثر کرنے میں رسائل وجرائد کو چونکہ ہمیشہ سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے، اس لئے متذکرہ بالا مجلات کی اشاعت کو کافی نہیں سمجھا گیا، بلکہ اپنی حکمت عملی کا مستقل حصہ بناتے ہوئے مستشرقین نے دوسرے متعدد

رسائل وجرائد کی اشاعت کا بھی اہتمام کیا چنانچہ ہندوستان سے (THE MUSLIM WORLD)

کا اجراء پیرس سے ۱۹۰۶ء میں (REVUE-DE-ISLAM) کا اجراء روس سے ۱۹۱۲ء میں MIR

ISLAM کا اجراء وغیرہ، رسائل وجرائد اور مجلات کی ان اشاعتی سرگرمیوں کا بظاہر مقصد تو

یہ تھا کہ وہ اپنی تحقیقات سے دوسروں کو روشناس کراسکیں، لیکن بہ باطن مدعا، اپنے پرانے استشراقی مقاصد

کی تکمیل ہی تھا، وہی ان کی بلند آہنگی تو وہ صاف نتیجہ تھی اقوام یورپ کی بالادستی کا، اور استعماری

تسلط کا، بہرحال اب منزل وہ بھی آئی کہ مستشرقین نے اپنی پہلی عالمی کانگرس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا اور

۱۸۷۳ء میں اسے پہلی بار عملی جامہ پہنایا گیا، عالمی کانگرسوں کا انعقاد بھی ان کیلئے بڑا مفید مطلب تھا، مختلف اداروں

کی سرگرمیاں، کارکردگی، نتائج، اطلاعات کا تبادلہ، بڑے بڑے علماء وفضلاء کی شرکت، مقالات، خطبات،

صلاح مشورے، قراردادیں وغیرہ، یہ سب باتیں تحریک استشراق کو فعال اور سرگرم بنانے کے لئے بہرحال

ضروری تھیں اور مستشرقین نے اس پہلو کو تشنہ توجہ نہیں چھوڑا اور انیسویں صدی کے اواخر سے ہی سالانہ

اجتماعات کو ایک روایت کے طور پر جاری کردیا۔

بہرحال یہ تفصیل اس اجمال کی تھی کہ انیسویں صدی سے لیکر بیسویں صدی کے ربع اول تک

کا زمانہ تحریک استشراق کا دور عروج وکمال تھا اور پھر ہم نے دیکھا کہ تحریک کے تمام شعبوں میں انتہائی

رفتار سے ترقی ہوئی، مستشرقین کا ایک مستقل رویہ اور سلوک نکھرتا چلا گیا اور بحیثیت مجموعی ان کی تمام

سرگرمیاں نہایت منظم طریقہ سے ہر سطح پر اپنے اثرات کو ظاہر کرتی رہیں، اسی عہد کی آخری دہائی میں اگرچہ

عالمی جنگ اور بین الاقوامی سیاست اور متعدد واقعات وحوادث نے ایک مرتبہ پھر سیاسی، سماجی اور

معاشی وثقافتی حالات کا نقشہ بدل ڈالا، تاہم یہ جائزہ ہم آئندہ صفحات میں عہد جدید کے تحت

لیں گے۔

(باقی)

ترکی کا ایک نامور صحافی

حافظ اشرف ادیب

۱۸۸۲ء تا ۱۹۷۱ء

از جناب صولت ثروت صاحب، کراچی

حافظ اشرف ادیب کا نام ترکی اور اسلامی صحافت کی تاریخ میں زریں حروف میں لکھے جانے کے لائق ہے، اگرچہ آج ترکی کے باہر بہت کم لوگ ان کے نام سے واقف ہیں، اور ترکی میں بھی ان کو بھلانے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن ایک زمانہ تھا کہ ان کا نام اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے میں خصوصاً ترکوں کی دنیا میں ہر پڑھے لکھے شخص کی زبان پر تھا، ان کا ہفت روزہ "صراط مستقیم" جس کو بعد میں "سبیل الرشاد" کا نام دے دیا گیا تھا، ۱۹۰۸ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان شاید اسلامی دنیا کا سب سے کثیر الاشاعت ہفت روزہ تھا، جس کی اشاعت پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ہم اشرف ادیب کو ترکی کا ابوالکلام آزاد کہہ سکتے ہیں، اس لحاظ سے کہ "سبیل الرشاد" اور "الہلال" دونوں ہمعصر بھی تھے اور اسلام کے نقیب بھی، یہ دوسری بات ہے کہ "الہلال" کی عمر بہت مختصر ہوئی، جب کہ سبیل الرشاد اور اس کے مالک کی عمر میں اللہ نے بڑی برکت دی،

اشرف ادیب کا خاندان مشرقی ترکی کے شہر سیواس سے تعلق رکھتا تھا، لیکن ان کے والد اسلام آغا نے انیسویں صدی کے آخر میں شہر سیرز میں رہائش اختیار کر لی تھی، جو

یونانی مقدونیہ کا ایک اہم شہر ہے، اور سالونیکا اور کوالا کی شہروں کے درمیان ذرا شمال کی طرف واقع ہے، اس زمانے میں یہ حصہ عثمانی سلطنت کا ایک حصہ تھا، مقدونیہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان میں ترکوں کے ہاتھ سے نکلا، اب سیریز کو سرلے (Serres) کہا جاتا ہے، اور آبادی چالیس پچاس ہزار کے لگ بھگ ہے، لیکن مسلمانوں سے خالی ہو گیا ہے۔

پیدائش | اشرف ادیب کی والدہ نفیسہ خانم کے خاندان کا تعلق ترکستان سے تھا، اور ان کے والد فرغانہ سے ہجرت کر کے آئے تھے، اور سیریز میں آباد ہو گئے تھے، ان کا یہاں شیشے کے برتنوں کا کاروبار تھا، نفیسہ خانم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی، اور قرآن مجید کی صحت کے ساتھ تلاوت کر سکتی تھیں، جبکہ اشرف ادیب کے والد پڑھے لکھے نہیں تھے، اور درزی اور کپڑوں پر زندیں کڑھائی کا کام کرتے تھے، جس کی وجہ سے صرمہ کش[1] اسلام آغا کہلاتے تھے، اشرف ادیب اسی شہر سیریز میں ۱۸۸۲ء میں پیدا ہوئے تھے، جب ترکی میں خاندانی نام کا قانون بنا تو ان کے نام کے آگے فرغن (Fergan) کا اضافہ ہو گیا،

اشرف ادیب کا گھرانہ ایک خوشحال گھرانہ تھا، شہر میں بہت بڑا مکان تھا، جس میں زنانہ اور مردانہ حصے تھے، اور وسیع صحن اور بائیں باغ تھا، چشمے کا پانی پختہ مٹی کی بلند نالیوں کے ذریعہ گھر کے زنانہ اور مردانہ دونوں حصوں میں آتا تھا، اور چونکہ یہ پانی لذیذ، ہلکا اور صحت بخش ہوتا تھا، اس لیے محلے کے لوگ ان کے گھر سے پانی بھر کر لے جاتے تھے، شہر سے باہر بھی ان کے کھیت اور باغ تھے، اشرف ادیب نے اپنی

---

[1] ترکی زبان میں سونے اور چاندی کے دھاگوں سے کشیدہ کاری کرنے والے کو صرمہ کش کہا جاتا ہے،

د نوشت[1] میں لکھا ہے کہ ہمارے کھیت کے بھٹے غیر معمولی طور پر بڑے ہوتے تھے، ان کا طول چالیس تا پچاس سینٹی میٹر تک ہوتا تھا، اور دانے نخود کے برابر ہوتے تھے، تربوز اور خربوزے بھی ہوتے تھے، اور خربوزے آٹھ آٹھ دس دس سیر کے ہوتے تھے، باغ میں مختلف پھلوں کے درخت تھے، انگور بہت پیدا ہوتا تھا، اشرف ادیب نے خاصی تفصیل سے لکھا ہے، پھلوں کے پکنے پر کس طرح جشن منایا جاتا تھا، انگوروں کو کس طرح توڑ کر گھر لایا جاتا تھا اور گھروں میں تقسیم کیا جاتا تھا، کس طرح انکا عرق نکالا اور انگور کا شربت بنایا جاتا تھا، اور کس طرح باغ میں تفریحی محفلیں جمتی تھیں، باغ کے قریب ہی پہاڑوں کے درمیان حصار اردی نام کی ایک تفریح گاہ تھی، جہاں بلند و بالا درختوں کے درمیان چشمہ بہتا تھا، یہاں ہفتہ میں ایک دن خواتین کے لیے مخصوص تھا، جب گھر کے لوگ وہاں تفریح کے لیے جاتے تھے، تو ایک دن پہلے سے تیاریاں شروع ہو جاتی تھیں، گھر پر ایک گائے تھی، جس کی وجہ سے دودھ، دہی اور مکھن کی فراوانی تھی۔ اشرف ادیب کی والدہ خود دودھ دوہتی تھیں، شہر میں دستکاری کے میلے بھی لگا کرتے تھے، سیر یزہ کا بقلوا[2] بہت مشہور تھا، اور استنبول تک بھیجا جاتا تھا، یہاں ایک مخصوص حلوا بھی تیار ہوتا تھا، جو چاول اور مکھن سے تیار کیا جاتا تھا، اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ رمضان کا زمانہ بڑی رونق کا زمانہ ہوتا تھا، اور وہ اپنے والد اور بڑے بھائی کے ساتھ سیر یزہ کی جامع مسجد میں تراویح پڑھنے پابندی کے ساتھ جاتے تھے، قاری

---

[1] یہ خود نوشت روز نامہ ینی آسیا استنبول میں ۵ جنوری ۱۹۷۰ء سے ۲۷ جنوری ۱۹۷۰ء تک بائیس قسطوں میں شائع ہوئی ہے، اشرف ادیب نے یہ حالات ینی آسیا کے مالک اور ناشر مصطفیٰ یولداتوتی متوفی سنہ ۱۹۷۰ء کے اصرار پر لکھنا شروع کیے تھے، ابھی سنہ ۱۹۱۲ء تک ہی پہنچے تھے کہ سنہ ۱۹۷۱ء میں اشرف ادیب کا بھی انتقال ہو گیا، سات سال بعد ان کی اشاعت ہوئی

[2] ایک قسم کی ترکی پیسٹری،

خوش رکھا، حفظ کرنے میں کوئی غلطی نہیں کرتے تھے عصر کی نماز کے بعد تلاوت قرآن کرتا یہ ہوتا تھا، اشرف ادیب نے بھی مقابلہ میں حفصہ کے مقام حاصل کیا، اشرف ادیب نے اپنے آبائی وطن کی ان تمام باتوں کا بڑی حسرت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اور آخر میں افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے گمراہی کا راستہ اختیار کیا جس کی وجہ سے ہمارا یہ وطن جو جنت کی طرح تھا، اور جسے سونے کی سرزمین کہا جاتا تھا، ہمارے ہاتھ سے ایسا نکلا کہ اب وہاں جا بھی نہیں سکتے، یہ ساری باتیں خواب و خیال بن گئیں"

ابتدائی تعلیم اشرف ادیب کے والد جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، پڑھے لکھے نہیں تھے، اور ان کو بیٹے کی تعلیم سے بھی خاص دلچسپی نہیں تھی، وہ اچھے کپڑے پہننے اور شان کی زندگی گزارنے سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے، لیکن ان کے برخلاف والدہ کو بیٹے کی تعلیم سے بہت دلچسپی تھی، اور انھوں نے اس معاملہ میں بڑی ذمہ داری اور ایثار کا ثبوت دیا، وہ بیٹے کی پڑھائی کی خود دیکھ بھال کرتی تھیں، بلکہ مدد دیتی تھیں، حکم تھا کہ مغرب کی اذان پر کھیل کو ختم کر دیا جائے اور سبق یاد کیا جائے،

اشرف ادیب نے اپنی بسم اللہ کی تقریب، ختنہ کی رسم اور حفظ قرآن کی تقریب کا بڑا دلچسپ حال لکھا ہے، انھوں نے ابتدائی اور رشدی مدرسہ کی تعلیم احمد پاشا مکتب میں حاصل کی، جو ان کے گھر سے ایک کیلومیٹر کے فاصلہ پر تھا، اس کے بعد انھوں نے قرآن حفظ کیا۔ قرآن حفظ کرنے کے لیے ان کے استاذ ابراہیم آفندی نے والدین کو آمادہ کیا تھا، حافظ قرآن بننے کے بعد جو تقریب ہوئی، اشرف ادیب نے اس کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اس کے بعد وہ اعدادی مدرسہ میں داخل ہو گئے، جو کالج کے برابر سمجھا جاتا تھا اشرف ادیب نے علوم عربیہ کے استاد مفتی زادہ عصام الدین آفندی اور حفظ قرآن کے

استاذ ابراہیم آفندی کا بڑی عقیدت، محبت اور احسان مندی کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، اور بتایا ہے کہ انہوں نے کس طرح قدم قدم پر ان کی حوصلہ افزائی کی، اعدادی مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اشرف ادیب جامع مسجد میں عصام الدین آفندی کے درس میں بھی شرکت کرتے تھے۔ عصام الدین آفندی ایک مرتبہ ان کو مفتی صاحب کے دفتر کے کتب خانہ میں لے گیے، اور اس عظیم الشان کتب خانہ کو دکھا کر دعا دی کہ انشاءاللہ ایک دن تم کو بھی ایک ایسے ہی کتب خانہ کا مالک بنا دے، اشرف ادیب تعطیل کے دنوں میں اس کتب خانہ سے استفادہ کرتے، یہاں جو علماء آتے ان سے عصام الدین آفندی اپنے شاگرد کا تعارف کراتے ہوئے کہتے کہ یہ ایک مختنتی طالب علم ہیں۔ اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ وہ جامع کے درس کے علاوہ خصوصی صحبتوں میں بھی فیضیاب کرتے تھے، اور اگر میں ایک ہفتہ ان کی ملاقات سے محروم ہو جاتا تو خلاء محسوس کرتا تھا۔

اس زمانہ میں ترکی ادب میں ایک نئی تحریک کا زور تھا، جو ادبیات جدیدہ کہلاتی تھی، چونکہ ادبیات جدیدہ کے ادیب اور شاعر رسالہ "ثروت فنون" کے گرد جمع ہو گیے تھے، اسی لیے ادبیات جدیدہ کے اس دور کو جو ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک رہا، ثروت فنون کا دور بھی کہا جاتا ہے، رسالہ ثروت فنون ۱۹۰۰ء میں سلطان عبد الحمید کے حکم سے بند کر دیا گیا، لیکن ادبیات جدیدہ کی تحریک جاری رہی، اور ۱۹۰۸ء میں جب ترکی میں مشروطیت یعنی آئینی حکومت قائم ہوئی تو یہی تحریک فجر آتی، یعنی آنے والی صبح کہلائی، ادبیات جدیدہ کے ادیب، ناول نگار اور شاعر فرانسیسی ادب سے بہت متاثر تھے، اور ان کی زبان میں عربی الفاظ اور محاورات کی بھرمار ہوتی تھی، ایک دفعہ اشرف ادیب نے ثروت فنون میں نئے ادیبوں کی ناولوں اور منظوم کلام کے مجموعوں کا اشتہار دیکھا، تو یہ کتابیں ڈاک سے

ہیں، ایک دفعہ اشرف ادیب ان کتابوں کا مطالعہ کر رہے تھے کہ ان کے استاذ
م الدین آفندی نے ان کو دیکھ لیا، لیکن تادیب کرنے کی بجائے یہ مشورہ دیا کہ ادب کی
ں کا مطالعہ اچھا ہے، لیکن اپنے درس کی طرف سے غفلت کر کے ان کا مطالعہ نہیں کرنا چاہیے،
کے بعد خود انہوں نے اشرف ادیب کو عہد تنظیمات کے بزرگ ادیبوں اور شاعروں
کمال، ضیا پاشا اور معلم ناجی کے منتخب اشعار لکھوائے، اور جب بھی موقع ملتا تو اشرف
ے ادبی موضوعات پر گفتگو کرتے،

اشرف ادیب نے ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں اعدادیہ مدرسہ کی تعلیم مکمل کر لی اور انکو
دت نامہ (سرٹیفکیٹ) مل گیا، اب ان کی خواہش یہ تھی کہ استنبول جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل
، اور مدرسۂ قانون میں داخلہ لیں، لیکن ان کے استاذ نے ان کو محکمۂ شرعیہ میں (کاتب)
ل) کی حیثیت سے ملازم کرا دیا، اس طرح ان کو مدرسۂ قانون میں داخلہ لینے میں ایک
ل کی دیر ہو گئی، لیکن انہوں نے یہ مدت ضایع نہیں کی، مدرسۂ قانون میں داخلہ امتحان
ذریعہ ہوتا تھا، اس لیے اشرف ادیب نے ملازمت کے ساتھ اس امتحان کی تیاری بھی شروع
ی، ایک سال بعد ملازمت ترک کر کے انہوں نے استنبول جا کر ۱۹۰۲ء میں داخلہ کا
ان دے دیا، اور اس میں کامیاب ہو گئے،

نون کی تعلیم | مدرسۂ قانون میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے اشرف ادیب کو استنبول آنا پڑا،
ہوں نے ایک ہم جماعت کے ساتھ مل کر ایک کمرہ کرایہ پر لے لیا، تعلیم پر پوری توجہ صرف
دی، مدرسہ میں درسی کتابیں نہیں تھیں، صرف لیکچر دیئے جاتے تھے، اور طلبہ ان سے نوٹ
ا کرتے تھے، اشرف ادیب نے اتنا ملکہ پیدا کیا کہ وہ پوری تقریر ضبط تحریر میں لے آتے تھے،
، لکھتے وقت نقطے نہیں لگاتے تھے، تاکہ جلدی لکھ سکیں، پھر بعد میں اپنی تحریر کو صاف کر لیتے

تھے، اس طرح پوری کتاب تیار ہو جاتی تھی، مدرسہ قانون کے اساتذہ میں کئی ملک کی ممتاز ترین شخصیتیں تھیں، ان سے اشرف ادیب کے قریبی تعلقات قائم ہوگئے، ان میں ایک شیخ الاسلام موسیٰ کاظم[1] تھے، جو "مجلہ"[2] پر درس دیتے تھے، دوسرے اسماعیل حقی مناسترلی[3] تھے، جو اصول فقہ کے استاذ تھے، اشرف ادیب تعلیم کے زمانہ میں ممتاز علماء کے مواعظ میں بھی پابندی سے شرکت کرتے تھے، ان کے استاذ اسماعیل حقی جامع ایاصوفیہ میں پابندی سے وعظ کہا کرتے تھے، جو بڑے پسند کیے جاتے تھے، اشرف ادیب مدرسہ کے درس کی طرح ان کو بھی لکھ لیا کرتے تھے، اس طرح انہوں نے لیکچروں اور مواعظ کے کئی مجموعے تیار کر لیے۔ بعد میں جب انہوں نے اخبار صراط مستقیم جاری کیا، تو یہ لیکچر اور مواعظ اس میں بالاقساط شایع کیے اور بعد میں بعض کو کتابی شکل میں بھی شایع کیا، اس دلچسپی اور محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ اشرف ادیب نے مدرسۂ قانون کے آخری امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی، اور ان کو ۱۹۰۸ء میں ڈاکٹریٹ کی سند مل گئی، اشرف ادیب اس کامیابی پر بہت خوش تھے، جب والدین کے پاس گھر گئے، تو ماں کو تو خوش ہونا ہی تھا، باپ بھی بہت خوش ہوئے، اور اشرف ادیب کے الفاظ میں وہ خوشی میں سگرٹ کے کش پر کش لگائے جارہے تھے، ایک سگریٹ ختم ہوتا تو دوسرا جلا لیتے تھے۔

---

[1] موسیٰ کاظم (۱۸۵۸ء تا ۱۹۲۰ء) سلطنت عثمانیہ میں ایک سو اکیسویں شیخ الاسلام تھے، ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۶ء کے درمیان تین مرتبہ مختصر مدت کیلئے شیخ الاسلام رہے، انجمن اتحاد و ترقی کے رکن بھی تھے، کئی کتابوں کے مؤلف اور مترجم بھی تھے، [2] مجلۂ احکام اسلامیہ، انیسویں صدی کے آخر میں جودت پاشا کی نگرانی میں جن اسلامی ضوابط کو دفعہ وار مرتب کیا گیا تھا، وہ "مجلہ" کہلاتا تھا، [3] اسماعیل حقی مناسترلی (۱۸۴۲ء تا ۱۹۱۲ء) ممتاز عالم اور مصنف اور عثمانی مجلس اعیان کے رکن تھے،

ڈاکٹر بننے کے بعد اشرف ادیب کو مکتب قضاۃ میں معلم نامزد کر دیا گیا، لیکن انھوں نے کم عمری کی وجہ سے یہ پیش کش منظور نہیں کی، اسی زمانہ میں انھوں نے والدین کو بھی استنبول بلالیا، شیخ الاسلام موسیٰ کاظم نے اپنی لڑکی سے اشرف ادیب کا نکاح کر دیا، لیکن پھر کسی غلط فہمی کی وجہ سے رخصتی سے قبل نکاح فسخ کر دیا گیا، اس کے بعد اشرف ادیب نے دوسری جگہ نکاح کیا، جس سے ان کے پانچ بچے ہوئے[1]،

استنبول آنے کے بعد اشرف ادیب کی سرگرمیوں میں بھی وسعت پیدا ہو گئی تھی، اور تعلقات بھی وسیع ہو گئے تھے۔ مدرسۂ قانون میں ان کے کئی ہم جماعت بعد میں بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر پہنچے، حتیٰ کہ وزیر بھی ہوئے۔ اسی زمانہ میں اشرف ادیب کو ملک کے سیاسی معاملات سے دلچسپی پیدا ہوئی، وہ مشہور انقلابی دانشور نامق کمال مرحوم سے بہت متاثر تھے، اور ان کی کتاب "رویا" کو جس پر پابندی لگی ہوئی تھی، چھپ چھپ کر پڑھتے تھے، اور اس کی وجہ سے وہ سلطان عبد الحمید کی استبدادی حکومت کے خلاف ہو گئے، انھوں نے "رویا" کو ہاتھ سے نقل کر کر کے لوگوں میں تقسیم کیا، اس زمانہ میں شیخ الاسلام موسیٰ کاظم اور اسماعیل حقی کے علاوہ جو ان کے اساتذہ تھے، اشرف ادیب کے جن ممتاز لوگوں سے تعلقات قائم ہوئے ان میں عباس حلیم پاشا[2]، محمد عاکف اور ابو العلاء ماردین کے نام اس لحاظ سے اہم ہیں کہ وہ اگلے سالوں میں اشرف ادیب کی صحافتی زندگی میں بہت مددگار

---

[1] اشرف ادیب کی خودنوشت۔ ینی آسیا ۱۶ ؍ جنوری ۱۹۷۰ء [2] عباس حلیم پاشا (سنہ ۱۹۲۶ تا سنہ ۱۹۳۴ء) محمد علی پاشا والی مصر کے پوتے اور وزیر اعظم سعید حلیم پاشا کے چھوٹے بھائی تھے، عیز اور اہل علم کے قدرداں تھے، عاکف کی دل کھول کر سرپرستی کی وہ ان کو ولی نعمت کہکر مخاطب کرتے تھے، اور اپنے کلام میں جگہ جگہ ان کا تذکرہ کیا ہے،

ثابت ہوئے،

صراط مستقیم | ترکی اسلامی دنیا کا پہلا ملک ہے جہاں آئینی بادشاہت قائم کی گئی تھی، یہ حکومت نوجوان عثمانیوں کی کوشش سے جن میں نامق کمال، ضیا پاشا اور مدحت پاشا کے نام سرفہرست ہیں، ۲۰ مارچ ۱۸۷۷ء کو قائم ہوئی تھی۔ آئین کے تحت چھیانوے (۹۶) ممبروں پر مشتمل ایک پارلیمنٹ قائم کی گئی، جس میں چھپن (۵۶) مسلمان اور چالیس (۴۰) عیسائی ممبر تھے۔[۵] یہ پارلیمنٹ سلطان عبدالحمید (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) کی تخت نشینی کے فوراً بعد ان ہی کے حکم سے قائم کی گئی تھی، لیکن ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ سلطان نے آئین معطل کر دیا، اور پارلیمنٹ برخاست کر دی۔ اس کے بعد سلطان عبدالحمید اور آئینی حکومت کے حامیوں کے درمیان مستقل کشمکش شروع ہو گئی، یہ کشمکش بالآخر ۱۹۰۸ء میں اس وقت ختم ہوئی جب فوج کے ایک گروہ نے جس میں نیازی بے اور انور پاشا نمایاں تھے، سلطان کو آئین بحال کرنے پر مجبور کیا۔ ۱۹۰۸ء میں چونکہ پہلی مشروطی (آئینی) حکومت بحال ہوئی تھی، اس لیے اس کو دوسری مشروطیت کہا جاتا ہے،

ایک ترک مصنف نے لکھا ہے کہ دوسری مشروطیت کا دور (۱۹۰۸ء تا ۱۹۱۸ء) اگرچہ ایک مختصر دور ہے، لیکن ترکوں کے افکار کی تاریخ میں بہت اہم دور ہے، اس دور میں ایک عظیم سلطنت کے ماضی، حال اور مستقبل کے بارے میں ہر قسم کے سوالات زیر بحث آئے اور ان کا جواب دینے کی کوشش کی گئی، یہ دور ترکی کے ماضی اور حال کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس زمانہ میں مشرق و مغرب کے درمیان امتزاج اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں دینی مسائل پر خوب بحث و مباحثہ

---

۵ ثروت صولت: بدیع الزمان سعید نورسی ص ۴۷ (البدر پبلی کیشنز لاہور ۱۹۷۷ء)

ہوئے۔ (ڈاکٹر سلیمان خیری بولائے: ترکی میں روح اور مادہ کی کش مکش ص ۱۴۰،
استنبول ۱۹۷۹ء)

آئین بحال ہوتے ہی سیاسی سرگرمیوں کی آزادی مل گئی، اور صحافت پر عائد پابندیاں بھی ختم ہو گئیں۔ آزادی ملتے ہی گھٹے ہوئے جذبات نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی، انجمن اتحاد و ترقی جس کی کوششوں سے آئینی انقلاب آیا تھا، متضاد قسم کے عناصر پر مشتمل تھی، پارٹی میں صرف سلطان عبدالحمید کے استبداد کے خلاف اتحاد تھا، اس کے ارکان میں کسی قسم کی نظریاتی وحدت نہیں تھی۔ اس میں مغرب پرست بھی تھے اور دینی عناصر بھی، ملحد اور آزاد خیال فری میشن بھی تھے، اور یہودیوں کو بھی پارٹی میں اچھا خاصا اثر حاصل تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک نے اپنا اپنا راگ الاپنا شروع کر دیا اسلام اور اس کی تعلیمات کے خلاف بھی آوازیں اٹھنے لگیں، اخبارات کیڑے مکوڑوں کی طرح نکل آئے، دوسری مشروطیت سے پہلے استنبول سے صرف چار اہم اخبار نکلتے تھے، ۲۳ رجولائی ۱۹۰۸ء کو مشروطیت کی بحالی کا اعلان ہونے کے بعد اخباروں اور رسالوں کی تعداد تین سو ترپن ۳۵۳ تک پہنچ گئی،[1]
اشرف ادیب نے بھی اس آزادی سے فائدہ اٹھایا، اور اپنے دوست ابو العلاء ماردین کے ساتھ مل کر ایک ہفت روزہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا، اخبار کا نام "صراط مستقیم" رکھا گیا محمد عاکف کو اس کا مدیر مقرر کیا گیا "صراط مستقیم" کا پہلا پرچہ ۱۱ر اگست ۱۹۰۸ء کو نکلا دوسری مشروطیت کے بعد نکلنے والے اخبار اور رسالوں میں سے بیشتر کی زندگی بہت مختصر ہوئی ۱۹۱۶ء تک ان کی تعداد ساڑھے تین سو سے گھٹ کر صرف آٹھ رہ گئی،[2]

---

[1] ترک دلی و ادبیاتی انسائیکلوپیدیسی جلد اول ص ۳۲۳ (استنبول ۱۹۷۷ء) [2] ایضاً،

"صراط مستقیم" ان میں سب سے زیادہ جاندار اور پائیدار نکلا، ۵ مارچ ۱۹۲۵ء تک یہ ہفت روزہ شایع ہوتا رہا، اس مدت میں اس کی پچیس ۲۵ جلدیں اور چھ سو اکتالیس ۶۴۱ شمارے شایع ہوئے، ساڑھے تین سال تک "صراط مستقیم" کے نام سے شایع ہوتا رہا، اور اس مدت میں اس کی کل سات جلدیں نکلیں، پھر آٹھویں جلد سے (۱۹۱۲ء) نام "سبیل الرشاد" کردیا گیا۔ اس مدت میں صرف پہلی عالمی جنگ کے بعد آزادی کی جنگ کے زمانہ میں غیر یقینی حالات کی وجہ سے اس کی اشاعت میں خلل پڑا، ورنہ ساری مدت پابندی سے نکلتا رہا، ۱۹۲۵ء میں قانون تحفظ عامہ کے تحت بند کردیا گیا۔ لیکن جب ترکی میں ایک پارٹی کی حکومت کا دور ختم ہوا تو مئی ۱۹۴۸ء سے "سبیل الرشاد" پھر نکلنا شروع ہوگیا، اور ۱۹۷۱ء میں اشرف ادیب کی وفات تک جاری رہا۔

اشرف ادیب نے اپنے ابتدائی دور کے ایک مقالے میں لکھا تھا کہ ہم نے اسلام کو اس کے اصلی ماخذ سے نہیں بلکہ ماں باپ سے سیکھا ہے، اور اس طرح جو کچھ سنا اس کو دین سمجھتے ہیں، اس کے نتیجہ میں بے شمار خرافات، توہمات اور رسم و رواج دین میں داخل ہوگئے ہیں۔ جن کا اصل دین سے تعلق نہیں، ان غیر اسلامی عقائد کی وجہ سے ایک طبقہ میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ دین ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ "صراط مستقیم" سے وابستہ لوگ اگر ایک طرف اس مرض کا علاج دین کے اصل سرچشمہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، تو دوسری طرف وہ یوروپی افکار اور علوم سے بھی استفادہ کرنا چاہتے ہیں۔ (ڈاکٹر سلیمان خیری بولائے: ترکی میں روح اور مادہ کی کش مکش ص ۲۵ بحوالہ صراط مستقیم شمارہ ۱۰)

صراط مستقیم ایک ملی، اسلامی اور علمی پرچہ تھا۔ اس کا سیاست اور سیاسی پارٹیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسلام پر کیے جانے والے اعتراضات کا جواب دینا۔ اسلامی دنیا

خصوصاً سلطنت عثمانیہ سے [illegible] کی اشاعت کے [illegible] کے
مقاصد میں سے تھے، ترکی کے ممتاز ترین اہلِ قلم اس میں مضامین لکھتے تھے، [illegible]
زبانوں سے ترجمے بھی کیے جاتے تھے، محمد عبدہ، فرید وجدی اور دوسرے مصری علماء کے
مضامین کے ترجمے شایع ہوتے تھے، فرید وجدی کی کتاب "مسلمان عورت" صراطِ مستقیم
میں قسط وار شایع کی گئی، مولانا شبلی نعمانی نے مصر کے مسیحی مصنف جرجی زیدان کی کتاب
تمدنِ اسلامی پر جو تنقید کی تھی، اس کا ترجمہ بھی صراطِ مستقیم میں شایع ہوا، مشہور دانشور اور
سلطنت عثمانیہ کے وزیرِ اعظم سعید حلیم پاشا کے کئی مقالات جن میں ان کا شاہکار اسلام شدن
(Islamization) بھی شامل ہے، "سبیل الرشاد" میں شایع ہوئے، چند ممتاز
ترک اہلِ قلم جو صراطِ مستقیم اور سبیل الرشاد میں پابندی سے لکھتے تھے حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ ابوالعلا ماردین: قانون کے پروفیسر تھے، اور اس موضوع پر متعدد کتابوں
کے مصنف تھے،

۲۔ احمد نعیم: (۱۸۷۲ء تا ۱۹۳۴ء) استنبول یونیورسٹی میں فلسفے کے پروفیسر تھے،
کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "اسلام اور قومیت" اور "اسلامی اخلاق کی بنیادیں" اہم
ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے تجرید بخاری کا ترکی میں ترجمہ بھی کیا تھا،

۳۔ عمر فرید قام (۱۸۶۱ء تا ۱۹۴۴ء) یونیورسٹی میں تاریخ ادب کے پروفیسر
تھے، تصوف، فلسفہ اور ادب خاص موضوع تھا، اور اس پر متعدد کتابیں لکھیں، ترکی کے
علاوہ فارسی کے اچھے شاعر تھے،

۴۔ اسماعیل حقی مناسترلی (۱۸۴۶ء تا ۱۹۱۲ء) اپنے وقت کے ممتاز عالمِ دین تھے،
مدرسۂ قانون میں فقہ کے استاد تھے، اسلامی موضوعات پر کئی کتابوں کے مصنف تھے،

۵۔ اسماعیل حقی ازمیرلی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۴۴ء) یونیورسٹی کے پروفیسر تھے فلسفہ اور تاریخ ادیان خاص موضوع تھے، تقریباً چونتیس ۳۴ کتابوں کے مصنف تھے،

۶۔ شمس الدین گونالتائی (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۱ء) یونیورسٹی کے پروفیسر تھے، تاریخ کے موضوع پر بکثرت کتابیں لکھیں۔ بعد میں ترکی کی انجمن تاریخ کے صدر اور ۱۶ر جنوری ۱۹۴۹ء سے ۲۲ر فروری ۱۹۵۰ء تک مختصر مدت کے لیے ترکی کے وزیر اعظم بھی رہے،

۷۔ شیخ الاسلام مصطفیٰ صبری (۱۸۶۹ء تا ۱۹۵۴ء) عربی اور ترکی میں کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ دینی مجددلر (دینی مجدد) ان کی مشہور کتاب ہے۔

۸۔ محمد حمدی الیالی (۱۸۷۹ء تا ۱۹۴۲ء) ممتاز عالم دین تھے، ترکی زبان میں آٹھ جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآن کے مؤلف تھے،

۹۔ مدحت جمال قونتائی (۱۸۸۵ء تا ۱۹۵۶ء) ممتاز شاعر اور ادیب تھے، نامق کمال اور عاکف پر دو دو جلدوں پر مشتمل کتابوں کے مصنف تھے،

۱۰۔ محمد طاہر بروصالی (۱۸۶۱ء تا ۱۹۲۶ء) دینی، ادبی اور تاریخی موضوعات پر کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں "عثمانلی مولفلری" (عثمانی دور کے مؤلف) جو تین ضخیم جلدوں میں ہے، سب سے مشہور ہے،

ان کے علاوہ شیخ الاسلام موسیٰ کاظم بھی (جن کا تذکرہ گزر چکا ہے) "صراط مستقیم" کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے،

اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے یا نہیں، اسلام کی تعلیمات عقل کے مطابق ہیں یا نہیں، اسلام میں عورتوں کی حیثیت، تعدد ازدواج، پردہ، قرآن اللہ کا کلام ہے یا نہیں، اور اس قسم کے دوسرے موضوعات پر صراط مستقیم میں مسلسل مضامین شائع

ہوتے تھے، مباحثے چلتے تھے، اور اعتراض کرنے والوں کو مدلل جواب دیئے جاتے تھے،

اگرچہ محمد عاکف "صراط مستقیم" کے مدیر تھے، اور پرچے کو مقبول بنانے میں ان کا حصہ کچھ کم نہ تھا، لیکن پرچے کی اصل روح رواں اشرف ادیب ہی تھے جو مالک اور ناشر تھے، وہ خود بھی مضامین لکھتے تھے اور مضامین حاصل کرنے کا انتظام کرتے تھے۔ عاکف سرکاری ملازم تھے اور کار منصبی کے سلسلہ میں ان کو مستقل باہر رہنا پڑتا تھا، لیکن اشرف ادیب ہر وقت دفتر میں موجود رہتے تھے، طبیعت میں انکساری تھی، اس لیے کبھی اپنی تعریف نہیں کی، اگر کبھی اپنی خدمات کا تذکرہ کرتے تھے تو اپنا نام لینے کی بجائے صراط مستقیم اور سبیل الرشاد کا نام لیتے تھے،

پیچھے بیان کیا جا چکا ہے کہ مشروطیت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی مغرب زدہ ترکوں کے ایک طبقہ نے اسلام پر اعتراضات شروع کر دیے تھے، ان میں آئینی انقلاب کے ایک ممتاز رہنما احمد رضا (۱۸۵۹ء تا ۱۹۳۰ء) کی صاحبزادی سلمیٰ خانم بہت پیش پیش تھیں۔ انہوں نے پیرس میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور طلاق، تعدد ازدواج اور دوسرے اسلامی شعار اور روایات پر مسلسل حملے کر رہی تھیں۔ ان کی اس ہرزہ سرائی کے خلاف ایک طرف صراط مستقیم میں خطوط اور تاروں کا سیلاب آ گیا، تو دوسری طرف انور پاشا اور نیازی بے سے جو مشروطیت کے معمار تھے، شکایتیں کرنا اور جواب طلب کرنا شروع کر دیا، کہ کیا مشروطیت لانے کا یہی مقصد تھا، اور کیا حکومت اس قسم کے خیالات کی تائید کرتی ہے؛ جب یہ شکایتیں پہنچیں تو نیازی بے نے ان کا جواب صراط مستقیم ہی میں دیا[1] کیونکہ یہ اخبار ساری عثمانی سلطنت میں پڑھا جاتا تھا، اور اس کی اشاعت چالیس

---

[1] اشرف ادیب کی خود نوشت، نبی اسیا آستنبول ۱۹ر جنوری ۱۹۷۸ء،

پانچ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔[1]

صراط مستقیم اپنی سادہ اور آسان زبان کی وجہ سے صرف خلافت عثمانیہ کی حدود ہی میں نہیں پڑھا جاتا تھا، بلکہ روس کے ترکی النسل مسلمان بھی اس کو ذوق و شوق سے پڑھتے تھے۔ اور ممتاز ترک ادیب احمد کبکلی کے الفاظ میں مشروطیت پہلی عالمی جنگ اور ترکی کی جنگ آزادی کے زمانے میں (۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۲ء) سب سے طاقتور اسلامی جریدہ صراط مستقیم تھا۔[2]

روس میں مقبولیت | روس میں "صراط مستقیم" کی مقبولیت کے بارے میں اشرف ادیب اپنی کتاب "محمد عاکف" میں لکھتے ہیں کہ

"صراط مستقیم" عالم اسلام کے ہر حصے میں پھیلنا شروع ہو گیا، خاص طور پر اس کے کئی ہزار نسخے روس جاتے تھے، ایشیا کے دور دراز گوشوں سے عاکف کے پاس خطوط آتے تھے، جس میں رسالے میں شایع ہونے والے مضامین نظم و نثر کی تعریف کی جاتی تھی، ان کی تحریریں روسی مسلمانوں کے درمیان چونکہ بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی تھیں، اس لیے زار کی حکومت "صراط مستقیم" کو خطرناک تصور کرتی تھی، اور اس کے داخلے میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالتی تھی، کبھی خریداروں کو پرچہ نہیں پہنچایا جاتا تھا، اور کبھی مہمل بہانوں کا سہارا لے کر سنسر کے حوالے کر دیا جاتا تھا، اور اس کی پارسل کی پارسل واپس کر دی جاتی تھیں، لیکن عاکف کی شہرت پورے روس میں پھیل گئی تھی، اور وہاں کے ادیب اور اہل قلم اپنے اور ان کے درمیان روحانی تعلق محسوس کرتے تھے، چنانچہ روس سے جو ادیب اور اہل قلم

---

[1] اشرف ادیب کی خود نوشت، یینی آسیا، استنبول ۹ ار جنوری ۱۹۶۷ء، [2] احمد کبکلی: محمد عاکف ص ۱۱ (استنبول ۱۹۶۲ء)

استنبول آتے وہ سید سے صراط مستقیم کے دفتر پہنچتے تھے، مالک کو تلاش کرتے اور ان سے ملاقات کرتے، عبدالرشید ابراہیم[1]، یوسف آقچورہ[2]، اسماعیل گسپرالی اور عیاض اسحاقی جیسے روسی ترک، روسی مسلمانوں کے بارے میں قیمتی اور مفید مضامین "صراط مستقیم" میں اشاعت کے لیے بھیجتے تھے۔"

آغا احمد اوغلو[3]، جو حال ہی میں آذربائیجان سے ترکی آئے تھے، اپنا زیادہ وقت مک کے ساتھ کام کرنے میں صرف کرتے تھے، ان کے قیمتی مقالے اور مضامین صراط مستقیم میں شائع ہوتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"اس زمانہ میں "صراط مستقیم" ہمارے آذربائیجان کے علاقوں میں بہت پڑھا جاتا تھا ہم لوگوں نے حسین زادہ علی بے کے ساتھ مشروطیت سے چار پانچ سال قبل (۱۹۰۳ء یا ۱۹۰۴ء) ایک اخبار نکالنا شروع کیا تھا، اس موقع پر ہماری نظر "صراط مستقیم" پر پڑی جو ترکی اور بیرون ترکی کے مسلمانوں کے درمیان ربط و تعلق قائم کرنے سے متعلق سنجیدہ اور اہم مضامین شایع کر رہا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ یہ پرچہ اسلامی بنیادوں کے تحفظ کے ساتھ جدید نظریات کو پیش کرنے میں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے راستے پر چل رہا

---

[1] عبدالرشید ابراہیم (۱۸۵۰ء تا ۱۹۴۴ء) روس کے ترک مہاجر اور سیاح، جاپان میں اسلام کی اشاعت کی، دنیائے اسلام کے نام سے دو جلدوں میں اپنا سفرنامہ لکھا۔ [2] یوسف آقچورہ (۱۸۷۶ء تا ۱۹۳۵ء)، اسماعیل گسپرالی (۱۸۵۱ء تا ۱۹۱۴ء) اور عیاض اسحاقی (۱۸۷۸ء تا ۱۹۵۴ء) تینوں روسی مسلمانوں کے نامور رہنما تھے، اسماعیل گسپرالی کریمیا کے رہنے والے تھے، اور روسی مسلمانوں کے سرسید کہے جا سکتے ہیں۔ [3] آغا اوغلو احمد (۱۸۶۹ء تا ۱۹۳۹ء) روسی آذربائیجان کے ممتاز رہنما اور دانشور تھے، ۱۹۰۹ء میں ہجرت کر کے ترکی آ گئے تھے۔

ہم اس رسالہ کو بڑی توجہ سے پڑھتے تھے، اور اس کے اقتباسات شایع کرتے تھے[5]۔
ترک انجمن (احمد آق اوغلو) کی مذکورۂ بالا تحریر کا اقتباس دینے کے بعد اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ:

"صراط مستقیم" میں ترکی النسل مسلمانوں کے بارے میں مضامین کی اشاعت سے ترکوں کی دنیا میں بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، ہماری مملکت میں جن لوگوں کو دنیائے ترک کے مطالعہ سے دلچسپی تھی، انھوں نے ان مضامین پر خاص توجہ دی، اور اس کے نتیجے میں دار الفنون اور کتب ملکیہ کی عمارت میں ایک اجتماع کیا گیا جس میں (اشرف ادیب) بھی شریک تھا، اس اجتماع میں تورک دَرنیگی کے نام سے ایک علمی جمعیت قائم کی گئی، جمعیت کا مقصد دنیا بھر کے ترکوں کے ماضی اور حال کے بارے میں تحقیقات کرنا، اور پھر ان معلومات کو ساری دنیا میں عام کرنا تھا، علاوہ ازیں ہمارا مقصد یہ بھی تھا کہ ترکی زبان کو سادہ اور آسان بنایا جائے، جمعیت کے بنیادی قواعد و ضوابط بھی اسی اجتماع میں مرتب کیے گیے، اور اس میں ایک انتظامی کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا، جمعیت کے نقطۂ نظر کو عام کرنے کے لیے "صراط مستقیم" کو پسند کیا گیا، "صراط مستقیم" نے بھی اس بات پر تشکر کا اظہار کیا، اور جمعیت (تورک دَرنیگی) کے قیام پر تمام عالم اسلام کو مبارکباد دی[6]۔

ترک دَرنیگی (انجمن ترک) اس لحاظ سے ترکی کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے، کہ وہ ترکی میں پہلی علمی اور تحقیقی جمعیت تھی، جو خاص ترکوں سے مخصوص تھی، یہ جمعیت ۱۹۰۸ء میں قائم کی گئی تھی، اشرف ادیب نے اس کے بانیوں کے نام نہیں لکھے، لیکن کمال قرہ علی اوغلو نے اپنی کتاب تاریخ ادب ترکی جلد سوم میں اس سلسلہ میں حسب ذیل نام دیئے ہیں[7]:

---

[5] احمد کبکلی: محمد عاکف، ص ۱۳ (استنبول ۱۹۷۲ء) [6] ایضاً، ص ۱۴ بحوالہ صراط مستقیم ص ۳۱۸، ۳ [7] سید کمال قرہ علی اوغلو: تورک ادبیاتی تاریخی جلد سوم ص ۵۲۸ (استنبول ۱۹۸۰ء)

صغانی کی عربی شاعری

از ڈاکٹر حامد علی خاں ریڈر شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

شعر گوئی میں صغانی کا مرتبہ نہایت بلند تھا، وہ ایک فصیح و بلیغ اور قادر الکلام شاعر تھے، اور حسب فرصت و موقع برجستہ اشعار بھی کہتے، ان کے حالات و تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم و فنون، لغت و ادب کے امام تھے، علاوہ ازیں ان کی زندگی کا طویل حصہ عرب ممالک میں گذرا، محاورات پر عبور حاصل کرنے کے لئے سرزمین نجد میں پانچ برس قیام کیا، اور عمر بھر درس و تدریس کے محبوب ترین شغل سے وابستہ رہے، اس لئے کلام شعری عیوب سے پاک اور صنائع و بدائع اور محاسن شعری سے لبریز ہے، اس میں جبالت اور جاہلی شاعری کی طرح رفعت و شوکت عظمت اور آمد ہی آمد ہے، اور آورد کا کوئی نام بھی نہیں ہے، البتہ ان کی نثر و نظم دونوں ہی مشکل اور نادر لغات سے گرانبار ہیں، مگر اس میں تصنع کو بالکل دخل نہیں ہے کیونکہ وہ لغات عرب کے ایک بحر ناپیدا کنار تھے،

الجندی نے اپنے شیخ ابو العباس احمد بن علی سرودی سے نقل کیا ہے کہ سرودی کو اس کے والد نے بتایا تھا کہ انھوں نے صغانی کے کثیر اشعار کو سنا تھا، مگر غالباً نہ تو صغانی نے از خود اپنے کلام کو محفوظ رکھا، اور نہ ان کی وفات کے بعد کسی نے ان کے کلام کی تدوین و حفاظت کی طرف توجہ کی، اس لئے اُن کے کلام کا کوئی مرتب مجموعہ موجود نہیں ہے، حالانکہ اگر تمام کلام محفوظ ہوتا تو ان کا دیوان کافی ضخیم ہوتا، زیادہ تر کلام ضائع ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ وہ عوام کی دسترس سے بالاتر تھا، اور صرف عظیم فضلا ہی اس سے استفادہ کر سکتے تھے، راقم کو مختلف مآخذ سے صرف ایک سو اکتالیس اشعار

دستیاب ہو سکے ہیں، ان تمام اشعار کو ضروری تشریح کے ساتھ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے تاکہ ان کا
دستیاب شدہ کلام یکجا ہو جائے،

اوپر گذر چکا ہے کہ ملک ضیف کے عہد حکومت میں علامہ عثمانی ہندوستان میں قیام سے بیزار ہو گئے تھے، فرائض سفارت سے سبکدوشی کے بعد اپنے فرزندوں کو بھی متنبہ کیا، اور انھوں نے مکان بھر کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی، ان حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک قصیدہ لکھا جو عربی زبان میں ادبی حیثیت سے منفرد اور ہندوستان میں اپنے طرز کا اولین قصیدہ ہے، اس میں لفظی و معنوی صنائع کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے حالات بھی تحریر کئے ہیں، اور زمانے کی ناسازگاری کا ذکر بھی کیا ہے یہ شاعرانہ انداز میں ان کی آپ بیتی ہے، "انسٹھ[59] اشعار پر مشتمل یہ پورا قصیدہ صنعت تجنیس میں ہے"۔

أنساني الدهر أعطاني وأوطاني　　　وحطني ووهاد الخسف اوطاني

(زمانے نے میرے دل سے میرے وطن اور میری نشستگاہوں کی یاد کو فراموش کر دیا اور مجھے قعر ذلت میں گرا کر روند ڈالا)

وكنت أفنيت عمري في رفاهية　　　فعطني ولذيذ العيش انساني

(حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و عشرت میں گذاری تھی، پھر اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، اور میری خوشگوار اور مرفہ الحال زندگی کو بھلا دیا)

وكان قدمني قدراً واكرمني　　　فالان اخرني عنه وانساني

(اگرچہ اس نے میری بڑی قدر افزائی کی تھی، اور وہ میرا بڑا اکرام کرتا تھا لیکن اب اس نے مجھ سے بے وفائی کرتے ہوئے مجھے پیچھے کر دیا، اور بھولا دیا)

وكم غنيت بمغنى العز ذا شرف　　　اجفى المجد اذيالي واردانی

(میں اعزاز کے ساتھ عظیم الشان، اور باعزت محلوں میں رہتا تھا، اور عظمت و بندگی کے ساتھ زندگی

فارغ البال زندگی بسر کرتا تھا)

لا استکین لسلطان ولا ملک　　بعظمه فردانی ثواردانی

(میں کسی بھی بادشاہ کے جاہ و جلال کی وجہ سے اس کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا، مگر زمانے نے مجھے
ہلاک و برباد کر دیا۔)

احل اهلی خرابا بائرا معرا　　کاننی لم اقم یوما العمر انی

(زمانے نے میرے متعلقین کو غیر آباد اور ویران زمین میں فروکش کر دیا ہے گویا کہ میں آبادی میں ایک
دن بھی اقامت گزیں نہیں رہا ہوں)

وصک بالجدب ابیاتی وحاشیتی　　من بعد ما مربی فی الخصب عمران

(ظالم زمانے نے اب میرے مکانات اور مجھ پر تکیہ کرنے والے لوگوں کے لئے خشک سالی اور
پریشان حالی کا پتہ لکھ دیا ہے حالانکہ میری زندگی کے دو دور نہایت خوشحالی اور فارغ البالی میں گذر چکے ہیں)

وردنی خائبا صفر الیدین لقی　　من بعد ما کان بالترحیب حیانی

(اس نے مجھے گری پڑی چیز کی طرح نامراد اور خالی ہاتھ واپس کر دیا حالانکہ اس سے پہلے وہ مجھے
خوش آمدید و عمر دراز باد کہہ چکا تھا۔)

وکان احیاء هذا الصقع لی تبعا　　فهل یدین من الاحیاء حیان

(اس دنیا کے سب ہی رہنے بسنے والے میرے فرمانبردار تھے، مگر اب یہ حالت ہے کہ کوئی دو
شخص بھی میری اطاعت کرنے والے نہیں ہیں)

ومسنی بالیم الضر معتسفا　　لما طوی لی اعوانی واعیانی

(اس نے ظلم پر کمربستہ ہو کر مجھے بڑی دردناک تکلیف پہنچائی ہے، جبکہ اس نے میرے سرداروں
ممتاز ساتھیوں کو مار ڈالا ہے۔)

وکنت أمی زماناً عزة وسنا ۔۔۔ فالآن جرّت فتاة السّوء أیانی

(میں زمانے کو عزت و وقار کے اعتبار سے تھکا چکا تھا، اور اب زمانہ، بسبب ظلم و ستم نے مجھے تھکا دیا)

وکان لو خضعت نفسی لمرضیة ۔۔۔ ألقی القیاد فأعلا فی و أسانی

(اگر میرا نفس اس کی رضا جوئی کی خاطر اس کے سامنے سرنگوں ہو گیا ہوتا، تو وہ قیادت

کی باگ میرے ہاتھ میں دیتا، مجھے بلند و بالا بناتا، اور مجھے بام عروج پر پہنچاتا)

فالآن لمّا رأی فقری و مسکنتی ۔۔۔ أعلّنی وعلیل السّوء أسمانی

(لیکن اب جبکہ اسے میرے فقر و فاقہ میں مبتلا ہونے کا یقین ہو گیا، تو اس نے مجھے بیمار بنا دیا اور

مجھے بدترین بیمار کا نام دیا)

وحین کنت حدیث السن ذا اشر ۔۔۔ منی عطائی وافتانی واسنانی

(جس وقت میں نوعمر اور سخت فراخ تھا، تو اُس نے مجھے انعامات سے سرفراز کیا غنی اور تونگر بنایا

اور مجھے ممتاز و نمایاں کیا)

ثم ازدرانی اخیراً وانّی عضنی ۔۔۔ من بعد ما نغضت للشیب اسنانی

(پھر اس نے آخر میں مجھے حقیر اور ناکارہ بنا دیا، اور میری شاخوں (یعنی گوشت پوست) کو

نوچنا شروع کر دیا، حالانکہ بڑھاپے کی وجہ سے میرے دانت ہلنا شروع ہو گئے اور خراب ہو گئے تھے)

وکان دوحة عیشی غضة منا ۔۔۔ غضیرة ذات اغصان وافنانی

(میرے عیش کا برگ و بار والا درخت عرصہ دراز تک سرسبز و تازہ رہا اور ہر ایک نعمت سے لطف اندوز ہوا)

حتی اذا ما جنی الدهر الظلم فنا ۔۔۔ قدامی وقدا دیم العمر افنانی

(یہاں تک کہ جب مصائب ڈھانے والا اجابت کا مرتکب ہوا تو میرا قدیم قد و قامت فنا ہو گیا،

اور ظاہری عمر کے سبز حصن نے مجھے شیخ فانی بنا دیا)

وکنت مما ارتجلت الشعر مقتضبا   یزری علی ابن ابی سلمی وحسان

(جس وقت میں فی البدیہہ شعر کہتا تھا تو اس کے مقابلے میں زہیر بن ابی سلمی اور حضرت حسان رضی کے شعر بے حقیقت معلوم ہوتے تھے)

فالان انی لاعیی الناس قاطبۃ   مذ ضامنی وجمیع الضیم حسانی

(مگر جب سے زمانے نے مجھ پر ظلم کیا ہے، اور ہر طرح کا ظلم مجھے گھونٹ گھونٹ کرکے پلایا ہے تو میں تمام لوگوں میں زیادہ تھکا ماندہ، اور عاجز ہو گیا ہوں)

وکان قصری من راہ قال لہ   یا بانی القصر نعم القصر والبانی

(میرا محل ایسا عظیم الشان تھا کہ جو آتا اور اس کو دیکھتا تو یہ کہتا کہ محل بنانے والا اور محل دونوں خوب ہیں)

فھدہ الدھر ھدا لانظام لہ   ضرب المعول غصن الطلح والبان

(لیکن زمانے نے اس کو بڑی بدنظمی اور بے ڈھنگے طریقے سے اس طرح منہدم کر دیا جیسا کہ کدال دالا ببول، اور بان کی شاخوں پر ضرب لگا کر انھیں ختم کرتا ہے)

وکنت امسی ولی ابوابی مفتحۃ   وکنت اصبح ذا صفح وغفران

(پہلے جب شام ہوتی تو میرے دروازے لوگوں کی فریاد رسی، اور مہمان نوازی کے لئے کھلے رہتے تھے، اور میں دن میں ان سے عفو و درگذر سے کام لیتا تھا)

حتی نبا المرتع الماھول آمنی   فی راس شاھقۃ خلفاء غفران

(مگر جس وقت سے آباد اور سرسبز و شاداب مقامات مجھ سے برہم ہوئے، تو اس وقت سے منحوس زمانے نے مجھے یمن کے دو مشہور قلعوں کے درمیان چکنی اور بلند پہاڑ کی چوٹی سے مانوس بنا دیا یعنی اب بنجر اور ویران زمینوں میں زندگی گزارنا پڑ رہی ہے)

ولی بعد ادا دا لعز دا مر بعد ... فلن لا ما مرا ارض مستوطنات

(عزت وشرافت کے مقام بغداد پر ہمیشہ میرا دل ...
میرے دو بیٹے سکونت پذیر ہیں)

وها ان الا ن کرها لا طوعية ... بالهند والسند ذو عدن وابنان

(اب میں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے تحت سندھ و ہند میں اقامت گزیں ہوں، حالانکہ میں
عدن میں اپنے بیٹوں کے ساتھ رہ چکا ہوں)

وکنت اسیر فی الآفاق من ملاءٍ ... ففرق الدهر افراسی وارسانی

(میں رفقاء کی جماعت کے ساتھ عالم کی سیر کیا کرتا تھا، مگر گردشِ دوراں نے میرے شہسواروں کو مجھ
سے جدا کر دیا، اور مجھے ایک جگہ مقیم بنا دیا)

وکان لی وُصَلُ عند الملوک معًا ... حتی تقضّبتَّ اُفراسی وارسانی

(پہلے بیک وقت بہت سے بادشاہوں سے میرے تعلقات تھے، یہاں تک کہ اے ظالم دہر تونے میرے
سب گھوڑوں کو فنا کر دیا، اور ان کی باگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا)

وکان مسرح عینی ذا طری فغدا ... مرا تعین حمی ارباب مکران

(میری نظر کے سامنے ہر طرح کی سبزی پر مشتمل اور گھنی چراگاہ تھی، اور جانوروں کی رہائش گاہ جو
بوچیان کے نگران نامی ساحلی علاقے کے باشندوں کی طرح محفوظ تھی)

وقد دهانی مکو منه فی صغری ... ولعد شیبی لخطی سنه مکروان

(زمانہ بدنے ایک بار مجھے کم عمری میں دھوکا دے کر مصیبت سے دوچار کیا تھا، اور دوسری
بار بوڑھا ہونے کے بعد اس نے دھوکا دیا، لہذا میری قسمت میں اس کی جانب سے دو فریب آئے)

وصار بینی وبین الا نس فی منفری ... من بعد المبابه بالباب رویان

(پہلے لوگوں کا مجد و سیادت یہ حال تھا کہ لوگ روان شہر بہجوم در ہجوم میرے دروازے
پر حاضری دیا کرتے تھے)

فلا ارى من بجيلة او بنى جُشَم، حولى غريبا وكا من اهل روانِ

(لیکن اب میں قبیلہ بجیل، قبیلہ بنو جشم یا یمن کے روان نامی علاقے کے رہنے والوں کا کوئی
اجنبی مسافر بھی اپنے گرد نہیں دیکھتا)

وكان لى بر جا ارجان ارجية فخيبت ونبا بى روضُ ارجان

(ارجان نامی شہر کے اطراف سے میری امید وابستہ تھی، مگر گردش ایام نے اسے ناکام بنا دیا
اور ارجان کے باغات میرے لئے ناخوشگوار بن گئے)

فصبرت مهما اردت السير معتزمًا المجد إلى ارجان ارجانى

(کیونکہ جب بھی میں نے صبر و تحمل سے کام لیکر ایک سرگرم کوشش کرنے والے کی طرح ارجان
ارادہ کیا تو زمانے نے میرے ارادے کی تکمیل کو میرے لئے موخر کر دیا)

ان كان غيرى فى خفضٍ فى دعةٍ يخلو بدفٍ و مزمار و عيدان

(میرے علاوہ دوسرے لوگ عیش و عشرت میں ہیں، اور خلوت میں دف، بانسری، اور باجوں سے
لطف اندوز ہو رہے ہیں)

فلى من الدهر فى يومى وليلته من التهدد فى غيظ و عيدان

(لیکن میرے لئے زمانے کی طرف سے شب و روز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں،
ایک صبح کو اور دوسری شام کو)

وكنت من قبل لو همت بدائرة صروف دهرى على حرٍ انا الثانى

(اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر زمانہ کسی شریف اور آزاد آدمی کو اپنی گردشوں کی

ولی ببغداد دار العزّ دار بها   فطل بلا ما والرشی مستہلی بہ

(عزت و شرافت کے مقام بغداد پر ہمیشہ ہر ول (از غلیظ مستمر) بنا رہا ہے اس کی یگ میرے دو بیٹے سکونت پذیر ہیں)

وھان الان کرھا لا طواعیۃ   بالھند والسند ذو علان وابنان

(اب میں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے تحت سند و ہند میں اقامت گزیں ہوں، حالانکہ میں عدن میں اپنے بیٹوں کے ساتھ رہ چکا ہوں)

وکنت اسیر فی الآفاق من ملاءِ   ففرق الدھر افراسی وارسانی

(میں رفقار کی جماعت کے ساتھ عالم کی سیر کیا کرتا تھا، مگر گردشِ دوراں نے میرے شہسواروں کو مجھ سے جدا کر دیا، اور مجھے ایک جگہ مقیم بنا دیا)

وکان لی وُصَلٌ عند الملوک معًا   حتی تقضّبتٌ أفراسی وارسانی

(پہلے بہت وقت بہت سے بادشاہوں سے میرے تعلقات تھے، یہاں تک کہ اے ظالم دہر تو نے میرے سب گھوڑوں کو فنا کر دیا، اور ان کی باگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا)

وکان مسرحٌ عینی ذا طوبی فغدا   مراتعی حمی ارباب مکران

(میری نظر کے سامنے ہر طرح کی سبزی پر مشتمل اور گھنی چراگاہ تھی، اور جانوروں کی رہائش کا چھوٹا بلوچستان کے مکران نامی ساحلی علاقے کے باشندوں کی طرح محفوظ تھی)

وقد دھانی مکرٌ منہ فی صغری   ولعد شیبی فحظی منہ مکروان

(زمانہ بدنے ایک بار مجھے کم عمری میں دھوکا دے کر مصیبت سے دوچار کیا تھا، اور دوسری بار بوڑھا ہونے کے بعد اس نے دھوکا دیا، لہٰذا میری قسمت میں اس کی جانب سے دو فریب آئے)

وصار بینی وبین الانس فی سفری   من بعد المبابہ بالمباب رومان

(پہلے لوگوں کا مجھ سے ایسا ربط تھا کہ لوگ وہاں سفر ہجوم در ہجوم میرے دروازے پر حاضری دیا کرتے تھے)

فلا أری من بکیل او بنی جشم، حولی غریبا ولا من أل روان

(لیکن اب میں قبیلۂ بکیل، قبیلۂ بنو جشم یا یمن کے روان نامی علاقے کے رہنے والوں کا کوئی اجنبی مسافر بھی اپنے گرد نہیں دیکھتا)

وکان لی بجا ارجان ارجیة، فخیبت وبنا بی روض ارجان

(ارجان نامی شہر کے اطراف سے میری امید وابستہ تھی، مگر گردش ایام نے اسے ناکام بنا دیا اور ارجان کے باغات میرے لئے ناخوشگوار بن گئے)

فصبرت مهما اردت السیر معترفا، المجد إلی ارجان ارجانی

(کیونکہ جب بھی میں نے صبر وتحمل سے کام لیکر ایک سرگرم کوشش کرنے والے کی طرح ارجان ارادہ کیا تو زمانے نے میرے ارادے کی تکمیل کو میرے لئے موخر کر دیا)

ان کان غیری فی خفض فی دعة، یخلو بدف و مزمار و عیدان

(میرے علاوہ دوسرے لوگ عیش و عشرت میں ہیں اور خلوت میں دف، بانسری اور باجوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں)

فلی من الدهر فی یومی ولیلته، من التهدد فی غیظو وعیدان

(لیکن میرے لئے زمانے کی طرف سے شب و روز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں، ایک صبح کو اور دوسری شام کو)

وکنت من قبل لو همت بدائرة، صروف دهری علی حر انا الثانی

(اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر زمانہ کسی شریف اور آزاد آدمی کو اپنی گردشوں کی

ولی ببغداد دار العز داعر بها   فلولا ما ملاد الضحی مسترها

(عزت و شرافت کے مقام بغداد پر جہاں خلیفہ مستنصر باللہ کا محل ہے وہاں
میرے دو بیٹے سکونت پذیر ہیں)

وهان الان کرها لا طواعیة   بالهند والسند ذو عدن و ابنان

(اب میں اپنی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوری کے تحت سندھ و ہند میں اقامت گزیں ہوں، حالانکہ میں
عدن میں اپنے بیٹوں کے ساتھ رہ چکا ہوں)

وکنت اسیر فی الآفاق من ملاء   ففرق الدهر افراسی وارسانی

(میں رفقاء کی جماعت کے ساتھ عالم کی سیر کیا کرتا تھا، مگر گردش دوراں نے میرے شہسواروں کو مجھ
سے جدا کر دیا، اور مجھے ایک جگہ مقیم بنا دیا)

وکان لی وصل عند الملوک معا   حتی تقضبت افراسی وارسانی

(پہلے ایک وقت بہت سے بادشاہوں سے میرے تعلقات تھے، یہاں تک کہ اے ظالم دہر تو نے میرے
سب گھوڑوں کو فنا کر دیا، اور ان کی باگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا)

وکان مسرح عینی ذا طوبی فغدا   مراعیهن حمی ارباب مکران

(میری نظر کے سامنے ہر طرح کی سبزی پر مشتمل اور گھنی چراگاہ تھی، اور جانوروں کی رہائش کا علاقہ
بلوچستان کے مکران نامی ساحلی علاقے کے باشندوں کی طرح محفوظ تھی)

وقد دهانی مکر منه فی صغری   و بعد شیبی لحظی منه مکران

(زمانہ نے ایک بار مجھے کم عمری میں دھوکا دے کر مصیبت سے دوچار کیا تھا، اور دوسری
بار بوڑھا ہونے کے بعد اس نے دھوکا دیا، لہذا میری قسمت میں اس کی جانب سے دو فریب آئے)

وصار بینی و بین الانس فی منزهی   من بعد البابه بالباب رویان

(پہلے لوگوں کا مجھ سے میل جول تھا کہ لوگ رومان، مغرب، حوم اور حجوم میرے دروازے پر حاضری دیا کرتے تھے)

فلا ارعامن بکیل او بنی جشم، حولی غریبا و کلامن الی رومانِ

(لیکن اب میں قبیلۂ بکیل، قبیلۂ بنو جشم یا یمن کے رومان نامی علاقے کے رہنے والوں کا کوئی اجنبی مسافر بھی اپنے گرد نہیں دیکھتا)

وکان لی یرجا ارجان ارجیۃ، فخیبت ونبابی روضُ ارجان

(ارجان نامی شہر کے اطراف سے میری امید وابستہ تھی، مگر گردش ایام نے اسے ناکام بنا دیا اور ارجان کے باغات میرے لئے ناخوشگوار بن گئے)

فصبرت مھما اردت السیر معترفاً، الجد إلی ارجان ارجانی

(کیونکہ جب بھی میں نے صبر و تحمل سے کام لیکر ایک سرگرم کوشش کرنے والے کی طرح ارجان کا ارادہ کیا تو زمانے نے میرے ارادے کی تکمیل کو میرے لئے موخر کر دیا)

ان کان غیری فی خفضٍ فی دعۃٍ، یخلو بدفٍ و مزمار و عیدانٍ

(میرے علاوہ دوسرے لوگ عیش و عشرت میں ہیں، اور خلوت میں دف، بانسری اور باجوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں)

فلی من الدھر فی یومی ولیلتہ، من التھدد فی غیظو وعیدان

(لیکن میرے لئے زمانے کی طرف سے شب و روز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں، ایک صبح کو اور دوسری شام کو)

وکنت من قبلی لو ھمت بدائرۃ، صروف دھری علی حرّ نا الثانی

(اس سے پہلے میرا یہ حال تھا کہ اگر زمانہ کسی شریف اور آزاد آدمی کو اپنی گردشوں کی

تو میں اپنا پتا تیر ان کا منہ پھیر نے والا تھا)

فصار سھمی فی شیبی وفی کبری　　وفی ارتعاشی بعد الاول الثانی

(اب زمانے میں میرا حصہ مستقل اور مسلسل مصائب میں، جو بڑھاپے، لاغری، اور مرض رعشہ کی صورت میں نازل ہوئے ہیں)

وکان لو صفرت کفای من نشب　　واحتجت افقرنی دھر واعرانی

(ستم پرور زمانے نے میرے ہاتھوں کو مال و دولت سے خالی کر دیا، حالانکہ میں خود ضرورتمند تھا، پھر اس نے مجھے مزید مفلس بنایا اور عریاں کر دیا)

فلان اذ شکرت اخلاف میسرتی　　وارتشت افقرنی دھر واعرانی

(پہلے میں تو تونگر تھا، اور ہر طرح کی سہولت مجھے میسر تھی مگر اب منحوس زمانے نے انتقام لیتے ہوئے مجھے نادار بنا کر چھوڑ دیا)

اَمَرُّ عیشی ما قاسیت فی سفری　　من بعد ما کان حلاہ وحلاّنی

(اپنی زندگی میں سب سے زیادہ تلخی مجھے سفر میں برداشت کرنی پڑی، حالانکہ زمانہ اس سے پہلے سفر کو خوشگوار اور دلچسپ بنا چکا تھا)

معطلاً جسمی الموھون منتقیا　　من بعد ما کان حلاہ وحلّانی

(اب وہ میرے نحیف و لاغر جسم کو بے کار کر چکا ہے، جب کہ پہلے اس نے اسے سنوارا سنوارا تھا، اور مجھے آراستہ کیا تھا)

وعاد قوتی کفا من نوی حشف　　وکان من صدر دراج وحُلانی

(اب میری خوراک مٹھی بھر کھجور رہ گئی ہے، حالانکہ پہلے تیتر اور کبرے کے سینے کا گوشت میری خوراک تھی)

یا قرۃ عینی حیف اللہ بین ازفتہا یداً إلی فلق ماسور یخلانی

(اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک، شریف دونا فرزندو! اگر تم میں ایک قیدی کو نجات دلانے کی طاقت ہو تو مجھے چھڑا لو)

فلست أبصر فی نبھی وفی سنتی جو سرج ولا أبراج حرانی

(کیونکہ مجھے بیداری اور خواب دونوں حالتوں میں سروج کی چراگاہ اور حران کے برج دکھائی نہیں دیتے)

لکن یدق قناۃ فی مدا غسق دھری وماس شدید الطعن حرانی

(لیکن اب باہمی نیزہ زنی میں بڑا ماہر اژدہا، پارہ پارہ کردینے والا، اور رسوا کن زمانہ اپنے ظلم وستم کے تیر میرے جسم پر توڑ رہا ہے)

من بعد ما ربنی طوکا و أکرمنی قولا واجزل لی نوالا وفانی

(پہلے زمانہ نے مجھے بڑے ناز ونعمت سے پالا زبان سے بڑا اکرام کیا، بڑے انعامات سے نوازا، اور مجھے طاقتور جوان بنایا)

حتی اذا صرت اخشی الذئب من کبری الا ذنی بصفیق الوجہ فتان

(یہاں تک کہ جب میں اپنے بڑھاپے کی وجہ سے بھیڑیے سے بھی ڈرنے لگا، تو اس نے مجھے اپنے فتنہ انگیز چہرے کی پناہ میں لے لیا)

وما خفی مضا فضو البحار بہا منح الجواد بلا عد وحسبان

(دنیا میں سمندروں کے پانی کی انتہائی زیادتی نے عطیات کی ایسی بارش نہیں کی ہوگی جس طرح کہ سخی زمانے نے پہلے بے گنتی اور بے حساب داد ودہش کی تھی)

حتی اذا وخط الشیب لقذ الہی جوانی بیا سیب وحسبان

یہاں تک کہ جب بڑھاپے نے گردن کے بالوں کو گھڑی بنا دیا اور زمانے نے دونوں ابروؤں کے ساتھ بڑھاپے سے
میرے سپاؤں کو چھلنی کر دیا)

وکنتُ کو عضتہُ لاقتُ جوانبہ واختفیٰ مخلہ منہ وارضانی

اگر میں زمانے کو اس کے کرتوتوں کا بدلہ دیتا تو اس کے پہلو نرم ہو جاتے اس کی عداوت
مجھ سے مخفی رہتی اور وہ مجھے رضا مند رکھتا تھا)

فصرت اورض بالآصال مُجتزیا وبالغدو فکفلی منہ ارضانؐ

اب یہ حال ہے کہ میں صبح و شام اس سے انتقام لینے کی تیاری کرتا ہوں تو مجھے اس کی جانب
سے دیمک زدہ دو زمینوں کا حصہ ملا ہے)

وکنت من قبل اودعتہ ھنًا کانما حاطہ للحفظ برجانِ

میں جس کے پاس بھی سونا بطور امانت رکھتا تو وہ ایسا محفوظ ہوتا کہ گویا دو برجوں نے حفاظت
کی خاطر اس کا احاطہ کر لیا ہے)

والان کل من استودعتہ اھبا ألصُّ من سارق العربان برجان

اب ہر وہ شخص جس کے پاس میں کچا چمڑا امانت کے طور پر رکھتا ہوں تو وہ عربوں کے برجان
نامی چور سے بھی بڑا چور بن جاتا ہے)

وکنت احسب دھری نافلا وسنا غمزأ فغل سنانی فل نبھانِ

اپنے زمانے کو غافل اور گھسنے والا اور نا تجربہ کار سمجھتا تھا لیکن اس نے میرے بھالے کو
اس طرح بیکار بنا دیا جس طرح کہ نبھان بیکار بنا دیتا تھا)

لما رأمی اتاط عن نصرز افرتی من آل حاتم الطائی نبھانِ

تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۵۵تا ۵۸

(جب زمانہ بدلنے حاتم طائی بنہانی کے خاندان کی طرف سے میرے اقارب و انصار کی مدد کو دیکھا

تو اس نے کسی سے مشورہ کئے بغیر اپنی رائے سے سلسلہ منقطع کر دیا)

فقلت یا دھر سالمنی مسالمۃ　　فاننی عُمَرِیٌّ ثم صاغانی

(تب میں نے کہا: اے زمانہ تو میرے ساتھ مصالحت کر لے کیونکہ میں حضرت عمرؓ بن الخطاب کی اولاد

سے ہوں اور میرا وطن صغان ہے)

فانصاع ینقاد اذ عانا و سالمنی　　و مدّ ظبعی و ناغانی و صاغانی

(یہ سن کر وہ میرا سچا فرمانبردار بن گیا، اس نے مجھ سے مصالحت کر لی، میرے بازو دراز کر دیئے، مجھ سے

قریب ہوا اور میری طرف ہمہ تن گوش ہو گیا)

فصار شکوای شکرا والجوی فرحا　　والعتب عتبی و قادانی و ناجانی

(اس لئے اب میرا شکوہ شکر سے اور غم خوشی سے بدل گیا، ناراضگی رضامندی میں تبدیل ہوگئی، اس نے

مجھ سے سرگوشیاں کیں، اور کہا کہ میں تجھ پر قربان)

وذاک للصفح منّی عن جنایتہ　　والصفح یجدی کثیراً ان جنی جانٍ[1]

(یہ تبدیلی اس لئے ہوئی کہ میں نے اس کے ظلم و ستم سے درگذر کیا، اور گنہگار کے گناہ سے درگزر کرنا

بڑا فائدہ مند ہوتا ہے)

علامہ صغانی مدرسہ تتشیہ میں استاد مقرر ہو کر گئے، تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور تدریس

سے فارغ ہو کر برجستہ حسب ذیل اشعار پڑھے:-

فہا کُم یا سادتی　　منّی دروساً عشرۃ

فانتم معادن الفضل الکرام البررۃ

ولستُ حبراً عالما　　لکنہا محبّرۃ

---

[1] تاریخ ثغر عدن ج ۲ ص ۵۵ تا ۵۸۔

فقلت ردوا أخاكم　　　فسلكم من عذره

(میرے بزرگو! مجھے درس بھی پڑھ لو، آپ لوگ علم وفن کے مخزن اور ایک اور شریف ہو میں کوئی زبردست عالم نہیں ہوں لیکن یہ کسی بھی مدرسے کے جاننے کے لائق ہیں۔ تمہارا بھائی تم لوگوں سے عذر قبول کرنے کی درخواست کر رہا ہے کیا تم جیسے ہی لوگ معذرت خواہ کا عذر قبول کیا کرتے ہیں)

یاقوت رومی نے صراحت کی ہے کہ علامہ صغانی نے اپنی تصنیف مناسک کو[1] "ان اشعار پر ختم کیا ہے"۔

شوقی الی الکعبة الغرا قد زادا　　　فاستعمل القلص الوخادة الزادا

(معزز خانۂ کعبہ کی زیارت کے لئے میرا شوق بہت زیادہ ہو چکا ہے، اس لئے شترمرغ کی مانند لمبی ٹانگوں والی تیز رفتار اونٹنیوں کو زادِ راہ کے طور پر استعمال کر)

ادا فلک الحنظل العامی منتجعاً　　　وغیرک انتجع السعدان وازدادا

(کیا تجھے عام تلخ اندرائن پسند ہے، حالانکہ تیرے علاوہ دوسرے اشخاص اونٹوں کا بہترین چارہ تلاش کر چکے)

اتعبت سرحلحتی آض عن کثب　　　نیا قہا رزحاً والصعب منقاداً

(تو نے اپنے جانوروں کو تھکا دیا یہاں تک کہ اونٹنیاں لاغر ہو کر ریت کے ٹیلے سے واپس ہوئیں اور دشوار امر آسان بن گیا)

فاقطع علائق ما ترجوه من نشب　　　واستودع الله اموالا واولادا

(متوقع موانع یعنی غیر منقولہ جائداد یا مال و مویشی کی وابستگی کو ختم کر اور اموال و اولاد کی

---

[1] ماہنامہ معارف ۴۰۴ : ۱۹۹ ، ۱۹۰ ، ۵۲ معجم الادباء ۹ ـ : ۱۸۹

امانت اللہ کو سونپ دے)

علامہ سیوطی نے صغانی کی ایک مناجات کے درج ذیل پانچ اشعار نقل کئے ہیں[۱] ان میں لفظ المرتجی کو بطور قافیہ استعمال کیا ہے، اور ہر شعر میں جداگانہ معنی مراد لیا ہے، جیسا کہ ترجمہ سے واضح ہوتا ہے،

یاراحم الطفل الرضیع المرتجی　　یا فاتح الباب المنیع المرتجی

(اے حقیر و مضطرب شیر خوار بچے پر رحم کرنے والے، اے محفوظ اور بند دروازے کے کھولنے والے)

ان کان غیری مبلسا مستیئسا　　فانا الفقیر المستکین المرتجی

(ممکن ہے کہ میرے علاوہ بھی کوئی شکستہ دل اور مایوس و نامراد ہو، مگر میں یقیناً فقیر، مسکین اور رحمت کا امیدوار ہوں)

او کان غیری آمنا فی سربہ　　فان المتیخ المستجیر و المرتجی

(یا ممکن ہے کہ میرے سوا کوئی شخص صرف اپنے خاندان میں مامون و محفوظ ہو، لیکن حقیقت میں کرم کا طالب وہ ہے جو پناہ کا متلاشی اور خائف ہو)

استانت الراحات عنی وانات　　یامن یقرب کل ناءِ مرتجی

(ہر طرح کا عیش و آرام ختم ہو چکا ہے، اور ہر ایک راحت دور ہو گئی آپ ہی ہر ایک بعید اور دشوار مقصد کو قریب کر دیتے ہیں)

انت الذی فیہ شفاء السقم لا　　قضب الذرنبی ولا دواء المرتجی

(آپ ہی ایسے امراض میں شفا عطا فرما سکتے ہیں جن کا علاج نہ زرنبی کا نشکر کرتا ہے، اور نہ کوئی دوسری مفید دوا)

---

[۱] بغیۃ الوعاۃ فی طبقات اللغویین والنحاۃ

[illegible] بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

خالقوا باکم واحکوا عقدة الادب ترقوا مراقی یھوا ماذر والرتب

(اخلاق وعادات میں اپنے والد کے مشابہ بنو اور ادب کی گرہ باندھو یعنی فنون ادب میں کمال حاصل کرو تو تم لوگ بلندی کے ایسے زینوں پر چڑھ جاؤ گے جن تک پہونچنے کے لئے بڑے بڑے صاحبانِ قدر و منزلت خواہاں ہوتے ہیں)

اذا ما اتی رمضان فبتک جبال التوانی بموسی رمیضه،

(جب ماہ رمضان آجائے تو گرم و تیز استرے سے غفلت و کاہلی کے علاقوں کو منقطع کردو)

واعرض عن اللغو فی صومه وقصّر طوال الامانی العریضة

(رمضان کے روزوں میں لغویات اور غلط کام سے بچ، اپنی طویل و عریض امیدوں کو انتہائی کم اور مختصر بنا دو)

وامض الی الخیر فیه وشو بمعد البرق المعالی و میضه

(ماہ صیام میں نیک اعمال پر برابر نظر رکھو، اور کوشش کرکے عظمت و رفعت کی برق کی چمک کو پیش نظر رکھو)

وشدّ علی غرصة الاعتماد فقد ایبس العمر روضاً عریضه

(زندگی کے معرکۂ کارزار میں نیک اعمال کے ذریعہ تیزی سے گامزن ہو جاؤ کیونکہ طویل اور بے عمل زندگی نے وسیع باغ کو بھی خشک کر دیا یعنی باقی ماندہ زندگی کو غنیمت سمجھو اور آخرت کے لئے زادِ راہ حاصل کرو) ؎۱۵

؎۱۵ پروفیسر ڈاکٹر مختار الدین احمد صاحب کے پاس بوڈلین لائبریری کے ایک مخطوطہ نمبر ۱۵۷/

وصاحب ارضنا حصیفا رضق ودمث لجنبک ارضا اریضه

(خوش اخلاق، متواضع، صائب الرائے اور پختہ عقل والے کے ساتھ دوستی کرنا اور اس کے ساتھ وقت گذار، ناپسند کردہ، شاداب اور زرخیز زمین کو اپنے پہلو کے لئے نرم بنا، یعنی استراحت کو ترک کرکے اس راہ مبارک میں عبادت کر)

وایقن بانّک فی فرصۃ الممات فبادر فوات الفریضہ

(یقین رکھ کہ تجھے موت نے ابھی موقع دیا ہے لہٰذا خوب دھیان رکھ کہ فرائض میں سے کوئی فرض بھی فوت نہ ہونے پائے)

واقرض لفقرک قبل الرحیل فقد أنشد الموت فیک قریضہ

(دار بقا کو رحلت سے قبل اپنے مال سے ضرورتمندوں کی اعانت کر تاکہ آخرت میں تو تہی دست نہ ہو کیونکہ موت نے تیرے بارے میں اپنا شعر پڑھ دیا ہے یعنی بزبان حال فنا کا اعلان کر دیا ہے)

ولکن جھلت اعاریضہ واحببت حبا شدیداً عروضہ

(لیکن تو اس کے اشعار کے اوزان سے ناواقف ہے، حالانکہ علم عروض سے تیرا بہت گہرا تعلق ہے)

وما ان تحض علیٰ طاعۃ وتنزل من کل خیر حضیضہ

(ایک طرف تو اپنے آپ کو اطاعت پر نہیں اکساتا ہے، اور دوسری طرف ہر ایک بھلائی میں پست مقام ہی پر ہوتا ہے)

(وانقض ظھرک عبا المعاصی وقد اسمع الصوت منہ نقیضہ

(معاصی کے بار نے تیری پشت کو بوجھل بنا دیا ہے، جب کہ موت نے اپنی جانب سے مخالف فیصلے کی خبر محکم طریقہ سے سنا دی ہے)

... حبك الخل عندی لا لانا خف وعقت من الغنی کنزا ینبه

بچوں کے عزیز ہونے اور اس کے نا سمجھ ہونے پر مجھے تعجب ہے، اور تو نے جسیم ہونے کے بعد بڑھاپے

کی بگڑی ہوئی حالت کو مکروہ سمجھا، یعنی بڑھاپا ہونے پر فطری تغیرات اور لاغری ضروری ہوتے

ہیں، لہٰذا پہلے ہی خدا کی اطاعت کی جائے اور آخرت میں کامیابی کے لئے عبادت کیجئے!

علامہ کا حسب ذیل قصیدہ اپنی نوعیت کا پہلا قصیدہ ہے جس کو اردو میں منتقل کرنا

دشوار ہے۔ طویل تشریح کے بعد ہی اس کی وضاحت ممکن ہے۔ اس لئے صرف عربی اشعار

پر نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، یہ قصیدہ درج ذیل تین حصوں میں منقسم ہے:-

۱۔ خدا کی حمد و ثنا اور رسولؐ کی نعت کے بعد یہ صراحت کی ہے کہ طلبہ کو یاد

کرانے کے لئے قرآنی سورتوں کی تعدادِ آیات کو نظم کی صورت میں پیش کیا گیا ہے چونکہ

آیات کی تعداد میں اہل کوفہ کا مسلک مشہور و معروف ہے۔ لہٰذا اسی کو اختیار کیا

گیا ہے، اور سورتوں کا ذکر حساب جمل یعنی ابجد و ہوز کے قواعد کے تحت ترتیب وار بیان

کیا گیا ہے،

۲۔ عموماً ہر مصرعۂ شعر میں ایک ایک سورت کو ترتیب سے ذکر کیا ہے،

۳۔ صحیح تعداد جاننے کے لئے فن حساب کے تین قاعدے تحریر کئے ہیں، ان میں سے کسی

بھی قاعدے پر عمل کر کے آیات کی صحیح تعداد معلوم ہو سکتی ہے۔

الحمد لله العلی الاحد	القادر الفرد الولی الصمد
ملجأ کل مشفق شرید	و امن کل خائف وحید

. . . .

. . . .

جل عن الاشباہ والانداد والمثل والاکفاء والاضداد

ثم صلوٰۃ اللہ والتحیہ تحیۃ زاکیۃ سنیہ

علی الذی اسری بہ رب الوری فوق السموٰت الرفیعات العلی

محمد خیر الانام طرًا ارفعھم قدرًا واعلی ذکرا

وبعد قال ضعیف ملتجی الی صلاح کل من یحبی

شرح فیھا اللہ واعلی قدرھا کما جلا للمومنین امرھا

اردت نظم عدد الاٰیات علی التوالی مشرق الایات

وکان ترتیب حساب الجمل اُولی واحری بالصبی المشتغل

فخضت فیہ طلب التسھیل مقربًا فیہ طریق القیل

مراعیا عدۃ اھل الکوفہ فانھا مشھورۃ معروفہ

وقلت العون من الخلاق علی احتیاز قصب السباق

فاتحۃ الکتاب زادو قبا وتلوھا راق فھید أوقبی

وآل عمران رسول وبنی وفی النساء وجہ قوم عربی

واحسب قری کثیر للمایدۃ وتلوھا قفت سلیمی ھاجۃ

وسورۃ الاعراف رمناوطنا وسورۃ الانفال عدھندونا

وتلوھا قد کان طیروقفص ویونس طاب قراۃ وخص

وھود حبت قاریا کتابہ ویوسف یا اخوتی قرابہ

والرعد جرس ملک وارملہ وتلوھا نصیل بد اوجملہ

والحجر صاد طائرا وارتبا   والنحل قد كل حما ری وکبا

سبحان مثل یوسف فی العدد   والکهف یروی قرطیا دیکا

ومریم صاد حباری رطفر   طه لقد قد هیب دهبر

والانبیاء یا قد یوم مبین   وسورة الحج علو حسن

والمومنون قلبی یلتهب   والنور ساد دانشاً واتعب

وسورة الفرقان زدت غاً   والشعراء نادر روح کاشرا

والنمل صدق جعفراً واقتنص   واحتسب ثدیث حادا القصص

والعنکبوت سل طاق ومضی   والروم سر وجج فالعمر انقضی

سورة لقمان لعثمان دمی   وسورة السجدة علی والحکم

وسورة الاحزاب عمرا یعجبنی   وفی سبا نادی دوا زددنی

وفاطر هم ملکوا واسجوا   لیس جد فوجه وانجحوا

والزاجرات فاق بکر قتما   وص فض حلیه واقتما

واحتسب هوث للزمر   وتلوها فارق هوا ک واصبر

وسورة السجدة لا دار نافع   وسورة الشوری نداو جامع

وسورة الزخرف طیب تاما   وفی الدخان طاوعوا انضا ما

واحتسب ثوال لبة الجاثیه   وسورة الاحقاف هذی لاغیه

سورة ختم الانبیا محمد   خل لعمری ورکا زعسجد

وسورة الفتح طوی کشفها وزل   والحجرات جل جیبی وارتحل

وق هذا مرتبی ومرتقی   والذاریات نشره ونشی

والطور ماء طاهر وعشر — والنجم بات ساهراً وقدري

وعدّ هدى نافع للقمر — وسورة الرحمن عقل الحبر

وعدّ صدق داهيًا للواقعه — والحديد كلّهن طائعه

واحسب بدت كساب للمجادلة — والحشر كُف دموعه وعادله

والامتحان جوهر بلينبع — والصّف دقّ يا سيرٌ ومربع

واحسب امامٌ يرقد للجمعه — ومثلها المنافقون ملمعه

وعدّ يا حازمٌ للتغابن — بهز دصيد للطلاق البائن

ومثلها في سورة التحريم — والملك لهوٌ وفساد الحليم

ون باب نافع والحكم — وتلوها كمثلها فاغتنم

مال وجذر يعدلان عدًّا — لهٗ طريق فاحفظن مجتهدا

نصّف فربع عدد الجذور — واضمم اليه جملة المذكور

ثم خذ الجذر من الكل و(حط بنصف) الجمع — نصف الجذور فاحفظنه و(حط)

وان يكن يعدل مال وعدد — جذرًا فنصف ثم ربّع ما ورد

ثم اطرحا ذا العدد المعينا — وخذ لباقي المال جذرًا بينا

وانقصه من نصف الجذور (اوزد) — عليه يخرج ما سئلت فاجهد

وان يكن يعدل جذر وعدد — مالًا فنصف ثم ربع للرشد

وزد على ذا العدد المربّعا — فجذره ونصف اجذار معا

جواب هذا السائل الممتحن — صديقه ونظمه للمحسن

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ریڈر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد، پاکستان۔

یہ مضمون پاکستان کی ایک سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۷ / ۱۸ فروری ۱۹۸۲ء کے لئے لکھا گیا تھا، مگر مقالہ نگار کی عدم شرکت کی وجہ سے وہ پڑھا نہ جا سکا، اب اسے معارف میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(اصلاحی)

کسی بھی سوسائٹی، ہیئت اجتماعی یا نظام حکومت میں تعلیم کو جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، کسی مخصوص معاشرہ میں کس قسم کی تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے، یہ موقوف ہے اس پر کہ وہ معاشرہ کس قسم کے نظریۂ حیات کا علمبردار ہے، دنیا اور اس کی زندگی کے بارے میں اس کے تصورات کیا ہیں، اس کی اقدار، اس کے معیارات، اس کی اولیات اور ترجیحات کیا ہیں، تعلیم کے معنی سکھانا، مطلق سکھانا، اس لئے بذات خود تعلیم کی اپنی کوئی اہمیت نہیں ہے، اہمیت اس کی ہے کہ سکھاتے کیا ہیں، گویا اصل شے تعلیم نہیں نصاب تعلیم ہے، وہ باتیں ہیں جو سکھائی جائیں، رہا مطلق سکھانے کا عمل تو یہ انسان کا کوئی مابہ الامتیاز عمل بھی نہیں، اس میں انسان اور جانور دونوں برابر ہیں، شیر اپنے بچے کو شکار کرنا سکھاتا ہے، اس کو کم کسی نے دیکھا ہوگا، مگر کتا بلی تو عام پالتو گھریلو جانور ہیں، ایک کتیا یا بلی اپنے نومولود بچے کو اس کے کام کی باتیں کس طرح سکھاتی ہے، اس کا مشاہدہ ہم میں سے اکثر نے کیا ہوگا، بلی اپنے بچوں کو جو کچھ سکھاتی ہے وہ اس کی برادری کے نقطۂ نظر سے شیرنی اپنے بچوں کو جو کچھ سکھاتی ہے وہ اس کے برادری کے نقطۂ نظر سے کتنا اہم ہے، مگر اسی عمل

کوئیک بھی ہے یا ہرن کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو وہ نہ صرف غیر اہم بلکہ حد درجہ ناپسندیدہ بلکہ گھناؤنا فعل نظر آئے گا۔ بعینہٖ اسی طرح کی صورت حال عالم علم انسانی میں پائی جاتی ہے، انسانوں کا ایک گروہ یا طبقہ جس عمل کو احسن شمار کرے گا دوسرا گروہ اس کو بدترین تصور کرے گا۔

دنیا میں تعلیم یا زیادہ صحیح یہ کہ نصاب تعلیم کے جو تصورات انسانوں نے بطور خود اپنے جبلی تقاضوں کے تحت اپنی حیوانی یا انسانی ضروریات کی تکمیل کے لئے قائم کئے، ان کی نسبت مختلف گروہوں اور طبقات کے درمیان اختلاف رائے کا ہونا ممکن ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے، اور اس میں ایک گروہ یا طبقہ دوسرے گروہ یا طبقے کو یا ایک فرد دوسرے فرد کو طاقتور ہونے کے ناطے جبر و تشدد کے ذریعہ تو خاموش کر سکتا ہے، لیکن اسکے پاس تفوق اور برتری کی ایسی کوئی دلیل نہیں جس کو چیلنج نہ کیا جا سکے، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو وہ تمام علوم و فنون جو اب تک انسان نے اپنی فطرت اور جبلت کی اندرونی تحریک سے ایجاد کئے، اور ان کو دنیا میں پھیلایا، ہم ان کو علی الاطلاق خیر و صلاح اور فوز و فلاح کا ضامن قرار نہیں دے سکتے، ان کا حسن و قبح ان کے محل استعمال سے مشروط ہے، لیکن خود حسن و قبح کا فیصلہ اگر مجرد عقل و علم انسانی پر چھوڑ دیا جائے تو پھر وہی سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ معیار اور حَکَم کس کو تسلیم کیا جائے اور اس باب میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی وجہ کیا ہوگی، ترجیح بلا مرجح کی صورت میں راجح اور مرجوح کے درمیان توافق ہم آہنگی پیدا کرنا ممکن نہیں، توافق اور ہم آہنگی کے فقدان کا دوسرا نام فساد ہے، انسانی علم نے ماضی کی نسبت بہت ترقی کر لی ہے، لیکن اس سے انسانی معاشرہ میں صلاح کی بجائے فساد کو فروغ ہوا ہے اور آج دنیا "ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ" کا جو منظر پیش کر رہی ہے، وہ سب کے سامنے ہے، اگر انھیں علوم کو فروغ دینا انبیاء کا مشن بھی ہوتا تو ان کا مقصد بعثت نعوذ باللہ فساد فی الارض ہی قرار پاتا، جس کی توقع آتش پرستوں کے خدا اہرمن سے تو ہو سکتی ہے، جو ان کے نزدیک شر کا خالق ہے، لیکن اللہ رب العالمین سے نہیں ہو سکتی جو کہ رؤف و رحیم اور رحمان و کریم ہے۔

[illegible]

مضمون ... کا مقصد اس عہد ... کی نشاندہی کرنا ہے جو بنیادی تعلیم اور ... تعلیم کے ...

بنیادی فرق کی حیثیت سے موجود ہے۔ جو لوگ اس فرق کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتے غلط بحث کا شکار ہو کر

راستے سے بھٹک جاتے ہیں، دانستہ یا نادانستہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں، خود گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں

کو بھی گمراہ کرتے ہیں، اس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ علم انسانی کی مسحور کن ترقی نے بہت سے

کم نظر مسلمانوں کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے یا کسی مصلحت اور ضرورت کے تحت وہ ناگفتنی باتیں کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں

نظام تعلیم | میرا موضوع ہے عہد نبویؐ میں اسلامی ریاست کا نظام تعلیم، دقت نظر سے کام لیکر دیکھا جائے

تو عہد نبویؐ میں نہ کوئی ریاست تھی نہ نظام تعلیم، ہاں تعلیم تھی، فقط تعلیم، ریاست اور نظام وغیرہ آجکل

کی اصطلاحیں ہیں اور ان کا اپنا ایک تصور ہے، ان کو ہم اس دور سعادت آثار کے احوال و ظروف

اور معاملات و مسائل پر اگر منطبق کریں، جن کی کوئی نظیر نہیں ہو سکتی، کہ وہ اپنی نظیر آپ تھے، تو ہمیں

بڑے اندیشے ہیں، اس کا نتیجہ وہی ہوگا جس کا ذکر اقبالؔ نے کیا ہے

حقیقت خرافات میں کھو گئی ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ ‍ یہ امت روایات میں کھو گئی

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس دور میں ریاست نہیں تھی تو پھر کیا تھا۔ جواب یہ ہے کہ نبوت

تھی صرف نبوت، اور نبوت کے بعد خلافت علی منہاج النبوۃ۔ اس کی جگہ ریاست، سلطنت، حکومت،

بادشاہت اور جمہوریت وغیرہ الفاظ گمراہ کن ہیں، اس عہد کی جو تاریخ جس رنگ میں بھی ہم تک

پہنچی ہے اس میں "ریاست" اور "نظام" جیسی کوئی چیز نظر نہیں آتی، تعلیم کا لفظ بھی نہیں ملا مگر یعلمکم

الکتاب والحکمۃ[51] "، بعثت معلماً[52] " خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ[53] " کی موجودگی میں

یہ نتیجہ نکالنا غلط معلوم نہیں ہوتا کہ تعلیم تھی، ضرور تھی۔ مگر آج کی طرح نہیں۔ آج کی طرح نہ اسکول

اور کالج تھے اور نہ آج کی طرح یونیورسٹیاں تھیں نہ ٹیچر اور پروفیسر تھے، اس لئے تعلیم کے مثبت نتائج

اور ثمرات تھے، آج کی طرح تباہی اور بربادی نہیں تھی فساد اور بگاڑ نہیں تھا، بقول اکبر

---

[51] وہ پیغمبر تم لوگوں کو کتاب و حکمت سکھاتا ہے [52] میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں [53] تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھے اور اسے سکھائے۔

یہاں تک سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا — افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اس لئے میں موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے اس عہد کی تعلیم سے متعلق سیدھے سادے الفاظ میں بعض واقعات اور حقائق کا ذکر آج کل کی گمراہ کن اصطلاحات کا سہارا لئے بغیر کروں گا، کم سواد نامکار نوجوان ترنگ میں آکر اس قسم کی نادانیاں کر جاتے ہیں، میں اس سے عمداً احتراز کروں گا، ایک جگہ میں نے کہیں مضمون میں لکھا ہوا پڑھا، مضمون نگار نے غالباً عہد نبوی میں طب اور حفظان صحت کے موضوع پر خامہ فرسائی کی تھی، غزوات میں ازواج مطہرات اور صحابیاتؓ کی ہنگامی نوعیت کی معمولی مصروفیات کا ذکر کرکے انھوں نے تان اس پر توڑی تھی کہ وہ آجکل کی باقاعدہ تربیت یافتہ نرسیں تھیں، العیاذ باللہ۔ عہد رسالت کی ان محترم، پاک اور مقدس ہستیوں کا تصور کیجئے اور موجودہ ہسپتالوں کی پیشہ ور نرسوں کا تصور کیجئے، اور پھر آج کل کی اسکالرشپ اور دانشوری پر سر پیٹ لیجئے۔

آنحضورؐ حامل کتاب پیغمبر تھے۔ الم۔ ذالک الکتاب لاریب فیہ۔ آپ کو الکتاب کی تعلیم کے لئے بھیجا گیا، یعلمھم الکتاب۔ آپ کا مشن لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینا تھا، اس لئے آپ نے لوگوں کو قرآن پڑھایا اور اپنے پیروکاروں کو بھی یہی تلقین فرمائی۔ خیرکم من تعلم القرآن وعلمہ، تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس نے قرآن پڑھنا سیکھا اور سکھایا۔ اس حدیث میں لفظ قرآن کو پڑھنے کے معنیٰ میں لے کر اس سے مجرد علم یا تعلیم کی اہمیت ثابت کرنا سطحیت ہی نہیں زیغ اور کج فہمی بھی ہے۔ یہ تعبیر منشاے دین سے ہم آہنگ نہیں اور تفسیر بالھویٰ کے زمرے میں آتی ہے، قرآن اور حدیث میں مسلمانوں کو جس تعلیم کی تاکید کی گئی ہے وہ علم دین اور قرآن کی تعلیم ہے اور بس، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں آنحضورؐ نے بعثت سے لیکر وصال تک جس چیز کی تعلیم کا اہتمام فرمایا، وہ قرآن اور صرف قرآن ہے، مسلمانوں کے پاس بحیثیت مسلمان کے پڑھنے کے لئے اس وقت تک اور کچھ تھا ہی نہیں، مقصود بالذات یہی تھا۔ اس کے بعد اگر کچھ اور سیکھنے سکھانے اور پڑھنے پڑھانے کا کہیں سراغ ملتا ہے تو وہ بطور یادگار

ان مختلف علوم و فنون کے. مثلاً سب سے پہلے جب کتاب اللہ کو ضبط تحریر میں لانے کے لئے کتابت کی ضرورت پیش آئی تو لوگوں نے لکھنا سیکھا. اس طرح لکھنا بھی گویا مسلمانوں کی تعلیم کا ایک جزو قرار پایا، اسی طرح خطوط، فرامین اور معاہدات کے لئے بھی فن تحریر کو سیکھنے اور سکھانے کی ضرورت ہوئی۔

وراثت کی تقسیم اور لین دین کے معاملات کے لئے تحریر کے ساتھ حساب کی بھی ضرورت ہوئی تو اس کی تعلیم بھی دینے دلانے کا سلسلہ شروع ہوا، قرآن نے ہدایت کی ہے کہ قرض کے لین دین کو، رقم چھوٹی ہو یا بڑی لکھ لیا کرو۔ اذا تداینتم بدین . . . . الخ (البقرہ ۲۸۲) اب ظاہر ہے اس حکم خداوندی کی تعمیل جب تک لکھنا نہ آئے کس طرح ہو سکتی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ قرآن لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے نازل ہوا تھا، درست نہیں، لکھنا پڑھنا دنیا میں نزول قرآن سے پہلے بھی تھا. قرآن رشد و ہدایت کے لئے نازل ہوا، آنحضورؐ قرآن کی تعلیم کے لئے مبعوث فرمائے گئے، آپ کے بعد یہ فرض آپ کی امت کو تفویض ہوا. قرآن اور علم دین کی تعلیم فرض عین قرار پائی جو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لئے لازمی تھی، باقی علوم و فنون کے بارے میں صرف اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ حسب ضرورت ثانوی درجے میں بطور فرض کفایہ عہد نبویؐ کے مسلمانوں کی تعلیم کا حصہ تھے، عہد نبویؐ کی تاریخ کے مطالعے سے جس کے دو ماخذ قرآن اور حدیث ہیں، یہی معلوم ہوتا ہے.

قرآن کو لوگ کس طرح پڑھتے پڑھاتے تھے. پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کے دونوں ہی ذریعے استعمال کئے جاتے تھے، یعنی سینہ بہ سینہ زبانی بھی اور کتابت و تحریر کے ذریعہ بھی، جن میں پہلا طریقہ کتابت کی عملی دشواریوں کی وجہ سے زیادہ عام تھا، عہد نبویؐ میں حدیث اور فقہ کو ایک علیحدہ علم یا فن کی حیثیت حاصل نہ تھی، باقی منطق فلسفہ اور علم کلام کا ذکر ہی فضول ہے، اس لئے ان کے سیکھنے سکھانے کا سوال بھی خارج از بحث ہے، البتہ دینی احکام اور مسئلے مسائل کا سکھانا چونکہ خود آنحضورؐ کی زندگی کا مشن تھا، اس لئے آپ

کی اتباع میں آپ کے ساتھی بھی اس کا اہتمام کرتے نظر آتے ہیں، اس کو فقہ کی تعلیم سے تعبیر کرنا غلطیہائے مضامین کے قبیل سے ہے۔ ؎

غلطیہائے مضامین مت پوچھ — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

فقہ کی تعلیم کا جو تصور آج عربی مدارس یا جامعات میں ہے کہ فقہ رہ گئی ہے اور فقہ جس سے ماخوذ تھی یعنی قرآن وہ غائب ہے۔ اس طرح کی فقہ کا سراغ ہمیں عہد نبوی کے سلسلہ تعلیم و تعلم میں کہیں نہیں ملتا، اس کے علاوہ بھی متعدد علوم و فنون کے سیکھنے سکھانے کا سراغ ملتا ہے، لیکن فرض عین اور فرض اولین کی حیثیت سے نہیں بلکہ فرض کفایہ کی حیثیت سے۔ اس سے فقط اتنا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام حسب ضرورت ان کے سیکھنے سکھانے سے مانع نہیں ہے، مثلاً عہد نبوی کے آثار میں یہ باتیں ملتی ہیں کہ قرآن و سنت کے علاوہ لوگ نشانہ بازی، پیراکی، حساب، طب، علم ہیئت، علم انساب اور قرات و تجوید بھی سیکھتے سکھاتے تھے، لیکن ظاہر ہے ان کا سیکھنا سکھانا اس درجہ کا نہیں تھا جس درجہ میں کہ قرآن کے سیکھنے سکھانے کا حکم تھا، زندگی اور تہذیب و تمدن سے متعلق وہ علوم جو اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں ان کے بارے میں صحیح اور متوازن نقطۂ نظر یہی ہے کہ اسلام کی مقرر کردہ دینی اور اخلاقی حدود میں رہ کر ان کا حصول جائز ہے۔ مثلاً زراعت یا حصول معاش کے دوسرے طریقے جو دنیا میں پہلے سے رائج ہیں، اسلامی معاشرہ میں بھی ان کو کچھ پابندیوں کے ساتھ اختیار کیا جائے گا اسلام اس سے مانع نہیں ہے، لیکن اس کو اگر یہاں تک بڑھا دیا جائے کہ اسلام زراعت سکھانے کے لئے آیا اور قرآن اصول زراعت کی کتاب ہے تو اس کی لغویت میں کلام نہیں، اسلام اس کے اور قرآن کا مقصد وجود اس طرح کے علوم و فنون نہیں ہو سکتے، زراعت اور پیداوار ہی کے کسی مسئلہ سے متعلق اس کا ذکر آتا ہے کہ آپ نے جواب میں فرمایا:

انتم اعلم بامور دنیاکم — تم اپنی دنیا کے امور کو بہتر سمجھ سکتے ہو۔

اس حدیث کے الفاظ سے قطعیت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کہ امور دنیا سے متعلق علوم و فنون سے آپ نے سروکار نہیں رکھا۔ لیکن مسلمانوں کو ان کے حصول سے منع بھی نہیں فرمایا بلکہ اس کے برعکس حسب ضرورت ان کے حصول کی طرف توجہ دلائی، لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ کی بعثت ان علوم و فنون کی تعلیم کے لئے تھی، آج کے مسلم معاشروں کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے ان علوم کو پس پشت ڈال دیا ہے جن کی تعلیم کے لئے آپ مبعوث ہوئے اور قرآن نازل ہوا۔ خود قرآن زبان حال سے فریاد کناں ہے:

یَارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (فرقان)	خدایا انھوں نے قرآن کو چھوڑ رکھا ہے۔

دوسری طرف ہم نے تعلیمی میدان میں اپنے جملہ وسائل کو سائنس اور ٹکنالوجی کی تحصیل پر لگا رکھا ہے، اس طرح ہم بھی بحیثیت مجموعی دنیا کی بہت سی قوموں میں سے ایک قوم بن کر رہ گئے ہیں، وہ بھی پست اور پسماندہ، جبکہ ہمارا اصل مقام اقوام عالم کی صف میں ان کے دوش بدوش رہنا نہیں بلکہ ان کی امامت کرنا تھا، اور یہ منصب ہمیں اسی وقت مل سکتا تھا جب ہم اپنے مقصد وجود سے باخبر ہوتے اور اس کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرتے، ہمارا مقصد وجود کیا تھا قرآن نے اس کو بہت صراحت اور وضاحت سے بیان کر دیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران-۱۱۰)	تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لئے نکالے گئے ہو، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو،

مسلمانوں کو خیر الامم کا لقب دے کر ان کو اقوام عالم سے ممیز ہی نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی جتا دیا گیا

کہ امت عالم انسانیت کے لئے برپا کی گئی اور اس کی ذمہ داری یہ قرار پائی کہ وہ معروف کا حکم دیگی اور منکر سے روکے گی، اس بار امانت کا متحمل ہونے کے بعد مسلمانوں کے پاس اتنا وقت کہاں سے آئیگا کہ وہ دنیا کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوں، مسلمان اپنے فرائض منصبی سے غافل نہ ہوں تو ان کو دنیوی ترقی میں سر کھپانے کی ضرورت ہی نہیں۔

اَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ	تم سربلند رہوگے اگر تم مومن رہوگے۔
(آل عمران: ۱۳۹)	

یہ دنیا مومن کی میراث ہے، وہ اس کی چاکری کرے گی، لیکن وہ اپنے مقام سے ہٹے تو ذلت و خواری ان کا مقدر ہوگی جیسا کہ سب کے سامنے ہے:

آنحضورؐ کی تعلیم یا نظام تعلیم جو چاہے کہہ لیجئے اس کا بنیادی نقطہ یہی تھا کہ آپ نے اپنے عہد کے مسلمانوں کو تشخص اور امتیازی حیثیت کا شعور دلا کر ایک عظیم مقصد اور بلند نصب العین کے لئے مرنا جینا سکھایا۔ یہی نکتہ:

اِنَّ صَلَاتِیۡ وَنُسُكِیۡ وَمَحۡیَایَ وَمَمَاتِیۡ	بیشک میری نماز اور میری قربانی اور
لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ	میری زندگی اور موت اس اللہ کے لئے ہے
(انعام: ۱۶۳)	جو رب العالمین ہے

میں بیان ہوا ہے جو ایک مومن کا وظیفہ ہے، آج سائنس اور ٹکنالوجی کا صور مسلمان معاشروں میں اس لئے پھونکا جا رہا ہے تاکہ وہ اس میں پھنس کر رہ جائیں اور اس علم کی طرف متوجہ نہ ہوں جو ان کا مابہ الامتیاز ہے اور اس طرح باطل پرست اقوام کی امامت اور سرپرستی، سیادت اور بالادستی قائم رہے، اور مسلمان جن سے ان کو خطرہ ہے بدستور ان کی غلامی اور چاکری کرتے رہیں، ائمہ کفر اور ضلالت کے قائدین نے مسلمانوں ہی کو سحر سامری سے اپنی بندگی میں نہیں لے رکھا ہے بلکہ انھوں نے

پوری انسانیت کو غلام بنا رکھا ہے، اور وہ طاقت کے سامنے کون لمن الملک الیوم پکار کر انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ راقم نے آج کی دنیا میں ایسے دونوں ہی نمائندہ طاقتوں کو دیکھا ہے یعنی یورپ میں بھی رہا ہوں اور امریکہ میں بھی، ہر دو جگہ انسانیت سسک سسک کر دم توڑ رہی ہے، وہ زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ	خداوندا تو ہمیں اس بستی سے نکال جس کو
الظَّالِمِ اَهْلُهَا (نساء: ۷۵)	رہنے والے ظالم ہیں۔

مگر وہ امت جس کو دنیا کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا گیا تھا خود اسی حالت میں گرفتار ہے ع

مژدہ باد اے مرگ عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

ضرورت ہے کہ ہم سب سے پہلے عہد نبوی کے تصور تعلیم کو دیانت داری کے ساتھ اس کی اصل اور خالص و منزہ شکل میں اپنائیں۔ اس کا علم حاصل کریں اور اس پر کاربند ہوں۔

معارف: مقالہ نگار کا یہ منشا نہیں ہے کہ مسلمان سائنس، ٹکنالوجی یا موجودہ دنیاوی علوم و فنون کی تحصیل ہی نہ کریں بلکہ وہ انھیں مقصود بالذات بنا لینے کی نفی و تردید کرنا چاہتے ہیں، اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جس چیز کی تعلیم دینے کے لئے ہوئی تھی اسی کی تعلیم و تحصیل پر انھیں اصلاً اپنی توجہ مرکوز کرنی چاہیئے، اور اسی میں ان کی زندگی اور سربلندی کا راز پنہاں ہے ع

گر تو می خواہی مسلماں زیستن	نیست ممکن جز بقرآں زیستن

وہ اس پر بھی زور دینا چاہتے ہیں کہ خیر امت کو اپنے اصل مقصد کو ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے، اگر اس نے بھی یورپ ہی کی طرح خالص مادی نقطۂ نظر کو اپنا لیا اور نئے علوم کی تحصیل کے درپے ہو کر کتاب و سنت کی تعلیم سے کوئی سروکار نہیں رکھا تو اس کا نتیجہ خود اس کی ذلت اور دنیا کی تباہی کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

مطبوعات جدیدہ

کاروانِ زندگی:- مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۸۱۵ مجلد مع گردپوش، قیمت ۵۰ روپیے، ناشر مکتبۂ اسلام ۳۷ گوئن روڈ، لکھنؤ،

یہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے خود نوشت حالات ہیں، اس میں انہوں نے اپنے بچپن ۱۹۱۴ء سے ۱۹۷۵ء تک کے حالات و واقعات زندگی اٹھارہ ابواب میں قلمبند کیے ہیں سب سے پہلے اپنے خاندان اور بستی دائرۂ شاہ علم اللہ کا تذکرہ کیا ہے، تاکہ اس ماحول کی تصویر سامنے آجائے جس میں ان کی نشو ونما ہوئی ہے، پھر لکھنؤ میں قیام، وہاں کے ماحول، اپنی تعلیم و تربیت اور عربیت کی مشق و ممارست کا حال لکھا ہے، اس سلسلہ میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ مشرقیات اور ندوۃ العلماء میں تحصیل علم کے علاوہ لاہور میں مولانا احمد علیؒ کے درس قرآن اور دیوبند میں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے درس حدیث میں اپنی شرکت کا تذکرہ کیا ہے، اور مندرجۂ ذیل اساتذہ سے خاص طور پر استفادہ کا ذکر کیا ہے، شیخ خلیل عرب، خواجہ عبدالحئی فاروقی، مولانا سید طلحہ، علامہ تقی الدین ہلالی، اسی حصہ میں اپنے والد محترم کے انتقال پا جانے کے بعد اپنے بزرگ اور شفیق بھائی ڈاکٹر حکیم مولانا سید عبدالعلی کے سایۂ عاطفت اور سرپرستی کا بڑی احسانمندی سے ذکر کیا ہے، جس نے انہیں شفقت پدری سے محرومی کا احساس نہ ہونے دیا، تعلیم کے مراحل ختم کرنے کے بعد ندوۃ العلماء میں اپنی معلمی کی سرگذشت بیان کی ہے، اس میں درس کے لیے اپنی

تیاری، لگن اور اس سلسلہ کی ضروری کارگذاریوں اور خدمات کی جو تفصیل لکھی ہے وہ
کے سہولت پسند اساتذہ کے لیے سبق آموز ہے، اس ضمن میں نصاب کی جدید ترتیب کے
ف کتابیں اور ریڈریں خود مرتب کرنے اور دوسرے اساتذہ سے مرتب کرانے کا ذکر بھی
ہے، اس کے بعد ندوۃ العلماء سے باہر کے اشخاص، اداروں اور جماعتوں سے اپنے روابط
تان سنائی ہے، اس سلسلہ میں مختلف اداروں کے دعوت ناموں اور وہاں کی گئی اپنی
ں کا ذکر کیا ہے، اسی حصہ میں جماعت اسلامی سے تعلق اور علٰحدگی اور ایک زمانہ میں
اعت سے اپنی وابستگی اور اس کے اجتماعات میں حصہ لینے کا تذکرہ کیا ہے، مولانا کا
ق دعوتی اور تبلیغی ہے، اصلاح خلق، خدمت دین، اشاعت اسلام، اعلائے کلمۃ اللہ
انوں کی سربلندی کے لیے جو ولولہ، جوش تڑپ اور بے قراری ان میں پائی جاتی ہے وہ
پوری کتاب میں بہت نمایاں ہے، اس کے لیے انہوں نے ملک و بیرون ملک
ہم، پر از مشقت اور یادگار سفر کیے، اس کی روداد بھی اس میں درج کی ہے، عربی زبان
نی لٹریچر کی تیاری اور مشرق وسطیٰ کا سفر بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، مولانا کا اصلاحی
دائرہ مسلمانوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ وہ غیر مسلموں کو بھی اسلام کا پیغام پہنچانے
بے چین رہتے ہیں، اس کتاب میں ایسے مخلوط اجتماعات کی روداد اور عنفوان شباب
ٹر امبیدکر کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے اپنے بمبئی تشریف لے جانے کا تذکرہ کیا
ولانا کو تصنیف و تالیف کا فطری ذوق اور تقریر و خطابت کا خداداد ملکہ ہے، اس
ب میں اپنی اکثر کتابوں کا مقصد و پس منظر بتا کر ان کا مکمل تعارف کرایا ہے، اور اپنے
، اور مختلف اہم تقریروں کا خلاصہ بھی افادۂ عام کے لیے درج کیا ہے، انہیں خود اپنی
ح کی فکر بھی برابر دامن گیر رہتی ہے، اس کے لیے متعدد اہل اللہ اور مشائخ کی خدمت میں

(ن) عاصرین کا ذکر کیا ہے، ان کی فرط شہرت، مقبولیت اور عظمت کی بنا پر انہیں بڑے سے
بڑے اعزازملے، دمشق اور مدینہ کی یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے مدعو کیے
گیے، اور ہندوستان اور عالم اسلام کے عظیم الشان اداروں اور اکیڈمیوں کے ممبر بنائے گیے
اس کتاب میں ان کی اور اپنی قومی، ملی، تعلیمی، اور دینی سرگرمیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، ان کا
حلقۂ تعارف بڑا وسیع ہے، جس میں مختلف طبقوں کے مشاہیر اور دنیائے اسلام کی ممتاز
شخصیتیں شامل ہیں، ان سب کا حسب موقع اس کتاب میں ذکر آ گیا ہے، اس طرح یہ آپ بیتی
اور جگ بیتی دونوں ہے، جو گذشتہ نصف صدی کے متعدد واقعات پر مشتمل ہونے کی
وجہ سے بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے،

محی الملۃ والدین مرتبہ مولانا شاہ عون احمد قادری۔ تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و
طباعت بہتر، صفحات ۴۵۲ مجلد مع گردپوش، قیمت ۲۵ روپیے، پتہ:
دار الاشاعت خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف، پٹنہ،

مولانا شاہ محمد محی الدینؒ کا تعلق پھلواری کے اس خانوادے سے ہے، جو کئی پشتوں سے
علم و عرفان کا گہوارہ ہے، خود مولانا کی ذات بھی علم و عمل اور شریعت و طریقت کی جامعیت
میں اپنے اسلاف کا نمونہ تھی، اور وہ اپنے والد بزرگوار مولانا شاہ بدر الدینؒ کے بعد خانقاہ
مجیبیہ کے سجادہ نشین اور امارت شرعیہ بہار کے امیر ہوئے، اس کتاب میں ان کی مذہبی اور
ملی خدمات کی تفصیل پیش کی گئی ہے، اور ان کے خاندانی حالات، ظاہری و باطنی تعلیم و تربیت،
علمی کمالات اور اخلاق و سیرت کے جلوے نمایاں کیے گیے ہیں، اور ان کے آل و اولاد اور
خلفاء و مسترشدین کا حال بھی تحریر کیا گیا ہے، اس کا پہلا اڈیشن مولانا کے انتقال کے بعد ہی
شایع ہوا تھا، یہ دوسرا اڈیشن ہے، اس میں بھی تعزیتی خطوط اور قطعات تاریخ درج ہیں،

شروع میں مرتب کے فرزند مولوی شاہ نصر احمد کے علاوہ مولانا مناظر احسن گیلانی کا مقدمہ بھی ہے جس میں بہار کی تاریخی و علمی اہمیت اور پھلواری اور خانقاہ مجیبیہ کی دینی خدمات اور نمایاں خصوصیات تحریر کی گئی ہیں۔

خطبات عیدین، مرتبہ مولانا محمد تقی امینی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۶۰ مجلد، قیمت ۲۱ روپیے، پتہ:- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا محمد تقی امینی ناظم شعبۂ دینیات سنی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے یونیورسٹی سے وابستہ ہونے کے بعد وہاں کی جامع مسجد میں جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے جو اب بھی جاری ہے، مکتبۂ جامعہ نے ان کے عیدین کے خطبوں کا یہ مجموعہ اپنی طباعت کے روایتی معیار کے مطابق شایع کیا ہے، ان میں اسلامی تہوار کے خط و خال، عیدین کی اہمیت و خصوصیت اور ان کے مخصوص اذکار و اعمال کی غرض و حکمت بتائی ہے، اور عید الفطر کے ضمن میں روزہ سے اسکا تعلق واضح کیا ہے، اور عید الاضحیٰ کے سلسلہ میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگذشت بیان کی ہے، فاضل خطیب نے ذکر و خشیتِ الٰہی، انابت الی اللہ، قلب و روح کی پاکیزگی، انفاق، قربانی، ایثار، مواسات، ہمدردی، اخوت اور مسلمانوں کی تہذیبی و معاشرتی اصلاح وغیرہ کو عیدین کی اصل روح اور خاص تعلیم بتا کر ان کی بڑی موثر وضاحت کی ہے مگر سب خطبوں کا موضوع ایک ہی ہونے کی وجہ سے ان میں اعادہ و تکرار ہے، نیز یہ خطبے خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مجمع میں دیئے گئے ہیں، اس لیے ان میں انہی کے ذوق کو مد نظر رکھا گیا ہے۔

میر باقر مخلص مرشد آبادی، مرتبہ ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب متوسط تقطیع

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۰۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۸ روپئے،
ناشر مغربی بنگال اردو اکیڈمی ۲ سندری موہن ایونیو کلکتہ نمبر ۱۴

مرشد آباد (بنگال) بھی اردو کا ایک بڑا مرکز تھا، جو آخری دور میں دلی کی تباہی کے بعد لکھنؤ اور عظیم آباد کی طرح شعراء اور ارباب کمال کی منزل بنا ہوا تھا، یہاں کے بعض قدیم سخنور میر، سودا، درد اور جانجاناں کے معاصر ہی نہیں، ان کے ہم پایہ بھی تھے، میر باقر مخلص اسی عہد کے ایک باکمال شاعر تھے، ان کی پیدائش بھی مرشد آباد میں ہوئی، اور وہ یہیں پیوندِ خاک بھی ہوئے، لیکن ان کا دیوان نایاب تھا، جس کا صرف ایک ہی نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ تھا، جو بڑے خراب اور خستہ حال میں تھا، اب اسی کی مدد سے ڈاکٹر عبد الرؤف ریڈر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی نے مخلص کا دیوان ایڈٹ کر کے اپنے مقدمہ کے ساتھ شایع کیا ہے، یہ دراصل ان کا وہ مقالہ ہے جس پر کلکتہ یونیورسٹی نے ان کو ڈی لٹ کی ڈگری دی ہے، اس میں مخلص کے نام و نسب اور سنہ پیدائش کے متعلق عرق ریزی سے بحث کر کے بعض تذکرہ نگاروں کے غلط بیان کی تصحیح کی ہے، ایک باب میں میر باقر کے عہد کے حالات کا جائزہ لیا ہے، پھر اردو اور فارسی تذکروں میں ان کے بارہ میں جو مواد درج ہے، اسے سلیقہ سے جمع کر کے حواشی میں تذکروں اور ان کے مولفین کے متعلق ضروری معلومات قلمبند کیے ہیں، ایک باب میں مرشد آباد کی اہمیت و مرکزیت واضح کرنے کے بعد وہاں کے مخلص کے ہمعصر شعراء کا مختصر تذکرہ لکھا ہے، اور ان کے کلام کا نمونہ بھی دیا ہے، اس کے بعد مخلص کے دور کی لسانی خصوصیات اور ان کے کلام کے بعض متروکات کی نشاندہی کی ہے، آخر میں مخلص کا دیوان دیا ہے، جو قصائد، غزلیات اور ساقی نامہ پر مشتمل ہے، اس میں بھی کہیں کہیں مفید حواشی درج ہیں، مخلص اساتذۂ فن میں تھے، قدامت کے باوجود ان کا کلام بلند پایہ اور درا

و تاب کے مدوّن کی معرفت و آفتاب علوم ہند پر ہے اس لئے اس کی اشاعت ایک مفید عمل ہے مغربی بنگال اردو اکیڈمی مبارکباد کی مستحق ہے، لائق مرتب نے محنت اور دیدہ ریزی کلام کا جائزہ لے کر ان کی جن خصوصیات کی نشاندہی کی ہے، اس سے ان کے عمدہ اچھی تنقیدی صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

تواریخ ریسلاس۔ شہزادۂ حبش، مرتبہ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت بہتر صفحات ۲۸۰ مجلد مع گرد پوش قیمت ۳۵ روپے، پتہ (۱) انجمن ترقی اردو، اردو گھر، راؤز ایونیو دہلی (۲) دانش محل، امین آباد پارک لکھنؤ۔

یہ انگریزی ناول "دی ہسٹری آف ریسلاس پرنس آف ابی سینیا" کا اردو ترجمہ ہے جسے سید کمال المعروف بہ سید محمد میر لکھنوی نے آگرہ اسکول بک سوسائٹی کی فرمائش پر کیا تھا، اور ۱۸۳۹ء میں چھپا تھا، اسے ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی لکچرر شعبۂ اردو شبلی کالج نے اس کا متن دوبارہ اپنے مقدمہ و حواشی کے کیا ہے، مقدمہ نگار نے مصنف ڈاکٹر سیموئل جانسن کی ناول نگاری کی خصوصیات اور اس قصہ، پلاٹ اور دوسرے ضروری معلومات قلمبند کیے ہیں، انہوں نے مترجم کے خاندانی حالا واقعات کی کافی چھان بین کی ہے۔ آخر میں میر صاحب کے علمی و ادبی کارناموں اور انکی تصنیفات تبصرہ کیا ہے، اور زیر نظر ناول کے ترجمہ کی خصوصیات اور اس کی زبان و طرز بیان پر اظہار خیال کی کے خیال میں یہ انگریزی ناول کا پہلا اردو ترجمہ ہے، جو اصلاح خلق کے علاوہ اس جذبہ سے کیا گیا ہے مغربی علوم و افکار سے واقف ہوں۔ اس لحاظ سے یہ اہم ہے، لائق مرتب کے مفید اور معلومات پر مشتمل اس کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے، انہوں نے ناموں اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی آخر میں دی کتاب کا نام تاریخ ریسلاس ہونا چاہیے، خود مترجم نے بھی یہی نام لکھا ہے۔

———

ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام

کسی فرماں روا خاندان یا فرماں روا اشخاص کی عظمت و شان، پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ ان کی فتوحات اور فوجی طاقت سے کیا جاتا رہا ہے، اور اسی حیثیت سے ان کی تاریخیں بھی لکھی جاتی تھیں خود ہندستان کے مختلف فرمانروا خاندانوں کی تاریخیں بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، اور ان میں ان کی فتوحات اور جنگوں کی تفصیل لکھی گئی، مغلوں نے بابر سے لے کر ظفر شاہ تک چار پانچ سو برس اس ملک پر حکومت کی، اور بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں، اور اپنے مقبوضات کا دائرہ راس کماری سے ہرات اور کابل تک پہنچا دیا، ان کی تاریخ بھی صرف ان کی جنگوں کی اور فتوحات کی تاریخ ہے لیکن اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا کہ ان کا فوجی نظم و نسق کیا تھا، نبرد آزمائی کے طریقے کیا تھے کس قسم کے اسلحے استعمال ہوتے تھے، میدان جنگ میں فوجوں کی ترتیب کیا ہوتی تھی، اُن کی مختلف ٹکڑیوں کے نام کیا ہوتے تھے، پھر ان کی ذمہ داریاں کیا ہوتی تھیں، وغیرہ وغیرہ، جب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب دار المصنفین کی رفاقت میں آئے، اور اُن کو انگریزی کا شعبہ دیا گیا، تو سید صاحب نے ان کو یہی مشکل موضوع دیا، جس کے لئے مواد کا تلاش کرنا پہاڑ سے جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا، انھوں نے دس بارہ سال کی مسلسل محنت اور جانفشانی سے نہ صرف مغلوں کے عہد کے بلکہ ہندوستان کے پورے عہد وسطیٰ کے فوجی نظام پر ایک ضخیم کتاب تیار کرکے پیش کردی، اس میں عہد وسطیٰ کے فوجی نظام مثلاً آلات حرب، آتشیں اسلحے، بحری بیڑے، فوج کا کوچ، صف آرائی، ترتیب، میدان جنگ، قلعے، چھاؤنیاں کمین گاہیں، مختلف فوجی عہدہ داروں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل نہایت دلچسپ انداز میں بیان کی گئی ہے، یہ اپنے موضوع پر اردو میں منفرد کتاب ہے، قیمت ۔/۲۲ روپیہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

"منیجر"